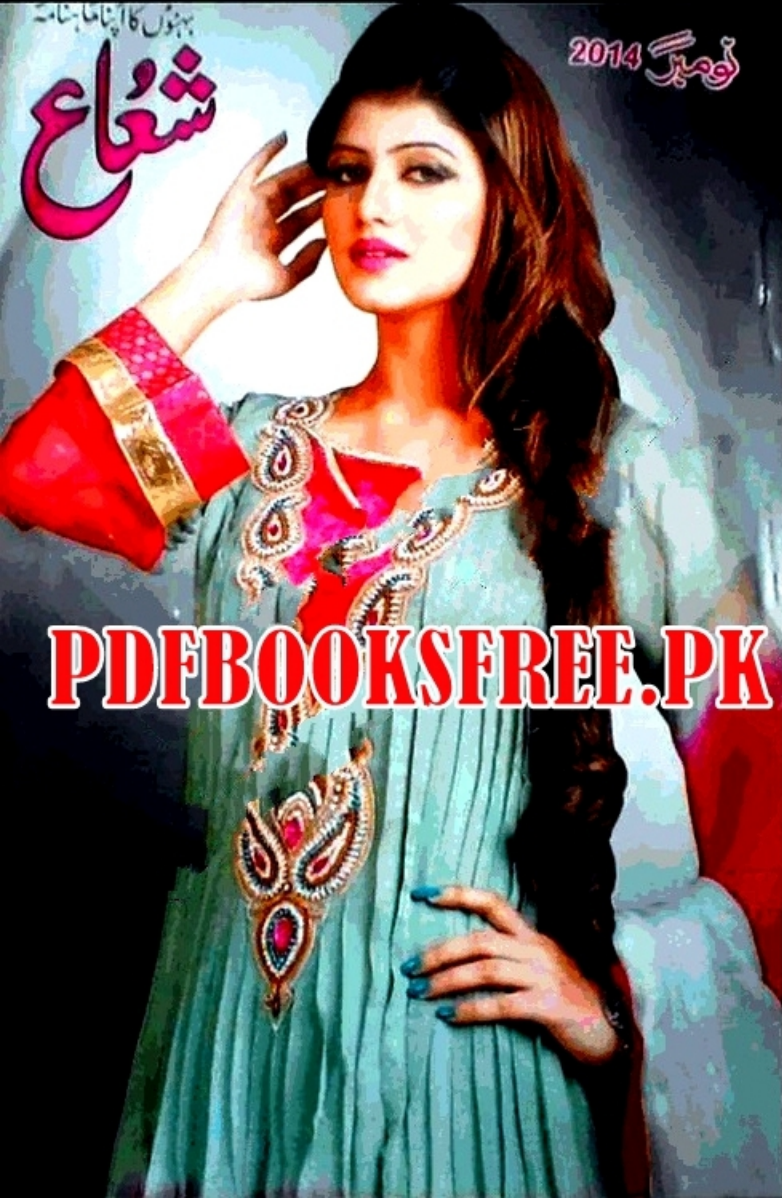


بہنوں کا اپنا ماہنامہ
شعاع
نومبر 2014
PDFBOOKSFREE.PK

پہلی شعاع، رضیہ جمیل 10
حمد، نعمان فاروقی 11
نعت، مظفر وارثی 11
نبی ﷺ کی باتیں، ادارہ 12

انٹرویو

بندھن، عامر سلیم 22
دستک، شاہین رشید 276
جانے کی جلدی، صائمہ اکرم 282
وہ اک پری تھی، نازیہ جمال 280

ناول

ایک تھی مثال، رخسانہ نگار عدنان 36
رقصِ بسمل، نبیلہ عزیز 246

مکمل ناول

یارم، سمیرا حمید 140
یہ ہنستا ہوا موسم، راشدہ رفعت 70
شبِ غم رہی، زرحین اظفر 192

ناولٹ

محبت فاتحِ عالم، شبیر نقوی 116

افسانے

دل کی چوکی، شاہین رشید 184
مٹی بڑی زرخیز ہے، مسعودہ صفت 66
دل کے فیصلے، سالکی نصیر حسین 58
سرخ گلاب، مشکور حسین یاد 261

غزل، ریحانہ چنگیزی 264
غزل، قابل اجمیری 264
غزل، خالد معین 265
نظم، نوشین اقبال نوشی 265

زرِ سالانہ بذریعہ رجسٹری
پاکستان (سالانہ) ------- 700 روپے
ایشیا، افریقہ، یورپ ------- 5000 روپے
امریکہ، کینیڈا، آسٹریلیا ------- 6000 روپے



مستقل سلسلے

خط آپ کے، رضیہ جمیل 26
مسکراہٹیں، صبا سحر 266
آئینہ خانے میں، واصفہ اصیل 273
بالوں سے خوشبو آئے، شگفتہ جاہ 270
یاد کے جھروکے، امت الصبور 286
کھلتا کسی پہ، خالدہ جیلانی 269
موسم کے پکوان، خالدہ جیلانی 288
خوبصورت بنیے، ادارہ 290

نومبر 2014
جلد 29 شمارہ 3
قیمت 60 روپے

خط و کتابت کا پتہ: ماہنامہ شعاع، 37 - اردو بازار، کراچی۔

رضیہ جمیل نے ابن حسن پرنٹنگ پریس سے چھپوا کر شائع کیا۔

Phone: 32721777, 32726617, 021-32022494 Fax: 0092-21-32766872
Email: shuaa@khawateendigest.com website: www.khawateendigest.com

شعاع کا نومبر کا شمارہ آپ کے ہاتھوں میں ہے۔

اگست کے دوسرے ہفتے سے شروع ہونے والا سیاسی افراتفری کا سلسلہ ابھی تک کسی نتیجے تک نہیں پہنچ سکا ہے۔ انقلاب اور تبدیلی تو کیا آتی جلسے جلوسوں نے عوام کے لیے مزید مشکلات کھڑی کر دی ہیں۔ اسی افراتفری کو الیکٹرانک میڈیا مزید ہوا دے رہا ہے۔ چند چینلز کو چھوڑ کر مجموعی طور پر میڈیا کا کردار حیران کن حد تک منفی رہا ہے۔ ہم مغرب میں آزادیٔ صحافت کی مثالیں دیتے نہیں تھکتے لیکن تمام تر آزادی کے باوجود وہاں کی روایات ہیں۔ براہ راست نشریات میں بھی ملکی مفاد کو مدنظر رکھا جاتا ہے جبکہ ہمارے یہاں ادب اور اخلاقیات کو ترک کر دیا گیا ہے۔ وہ آداب متروک الفاظ بن کر رہ گئے ہیں۔ غیر مہذب اور ناشائستہ زبان کے ساتھ ساتھ انتہائی اشتعال انگیز رویہ اور انداز اختیار کیا جا رہا ہے۔ ملکی مفاد کا بھی کسی کو خیال نہیں ہے۔ آزادیٔ صحافت کے نام پر ہیجان پیدا کیا جا رہا ہے، اشتعال انگیزی کی جا رہی ہے۔ اس کے نتائج خطرناک بھی ہو سکتے ہیں۔

سیاست اور صحافت کے اسی انداز سے کاروبار حکومت ہی نہیں کاروبار زندگی بھی متاثر ہوا ہے اور اس کا سب سے زیادہ نقصان عوام کو پہنچ رہا ہے۔

آہ فرحانہ ناز ملک،

ابھرتی ہوئی باصلاحیت اور ذہین مصنفہ فرحانہ ناز ملک گاڑی کے حادثے میں اس دار فانی کو الوداع کہہ گئیں۔

اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُون

فرحانہ ناز ملک ایک شادی میں شرکت کے لیے جا رہی تھیں۔ ان کے ساتھ ان کی والدہ، بہن اور بھائی بھی تھے۔ وہ بھی موقع پر ہی جاں بحق ہو گئے۔

فرحانہ ناز ملک کے خاندان کے لیے یہ بہت بڑا سانحہ ہے۔ خصوصاً ان کے بچوں اور شوہر کے لیے۔ ہم اللہ تعالیٰ سے دعاگو ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کے بچوں کو اپنے حفظ و امان میں رکھے، اس عظیم سانحے کو برداشت کرنے کی ہمت اور حوصلہ عطا فرمائے اور انہیں صبر جمیل سے نوازے۔

فرحانہ ناز ملک کو اپنے جوار رحمت میں جگہ دے۔ آمین۔

قارئین سے بھی دعائے مغفرت کی درخواست ہے۔

اس شمارے میں،

- راشدہ رفعت کا مکمل ناول - یہ بہتا ہوا موسم، سمیرا حمید کا مکمل ناول - یادم،
- فرحین اظفر کا مکمل ناول - شب غم رہی بڑی دیر تک،
- نبیلہ نقوی کا ناولٹ -
- رخسانہ نگار عدنان اور نبیلہ عزیز کے سلسلے وار ناول،
- شاہین ملک، سلمیٰ نصیر حسین، میمونہ صدف اور مشکور حسین یاد کے افسانے،
- فرحانہ ناز ملک کی یاد میں مضامین، عامر سلیم اور آسیہ سلیم کا بندھن،
- معروف شخصیات سے گفتگو کا سلسلہ - دستک،
- پیارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی پیاری باتیں - احادیث نبوی کا سلسلہ،
- خط آپ کے اور دیگر مستقل سلسلے شامل ہیں۔

شعاع کا یہ شمارہ آپ کو کیسا لگا؟ اپنی رائے سے ضرور نوازیے گا۔

حمد باری تعالیٰ

تجھ کو خبر ہے کس پہ شمع سی جل رہی ہے
پھر کیوں ہوا کے برہم اس سے الجھ رہی ہے

تھوڑا ہے رزق میرا مجھ کو نہیں یہ غم ہے
تیری ثنا کی دولت اس سب سے قیمتی ہے

رحمت کی اک نظر ہو ان کے بھی حال پر اب
تقدیر جن کی تو نے دکھ درد سے بھری ہے

تیری نوازشوں سے، تیرے کرم سے مولا
رحمت کی سبز چادر ہر ایک پر تنی ہے

تجھ کو اسی ادا سے ہم نے اب کے پکارا
ہے پُر یقین لہجہ اور آنکھ میں نمی ہے

نعمان فاروق

نعت رسول مقبولؐ

کُل عالم، جس کی گُنیا جس کی پرچھائیں سویرا
وہ ہے رسولؐ میرا

جس کی کملی کے سائے میں آنکھ سحر نے کھولی
جس کے لہجے میں ہم تک پہنچی قدرت کی بولی
جس کے چاروں سمت خدا نے اپنا نور بکھیرا
وہ ہے رسولؐ میرا

جس کی سچائی نے بادل کے شہ زور پچھاڑے
جس نے تیز ہواؤں کے سینے پر جھنڈے گاڑے
جس کے دریا کی لہروں نے کہساروں کو گھیرا
وہ ہے رسولؐ میرا

آپ چٹائی پر سویا بانٹی خیرات میں شاہی
چھو کر جس کے پاؤں کو قائد کہلائی گمراہی
جس کی چوکھٹ پر انسان کی عظمت کرے بسیرا
وہ ہے رسولؐ میرا

لاکھوں سلام اس پر بھیجوں لاکھوں درود بھیجوں
روح کو اکثر اس کے روضے پر بے وجود بھیجوں
جس کی رحمت کا احسان مظفر پر بہتیرا
وہ ہے رسولؐ میرا

مظفر وارثی

ادارہ



دین کی سمجھ

حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"جس شخص کے ساتھ اللہ بھلائی کا ارادہ کرتا ہے اس کو دین کی سمجھ عطا فرما دیتا ہے۔" بخاری و مسلم

فائدہ: دین کی سمجھ (فقاہت) سے مراد قرآن و حدیث کا فہم، دین کے احکام و مسائل کا علم اور حلال و حرام کی تمیز ہے۔ وہ فقاہت مراد نہیں ہے جسے آج کل عام طور پر سمجھا جاتا ہے کہ ائمہ کے اقوال اور ان پر مبنی استنباطات و استخراجات کو سمجھنا فقاہت ہے اور مدونہ کتب فقہ کے ماہرین کو فقیہ باور کیا اور کرایا جاتا ہے اور ستم ظریفی کی انتہا ہے کہ اسی نقطہ نظر کے مطابق ایسے لوگ محدثین کو بھی (نعوذ باللہ) فقاہت سے عاری سمجھتے اور انہیں صرف عطار قرار دیتے ہیں۔ حالانکہ اصل فقیہ یہی لوگ ہیں۔ انہوں نے قرآن و حدیث کی روشنی میں زندگی کے تمام مسائل پر مجموعے مرتب کیے اور الگ الگ ابواب و فصول کے مطابق احادیث رسول درج کیں، تاہم اپنی رائے سے اجتناب کیا جو غایت درجہ تقویٰ اور احتیاط کی بات ہے۔ لیکن لوگوں نے اسی احتیاط و تقویٰ کی وجہ سے انہیں فقہا کی فہرست ہی سے خارج کر دیا اور فقہا صرف انہیں قرار دیا جو قرآن و حدیث کی تصریحات سے صرف نظر کر کے صرف اقوال ائمہ اور ان پر مبنی تفریع در تفریع مسائل کا علم رکھتے ہوں۔

رشک کے قابل

حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"رشک کے قابل صرف دو آدمی ہیں۔ ایک وہ آدمی جس کو اللہ نے مال دیا، پھر اسے حق (کی راہ) میں خرچ کرنے کی توفیق بھی دی۔ اور دوسرا وہ آدمی جس کو اللہ نے دانائی سے نوازا، چنانچہ وہ اس کے ساتھ (لوگوں کے معاملات کے) فیصلے کرتا اور دوسروں کو بھی سکھاتا ہے۔" (بخاری و مسلم)

حسد سے مراد رشک ہے اور وہ یہ ہے کہ آدمی اس جیسی چیز کی آرزو کرے (نہ کہ حسد میں یہ جذبہ کار فرما ہوتا ہے کہ فلاں کو جو فلاں نعمت حاصل ہے، وہ اس سے محروم ہو جائے۔)

فوائد و مسائل:

1- رشک کا مطلب حسد کرنا نہیں ہے جیسا کہ خود امام نووی رحمۃ اللہ نے بھی وضاحت فرمائی ہے۔

2- حسد کرنا ممنوع اور حرام ہے، کیونکہ اس میں حاسد کی یہ آرزو ہوتی ہے کہ فلاں شخص کو جو نعمت حاصل ہے، وہ چھن جائے۔ رشک کرنا جائز ہے اور اس کا مطلب یہ ہے کہ جب انسان یہ دیکھے کہ فلاں پر اللہ کا انعام و اکرام ہو رہا ہے تو یہ آرزو کرے: کاش! مجھے بھی اللہ کی طرف سے یہ نعمتیں حاصل ہوں۔ وہ حاسد کی طرح جلے کڑھے نہیں بلکہ خوش ہو کر اللہ سے دعا کرے۔

حکمت سے مراد قرآن و حدیث کا علم ہے کیونکہ یہی انسان کے لیے نافع ہے اور اسی کے ذریعے ہی سے لوگوں کے درمیان صحیح فیصلے کیے جا سکتے ہیں۔ اس میں مال کے ساتھ علم نافع کے حاصل کرنے کی بھی ترغیب ہے۔

ہدایت قبول کرنا

حضرت ابو موسیٰ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"اس ہدایت اور علم کی مثال جس کے ساتھ اللہ نے مجھے بھیجا "اس بارش کی مانند ہے جو کسی زمین پر برسی۔ چنانچہ اس (زمین) کا ایک حصہ عمدہ تھا۔ اس نے پانی کو اپنے اندر جذب کیا اور گھاس اور کثیر مقدار میں دیگر جڑی بوٹیاں اگائیں اور اس کا ایک حصہ سخت تھا (جو پانی کو فوری طور پر جذب نہیں کرتا) اس نے پانی کو اکٹھا کر لیا۔ تو اس کے ذریعے سے اللہ نے لوگوں کو نفع دیا۔ انہوں نے خود بھی پیا، جانوروں کو بھی پلایا اور کھیتوں کو بھی سیراب کیا اور وہ بارش زمین کے ایک اور حصے کو بھی پہنچی جو چٹیل تھا (ایسا ہموار اور صاف جہاں پانی ہی نہ ٹھہرے) جس نے پانی اکٹھا کیا نہ کوئی گھاس اگائی۔ چنانچہ یہی مثال اس شخص کی ہے جس نے دین میں سمجھ حاصل کی اور اس ہدایت سے اللہ نے اسے نفع پہنچایا جس کے ساتھ اللہ نے مجھے بھیجا۔ پس اس نے خود بھی علم حاصل کیا اور دوسروں کو بھی سکھلایا اور اس شخص کی مثال جس نے اس کی طرف سر اٹھا کر بھی نہ دیکھا (اعراض و گریز کیا) اور نہ اللہ کی اس ہدایت کو قبول کیا جس کے ساتھ اللہ نے مجھے رسول بنا کر بھیجا۔" (بخاری و مسلم)

فوائد و مسائل: اس سے معلوم ہوا کہ علم کے اعتبار سے لوگوں کی تین قسمیں ہیں۔ ایک وہ لوگ ہیں جو قرآن و حدیث کا علم حاصل کرتے ہیں اور اس پر عمل کرنے اور دوسروں کو بھی اس کی تعلیم دینے کے علاوہ اس علم سے مزید استنباط و استخراج کر کے قرآن و حدیث کے فیض کو زیادہ سے زیادہ عام کرتے ہیں، یہ سب سے بہتر لوگ ہیں۔

دوسرے وہ لوگ ہیں جو علم تو حاصل کرتے ہیں لیکن اس سے استنباط و استخراج کی استعداد نہیں رکھتے اس علم سے اگرچہ ان کو خود بھی اور دوسروں کو بھی فائدہ پہنچتا ہے، تاہم ان کا فیض پہلی قسم کی بہ نسبت کم ہے۔ اس اعتبار سے یہ دونوں قسمیں محمود ہیں۔ (جیسا کہ مثال کا بھی مقصود ہے)

تیسرے وہ لوگ ہیں جو قرآن و حدیث کے علم سے اعراض و گریز کا راستہ اپناتے ہیں، نہ خود اسے سنتے اور پڑھتے ہیں، جس سے انہیں فائدہ ہو اور نہ اسے سیکھ کر دوسروں تک پہنچاتے ہیں کہ وہ فائدہ اٹھا سکیں۔ یہ لوگوں کی بدترین قسم ہے۔ ہر مسلمان کو کوشش کرنی چاہیے کہ اس کا شمار پہلی دو قسموں میں سے کسی ایک قسم میں ہو۔

سرخ اونٹوں سے بہتر

حضرت سہل بن سعد رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے فرمایا۔

"اللہ کی قسم! تیرے ذریعے سے کسی ایک آدمی کو اللہ تعالیٰ کا ہدایت دے دینا تیرے لیے سرخ اونٹوں سے بھی بہتر ہے۔" بخاری و مسلم

فائدہ: "سرخ اونٹوں سے بہتر ہے" یہ ایک تمثیل ہے، ہر بہتر چیز کے لیے۔ سرخ اونٹ عرب میں بہت بیش قیمت ہوتا تھا۔ اس میں دعوت الی اللہ کی فضیلت اور لوگوں کو ہدایت کی طرف بلانے کی ترغیب ہے۔ تاہم اس کے لیے پہلے ضروری ہے کہ انسان خود بھی ہدایت کے راستے سے آگاہ اور واقف ہو، اس لیے قرآن و حدیث کا علم حاصل کرنا نہایت ضروری ہے کہ اس کے بغیر ہدایت و رہنمائی کا فریضہ انجام ہی نہیں دیا جا سکتا۔

احکام پہنچانا

حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"میری طرف سے لوگوں کو (احکام الٰہی) پہنچا دو اگرچہ ایک آیت ہی ہو اور بنی اسرائیل سے بیان کرو، اس میں کوئی حرج نہیں۔ اور جو مجھ پر جان بوجھ کر

جھوٹ بولے، وہ اپنا ٹھکانا جہنم میں بنا لے۔ (بخاری)

فوائد و مسائل :

1۔ اس میں ایک تو قرآن و حدیث کا علم حاصل کرنے اور پھر اسے آگے پھیلانے کی تاکید ہے، جس کو تھوڑا یا زیادہ جتنا بھی علم ہو، وہ اس کی تبلیغ ضرور کرے اور لوگوں تک احکام الٰہی پہنچائے۔ یہ نہ سمجھا جائے کہ تبلیغ و دعوت تو صرف علماء اور سند یافتہ لوگوں ہی کا کام ہے بلکہ ہر شخص اپنے علم کی حد تک اس کا مکلف ہے، حتیٰ کہ کسی کو کسی ایک آیت ہی کا علم ہے، یعنی کسی ایک حکم الٰہی ہی سے وہ آگاہ ہے تو اس کی ذمہ داری ہے کہ وہ لوگوں کو بھی اس سے آگاہ کرے۔

2۔ اس میں بنو اسرائیل سے بیان کرنے کی جو اجازت ہے، اس سے مراد صرف بعض وہ واقعات اور قصے ہیں جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بیان فرمائے ہیں اور وہ صحیح احادیث میں موجود ہیں۔ اس کا مقصد ہر قسم کی اسرائیلی روایات بیان کرنے کی عام اجازت دینا نہیں ہے، جیسا کہ عام طور پر اس سے یہ مفہوم اخذ کیا جاتا ہے۔

3۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف جھوٹی بات منسوب کرنے پر سخت وعید ہے، جس کا تقاضا یہ ہے کہ احادیث کی تحقیق اور چھان پھٹک نہایت ضروری ہے۔ اور جو حدیث بے سند ہو یا اس کے سلسلہ سند میں کاذب راوی ہوں یعنی شدید ضعف کی حامل ہو تو ایسی روایت کو حدیث رسول کے طور پر پیش کرنا سخت جرم ہے۔ ضعیف روایات کے مختلف درجے ہیں، لیکن ان درجات کا علم اسمائے رجال اور اصول حدیث پر گہری اور وسیع نظر کے بغیر ممکن نہیں اور ایسے اصحاب علم جو علوم حدیث پر ماہرانہ نظر رکھتے ہوں، بہت ہی قلیل ہوتے ہیں۔ اس لیے عام علماء کے لیے زیادہ بہتر اور محتاط راستہ یہی ہے کہ وہ ضعیف حدیث بیان کرنے سے گریز کریں، چاہے ضعف شدید ہو یا خفیف۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف ایسی بات منسوب نہ کی جائے جس کی نسبت آپ کی طرف مشکوک ہو، اسی لیے ضعیف احادیث بھی بیان نہیں کرنی چاہئیں۔

جنت کا راستہ

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"جو شخص علم (دین) کی تلاش کے لیے کسی راستے پر چلے تو اللہ تعالیٰ اس کے لیے جنت کا راستہ آسان فرما دیتا ہے۔" مسلم

فائدہ : علم سے مراد دین یعنی قرآن و حدیث کا صحیح علم ہے، جو فقہی تعصب کی عینک کے بغیر حاصل کیا جائے۔

ہدایت کی طرف بلانے والا

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ ہی سے روایت ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"جو شخص ہدایت کی طرف بلائے گا اس کو ان تمام لوگوں کے برابر اجر ملے گا جو اس ہدایت کی پیروی کریں گے اور یہ پیروی کرنے والوں کے اجر میں کمی نہیں کرے گا۔" مسلم

فوائد و مسائل : اس حدیث کا اگلا حصہ یہ ہے۔

"جو گمراہی کی دعوت دے گا تو اس کو ان تمام لوگوں کے گناہوں کے برابر گناہ ہو گا جو اس گمراہی کی پیروی کریں گے اور یہ ان گمراہی کی پیروی کرنے والوں کے گناہوں میں کوئی کمی نہیں کرے گا۔"

اس میں خیر کی دعوت دینے والوں کے لیے بڑی خوش خبری اور شر کی دعوت دینے والوں کے لیے سخت وعید ہے۔

صدقہ جاریہ

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ ہی سے روایت ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"جب انسان مر جاتا ہے تو اس کے عمل کا سلسلہ ختم ہو جاتا ہے مگر تین چیزوں کا ثواب اسے ملتا رہتا ہے۔ صدقہ جاریہ اور وہ علم جس سے فائدہ اٹھایا جائے اور نیک اولاد جو اس کے لیے دعائے خیر کرتی رہے۔" (مسلم)

فائدہ : "عمل کا سلسلہ ختم ہو جاتا ہے" کا مطلب ہے کہ اس پر اجر و ثواب ملنا بند ہو جاتا ہے، تاہم تین عمل ایسے ہیں کہ موت کے بعد بھی ان کا ثواب میت کو پہنچتا رہتا ہے۔ صدقہ جاریہ جیسے مرنے والا مسجد، مدرسہ، ہسپتال اور سرائے وغیرہ بنا جائے تو جب تک لوگ ان سے فائدہ اٹھاتے رہیں گے، میت کو ثواب پہنچتا رہے گا۔

علم "جس سے فائدہ اٹھایا جائے" کا مطلب ہے دوستوں کو علم سکھانا یا تالیفات و تصنیفات کے ذریعے سے علم پھیلانا۔ جب تک اس کا سلسلہ تلمذ قائم اور کتابیں محفوظ و موجود رہیں گی اور لوگ ان سے برابر فائدہ اٹھاتے رہیں گے تو ان کا اجر بھی استاد یا مصنف کتب کو ملتا رہے گا۔

اولاد کی نیک تربیت بڑی ضروری ہے تاکہ وہ مرنے کے بعد صحیح طریقے سے اپنے والدین کے حق میں دعائے خیر کرتی رہے کیونکہ اولاد کی دعا والدین کے حق میں مفید ہے۔

دنیا اور اس کا سامان

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ ہی سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا۔

"دنیا ملعون ہے اور جو کچھ سامان اس میں ہے وہ بھی ملعون ہے سوائے اللہ تعالیٰ کے ذکر اور اس کے متعلقات کے اور عالم یا متعلم کے۔"

(اسے ترمذی نے روایت کیا ہے اور کہا ہے : یہ حدیث حسن ہے۔)

فوائد و مسائل :

1۔ اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ واقعی دنیا اور اس کا ساز و سامان ملعون ہے بلکہ دنیا کا وہ مال و متاع ملعون ہے جو انسان کو اللہ کی یاد سے غافل کر دے یا اس کے لیے ملعون ہے جس کو دنیا میں اللہ یاد ہی نہ آئے۔

2۔ اسے کتاب العلم میں اس لیے بیان کیا ہے کہ علم دین کا حاصل کرنا نہایت ضروری ہے تاکہ انسان کو علم ہو کہ فلاں بات یا کام اللہ کی رضا کا اور فلاں اس کی ناراضی کا باعث ہے اسی لیے اس میں عالم اور متعلم کو مستثنیٰ کر دیا گیا ہے۔

علم کے لیے نکلنے والا

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"جو شخص علم کی جستجو میں نکلتا ہے تو وہ لوٹنے تک اللہ کی راہ میں (شمار) ہو گا۔"

(اسے ترمذی نے روایت کیا ہے اور کہا ہے : یہ حدیث حسن ہے۔)

مومن کی منزل

حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"مومن بھلائی سے ہرگز سیر نہیں ہوتا، یہاں تک کہ وہ اپنی آخری منزل جنت میں پہنچ جاتا ہے۔"

(اسے ترمذی نے روایت کیا ہے اور کہا ہے : یہ حدیث حسن ہے۔)

عالم کی فضیلت

حضرت ابو امامہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "عابد پر عالم کی فضیلت ایسے ہی ہے جیسے میری فضیلت تمہارے ایک ادنیٰ آدمی پر۔"

پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"بے شک اللہ تعالیٰ اس کے فرشتے اور آسمان و زمین کی مخلوق، حتیٰ کہ چیونٹی اپنے بل میں اور مچھلی تک (پانی میں) لوگوں کو بھلائی سکھلانے والوں پر (اپنے اپنے انداز میں) رحمت بھیجتے اور دعائیں کرتے ہیں۔

(اسے ترمذی نے روایت کیا ہے اور کہا ہے : یہ حدیث حسن ہے۔)

فوائد و مسائل :

1۔ عالم سے مراد قرآن و حدیث کا عالم ہے جو فرائض و سنن کی پابندی کے ساتھ تعلیم و تعلم میں مصروف رہتا ہے اور عابد سے مراد وہ شخص ہے جو اپنا زیادہ وقت عبادت الٰہی میں گزارتا ہے۔ اس کے نوافل اور کثرت ذکر کا فائدہ چونکہ اس کی اپنی ذات تک محدود رہتا ہے' جب کہ عالم کے علم کا فیض دوسرے لوگوں تک بھی پہنچتا ہے' اس لیے وہ عابد پر بہت زیادہ فضیلت رکھتا ہے۔

2۔ صلاۃ کی نسبت اللہ کی طرف ہو تو معنی ہوتے ہیں : رحمت بھیجنا' فرشتوں کی طرف ہو تو معنی ہیں : مغفرت کی دعا کرنا اور دوسری مخلوق' انسان و حیوان کی طرف ہو تو معنی ہیں : دعا و التجا کرنا۔ گویا معلم خیر پر اللہ تعالیٰ رحمت بھیجتا ہے' فرشتے اس کے لیے مغفرت طلب کرتے ہیں اور دوسری مخلوق اس کے حق میں خیر کی دعائیں کرتی ہے۔

اس میں عالم کی فضیلت اور علما کی توقیر و تکریم کا بیان ہے۔

دین کا علم

حضرت ابو درداء رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا۔

"جو شخص ایسے راستے پر چلے جس میں وہ (دین کا) علم تلاش کرے تو اللہ تعالیٰ اس کے لیے جنت کا راستہ آسان کر دیتا ہے اور فرشتے طالب علم کے لیے' اس کے اس عمل سے خوش ہو کر اپنے پر رکھ دیتے ہیں اور عالم کے لیے آسمان و زمین کی ہر مخلوق' حتیٰ کہ مچھلیاں پانی میں مغفرت کی دعا کرتی ہیں اور عالم کی فضیلت عابد پر ایسے ہے' جیسے چاند کو سارے ستاروں پر فضیلت حاصل ہے اور علما انبیاء کے وارث ہیں اور انبیاء نے اپنے ورثے میں دینار اور درہم نہیں چھوڑے' وہ تو (دین کا) علم ہی ورثے میں چھوڑ کر جاتے ہیں۔ چنانچہ جس نے وہ علم حاصل کیا' اس نے (شرف و فضل کا) ایک بڑا حصہ حاصل کر لیا۔"

(اسے ابوداؤد اور ترمذی نے روایت کیا ہے۔)

فائدہ : اس میں بھی علم دین حاصل کرنے کی فضیلت اور علما کے شرف و احترام کا بیان ہے۔ فرشتوں کے رکھ دینے کا مطلب ہے کہ وہ اپنے پروں کو بند کر کے بیٹھ جاتے ہیں' جیسے علم و ذکر کی دوسری محفلوں کو وہ گھیر لیتے ہیں۔

فطرت کی طرف رہنمائی

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس' جس رات آپ کو معراج ہوئی تھی' شراب اور دودھ کے دو پیالے لائے گئے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان دونوں کی طرف دیکھا اور دودھ (والا پیالہ) پکڑ لیا۔ جبرئیل علیہ السلام نے کہا : تمام تعریفیں اس اللہ کے لیے ہیں' جس نے آپ کی رہنمائی فطرت کی طرف فرمائی' اگر آپ شراب (والا پیالہ) لے لیتے تو آپ کی امت گمراہ ہو جاتی۔ (مسلم)

فوائد و مسائل :

1۔ اسلام دین فطرت ہے جسے ہر وہ نفس قبول کر لیتا ہے جو فطرت سلیمہ پر قائم اور اس کا فہم صحیح ہو۔

2۔ اللہ تعالیٰ جس کو خیر اور فضل کی توفیق دے اسے اللہ تعالیٰ کی حمد کرنی چاہیے۔

3۔ شراب تمام خرابیوں کی جڑ ہے' اسی لیے اسے ام الخبائث کہا جاتا ہے۔



پیرِ کامل

مصنفہ : عمیرہ احمد
تبصرہ : آمنہ زریں

صراط مستقیم ہی دراصل دنیا میں آزمائش کی شکل اختیار کرتا ہے۔ اس کی تلاش' اس سے بھٹکنا' اس پر چلتے ہوئے ڈگمگانا' چلنا' گرنا' پھر سنبھل جانا۔ دراصل صراط مستقیم ہی آزمائش ہے!

وہ جو کلید قرآن ہے۔ وہ جس کا ورد صبح و شام ہے۔ وہ جو زبان پر جاری ہے۔ مگر روح جس کے فہم سے منہ موڑے ہراساں و پریشان زوال کے مدارج طے کر رہی ہے۔ وہ صراط مستقیم کون سا ہے؟ کیا سب کا اپنا اپنا؟

دیکھیے۔ نفیس' دھیما اور معتدل لہجہ لیے ڈاکٹر سید سبط علی کے الفاظ میں۔

"صراط مستقیم وہ راستہ ہے جو اللہ اپنے پیغمبر کے ذریعے قرآن پاک میں بتاتا ہے۔ صاف' دو ٹوک اور واضح الفاظ میں۔ وہ کام کریں جس کا حکم اللہ اپنے رسول کے ذریعے دیتا ہے اور اس کام سے رک جائیں جس سے منع کیا جاتا ہے۔"

"ہدایت کی تلاش ہے' قرآن کھول لے۔ کیا ہے جو وہ آپ کو نہیں بتا دیتا۔ وہ آپ کو انجان اور بے خبر نہیں رہنے دیتا۔ کیا اللہ انسان کو نہیں جانتا ہوگا؟ اس مخلوق کو جو اس کی اربوں کھربوں تخلیقات میں سے ایک ہے۔"

کردار' کہانی' واقعات کا تسلسل ہے۔ "پیر کامل" پڑھتے ہوئے لمحہ بھر بھی الگ ہونا مشکل ہے۔ مگر محاسن پر بحث کرنے کے لیے انتخاب ایک مشکل مرحلہ ثابت ہوتا ہے۔ امامہ اور سالار دو الگ بہتی ہوئی انتہائیں۔ پھر ان کے یکجا ہونے پر منتج ہونے والا فہم انتخاب کا حق رکھتی ہے اور انتخاب اس کے معیار کی گواہی دیتا ہے۔

صلاحیت سمت اختیار کرتی ہے اور سمت منزل کا تعین کرتی ہے۔ تخلیق کائنات میں صلاحیت کی تقسیم بلحاظ سعادت اپنے آپ میں منفرد تو ہوتی ہی ہے' ممتاز بھی ہو جاتی ہے۔ وقت کی گردش وہی رہتی ہے' حرکت کا سفر انسان کو کہاں سے کہاں لے جاتا ہے۔ یہ صرف دیکھنے کی نہیں سوچنے کی بات ہے!

اپنے تخلیقی سفر میں عمیرہ احمد نے منفرد اسلوب کی بدولت "دیکھتے ہی دیکھتے" دلوں میں گھر کر لیا۔ مگر یہ مقام ایسا نہیں کہ جس کی ہمسری ناممکن ہو۔ سعادت سے جڑے مقام البتہ نایاب ہو جاتے ہیں!

مسلمان ہونے کی شناخت سے رسوائی آج اگر جوڑ دی گئی ہے۔ تو یہ مسلمان کی بے عملی کا بین ثبوت ہے۔ مگر مقام شکر ہے کہ یہ رسوائی بے یقینی سے جڑی ہوئی نہیں ہے۔ اس شناخت کی جڑ سے جڑے رہنا۔ دور حاضر کی سب سے بڑی آزمائش ہے۔ اپنی بقا کے لیے جلنے کے دور ابتلا میں اس شناخت کو تسلیم کرنا۔ محبت کرنا۔ فہم رکھنا اور اس کو عام فہم بنانے کی جدوجہد میں اپنا حصہ ڈالنا۔ سعادت نہیں تو اور کیا ہے؟

سو عمیرہ احمد کے ذہن رسا اور شاندار قلم سے "پیر کامل" کی محبت میں سرشار لفظ جب نکلے تو دلوں میں گھر کر گئے۔ سالار سکندر اور امامہ ہاشم کی داستان' محبت' استقامت اور آزمائش کی بھٹی سے کندن ہو کر نکلنے کی داستان ہے۔

سفر۔ مگر سفر کی مشکلات؟

مدہم لہجے مگر مضبوط موقف رکھنے والے ڈاکٹر سبط علی۔ قحط الرجال کی شب ظلمت کا ستارا!

ہر چمکتی چیز سونا نہیں ہوتی کو سچ کرتا ہوا۔ جلال انصر کا کردار۔ ملمع چڑھاتے اور اتارتے وقت۔ ابن الوقتی کے تقاضے پورا کرتا ہوا۔ ہر زمانے میں مفاد پرستی کی علامت۔ زمانے سے مٹی ہوئی سادہ لوحی کی نشانی۔ سعیدہ اماں کا کردار۔ ہر جگہ تلقین و نصیحت کا منبر سجائے وعظ کے شوقین حضرات کی نمائندگی کرتا ہوا۔ سعدیہ ظفر کا کردار۔ پکی لگن رکھنے والی مخلص دوست۔ جویریہ۔ بزعم خود امامہ کی گمراہی اور رسوائی کا عندیہ دینے والا۔ ہاشم مبین۔ جدت زدہ کے مضطرب جنوں کو سہولت سے نمٹتے ہوئے۔ اپنی زمین سے جڑے ہوئے۔ دھرتی کی لگن میں لگے ہوئے فرقان کا کردار۔ جس کے پاس وعظ و نصیحت نہیں عمل ہے۔

ان کرداروں کی جزئیات نگاری۔ ان کے مرکز کا پتا دیتی ہے اور فہم کی اس رسائی کا ذریعہ عمیرہ احمد کی وہ شان دار صلاحیت ہے، جس کی بدولت وہ کسی بھی مرحلے پر پڑھنے والے کو آسان اور متوقع اندازہ لگانے کی مہلت نہیں دیتیں۔ ان سب کرداروں کے علاوہ ایک خاموش کردار تقدیر کا بھی ہے۔ تقدیر۔ فہم کی قید سے ماورا ہے۔ مگر جب تحریر کی صورت میں دوسروں کی زندگیوں سے جڑے ہوئے خاموش کردار کی صورت ابھرتی ہے تب ہم اسے دیکھنے کے تجربے سے گزرتے ہیں!

سب سے پہلے سالار سکندر کے کردار کا جائزہ لیتے ہیں۔ امامہ اور سالار میں سے ہمیں کون زیادہ محبوب ہے۔ میرا خیال ہے کہ یہ ایک مشکل فیصلہ ہے!

سالار۔ خطر مول لینے والے لوگ۔ بہر صورت بہادر ہوتے ہیں اور بہادر لوگ فیصلہ کن گھڑی میں پورا اترنے کی صلاحیت بھی رکھتے ہیں! غیر معمولی ذہانت اور کم عمری کا خطرناک امتزاج اس کے اضطراب کی من موجی توجیہات وضع کرتا رہا۔ مگر یہ اس کی جرأت کی بدولت ہی تھا کہ اس کے لاشعور میں پھنسا احساس جرم آخر کار اس کو آزمائشوں کی بھٹی میں سے کندن بنا کر نکال لایا۔ کندن بننے کی خواہش سب ہی کر سکتے ہیں؟ مگر بھٹی میں گرنے اور پھر پڑے رہنے کی؟

امامہ۔ صراط مستقیم کچھ لوگوں کے پاس موجود اس روشنی کی طرح ہوتا ہے جسے وہ گلے لگائے رہتے ہیں اور کچھ لوگ اس کی جستجو اور دریافت کی آزمائش سے گزارے جاتے ہیں۔ پھر اس پر استقامت اختیار کرنے کی جرأت سے نوازے جاتے ہیں اگر سالار کی ذہانت غیر معمولی درجے کی تھی۔ تو اس کا مقدر بننے والی امامہ کی استقامت بھی غیر معمولی تھی!

اس کی عمر دیکھیں۔ خواہشات، خوابوں سے وابستگی کا عالم دیکھیں۔ آسائشوں، رشتوں سے کٹ کر قائم رہنے کی استعداد دیکھیں۔ اور اپنی دانست میں بھی پہلی محبت۔ اس کی دیانت اور فراخ دلی کا عالم دیکھیں۔ امامہ نے آٹھ سال بعد دوبارہ جلال سے شادی کی درخواست کی۔ پہلی شادی اور بیٹے پر کوئی اعتراض نہ ہونے کا عندیہ بھی دیا تھا!

"مذہب کی بات اپنی جگہ۔ مگر مذہب کے ساتھ معاشرہ بھی تو کوئی چیز ہوتا ہے۔ جس میں ہم رہتے ہیں اور جس کی ہمیں پروا کرنی چاہیے۔ تم بہت اچھی ہو مگر لوگ سمجھتے ہیں کہ تم اچھی لڑکی نہیں ہو اور میں کسی اسکینڈلائزڈ لڑکی سے شادی نہیں کر سکتا۔ میں برداشت نہیں کر سکتا کہ کوئی یہ کہے کہ میری بیوی کا کردار اچھا نہیں ہے۔"

انسان کا فہم اور بصیرت محدود ہے مگر قدرت کی نظر ہر شے پر رہتی ہے۔ جلال سے ملنے والی اذیت امامہ کی آزمائش کے مرحلوں میں سے ایک تھی مگر حقیقت تو یہ تھی کہ امامہ کو اس کے غلط انتخاب کا بیّن ثبوت دے دیا گیا۔ امامہ اور جلال انصر کی تقدیر ایک کیسے ہو سکتی تھی؟ جب کہ ان کی ترجیحات کا رخ زمین آسمان کے فاصلے پر تھا!

عمیرہ کی جزئیات نگاری یقیناً "قابل داد ہے۔ مگر صورت حال کے تمام فطری تقاضوں کا خیال رکھنا ان کی چابک دستی کی دلیل ہے۔ سالار کے موبائل کا استعمال 'مبیحہ کے گھر سے کی گئی کال گھر کے بجائے آفس کی گاڑی اور ڈرائیور۔ یہ وہ نکات تھے جنھوں نے امامہ کی تلاش کے لیے کوئی نشان نہ چھوڑے اور یوں امامہ محفوظ و مامون 'شناخت تبدیل کر کے رہنے کے قابل ہو سکی!

کہانی کے اہم ترین مناظر میں اسلام آباد کی پہاڑیوں پر درخت سے بندھے ہوئے سالار کی حالت زار کا بیان ہے۔ خوف 'حقیقت سے بڑھ کر لگتا ہے' مگر جب حقیقت بن جاتا ہے۔ تب کیا ہوتا ہے؟ یہ صرف اس سے گزرنے والا جانتا ہے!

یہی وہ تجربہ تھا جو سالار کی زندگی کا دھارا تبدیل کر گیا۔ اور وہ دھن کا پکا۔ اپنے قول پر پورا اتر گیا۔ آزمائش تکلیف دہ تھی مگر انعام اور درجات بھی اسی حساب سے!

کہانی کی راہ گزر پر قاری کردار کے ساتھ چلتا ہے۔

اور لکھنے والے کا کمال یہ کہ وہ جب کردار کو کسی غلط فہمی کا شکار ہونے دیں تو پڑھنے والا بھی اس احساس میں رگیدا جائے۔ یہ لفظ خاص طور پر اس لیے کہ ریڈ لائٹ ایریا میں امامہ کی موجودگی کا تصور لیے۔ سالار کے ساتھ ساتھ کانٹوں پر رگیدے جانے، حلق میں کانٹے اگ آنے کا احساس۔ مجھے آج بھی یاد ہے۔ اس منظر کے خاتمے پر جان میں جان آئی۔ مگر ایک لمبے وقفے کے بعد!

"تکلیف دے کر اسے آگہی نہیں دی گئی۔ صرف تکلیف کا احساس دے کر اسے آگہی سے شناسا کروایا گیا تھا۔ اسے وہاں نہ دیکھ کر وہ اس حالت میں جا پہنچا تھا۔ وہ اسے وہاں دیکھ لیتا تو اس پر کیا گزرتی! اسے اللہ سے خوف آیا تھا۔ بے پناہ خوف۔ انسان کو انسان رکھنا اسے آتا تھا۔ کبھی غضب سے کبھی احسان سے۔ وہ اسے اس کے دائرے میں ہی رکھتا

تھا۔"

تیسرے اہم ترین منظر میں عمیرہ کے قلم کی دسترس اپنے عروج پر ہے جہاں وہ قاری کو حسب منشا کچھ بھی اخذ نہیں کرنے دیتیں اور بس ان ہی کو معلوم ہوتا ہے کہ وہ کب کون سے تختے جوڑیں گی۔

جی۔ یہ وہ منظر ہے جب سالار سکندر آمنہ کو علیحدگی حاصل کرنے کے دلائل اور سہولت استعمال کرنے کا موقع فراہم کرنے کی تیاری کے ساتھ آیا۔ مگر۔

"سالار سانس نہیں لے سکا۔ اس نے زندگی میں اس سے زیادہ خوب صورت لڑکی نہیں دیکھی تھی یا پھر اسے اس لڑکی سے زیادہ خوب صورت کوئی نہیں لگا تھا۔ وہ یقیناً" آمنہ تھی۔ وہ آگے نہیں بڑھ سکا۔ وہ اس سے نظریں نہیں ہٹا سکا۔ کسی نے اس کے دل کو مٹھی میں لیا تھا۔ دھڑکن رکی تھی یا رواں۔ وہ جان نہیں سکا۔"

ہم بھی سالار کے ساتھ ساتھ رہے اور جب اس نے فرقان کو آگاہ کیا۔ تب ہم بھی جان سکے۔

"جسے تم میری نیکی کہہ رہے ہو وہ دراصل میرا اجر ہے جو مجھے زمین پر ہی دے دیا گیا ہے۔ مجھے آخرت کے انتظار میں نہیں رکھا گیا اور میرا مقدر آج بھی وہی ہے جو نو سال پہلے تھا۔ مجھے وہی عورت دی گئی ہے جس کی میں نے خواہش کی تھی 'امامہ ہاشم اس وقت میرے گھر پر ہے۔"

کہانی میں ہلکے پھلکے جملے بھی فطری اظہار کا ذریعہ ہیں۔ جن میں سالار کے دو بدو جملے شامل ہیں جو اس کی فطری صاف گوئی کا نتیجہ تھے۔ امامہ کی والدہ کے ہاتھوں پٹائی کی اطلاع پر دو لفظی تبصرہ "ویری نائس" پولیس کی آمد پر "ثبوتوں اور گواہوں کی موجودگی کے باوجود سالار کا اپنے موقف پر قائم رہنا اس کی بے خوفی کے ساتھ ساتھ اس کی استقامت اور جرأت کی نشاندہی تھا۔ اس نے کہیں بھی کمینگی کا مظاہرہ نہیں کیا۔ لڑکوں کی دوستی میں جانثاری کا عنصر متاثر کن ہوتا ہے۔ مگر سالار کے دوستوں کا عملی مظاہرہ بھی پر لطف تھا!

واپس آتے ہیں سمت کے تعین اور ترجیحات کی تبدیلی کی طرف اور اس کتاب میں موجود اصل پیغام کی طرف۔

سید سبط علی ابہام کو دور کرنے میں کمال رکھتے تھے۔

"اسلام کو سمجھ کر دیکھیں تو آپ کو پتا چلے گا کہ اس میں کتنی وسعت ہے۔ یہ تنگ نظری اور تنگ دلی کا دین نہیں ہے اور نہ ہی ان دونوں چیزوں کی اس میں گنجائش ہے۔ یہ "میں" سے شروع ہو کر "ہم" پر جاتا ہے۔ "فرد" سے "معاشرے" تک۔"

"کون ہے جسے آج یا آئندہ آنے والے زمانے میں کسی شخص کے لیے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے بڑھ کر فضیلت دے دی جائے؟"

"کیا مسلمانوں کے لیے ایک اللہ "ایک قرآن" ایک رسول اور ان کی سنت کافی نہیں؟"

"کوئی پیر کامل کا فرق بتا سکتا ہے؟" "نہیں بتا سکتا۔"

ڈاکٹر سبط علی کہہ رہے تھے "وہ صرف مسلمان تھے۔ جو یہ یقین رکھتے تھے کہ اگر وہ صراط مستقیم پر چلیں گے تو جنت میں جائیں گے "اس راستے سے ہٹیں گے تو اللہ کے عذاب کا نشانہ بنیں گے۔"

"احترام ہر ایک کا کریں۔ ہر ولی کا "ہر مومن کا" ہر بزرگ کا "ہر شہید کا" ہر صالح "ہر پارسا کا۔ مگر اپنی زندگیوں میں ہدایت اور رہنمائی صرف حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے لیں کیوں کہ انہوں نے آپ تک اپنے ذاتی احکام نہیں پہنچائے 'جو کچھ بتایا ہے وہ اللہ کا نازل کردہ ہے۔"

"عروج ہر قوم 'ہر نسل کا خواب ہوتا ہے 'مگر بھی کسی قوم پر عروج صرف اس بنا پر نہیں آیا کہ اسے ایک کتاب اور نبی دے دیا گیا 'جب تک اس قوم نے اپنے اعمال اور افعال سے عروج کے لیے اپنی اہلیت ثابت نہیں کردی 'وہ کسی مرتبہ 'کسی فضیلت کے قابل نہیں ٹھہری۔"

اللہ کے ہاں رائج میرٹ سسٹم انصاف کے تقاضوں کو پورا کرتا ہے اور اللہ لوگوں سے تقاضا کرنے کا روادار ہے کہ وہ بھی انصاف کریں۔ سفارش اور اقربا پروری اسے اگر ناپسند ہے تو اسی لیے کہ اس کے نظام میں بے عملی کی گنجائش موجود نہیں!

اپنا عکس دیکھنے کے لیے صرف آئینہ کافی نہیں ہوتا۔ بلکہ روشنی اور آئینے کے سامنے کھڑا ہونے کی جرأت بھی درکار ہوتی ہے۔ لفظوں میں بھی روشنی کی تاثیر موجود ہوتی ہے اور یہ باطن کی تاریکی کو دور کرنے کا کام کرتے ہیں۔ اطاعت و فرماں برداری 'تسلیم و رضا کا نتیجہ انسان کو معلوم نہیں ہوتا۔ مگر پھر بھی وہ اس راستے پر قدم رکھ دیتا ہے۔ ایسے میں دنیاوی اور اخروی 'ظاہری اور چھپے ہوئے فیض اس کے ہمراہ ہو لیتے ہیں اور اس کو خبر تک نہیں ہوتی!

"آپ جیسا چاہیں گے میں ویسا ہی کروں گا۔"

"آپ مجھ سے درخواست نہ کریں "آپ مجھے حکم دیں۔" "اس نے خود کو کہتے پایا تھا۔"

جملے کا آخری حصہ جس کیفیت کا عکاس ہے 'وہ خود اختیاری سے دستبرداری کا اقرار ہے۔ اور اس طرح کے لطیف پیرائے دراصل گہرائی کے مظہر ثابت ہوتے ہیں!

سالار نے ڈاکٹر صاحب کے کہے کی لاج رکھی۔ حالات تقدیر نے مرتب کیے۔ عمل دور آمد تسلیم و رضا نے کروایا۔ اور "اہدنا الصراط المستقیم" کہنے والوں کو "انعمت علیہم" میں شامل کرلیا گیا!

کہانی کا آخری حصہ جادوئی معلوم ہوتا ہے۔ سانس روکے۔ جب ہم رنج والم کو تحلیل ہوتا دیکھتے ہیں۔ غم والم کے بوجھ کو ہٹتا ہوا دیکھتے ہیں۔ تب تسکین آور کیفیت ہم پر بھی وارد ہونے لگتی ہے!

قرآن کریم کی کچھ آیتیں یاد آتی ہیں۔ ان کو زمانے کے 'حالات سے جوڑ کر دیکھیے۔ اور اپنے رب کی شان بیان کرنے کا لطف حاصل کیجیے۔

"پھر کہتے ہیں کہ یہ اللہ کی طرف سے ہے تاکہ قیمت وصول کریں تھوڑی۔" (البقرة)

آیتوں میں تحریف 'تشریح میں ردوبدل کرکے دنیا کا جتنا بھی بڑا حصہ وصول کریں۔ قرآن اور آخرت کے پیش نظر وہ قیمت ہمیشہ "ثمنا" قلیلا "ہی رہے گی۔

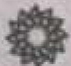
"اور وہ جو ایمان لائے اللہ پر اور آخرت کے دن پر اور عمل کیے نیک 'پس ان کا اجر ان کے رب کے پاس ہے اور نہ خوف زدہ ہوں گے 'نہ غم زدہ۔" (البقرة)

"ممکن ہے تم ایک شے کو ناپسند کرو اور اللہ تعالیٰ اس کے اندر کوئی بڑی منفعت رکھ دے۔" (النساء)

پس 'یہ کس طرح ممکن تھا۔ کہ رب کائنات صراط مستقیم کی خواہش رکھنے والے دلوں کو رنج والم میں مبتلا رہنے دیتا؟ ان کی حفاظت نہ کرتا؟ کیوں کہ وہ بہترین قدردان ہے۔

"پیر کامل" کو بار بار پڑھنا بھی پہلی بار پڑھنے جیسا لطف دیتا ہے 'مگر پہلی بار کے پڑھنے پر کچھ احساسات ابھی تک یاد ہیں۔ جن میں سے ایک۔ اس موضوع پر بلند آہنگ تحریر اور اشاعت کے لیے عمیرہ احمد اور ادارہ یکساں تحسین اور مبارک باد کے مستحق ہیں۔ اللہ جس کی ہدایت 'حفاظت اور مدد کا ذمہ لے لیتا ہے 'پھر اس کو کیا ڈر؟ اور رستہ بھی اس کا 'پیغام بھی اس کا 'محبت بھی اس کی۔ تو پھر نہ وہ بے خبر ہے۔ نہ بے قدر!

امامہ اور سالار کے ملن کے بعد ان کی زندگی میں مزید کتنے امتحان ہیں۔ کون سے موڑ ہیں۔ ان کے ساتھ کیا ہونے والا ہے۔ یہ تو پیر کامل کا دوسرا حصہ آب حیات پڑھ کر ہی پتا چلے گا۔



بندھن

عامر سلیم ہمراہ آسیہ سلیم

شاہین رشید

عامر سلیم کو کون نہیں جانتا۔ معروف گلوکار ہیں۔ انہوں نے نہ صرف بڑوں کے لیے گایا' بلکہ بچوں کے لیے بھی ان کی خدمات بہت ہیں۔ آج کل زیادہ تر ملک سے باہر رہتے ہیں کیونکہ کراچی کے حالات انہیں پریشان رکھتے ہیں۔ گزشتہ دنوں پاکستان آئے تو ان سے "بندھن" کے لیے بات ہوئی۔

"کیسے ہیں۔ اور کب آئے پاکستان؟"

"اللہ کا شکر ہے جناب۔ تین ماہ ہوگئے ہیں آئے ہوئے۔ امریکا گیا تھا۔"

"کیوں گئے تھے؟"

"بس جی کچھ پروگرام کرنے تھے۔ پھر یہاں کے آئے دن کے خراب حالات۔ مگر پھر بھی اپنا ملک اپنا ہی ہے۔ جو سکون یہاں رہنے میں ہے' دوسرے ملک میں نہیں ہے۔"

"فیملی لائف کیسی گزر رہی ہے۔ بچوں میں ماشاء اللہ کتنا اضافہ ہوا؟"

قہقہہ "ایک کا اضافہ ہوا ہے۔ بچے دو ہی اچھے ہیں۔ دونوں بیٹے ہیں۔ بڑے بیٹے کا نام عماد ہے اور چھوٹے کا علی ہے۔"

"ماشاء اللہ کتنے بڑے ہوگئے ہیں؟"

"بڑا تقریباً پانچ سال کا ہے اور چھوٹا تین سال کا ہے۔"

"اور شادی کو کتنا عرصہ ہوگیا؟"

"28 اکتوبر 2007ء کو ہماری شادی ہوئی۔ یعنی تقریباً سات سال ہوگئے ہیں۔"

"آپ کی پسند سے ہوئی؟"

"پسند یوں تھی کہ پہلے میری امی نے پسند کیا پھر وہ بہت عرصہ اصرار کرتی رہیں کہ لڑکی سے مل لو۔ میں ٹالتا رہا۔ کئی سال ٹال مٹول چلتی رہی۔ آخر ایک دن امی ہی پر رحم آہی گیا۔ میں نے ہامی بھری تو کہنے لگیں کہ پہلے تصویر دیکھ لو۔ تصویر دیکھی تو لڑکی اچھی لگی۔ تصویر بھی کمپیوٹر پہ دیکھی۔ سوچا بات بھی کر لی جائے۔ چنانچہ ایک ہفتہ فون پر بات ہوئی پھر میں نے شادی کے لیے رضامندی دے دی۔"

"اچھا تو کیا ملاقات نہیں کی؟"

"نہیں۔"

"کیوں۔؟"

"سوچا کہ تصویر جیسی ہی تو ہوگی اس لیے شادی کے دن ہی ملاقات کروں گا اور پھر شادی کے دن ہی ملاقات کی۔ شادی کی رسموں میں بھی نہیں دیکھا میں نے۔"

"حیرت ہے ایسا کیوں کیا۔ گھر والوں نے اصرار نہیں کیا؟"

"وجوہات تھیں۔ ایک تو امی کی پسند پر اعتبار تھا اور دوسری بات یہ کہ مجھے مناسب نہیں لگا شادی سے پہلے ملاقات کرنا۔ بس سوچ لیا تھا کہ جیسی بھی ہے اب مجھے قبول ہے کہ میری ماں کی پسند ہے۔"

"پھر کیسا پایا آپ نے؟"

"الحمدللہ بہت اچھا۔ میری بیگم بہت اچھی ہے اور مزے کی بات بتاؤں کہ میں نے بغیر دیکھے شادی کی تو میرے دوست احباب بھی بہت حیران تھے کہ میں نے اتنا بڑا فیصلہ بغیر دیکھے کیسے کرلیا۔ مگر ماں کی پسند اور اللہ توکل پہ کام کیا۔ اور اللہ تعالیٰ نے مجھے مایوس نہیں



کیا۔"

"پھر بھی دوران گفتگو کیسا محسوس کیا کہ لڑکی کیسی ہوگی اور کوئی آئیڈیل بنایا ہوا تھا آپ نے؟"

"ہاں مگر آپ اسے آئیڈیل نہیں کہہ سکتیں۔ سوچا ضرور تھا کہ بیوی ایسی ہو جو مجھ سے کم تر نہ ہو' نرم مزاج ہو' میری باتوں کو سمجھے اور پھر جب بات کی تب بھی احساس ہوا کہ آسیہ میری سوچ کے بہت قریب ہے۔"

"شادی دھوم دھام سے ہوئی ہوگی۔ کیونکہ آپ ایک مشہور و معروف شخصیت ہیں اور سات' آٹھ سال پہلے تو آپ کا عروج تھا؟"

"نہیں جی۔ شادی بالکل بھی دھوم دھام سے نہیں ہوئی' نہ ہی دوستوں کو بڑی تعداد میں بلایا۔ بس سادگی کے ساتھ لاہور میں شادی کی۔"

"کیوں ایسا کیا؟"

"پتا نہیں کیوں۔ میں ان تقریبات کو گھریلو اور اپنی پرسنل تقریب سمجھتا ہوں۔ مجھے میڈیا میں رہ کر اور بطور گلوکار شادی کرکے کبھی بھی سکون نہ ملتا میں اپنی پروفیشنل زندگی اور پرائیویٹ زندگی کو الگ رکھتا ہوں۔"

عامر سلیم کا تعلق ملتان شہر سے ہے اور یہ تقریباً تیس سال قبل کراچی آئے تھے اور پھر مستقل قیام کراچی میں ہی کرلیا۔ پنجابی ادب میں ماسٹرز ڈگری لینے والے عامر سلیم کو گلوکاری کا شوق بچپن سے ہی تھا اور بڑی جدوجہد کے بعد انہیں یہ مقام ملا' سیڑھی بہ سیڑھی چڑھنے والے ہی ہمیشہ کامیاب رہتے ہیں۔

"عامر سلیم۔ آپ ماشاء اللہ ایک خوش گوار ازدواجی زندگی گزار رہے ہیں۔ اگر آپ کو تھوڑا ماضی کی طرف لے جائیں تو یہ بتایئے کہ آپ شادی کے لیے ٹال مٹول کیوں کرتے تھے؟"

قہقہہ "بس پتا نہیں کیوں ٹال مٹول کرتا رہا۔ شاید شادی کے لیے اللہ تعالیٰ نے ایک وقت مقرر کر رکھا ہوتا ہے۔ انسان کے اختیار میں کچھ بھی نہیں۔ تو اور جب وقت آگیا شادی ہوگئی۔"

زندگی۔"

"ویسے شادی جلدی ہونی چاہیے یا دیر سے؟"

"اپنے اختیار میں ہو تو جلدی ہونی چاہیے' تاکہ آپ کی اولاد بھی آپ کی جوانی میں ہی ہو جائے اور بڑی ہو کر آپ کے شانہ بشانہ کھڑی ہو اور آپ اس کی خوشیاں خود دیکھیں۔ میں تو شادی کے بعد اس نتیجے پہ پہنچا ہوں کہ شادی اور پھر بچے آپ کی زندگی کو مکمل کر دیتے ہیں۔"

"کیا زندگی رک نہیں جاتی؟"

"نہیں بالکل بھی نہیں۔ لائف سیٹ ہو جاتی ہے اور بیوی اچھی ہو تو گھر جنت بن جاتا ہے۔ شادی کے بعد انسان کا سارا فوکس اس کا گھر اس کی بیوی اور اس کے بچے ہوتے ہیں اور لوگ فضول میں جو ادھر ادھر ٹائم گزارتے ہیں اس سے بھی بچ جاتے ہیں۔"

"شادی کے بعد بیگم کو کیسا پایا؟"

"بہت اچھا۔ ایک مکمل عورت' ایک مکمل بیوی اور ایک مکمل ماں اور آپ یقین کریں کہ سب لوگ آسیہ کی تعریف کرتے ہیں تو مجھے اپنی بیوی پہ بہت فخر ہوتا ہے۔"

"اچھا۔ گڈ۔ آپ کی کائنگی کو پسند کرتی ہیں؟"

"بالکل۔ بہت زیادہ۔ نہ صرف پسند کرتی ہیں' بلکہ اچھے اچھے مشورے بھی دیتی ہیں اور سچ بات تو یہ ہے کہ میری بیگم نے میرے کام میں کبھی مداخلت نہیں کی اور نہ ہی مجھ پر کبھی شک کیا ہے۔"

"مزاجاً" کیسی ہیں؟"

"بہت نرم اور خوش مزاج۔ غصہ نہیں آتا۔ اور سب سے بڑی خوبی تو یہ ہے کہ جب مجھے غصہ آتا ہے تو یہ زبان نہیں چلاتی' بلکہ خاموش ہو جاتی ہے اور اس کی خاموشی دیکھ کر میرا غصہ بھی رفو چکر ہو جاتا ہے۔"

"اپنے ہاتھوں سے پکا کر سب سے اچھی چیز کیا کھلاتی ہیں؟"

قہقہہ۔ "اب میری بیگم جو بھی پکا کر کھلاتی ہے مجھے پسند آتا ہے۔ لیکن جب شادی ہوئی تھی تو کچھ پکانا نہیں آتا تھا۔ ہنسی مجھے اس لیے آئی کہ اگر آپ اس وقت یہ سوال پوچھتیں تو میں آپ کو کیا جواب دیتا۔"

"ہوں۔ اچھا۔ شادی کے لیے لڑکے اور لڑکی کو خوب صورت ہونا چاہیے یا نہیں؟"

"جو اپنے تمام اعضا کے ساتھ سلامت ہے' وہ میرے نزدیک ایک خوب صورت انسان ہے۔ ظاہری خوب صورتی کوئی معنی نہیں رکھتی۔ سیرت کام آتی ہے اور اچھی سیرت والی خواتین ہی گھر کو بناتی سنوارتی ہیں اور میں سمجھتا ہوں کہ اللہ نے ہر انسان کو خوب صورت بنایا ہے۔"

"اچھی اور بری عادت بتائیں بیگم صاحب کی' ویسے تعریف تو آپ نے بہت کر دی اور اچھی عادت بتانے سے پہلے آپ یہ بتائیں کہ آپ کو کھانا پکانا آتا ہے؟"

"بالکل آتا ہے کھانا پکانا۔ کیونکہ میں نے کافی عرصہ اکیلے زندگی گزاری ہے۔ اکیلے رہ کر تو انسان بہت کچھ سیکھ جاتا ہے۔ میری بیگم میں ساری باتیں بہت اچھی ہیں' سب سے اچھی عادت ہے کہ مجھ پر شک نہیں کرتی۔ مجھ پر کوئی پابندی نہیں لگاتی اور نہ ہی میرا موبائل چیک کرتی ہے۔"

"فضول خرچ ہیں؟"

"بالکل بھی نہیں۔ ویسے شاپنگ سینٹر گھومنے اور ونڈو شاپنگ کا بہت شوق ہے' مگر ضرورت کی چیز خریدتی ہے۔"

"اچھی زندگی گزارنے کے لیے کیا ضروری ہے؟"

"سب سے پہلے اچھا لائف پارٹنر جو آپ کے ہر دکھ سکھ کو سمجھے اور آپ کا ساتھ دے۔ پھر پیسے کا ہونا بھی ضروری ہے کہ پارٹنر کو صرف آزمائش میں ہی نہ ڈالا جائے' بلکہ اس کو زندگی کی کچھ سہولتیں بھی دی جائیں۔"

آسیہ سلیم

"عامر بیوی بچوں کو ٹائم دیتے ہیں۔" ہم نے اس سوال سے آسیہ سلیم صاحبہ سے بات کا آغاز کیا۔

"جی جی بالکل دیتے ہیں۔ باوجود مصروف رہنے کے ہم سب کو وقت دیتے ہیں۔ ہم گھومنے پھرنے اور کھانے پینے جاتے ہیں ہمارا بہت خیال رکھتے ہیں۔ ہماری ضرورتوں کو ہمارے بتانے سے پہلے ہی سمجھ جاتے ہیں۔"

"ناراض ہیں؟"

ہنستے ہوئے۔ "جی ہیں۔ کبھی کبھی تو بہت زیادہ ناراض ہو جاتے ہیں' مگر ویسے مزاج نرم ہی رہتا ہے۔ غصہ بھی کچھ وجوہات کی بنا پر ہی آتا ہے۔"

آسیہ سلیم کے والد اردو اسپیکنگ ہیں اور والدہ پنجابی ہیں۔ والد صاحب فورس میں تھے۔ اس لیے شہر شہر گھومنے پھرنے اور رہنے کا موقع ملا۔ لیکن پھر بھی زیادہ قیام لاہور اور ملتان میں رہا۔ آسیہ نے اسلامک ہسٹری میں ماسٹرز کیا ہے۔ ان کی تین بہنیں اور دو بھائی ہیں۔ آسیہ کا نمبر آخری ہے۔

"مشہور لوگ لڑکیوں کی کمزوری ہوتے ہیں اور عامر سلیم بھی اچھے خاصے مشہور ہیں۔ پروپوزل آیا تو کیا احساسات تھے آپ کے؟"

"ارے جناب میں تو بہت زیادہ خوش تھی' مگر دلچسپ بات تو یہ تھی کہ مجھ سے وابستہ لوگ زیادہ خوش تھے اور میری دو بہنیں تو اور بھی زیادہ۔ اور ان کے گانے تو میں پسند کرتی ہی تھی۔ ان کی فیملی سے بھی واقف تھی اور مجھے اندازہ تھا کہ عامر اور ان کی فیملی ممبر سب بہت اچھے ہیں۔"

"سسرال میں سب سے زیادہ دوستی کس سے ہے آپ کی؟"

"ویسے تو سب ہی اچھے ہیں' لیکن ان کی والدہ بہت اچھی ہیں اور یقین کریں کہ سب ہماری چاہت آج بھی اسی طرح کرتے ہیں جس طرح پہلے دن کرتے تھے۔ چھوٹی چھوٹی باتوں کا خیال رکھنا' چھوٹی چھوٹی ضرورتوں کا خیال رکھنا' بہت اچھا لگتا ہے۔ بس اللہ تعالیٰ محبتیں برقرار رکھے (آمین) سسرال میں میرا اپنا ایک کمرا ہے' جو ہمیشہ مجھے صاف ستھرا اور سجا ہوا ملتا ہے۔"

"شادی سے پہلے آئیڈیل بنایا تھا؟"

"نہیں جی۔ میں ان لڑکیوں میں سے نہیں تھی کہ جو کہانیاں اور ناول پڑھ کر آئیڈیل بنا لیتی ہیں۔ میں تو ایک سیدھی سادی لڑکی تھی اور فیصلے اللہ پر چھوڑے ہوئے تھے اور اللہ جو کرتا ہے' بہتر کرتا ہے' تو اللہ نے میرے ساتھ بھی بہت اچھا کیا۔ آج میں ایک کامیاب اور خوش گوار زندگی گزار رہی ہوں۔"

"نکاح اور رخصتی۔ لڑکی کی زندگی میں یہ دو دن بہت اہم اور جذباتی ہوتے ہیں' یہ وقت کیسا گزرا تھا؟"

"نئی زندگی کی خوشی بہت ہوتی ہے اور میکے کی جدائی کا سوچ کر دکھ اور تکلیف بھی بہت ہوتی ہے۔ بہت جذباتی موقع ہوتے ہیں اور برداشت کرنا بہت مشکل ہوتا ہے۔ مگر یہ سب کچھ تو بابا آدم کے زمانے سے چلا آرہا ہے اور بیٹیاں تو پیاری ہی اچھی ہوتی ہیں۔"

"منہ دکھائی میں کیا ملا تھا اور ہنی مون کے لیے کہاں گئی تھیں؟"

"اسپیشلی ہنی مون ٹرپ کے لیے تو کہیں نہیں گئے آئے دن ایک شہر سے دوسرے شہر آنا جانا لگا رہتا ہے تو بس پھر وہی ہمارا ہنی مون تھا۔ منہ دکھائی میں انہوں نے ایک بریسلٹ اور انگوٹھی دی تھی۔"

"شادی اور ولیمہ کا جوڑا ایک ہی دن پہنا جاتا ہے۔ پھر بھی لڑکیاں بھاری سے بھاری جوڑا بنواتی ہیں کیوں؟"

"لڑکیاں تو شاید اتنی ایکسائیٹڈ نہیں ہو رہی ہوتیں جتنی مائیں ہو رہی ہوتی ہیں۔ بس پھر کرنا پڑتا ہے۔ میرے جوڑے بھی اچھے خاصے بھاری تھے۔ پہلے دن کا جوڑا میکے کا تھا اور دوسرے دن کا جوڑا سسرال کا تھا جو عامر نے اپنی پسند سے لیا تھا۔"

"آپ ان کے ساتھ کہیں جاتی ہیں تو ان کی کیا ڈیمانڈ ہوتی ہے۔ میک اپ یا سادگی؟"

"زیادہ میک اپ کی ڈیمانڈ نہیں کرتے' البتہ ان کا دل چاہتا ہے کہ کپڑے بہت اچھے کلر کے ہوں اور بال اسٹائلش انداز میں بنے ہوئے ہوں۔"

"چھٹی کا دن گھر پر ہی گزرتا ہے یا کہیں جاتی ہیں؟"

"چھٹی کا دن ویسے تو زیادہ تر گھر پر ہی گزرتا ہے۔ مگر کبھی کہیں گھومنے بھی چلے جاتے ہیں۔ دونوں بیٹوں کا دل چاہتا ہے تو ان کی خاطر بھی نکلتے ہیں۔"

اوکے آسیہ سلیم۔ بہت شکریہ ٹائم دینے کا۔





خط بھجوانے کے لیے پتا
ماہنامہ شعاع - 37 - اردو بازار، کراچی۔
Email: info@khawateendigest.com
shuaamonthly@yahoo.com

آپ کے خط اور ان کے جوابات کے ساتھ حاضر ہیں اللہ تعالیٰ سے آپ کی عافیت، سلامتی اور خوشیوں کے لیے دعا ہیں۔

اللہ تعالیٰ آپ کو، ہم کو، ہمارے پیارے وطن کو اپنے حفظ و امان میں رکھے۔ آمین

پہلا خط ڈوپگیٹ حویلیاں سے چندا چوہدری کا ہے۔ لکھتی ہیں

میں نے شعاع منگوایا تو اس میں میرے مہندی کے ڈیزائن موجود تھے۔ مجھے بہت خوشی ہوئی اپنے ڈیزائن دیکھ کر۔ آپ کا بہت بہت شکریہ مگر مجھے آپ سے تھوڑا سا گلہ ہے وہ یہ کہ آپ نے مہندی کے ڈیزائن کے ساتھ میرا نام لکھنے کے بجائے ادارہ لکھ دیا ہے۔ کل میرا پیپر ہے یعنی 12 تاریخ کو اس لیے وقت کی کمی کے باعث لمبا چوڑا خط نہیں لکھ رہی ہوں۔

ج: پیاری چندا! ہمیں بے حد افسوس ہے کہ آپ کے مہندی کے ڈیزائن شائع ہوئے لیکن آپ کا نام شائع نہ ہو سکا۔ امتحانات میں آپ کی کامیابی کے دل سے دعا گو ہیں۔ اللہ تعالیٰ آپ کو ہر امتحان میں کامیابی دے۔ آمین۔

روما اشفاق، مری سے شریک محفل ہیں لکھتی ہیں

ایک تھی مثال۔ رخسانہ نگار عدنان بہت زبردست لکھتی ہیں آپ۔ اگر میرے پاس ہوں تو گلے لگاؤں اور ہاتھ چوم لوں اب جلدی جلدی بھائی مثال کے ساتھ سب کچھ اچھا کر دیں کہ دل کو سکون محسوس ہو کہ برے وقت کے بعد اچھا وقت بھی آتا ہے۔ اس کے بعد رقص بسمل کی کیا بات ہے آپی ایک بات تو بتائیے یہ امرحہ کا دماغ تو خراب نہیں ہو گیا۔ یہ کیا فضول لڑکی ہے محبت کا جواب محبت سے کیوں نہیں دیتی ہے اور یہ گرد کے پار کیا اسٹوری ہے آپی شفا، مجھے بہت پیار آیا۔ میری شعاع کے ساتھ دو سال پرانی دوستی ہے۔ آج کل میں انٹر کی اسٹوڈنٹ ہوں آپ یہ بھی کہہ سکتے ہیں مجھے ماں کے پیٹ سے ہی یہ شوق پیدا ہوا ہے کیونکہ میری امی شعاع کو بڑے ہی شوق سے پڑھتی ہیں۔ شعاع کی سب رائٹرز بہت اچھا لکھتی ہیں مگر سائرہ رضا، میرا حمید اور نبیلہ عزیز کا کیا ہی کہنا۔ اچھا آپی میں اپنی بہت خوب صورت اور ذہین سسٹرز کو کہنا چاہتی ہوں کہ بیماری اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہوتی ہے تم نے میڈیکل میں بہت محنت کی تھی بیماری کی وجہ سے نمبر اچھے نہیں آئے۔

گرتے ہیں شہسوار ہی میدان جنگ میں
وہ طفل کیا گرے جو گھٹنوں کے بل چلے

بس تمہیں اتنا تو پتا چل گیا نا کہ برے وقت میں آپ کا کوئی نہیں ہوتا اور اللہ تعالیٰ جو بھی کرتا ہے اچھے کے لیے کرتا ہے۔

ج: پیاری روما! بہت اچھی بات لکھی ہے تم نے۔ بندے کا کام تو کوشش کرنا ہے۔ کامیابی دینا یا نہ دینا اس مالک کے اختیار میں ہے اور وہ ہمارے حق میں جو کرتا ہے بہتر کرتا ہے۔ ویسے بھی لڑکیوں کے لیے یہ پروفیشن بہت مشکل ہے۔ بہت ٹائم دینا پڑتا ہے۔ جس سے گھر اور بچے نظر انداز ہوتے ہیں۔

شعاع کی پسندیدگی کے لیے تہہ دل سے شکریہ۔

فضیلہ ابراہیم نے گوٹھ ابراہیم کلوئی سے لکھا ہے

میں نے اور زینب نے ہوش بھی نہیں سنبھالا تھا شعاع تب سے ہمارے گھر میں آرہا ہے۔ پہلے مریم باجی پڑھتی تھیں پھر ہم بھی شعاع کے دیوانے ہو گئے۔ مریم باجی میں اور زینب تینوں شعاع کا ہر ماہ بہت بے صبری سے انتظار کرتے ہیں۔ ہمارے بھائی مشتاق تو نمرہ بخاری کی تحریریں بہت شوق سے پڑھتے ہیں۔ اب آتے ہیں اس ماہ کے شعاع کی طرف "واقعی واہ" "تو" پڑھ کے "واہ" نکل گئی۔ زبردست۔ دل خوش کر دیا سائرہ جی آپ نے۔ گرد کے پار بھی بہت ہی اچھا مکمل ناول ہے۔ افسانے سب ہی اچھے تھے۔ اب آتے ہیں سلسلے وار ناولز کی جانب۔ سیارم کے لیے تو الفاظ ہی نہیں۔ رقص بسمل میں مجھے تیمور اور ولید کا کردار اچھا لگتا ہے۔ نبیلہ جی! تھوڑی کہانی میں تیزی لائیں۔ حمزہ علی عباسی کا انٹرویو بھی شعاع میں شامل کریں۔

ج: پیاری فضیلہ! بہت خوشی ہوئی کہ شعاع آپ سب بہن بھائیوں کا پسندیدہ پرچا ہے، مریم اور زینب کا بھی ہماری طرف سے شکریہ ادا کریں۔
سائرہ رضا اور دیگر مصنفین تک آپ کی تعریف ان سطور کے ذریعے پہنچائی جا رہی ہے۔

حافظ آباد سے صائمہ مشتاق نے شرکت کی ہے، لکھتی ہیں۔

ماشاء اللہ ہماری رائٹرز کے پاس موضوعات کی کمی نہیں۔ لیکن جیسے پہلے ہوتا تھا کہ ہر موسم بدلنے یا ہر تہوار پر اس کے مطابق کہانیاں ہوتی تھیں اب ایسا نہیں ہے۔ عید کو ہی دیکھ لیں۔ جب عید نمبر ہوتا تھا پہلے تو پورا شمارہ عید سے متعلق کہانیوں سے بھرا ہوتا تھا۔ تو بس اتنا چاہتی ہوں کہ عید وغیرہ کے موقعوں پر تمہارے میں مہندی کی مہک، چوڑیوں کی کھنک، خوشبو اور عیدی کی خوشی جھلکے پھر چاہے موضوع کوئی بھی ہو۔ میں بھی بس ناسٹیلجک ہو جاتی ہوں۔ کسی کی زندگی میں بھی پریشانیاں (ویسے میں ٹینشن لیتی نہیں ہوں) اور الجھنیں میں بھی وہی اداسیاں اور تفکرات دیکھتی ہوں تو تھوڑی ڈسٹرب ہو جاتی ہوں کہ کیا یار کہیں تو تبدیلی نظر آئے۔ خیر بات کہی ہو گئی۔ مگر آپ میرا نقطہ نظر سمجھ گئی ہوں گی کہ پرانے دور کو یاد کرنے سے کیا مراد ہے۔

اب شمارے کی طرف آتی ہوں۔ سرورق ویسا ہی تھا جیسا ہونا چاہیے تھا یعنی عید کی مناسبت سے۔ فائقہ ودود لگی "یارم" سے ملنے کے لیے۔ مگر یہ کیا؟ اب میاں جی روٹھ گئے ہیں اور سجنی کو منانے کا کوئی ڈھنگ سمجھ میں نہیں آرہا۔ مگر ایک بات بتاؤں؟ میاں جی روٹھ کر بھی دل کے بہت قریب محسوس ہوتے ہیں جبکہ وہ روٹھنے میں حق بجانب بھی ہیں۔ ابھی امرحہ کی پریشانی سے فارغ ہوئی تھی کہ سائرہ رضا کی "تو" نے متوجہ مشغول کر لی۔ میں بھی شاید کسی بکرے کی "تو" ہوگی مگر پڑھنے پہ پتا چلا بکرا نہیں بکرے وہ بھی بکریوں سمیت۔ ہاہاہا ویسے مجھے لگا تھا کہ شاید نوال سیریز کی کوئی کہانی ہوگی مگر۔ چلو جو تھا اسی پہ گزارہ کر لیا۔ تیمور کے سر کا جالی میں پھنسنے والا منظر تو کمال کا تھا۔ مزہ ہی آگیا۔ ویسے سائرہ نے پروفیشنل لوگوں کی زندگی پر جس ہلکے پھلکے انداز میں روشنی ڈالی ہے وہ بہت قابل تحسین ہے۔

نایاب جیلانی نے بھی بہت خوب لکھا۔ کبھی کبھی نہ بولنا کیسے کیسے مسائل جنم لیتا ہے۔ بہت خوب صورتی سے بتا دیا آپ نے۔ ایسے ہی تو شکیب صاحب نے نہیں فرمایا کہ

گفتگو کیجیے کہ یہ فطرت انسان ہے شکیب
جالے لگ جاتے ہیں جب بند مکاں ہوتے ہیں

ویسے میں نے غور کیا ہے کہ نایاب کو نک نیم رکھنا بہت پسند ہے۔ میں نے آج تک ان کی ایسی کوئی کہانی نہیں دیکھی جس میں کردار کا نک نیم نہ ہو۔ حتیٰ کہ حمزہ جیسے خوب صورت نام کو بھی "حامے" نک نیم دے دیا جو کہ بات ہے کہ مجھے پسند نہیں آیا۔ مگر اس بار "گرد کے پار" میں مرکزی کردار کی بچت ہو گئی مگر رانی شازی نے خانہ پر کر دیا۔

عائشہ نصیر کا ناولٹ بھی بہت اچھا تھا۔ ایک بہت حساس اور معاشرتی مسئلے کو موضوع بنا کر بہت عمدہ انصاف بھی کیا۔ اللہ ہدایت دے ایسے ضعیف الاعتقاد لوگوں کو آمین۔ افسانے بھی بہت خوب تھے۔ "آفرین" سب سے زیادہ مزے کا لگا۔

باقی "رقص بسمل" کو تھوڑی رفتار کی ضرورت ہے۔ ویسے اچھا ہے۔ مستقل سلسلوں سے بھی شکایت نہیں تھی

اب بھی نہیں ہے۔ بہت مزہ آتا ہے پڑھ کر۔

آپ نے مجھے افسانہ نگاری کی طرف توجہ دینے کا کہا۔ بہت اچھا لگا۔ سچ کہوں تو دل میں بڑی گدگدی ہوئی۔ میں نے تھرڈ ایئر میں ایک افسانہ "بند مٹھی" کے نام سے خواتین ڈائجسٹ میں بھجوایا تھا۔ ناقابل اشاعت ہوا۔ مگر میں نے دل پہ نہیں لیا۔ مگر ہوا یہ کہ امی کا انتقال ہو گیا۔ بڑی بجیا کی شادی ہو گئی۔ شازی بجو گورنمنٹ ٹیچر ہیں تو گھر کی ذمہ داری تیسری بہن یعنی مجھ پہ آگئی۔ پڑھائی کے ساتھ ساتھ گھرداری کرتے کرتے اس طرف دھیان کم ہی آتا تھا۔ فائنل ایئر میں ہماری ٹیچر نے کلاس میں "افسانہ نگاری" کا مقابلہ کروایا تھا۔ اردو افسانہ لکھنا تھا۔ میری دوسری پوزیشن تھی چالیس لڑکیوں میں لیکن اور [illegible] سہیلیوں سے میں سنجیدگی سے اس بارے میں سوچ رہی ہوں۔

ج : صائمہ! تفصیلی تبصرے کا شکریہ، لیکن یہ بات درست نہیں کہ ہم نے عید کے لحاظ سے پرچا ترتیب نہیں دیا۔ عید سروے، گوشت کے پکوان، مہندی کے ڈیزائن عید کے اشعار سب عید کے رنگ ہی تھے۔ کہانیاں ضرور لکھیں، تحریر شائع نہیں ہوا تو کوئی بات نہیں کوشش جاری رکھیں۔

شبانہ عندلیب نے گوجرانوالہ سے لکھا ہے

سرورق اچھا تھا۔ سفید ڈریس والی زیادہ پیاری لگ رہی تھی۔ سرورق کے بعد فہرست پر نظر دوڑا کے سب سے پہلے اپنا فیورٹ ناول یارم پڑھا۔ دل سے بے ساختہ واہ واہ کی صدا بلند ہوئی۔ قسط بہت شاندار تھی۔ امرحہ کے لیے دل دکھی تو ہوا لیکن اس کے ساتھ ٹھیک ہی ہوا۔ پلیز پلیز آخر میں عالیان کے ساتھ کچھ برا نہیں ہونا چاہیے۔ سمیرا جی کے لکھنے کے انداز میں کچھ کچھ اشفاق احمد کی جھلک نظر آتی ہے۔ لگتا ہے کہ انہوں نے اشفاق احمد کو بہت زیادہ پڑھا ہے۔ مجھے یارم بہت پسند ہے۔ بس اس کا اینڈ ہیپی ہونا چاہیے۔ اوکے عید قرباں کے حوالے سے بہنوں کے بہت اچھے جوابات تھے۔ سنبل ملک اعوان، حرمت ردا اکرم کے جواب بہت اچھے لگے۔ دل کچھ دکھی بھی ہوا۔ شفق گلزار سے ملاقات اچھی رہی۔ سائرہ رضا کا آدھا بھی ٹھیک لگا۔ زیادہ ہنسی نہیں آئی گرد کے پار اچھا تھا۔

عائشہ نصیر احمد کا اک ہاتھ ذرا بڑھا بہت اچھا تھا۔ اسے پڑھ کے ہنسی آگئی۔ افسانوں میں دل کی عیدی سب پر بازی لے گیا۔ باقی بھی سب ٹھیک تھے۔ آپی کیا فرحت اشتیاق اور عمیرہ احمد نے شعاع خواتین کو بالکل چھوڑ دیا ہے اب وہ کبھی نہیں لکھیں گی کیا۔

مستقل سلسلے سب اچھے تھے۔ پیاری نبی کی پیاری باتیں پڑھ کے معلومات میں بہت اضافہ ہوتا ہے۔ اس بار قربانی کے حوالے سے بیش قیمت معلومات پڑھنے کو ملیں۔

آخر میں آپ سے ایک فرمائش ہے کہ ہماری وہ رائٹر بہنیں جو اب ہم میں نہیں ہیں پلیز ان کی تحریریں بھی وقتاً "فوقتاً" شائع کر دیا کریں۔ ہمیں ان کو پڑھنا اچھا لگتا ہے۔

ج : پیاری شبانہ! آپ کی تجویز اچھی ہے۔ ہماری بہت سی قارئین نے شازیہ چوہدری کی تحریروں کو دوبارہ شائع کرنے کی فرمائش کی ہے۔ عمیرہ احمد نے پیر کامل کا دوسرا حصہ لکھا ہے جو اس ماہ یعنی نومبر کے شمارے میں خواتین میں شروع ہوا ہے۔ فرحت اشتیاق بھی ناول لکھ رہی ہیں جو آپ جلد پڑھ سکیں گی۔

بشریٰ عابد مخدوم اور زیبا حسن مخدوم لکھتی ہیں

شعاع اور خواتین سے ہماری بالترتیب بارہ اور دس سالہ خاموش دوستی رہی ہے اور اس خاموشی کو توڑنے پہ ہمیں مجبور کیا ہے ہمارے "یارم" نے۔ سمیرا آپی آپ بہت اچھا لکھتی ہیں بس لکھتی ہی جاتی ہیں، لکھتی ہی جاتی ہے لیکن پلیز عالیان اور امرحہ کو جدا مت کیجیے گا اور عالیان کو کہیں کہ تھوڑا سا اپنا غصہ کم کر لے۔ تمہیں کیا پتا مشرقی معاشرے کا مشرقی لڑکیوں کا۔

اس کے بعد جو کردار مجھے سب سے زیادہ پسند آیا وہ "کارل" کا ہے۔ آپی سمیرا! کیا سچ کوئی ایسا کردار ہے کہیں۔۔۔ اگر ہے تو مجھے ضرور بتائیے گا۔ پلیز۔

باقی دونوں سلسلے وار ناولز کے صفحات بہت تھوڑے ہوتے ہیں ابھی شروع کرتے ہیں تو ختم بھی ہو جاتے ہیں۔ مثال کا یوں گھر سے چلے جانا اچھا نہیں لگا۔ مگر خیر! حالات بندے سے کچھ بھی کروا لیتے ہیں اور پلیز ولید رحمان کے ساتھ کچھ برا نہ ہو پلیز۔ "عائشہ نصیر احمد" نے بھی بہت اچھا لکھا۔ ہلکے پھلکے انداز میں ایک اہم موضوع بیان کیا۔

باقی افسانے اور ناول بھی بہت اچھے تھے۔

ج : بشریٰ اور زیبا شعاع کی بزم میں خوش آمدید دس بارہ سال کی خاموشی کے بعد آپ نے خط لکھا۔ ہر ماہ باقاعدگی سے خط لکھیے گا۔ "کارل" سچ کہیں ہے یا نہیں یہ تو سمیرا ہی بتا سکتی ہیں لیکن ہمارا خیال ہے کہ کارل کہیں نہ کہیں کسی نہ کسی نام سے ضرور موجود ہے۔ ہو سکتا ہے ہمارے درمیان ہی ہو ہم پہچان نہ پائے ہوں۔

مثال کے بارے میں رائے خراب کرنے میں جلدی نہ کریں پہلے یہ قسط پڑھ لیں پھر فیصلہ کریں۔

عائشہ خان ٹنڈو محمد خان سے شریک محفل ہیں لکھا ہے

شعاع عید سے پہلے مل گیا یوں لگا کہ عید سے پہلے ہمیں عیدی مل گئی۔ سب سے پہلے ٹائٹل پر غور و فکر کیا اف بہت پیارا ہے۔ سب سے پہلے افسانہ دل کی عیدی پڑھا' واہ حیا بخاری 'عید اور ضرب غضب کے متاثرین دونوں کا حق ادا کر دیا۔ شہریار ساتھ کا کردار تو تھا ہی اچھا پر دادی کی نصیحت نہ ہوتی تو کچھ نہ ہوتا" اور شاہ گل نامی خاتون کے خیالات تو مصنف نے بہت پیارے لکھے۔ ویل ڈن حیا بخاری۔ حیا سے کوئی پٹھان فوجی کی کہانی لکھوائیں ناں مکمل ناول "وعدہ وفا" جیسا۔

مکمل ناول نے تو دل جیت لیا۔ تو اکیلی تو پیاری بات ہے ہنس ہنس کر میں نے پیٹ پکڑ لیا اف۔ اس بار سائرہ نے بہت جنبلایا اور جب پڑوسیوں کے بچوں کے ساتھ تولنے کے لیے "تولہ" زیور مانگتا ہے اس وقت میں بہت ہنسی (ہاہاہا)

کیونکہ مجھے بھی سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ وہ چوڑی کیوں مانگ رہا ہے جیسے ہی پڑھا۔ گرم مسالہ ایک تولہ۔۔۔ وغیرہ وغیرہ مجھے تو ہنسی کے مارے قہقہے واہ سائرہ اس بار تو بہت اچھی انٹری دی۔ سائرہ تو نیم اکرم مطلب کہ آل راؤنڈر بن گئی ہیں۔ "گرد کے پار" نایاب جیلانی اتنے مزے کا ناول کہ ایک نشست میں رات ایک بجے ختم کر کے ہی سوئی۔ اس بار آسان لفظوں میں لکھ کر نایاب نے بہت [illegible] مزہ آگیا۔ "یارم" کے سحر سے نکلنا مشکل ہو جاتا ہے جس وقت یارم پڑھتی ہوں۔ کافی دیر کہانی ذہن میں چلتی ہے۔ امرحہ نے ناشکری کر کے اچھا نہیں کیا۔ عالیان کو قبول کر لیتی۔ خیر ابھی بھی تاخیر نہیں ہوئی۔ ورا کا کردار بہت اسٹرونگ ہے۔ اور ٹوئیٹ کے متعلق پڑھ کر بھی مزا آیا ایک تھی عمرانہ، ایک کلثوم بھی اچھا لگا۔

اس بار کے عید سروے نے تو دل جیت لیا تمام بہنوں نے تفصیل سے لکھا۔ کوثر خالد بھلے مزاج کے اسٹائل 'رضوانہ شکیل کا محبوب کے نخرے اور قربانی کے بکرے (واہ) اقراء ملک کا ہر فن ہونا' تزئین صرف ظفر ملتان کی سمجھ بھی آئی اور پسند بھی آئی میں بھی ٹرائی کروں گی۔ گلزار بھائی مجھے کچھ خاص پسند نہیں اس لیے ابھی پڑھا نہیں۔ ذاکر بھائی کا بھی تعارف دیں۔ خطوط تو تمام بہنوں کے ہمیشہ ہی اچھے ہوتے ہیں۔ ہماری قارئین ہیں ہی اتنی قابل اور لائق فائق۔

ج : عائشہ! آپ ہماری مستقل قاری اور تبصرہ نگار ہیں۔ ہر بار ہی آپ کا تبصرہ بہت خوب ہوتا ہے۔ اس بار بھی تبصرہ پڑھ کر مزہ آیا۔ آپ نے صحیح لکھا۔ سائرہ رضا واقعی جس موضوع پر لکھتی ہیں اس سے پورا انصاف کرتی ہیں۔ حیا بخاری تک آپ کا پیغام پہنچا رہے ہیں۔ فوجی بھائیوں کی کہانیاں ہماری تمام قارئین بہت پسند کرتی ہیں یہ حقیقت ہے کہ فوج اگر سیاست میں ملوث نہ ہو تو ہم سب کے لیے بہت عزت و احترام کے لائق ہے۔

نیلم حرا میرپور خاص سے لکھتی ہیں

آپ لوگ ڈائجسٹ کے سلسلے "آئینہ خانے میں" کسی ایکٹر، سنگر یا کسی چینل کے پڑوسی ملک کی نقالی کرنے پر خوب "لتے" لیتے ہوئے انہیں آئینہ دکھاتے ہیں پھر اپنی رائٹر کی تصحیح کیوں نہیں کی؟ یہ ایک اردو ڈائجسٹ ہے جس میں "سائرہ رضا" کافی متواتر سے کارن، چنتا، شانتی اور ان جیسے دوسرے لفظ استعمال کر رہی ہیں۔ وہ ایک اچھی رائٹر ہیں۔ لیکن اس ڈائجسٹ سے جہاں لڑکیاں اچھی باتیں سیکھتی ہیں وہیں کم پڑھی لکھی لڑکیاں اور دیہاتی لڑکیاں اچھی اردو بھی سیکھتی ہیں تو کیا ایک اردو ڈائجسٹ انہیں ہندی سکھا رہا ہے؟ کچھ لفظ اردو اور ہندی کو الگ کرتے ہیں پر وہی لفظ اردو میں ڈال کر اس کو ہندی بنایا جا رہا ہے۔ کیا "سکون" "وجہ" اور "فکر" بہت مشکل لفظ ہیں جو ان کی جگہ شانتی، کارن اور چنتا کے لفظ استعمال ہوں گے۔

اس سب سے ڈائجسٹ اور رائٹر کا مقام اور نام خراب ہو رہا ہے۔ میرے کچھ جاننے والوں نے یہاں تک کہہ دیا

کہ دوسرے ملک ہماری ثقافت اور زبان پر اپنا رنگ اپنے میڈیا کے ذریعے چڑھا رہے ہیں۔ ایک ڈائجسٹ اور ہمارا ادب بچے تھے اب ایجنسیاں ان سے بھی یہ کام لے رہی ہیں۔ آپ کو کہانیاں شائع کرنے سے پہلے چیک کرنی چاہیے اور میں یہ ــ خط ــ پڑھنے والی بہنوں سے بھی پوچھنا چاہتی ہوں کہ ان لفظوں نے کسی کو چونکایا نہیں کہ یہ لفظ ہماری زبان کے نہیں؟

اردو ہماری قومی زبان ہے۔ جب ہمیں ان کے جیسا ہی رہنا بولنا تھا تو کیا ضرورت تھی "پاکستان" کی۔

ج: پیاری نیلم! بہت سے ہندوانہ رسم و رواج ہمارے معاشرے میں رائج ہیں۔ یہ شاید ایک ہزار سال ساتھ رہنے کا نتیجہ ہے اور کچھ چینلز بھی اسے فروغ دے رہے ہیں لیکن جہاں تک زبان کا تعلق ہے اردو زبان نے ہندوستان کی سرزمین پر جنم لیا۔ اس میں سنسکرت، ہندی، عربی اور فارسی کے بہت سے الفاظ شامل ہیں۔ خود اردو ترکی زبان کا لفظ ہے جس کے معنی لشکر کے ہیں۔ ہمارے گیتوں میں بہت سے ہندی الفاظ شامل ہوتے ہیں۔ امیر خسرو کے گیت پڑھیں تو اس میں بیشتر الفاظ ہندی کے ہیں۔ کارن تو عام لفظ ہے جو کئی بڑے ادیبوں نے اپنی تحریروں میں استعمال کیا ہے۔ اردو زبان کا دامن بہت وسیع ہے اس میں دوسری زبانوں کے الفاظ شامل ہوں گے تو اس کی وسعت میں مزید اضافہ ہوگا۔

ہم آئندہ احتیاط رکھیں گے کہ ہندی الفاظ شامل نہ ہوں۔

ثوبیہ نور نے گلشن گرنچھ بھلوال گھر سے شرکت کی ہے، لکھتی ہیں

جیسے ہی شعاع ہاتھ میں آیا (حالانکہ خود نہیں آیا میں خود بنفس نفیس بازار جا کر لائی تھی) سارے کام پس پشت ڈال کر اس کو پڑھنے بیٹھ گئے کہ دکھے دل کی مرہم پٹی اسی طرح ممکن تھی۔ صدمہ بڑا تھا مگر مسیحائی بھی تو خود ہی کرنا تھی ماسٹرز ان اکنامکس فرام اسلامیہ یونیورسٹی (بہاولنگر کیمپس) کے لیے دیکھے گئے خواب کی تعبیر ایم اے اردو پرائیویٹ کی صورت سامنے آئی تو چند دن غم منانا تو بنتا تھا۔

ناول اچھا تھا "بارونق" سانحہ بھی ہوتا تو خیر تھی کہ ہم نے تو ظاہر بھی توجہ ہی نہیں دی تھی کہ کسی شادی سے واپسی پر اگر کوئی پوچھے کہ دلہن کیسے ڈریس میں تھی تو اتنا پوچھنے والے کو گھور کر دیکھا جاتا ہے مطلب جاتے وقت ہدایت کی تھی کہ ڈریس بھی دیکھ کر آنا؟؟

"پہلی شعاع" روشنی کی کرنیں بکھیر رہی تھی۔

"تو" شروع کیا تو تھوڑی بے دھیانی کی سی کیفیت تھی اور یہ کیفیت ایڈم سمتھ اور ڈاکٹر مارشل کو پڑھتے ہوئے تو ہو سکتی ہے مگر سائرہ رضا؟؟ اتنی باذوق ثوبیہ اتنی بے ادب نہیں ہو سکتی ہو نک ٹنک ویڈیم ذم نہ کشیدہ مو والی کیفیت چھا ہی گئی تو فقط شام ہوئی لائٹ چلی اور پھر بجھ بھی گئی (بھئی پاکستان میں رہتی ہوں میں کون سا دبئی کا قصہ سنا رہی ہوں جو لائٹ جلے تو پھر بجھے ہی نہ) خیر ادھر ادھر ہاتھ مار کر ایمرجنسی لائٹ دریافت کی تو پتا چلا کہ اس کی چارجنگ آخری دموں پر ہے اگر اس کو وقت پر چارجنگ پر لگایا ہوتا تو فقدیہ کا شمار اس ہیرو جیسا نہ ہوتا جس کا تعارف نظیرس بخاری "کل سویرے آنکھ جو میری کھلی" میں کرواتے ہیں۔ ویسے سائرہ جی اچھی خواری آپ نے ابو اور عاشر کی کروائی ہے نا' یہ تو میں تھی جس نے اپنے ہی ہاتھوں پر ہاتھ مار کر رہ جانا ورنہ ہوتے کوئی بھائی صاحب شادی کو کھیل سمجھنے والے' تو ان کے ارمانوں کا خون آپ کے سر ہی ہوتا تھا۔ خیر دل دان ساتھ تھی ہمیشہ کی طرح چھا گئیں۔ مطلب ساس ہی اول ہے۔

یارم کو شروع کرنے سے پہلے دل تھوڑا ڈرا ہوا تھا کہ پچھلی قسط اچھے خاصے ٹریجک موڑ پر ختم ہوئی تھی مگر جناب یہ سمیرا ہیں۔ لفظ لفظ موتی' ہر کردار اپنی مثال آپ ہر واقعہ جیسے انگوٹھی میں نگینہ۔ بس پڑھتے جائیے "ایک تھی مثال" "تو جہاں سے شروع وہیں پہ ختم۔ رخسانہ جی آپ تو بکی بکی سی بی بی کو پیاری ہو گئیں (حالانکہ ابھیں بھی کچھ کم پیاری نہ تھیں)

یہی کام نبیلہ عزیز کر رہی ہیں گویا ناول نہ ہوا انڈین سوپ ہو گیا۔ افسانے تقریباً سارے ہی اچھے تھے نایاب جیلانی نے بھی اچھا لکھا۔ "امن عشائیہ" بہت زبردست نظم تھی۔ "باتوں سے خوشبو آئے" کا لفظ لفظ مہکتا گلاب تھا۔ کوثر خالد کا خط واقعی منفرد تھا۔

حرمت رو! آپ کو پتا نہیں کیوں امرحہ کے گھر والوں کا رویہ مبالغہ آمیز لگا ورنہ اکثر گھرانوں میں بعض بچوں کے ساتھ انتہائی ہتک آمیز رویہ رکھا جاتا ہے اور مزے کی بات

ہے کہ اسے برا بھی نہیں سمجھا جاتا بلکہ "اسی طرح کا ہے تو یہ ہی کہیں گے نا" اور "مذاق تھا تم نے رونا شروع کر دیا" ناپ تول باتیں کی جاتی ہیں۔ اب بچہ چاہے نفسیاتی مریض ہی کیوں نہ بن جائے۔ مارچ کے تبصروں میں تاک جھانک کی۔ اچھی رہی۔

ج: ثوبیہ! آپ کی رائٹنگ بھی بہت اچھی ہے اور خط بھی بہت دلچسپ لکھا' ہمارے خیال میں یہ بہتر ہی ہوا کہ آپ کو اکنامکس میں داخلہ نہیں ملا۔ اردو ادب میں آپ زیادہ کامیاب رہیں گی بلکہ آپ کو افسانہ نگاری پر بھی توجہ دینا چاہیے۔ سمیرا حمید کا یہ ناول ان کی دوسری تحریروں سے کافی مختلف ہے اور ہمیں خوشی ہے کہ قارئین نے سمیرا کے اس انداز کو بھی پسند کیا ہے۔ سنجیدہ تحریروں کی نسبت مزاح لکھنا واقعی مشکل ہے۔

رخسانہ نگار ٹی وی کے ساتھ ساتھ ہمیں بھی پیاری ہیں ان کا یہ ناول بھی بہت اچھا ہے لیکن چونکہ روایتی انداز کا ناول نہیں ہے اس لیے آپ کو ایسا محسوس ہو رہا ہے۔

گل افشین بہول سے لکھتی ہیں

اس شمارے کی تمام کہانیاں بہت اچھی تھیں ہم تمام دوستیں نمن' شایان' عمیرہ اور نمو باقاعدگی سے شعاع پڑھتی ہیں۔ واقعی شعاع منفرد اور قابل تعریف ہے۔

ج: پیاری گل افشین! شعاع کی پسندیدگی کے لیے آپ سب دوستوں کا بہت شکریہ۔ شایان کو سالگرہ کی مبارک باد اور بہت ساری دعائیں۔

موش زہرہ' حسنہ زہرہ' سنبل فاطمہ نے ہنگو خیبر پختونخوا سے لکھا ہے

اس ڈائجسٹ میں جو بھی کہانیاں ہوتی ہیں۔ وہ ہمارے اردگرد کے کرداروں کی عکاسی کرتی ہیں۔ رخسانہ نگار کی کہانی "ایک تھی مثال" بالکل ہی کہانی کی طرح لگتی ہے۔

شعاع کے باقی سلسلے بھی بہت اچھے ہیں۔ بہت مشکل سے ہم آپ کو خط لکھتے ہیں اگر شائع نہ ہوا تو بہت دکھ ہوگا ہمیں۔

ج: موش' حسنہ اور سنبل! ہمیں اندازہ ہے کہ ہماری بہت سی قارئین کو خط پوسٹ کرانے میں کتنی دشواریوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے اور وہ کتنی مشکل سے پرچا حاصل کرتی ہیں۔ شعاع کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔ آئندہ بھی ہمیں خط لکھتی رہیے گا۔

عمیرا نوشین نے منڈی بہاؤالدین سے لکھا ہے

عید کی مناسبت سے سرورق ٹھیک ہی لگا البتہ ماڈل کے جھمکے ایک دم نگاہوں کو بھا گئے۔ سمیرا حمید کے "یارم" کے بارے میں یہی کہوں گی کہ اس کے پراثر الفاظ اور کردار آنکھوں کے رستے دل میں اتر گئے۔ "رقص بسمل" اور "ایک تھی مثال" بہت زبردست انداز میں آگے بڑھ رہے ہیں۔ شیف گلزار سے ملاقات بہت اچھی رہی۔ ان کے بارے میں جان کر اچھا لگا۔ باقی اشعار کے دو صفحات سے ایک صفحہ کیوں ہو گیا۔ "خط آپ کے" میں اب خطوط نے کافی مقبولیت حاصل کر لی ہے۔ قاری بہنیں بہت خوب صورت انداز و الفاظ میں کہانیوں پر تبصرہ کرتی ہیں اور میں سمجھتی ہوں کہ یہ سب "شعاع" کی بدولت ہی ہے کہ قارئین کے زبان و بیان میں پختگی آئی ہے۔ ثوبیہ نور نے اپنے گاؤں کا تعارف کا آغاز افسانوی انداز میں کیا اور اس کی خوبیوں و خامیوں کو بڑے خوب صورت انداز میں بیان کیا۔ یہ سلسلہ بھی اچھا ہے اپنے ملک کے چھوٹے شہروں اور دیہات کے بارے میں جاننا دلچسپ بھی ہے اور معلوماتی بھی۔ گوشت کے پکوان میں تمام تراکیب آسان و سادہ تھیں جو کہ پسند آئیں۔

"خوب صورت بنیے" "میں بازی میک اپ کرنے کے طریقے کے بجائے قدرتی چیزوں سے حسن نکھارنے کے ٹوٹکے لکھ دیا کریں تو زیادہ اچھا لگے گا۔ دیگر افسانے و ناولٹ بھی ٹھیک تھے مجموعی طور پر رسالہ خوب تھا۔

ج: عمیرا! ہماری کوشش یہی ہوتی ہے کہ قدرتی چیزیں جو آسانی سے دستیاب ہوں ان سے حسن نکھارنے کی ترکیبیں بتائی جائیں۔ آپ نے صحیح لکھا ہے ہماری قارئین بہت ذہین ہیں اور ہمارا ملک بہت خوب صورت اور قدرتی وسائل سے مالا مال ہے اس کا اندازہ ہمیں موصول ہونے والے خطوط سے ہوتا ہے لیکن قارئین سے ہمیں ایک شکایت ہے کہ وہ دیگر سلسلوں میں بہت کم دلچسپی لیتی ہیں خصوصاً "اچھے لطیفے" ہمیں بہت کم تعداد میں موصول ہوتے ہیں۔

بشریٰ صدیق نے چیچہ وطنی سے لکھا ہے

اس بار خط لکھنے کی بنیادی وجہ سمیرا حمید کی "یارم" ہے بلاشبہ عمدہ لکھ رہی ہیں مگر یہ کیا؟ کیا یہ وہی سمیرا حمید ہیں جنہوں نے "دائم الحبس" اور "مرشت" جیسے شاہکار لکھے۔ مگر "یارم" میں کیا ہوا؟ سمیرا کے ناول میں تمام غیر ملکی کردار مسلسل پاکستانی معاشرے اور اسلام پر تنقید کیے جا رہے ہیں اور امرحہ کے پاس اس کا کوئی جواب نہیں۔ عجیب کیسی بیوقوف ہے۔ جو ہر خامی کو نے جا رہی ہے۔ مگر کچھ بولتی نہیں۔ مگر جب بات اپنی ذات کی آتی ہے تو وہ "کارل" جیسے شیطان کو بھی کتابوں کا پلندہ دے مارتی ہے بغیر نتائج کی پروا کیے اور پھر امرحہ کے پاس تو "دادا جان" بھی ہیں۔ وہ بھی اسے گائیڈ کرتے ہیں۔ یہ کیا بات ہوئی؟ ایک رائٹر جو غیر مسلم و مسلم کرداروں سے اپنے ملک اور سب سے بڑھ کر اپنے معاشرے پر جو کہ اسلام کی اپنے اندر زبردست جھلک رکھتا ہے کا جواب تنقید لکھ رہی ہے تو پھر وہی لکھاری جوابی کارروائی کیوں کرنے سے قاصر ہے؟ پاکستان کے حوالے سے آمنہ ریاض کی تحریر "بھی میرا حوالہ ہے" ہمیں ابھی تک بھولی نہیں۔ سمیرا جی ایسا مت کریں ورنہ دل پھٹ جائے گا اور پھر ناول کا کردار "لیڈی مہر" کا یہ کہنا کہ "میں نے بچوں کو اسلام پر نہیں لگایا کہ یہ میری خود غرضی ہوتی" حیرت در حیرت۔

"محبت میں سب بھول جاؤ" لیڈی مہر سے درخواست کہ آپ اگر اپنے بچوں کو اسلام پر نہیں لگانا چاہتیں تو برائے مہربانی اسلام سے منافی باتیں بھی مت کریں۔ کیا اسلام میں کچھ ایسا ہے کہ "محبت میں سب بھول جاؤ" تو پھر میں جاننا چاہوں گی۔ ادھورا علم گمراہ تو کر سکتا ہے گمراہ سے کر نہیں جا سکتا۔ ڈی این اے بھی نسل کا پوچھے تو ایک مسلم لڑکی کے چھکے چھوٹ جائیں اور ایک مسلم لڑکی (یعنی امرحہ) عالیان کے بارے میں بات کرتے ہوئے صرف اس کے باپ کا پوچھ لے تو معتوب ٹھہرادی جائے۔ یہ کیسا تضاد ہے؟ اور ہاں چلو مانا کہ باقی بچے تو مسلم تھے ہی نہیں جبکہ "بچہ فطرت اسلام پر پیدا ہوتا ہے" مگر عالیان تو فطرت اسلام پر پیدا ہونے والا ایک ایسا بچہ تھا جس کو اس کی ماں تک نے بھی اسلام سے متنفر نہیں کیا تو پھر لیڈی مہر کس بیس پر عالیان کو وہ مذاہب پر جا رہی ہے۔

ج: بشریٰ! آپ نے لکھا ہے ایسے خطوط شائع کرنے سے پرہیز کریں۔ جس سے تفرقہ نظر آئے کیونکہ ہمارے ڈائجسٹ کو ہر مکتبہ فکر کے لوگ پڑھتے ہیں۔ اس لیے ہم آپ کے خط کا وہ حصہ شائع نہیں کر رہے ہیں جو آپ نے علیمہ خیام کے بارے میں لکھا ہے یارم کے بارے میں جو کچھ آپ نے لکھا ہے اسے ہم آپ کی جلد بازی کہیں گے۔

تصویر کا ایک حصہ دیکھ کر پوری تصویر کے بارے میں فیصلہ نہیں کیا جا سکتا۔ یہ قسط پڑھ لیں آپ کو اسلام کے بارے میں امرحہ کے ردعمل کا پتا چل جائے گا۔ "محبت کرتے وقت سب کچھ بھول جاؤ" کا مطلب یہ نہیں کہ اپنا مذہب، اپنی تہذیب بھول جاؤ بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ بلا امتیاز مذہب، تہذیب، خاندان، غربت، امارت کسی مفاد کے بغیر سب سے بے لوث محبت کرو۔ لیڈی مہر نے جن بچوں کی پرورش کی ان کا تعلق مختلف قطعوں، ممالک اور مذاہب سے تھا۔ انہوں نے دیانت داری کا مظاہرہ کیا کہ اپنی پرورش کے عوض انہیں مسلمان نہیں بنایا۔ اب یہ ان کی مرضی ہے کہ وہ لیڈی مہر سے متاثر ہو کر اسلام قبول کریں۔ جیسے ان کے دو بچے اسلام کی اسٹڈی کر رہے ہیں۔ شارٹ اور سوئمنگ کو غیر مناسب لباس نہیں پہنتیں عالیان نے اسلام کو پسند کیا، اس نے اپنے باپ کی وجہ سے نہیں لیڈی مہر کی وجہ سے اسلام قبول کیا۔ ان کی سیرت کردار سے متاثر ہو کر اسلام کا مطالعہ کیا پھر مسلمان ہوا۔

امن علی ساہیوال سے تشریف لائی ہیں لکھا ہے
میں پہلی بار شریک محفل ہوں۔ اوئی کیا ہوا؟ اچھا اچھا... مجھ سے مل کر بہت خوشی ہوئی ہے نا (بس جی بھی غرور نہیں کیا...) ویسے شعاع سے وابستگی کو تو بہت سال گزر چکے ہیں۔ آٹھویں میں تھی جب میں نے پہلی بار شعاع پڑھا تھا اور اب ایم اے اردو کی طالبہ ہوں۔ تو اسی سے اندازہ لگالیں کہ کتنے پرانے تعلقات ہیں شعاع سے۔ سچ ہے کہ شعاع ایسا معیاری ادبی رسالہ ہے۔ نہ صرف مجھے بلکہ بہت سی لڑکیوں کو خوشی و غمی ہر طرح کے حالات میں بہترین زندگی گزارنے کے ڈھنگ سکھا رہا ہے۔

اوہ ہاں بچ! آج بھی خطوط کے جواب دیتے ہیں نامکمل کرتے ہیں جی... اتنی اپنائیت سے "اتنے پیار سے کہ بس



...رئیلی بہت اچھا لگتا ہے۔
اور... اور یہ کہ مجھے بھی لکھنے کا جنون ہے دعا کیجیے گا اس میں کامیاب ہو جاؤں۔

ج: اسن علی! سچ کہتے ہیں خط آدھی ملاقات ہوتا ہے' آپ سے مل کر بہت خوشی ہوئی۔ کامیابی کے لیے اولین شرط کوشش ہے' کوشش جاری رکھیے' ضرور کامیاب ہوں گی۔

پاکیزہ ہاشمی نے بہاولپور سے شرکت کی ہے' لکھا ہے

اس ماہ پہلی بار شعاع کو پڑھا اور یادرم کو بھی کیا کہوں۔ ابتدا کا یہ جملہ "اور محبت کا ایک ہی مجمو ہے دنیا" اس کا ایک ہی قصور ہے دنیا دار ہونا' اس جملے پر ایک ہی بالا لگتا ہے روایات کا۔ اس سوال کا اس سوال کا جواب جی۔ سمیرا حمید کے الفاظ انسان کو اپنے حصار میں لے لیتے ہیں۔ آہ میں کئی بار ہماری بھی آہ نکلی۔ اور نایاب جی کیا بات ہے آپ کی شفا کی شادی کو ساڑھے چھ سال ہوئے ہیں اور آخر میں چھ سال بتایا گیا۔

ج: شکریہ پاکیزہ! شعاع پڑھنے کا اور اس توجہ سے پڑھنے کا۔ ہمیں اعتراف ہے کہ ہماری قارئین چھوٹی چھوٹی باتوں پر بھی نگاہ رکھتی ہیں' اس لیے ہم کو بہت احتیاط کرنا پڑتی ہے لیکن پھر بھی بشر ہونے کے ناتے غلطی ہو ہی جاتی ہے' آپ نے نشان دہی کی خوشی ہوئی۔ آئندہ خیال رکھیں گے۔

مدیحہ راولپنڈی سے لکھتی ہیں

ایک بات سے کنفیوز ہوں کہ شعاع کے سرورق پر لڑکی کے کاندھے پہ تیسرا ہاتھ کس کا ہے؟

ج: مدیحہ! تیسرا ہاتھ ہمیشہ خفیہ ہوتا ہے اب بھی دیکھ لیں دھرنوں کے پیچھے کسی تیسرے ہاتھ کا ذکر کیا جارہا ہے لیکن کوئی نام نہیں لیتا۔

ڈاکٹر آمنہ حسین نے آریان ٹی شہداد پور سے لکھا ہے

اس دفعہ شعاع کچھ پسند نہیں آیا مگر یادرم بہت زبردست تھا۔

ج: پیاری آمنہ! ہمیں افسوس ہے۔ اس بار شعاع آپ کو اچھا نہیں لگا ہم اسے مزید بہتر بنانے کی کوشش کریں گے۔

خالدہ نے گکھڑ منڈی ضلع گوجرانوالہ سے لکھا ہے

اس ماہ کا شعاع بہت اچھا لگا۔ تعریف کے لیے الفاظ نہیں مل رہے۔

ج: بہت شکریہ خالدہ۔

قارئین متوجہ ہوں!

1 شعاع ڈائجسٹ کے لیے تمام سلسلے ایک ہی لفافے میں بھجوائے جاسکتے ہیں۔ تاہم ہر سلسلے کے لیے الگ کاغذ استعمال کریں۔
2 افسانے یا ناول لکھنے کے لیے کوئی بھی کاغذ استعمال کرسکتے ہیں۔
3 ایک سطر چھوڑ کر خوش خط لکھیں اور صفحے کی پشت پر یعنی صفحے کی دوسری طرف ہرگز نہ لکھیں۔
4 کہانی کے شروع میں اپنا نام اور کہانی کا نام لکھیں اور اختتام پر اپنا مکمل ایڈریس اور فون نمبر ضرور لکھیں۔
5 مسودے کی ایک کاپی اپنے پاس ضرور رکھیں۔ ناقابل اشاعت صورت میں تحریر کی واپسی ممکن نہیں ہوگی۔
6 تحریر روانہ کرنے کے دو ماہ بعد صرف پانچ تاریخ کو اپنی کہانی کے بارے میں معلومات حاصل کریں۔
7 شعاع ڈائجسٹ کے لیے افسانے' خط یا سلسلوں کے لیے انتخاب' اشعار وغیرہ درج ذیل پتے پر رجسٹری کروائیں۔

ماہنامہ شعاع۔ 37 اردو بازار کراچی۔

رخسانہ نگار عدنان

ایک تھی مثال

عدیل اور فوزیہ نسیم بیگم کے بچے ہیں۔ بشریٰ ان کی بہو ہے اور ذکیہ بیگم کی بیٹی ہے۔ عمران بشریٰ کا بھائی ہے۔ مثال ذکیہ بیگم کی نواسی اور نسیم بیگم کی پوتی ہے۔ بشریٰ اور نسیم بیگم میں روایتی ساس بہو کا تعلق ہے۔ نسیم بیگم مصلحتاً بہو سے لگاوٹ دکھاتی ہیں۔ دوسری طرف ذکیہ بیگم کا کہنا ہے۔ ان کی بیٹی بشریٰ کو سسرال میں بہت کچھ برداشت کرنا پڑتا ہے۔ پانچ سال کی مسلسل کوششوں کے بعد بشریٰ کی نند فوزیہ کا بالآخر ایک جگہ رشتہ طے پا جاتا ہے۔ نکاح والے روز بشریٰ دولہا ظفیر کو دیکھ کر چونک جاتی ہے۔

عدیل سے شادی سے قبل ظفیر کا بشریٰ کے لیے بھی رشتہ آیا تھا مگر بات نہ بن سکی تھی۔ نکاح والے دن فوزیہ کی ساس زاہدہ اور ذکیہ بیگم بھی ایک دوسرے کو پہچان لیتی ہیں۔ بشریٰ اپنی ماں سے یہ بات چھپانے کے لیے کہتی ہے مگر عدیل کو پتا چل جاتا ہے۔ وہ ناراض ہوتا ہے مگر فوزیہ اور نسیم بیگم کو بتانے سے منع کرتا ہے۔ بشریٰ اور عدیل ایک ہفتے کے لیے اسلام آباد جاتے ہیں۔ وہاں انہیں پتا چلتا ہے کہ بشریٰ کے ہاں سات سال بعد پھر خوش خبری ہے۔

عفان اور عاصمہ اپنے تین بچوں اور والد کے ساتھ کرائے کے گھر میں رہتے ہیں۔ عفان کے والد فاروق صاحب سرکاری نوکری سے ریٹائر ہوئے ہیں۔ گریجویٹی اور گاؤں کی زمین فروخت کر کے وہ اپنا گھر خریدنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ ڈیڑھ کروڑ میں زمین کا سودا کر کے وہ عفان کے ساتھ خوشی خوشی شہر آ رہے ہوتے ہیں کہ ڈکیتی کی واردات میں قتل ہو جاتے ہیں۔

عفان کے قریبی دوست زبیر کی مدد سے عاصمہ عفان کے آفس سے تین لاکھ روپے اور فاروق صاحب کی گریجویٹی سے سات لاکھ روپے وصول کر پاتی ہے۔ زبیر گھر خریدنے میں بھی عاصمہ کی مدد کر رہا ہے۔

اسلام آباد سے واپسی پر عدیل دونوں متوحشین کو دیکھتا ہے۔ زاہدہ نسیم بیگم سے بیس لاکھ روپے سے مشروط فوزیہ کی



رخصتی کی بات کرتی ہیں۔ وہ سب پریشان ہو جاتے ہیں۔ عدیل بشریٰ سے ذکیہ بیگم سے تین لاکھ روپے لانے کو کہتا ہے۔

حمیدہ خالہ' عاصمہ کو سمجھاتی ہیں کہ عدت میں زبیر کا ایسے اس کے گھر آنا مناسب نہیں ہے۔ لوگ باتیں بنا رہے ہیں جبکہ عاصمہ کی مجبوری ہے کہ گھر میں کوئی مرد نہیں۔ اس کا بیٹا ابھی چھوٹا ہے اور سارے کام اس نے خود کرنے ہیں۔ وہ جلد از جلد اپنا گھر خریدنا چاہتی ہے۔ عاصمہ کے کہنے پر زبیر کسی سختی سے فتویٰ لے کر آجاتا ہے کہ دوران عدت انتہائی ضرورت کے پیش نظر گھر سے نکل سکتی ہے بشرطیکہ مغرب سے پہلے واپس گھر آجائے' سو وہ عاصمہ کو مکان دکھانے لے جاتا ہے۔ اور موقع سے فائدہ اٹھا کر اسے اپنی ہوس کا نشانہ بناتا ہے اور وہیں چھوڑ کر فرار ہو جاتا ہے۔

رقم مہیا نہ ہونے کی صورت میں فوزیہ کو طلاق ہو جاتی ہے۔ نسیم بیگم جذباتی ہو کر عدیل اور اس کے گھر والوں کو مورد الزام ٹھہرانے لگتی ہیں۔ اسی بات پر عدیل اور بشریٰ کے درمیان خوب جھگڑا ہوتا ہے۔ عدیل طیش میں بشریٰ کو دھکا دیتا ہے۔ اس کا ابارشن ہو جاتا ہے۔ عدیل شرمندہ ہو کر معافی مانگتا ہے مگر وہ ہنوز ناراض رہتی ہے اور اسپتال سے اپنی ماں کے گھر چلی جاتی ہے۔

اسی اسپتال میں عدیل عاصمہ کو دیکھتا ہے جسے بے ہوشی کی حالت میں لایا گیا ہوتا ہے۔ عاصمہ اپنے حالات سے تنگ آکر خودکشی کی کوشش کرتی ہے تاہم بچ جاتی ہے۔ نو سال بعد عاصمہ کا بھائی ہاشم پریشان ہو کر پاکستان آجاتا ہے۔ عاصمہ کے سارے معاملات دیکھتے ہوئے ہاشم کو پتا چلتا ہے کہ زبیر نے ہر جگہ فراڈ کر کے اس کے سارے راستے بند کر دیے ہیں اور اب مفرور ہے۔ بہت کوششوں کے بعد ہاشم' عاصمہ کو ایک مکان دلا پاتا ہے۔

بشریٰ اپنی واپسی الگ گھر سے مشروط کر دیتی ہے۔ دوسری صورت میں وہ علیحدگی کے لیے تیار ہے۔ عدیل سخت پریشان ہے۔ عدیل مکان کا اوپر والا پورشن بشریٰ کے لیے سیٹ کروا دیتا ہے اور کچھ دنوں بعد بشریٰ کو مجبور کرتا ہے کہ وہ فوزیہ کے لیے عمران کا رشتہ لائے۔ نسیم بیگم اور عمران کسی طور نہیں مانتے۔ عدیل اپنی بات منوانے جانے پر بشریٰ سے جھگڑتا ہے۔ بشریٰ بھی ہٹ دھرمی کا مظاہرہ کرتی ہے۔ عدیل طیش میں بشریٰ کو طلاق دے دیتا ہے اور مثال کو چھین لیتا ہے۔ مثال بیمار پڑ جاتی ہے۔ بشریٰ بھی حواس کھو دیتی ہے۔ عمران بہن کی حالت دیکھ کر مثال کو عدیل سے چھین کر لے آتا ہے۔ عدیل عمران پر اغوا کا پرچا کٹوا دیتا ہے۔

عاصمہ اسکول میں ملازمت کر لیتی ہے مگر گھریلو مسائل کی وجہ سے آئے دن چھٹیاں کرنے کی وجہ سے ملازمت چلی جاتی ہے۔ اچانک ہی فوزیہ کا کہیں رشتہ طے ہو جاتا ہے۔

انسپکٹر طارق دونوں فریقین کو سمجھا بجھا کر مصالحت پر آمادہ کرتے ہیں۔ ذکیہ بیگم کی خواہش ہے کہ عدیل' مثال کو لے جائے' تاکہ وہ بشریٰ کی کہیں اور شادی کر سکیں۔ دوسری طرف نسیم بیگم بھی ایسا ہی سوچے بیٹھی ہیں۔ فوزیہ کی شادی کے بعد نسیم بیگم کو اپنی جلد بازی پر پچھتاوا ہونے لگتا ہے۔

انسپکٹر طارق ذکیہ بیگم سے بشریٰ کا رشتہ مانگتے ہیں۔ ذکیہ بیگم خوش ہو جاتی ہیں مگر بشریٰ کو یہ بات پسند نہیں آتی۔ ایک پراسرار سی عورت عاصمہ کے گھر بطور کرائے دار رہنے لگتی ہے۔ وہ اپنی حرکتوں اور انداز سے جادو ٹونے والی عورت لگتی ہے۔ عاصمہ بہت مشکل سے اسے نکال پاتی ہے۔

بشریٰ کا سابقہ منگیتر احسن کمال ایک طویل عرصے بعد امریکا سے لوٹ آتا ہے۔ وہ گرین کارڈ کے لالچ میں بشریٰ سے منگنی توڑ کر نازیہ بھٹی سے شادی کر لیتا ہے' پھر شادی کے ناکام ہو جانے پر ایک بیٹے سیفی کے ساتھ دوبارہ اپنی چچی ذکیہ بیگم کے پاس آجاتا ہے اور دوبارہ بشریٰ سے شادی کا خواہش مند ہوتا ہے۔ بشریٰ تذبذب کا شکار ہو جاتی ہے۔

بشریٰ اور احسن کمال کی شادی کے بعد عدیل مستقل طور پر مثال کو اپنے ساتھ رکھنے کا دعوا کرتا ہے مگر بشریٰ قطعی نہیں مانتی' پھر احسن کمال کے مشورے پر دونوں بمشکل راضی ہو جاتے ہیں کہ مہینے کے ابتدائی چند دنوں میں مثال بشریٰ کے پاس رہے گی اور بقیہ چند روز عدیل کے پاس۔ گھر کے حالات اور نسیم بیگم کے اصرار پر بالآخر عدیل عفت سے شادی کر لیتا ہے۔ والدین کی شادی کے بعد مثال دونوں گھروں کے درمیان گھن چکر بن جاتی ہے۔ بشریٰ کے گھر میں سیفی اور احسن اس کے ساتھ کچھ اچھا برتاؤ نہیں کرتے اور عدیل کے گھر میں اس کی دوسری بیوی عفت۔ مثال کے لیے مزید زمین تنگ۔ بشریٰ

اور عدیل کے نئے بچوں کی پیدائش کے بعد بڑھ جاتی ہے۔ مثال اپنا اعتماد کھو بیٹھتی ہے۔ احسن کمال اپنی فیملی کو لے کر ملائیشیا چلا جاتا ہے اور مثال کو تاریخ سے پہلے عدیل کے گھر بھجوا دیتا ہے۔ دوسری طرف عدیل اپنی بیوی بچوں کے مجبور کرنے پر مثال کے آنے سے قبل اسلام آباد چلا جاتا ہے۔ مثال مشکل میں گھر جاتی ہے۔ پریشانی کی حالت میں اسے ایک منشی تنگ کرنے لگتا ہے تو عاصمہ آکر اسے بچاتی ہے۔ پھر اپنے گھر لے جاتی ہے۔ جہاں سے مثال اپنے ماموں کو فون کر کے بلواتی ہے اور اس کے گھر چلی جاتی ہے۔

عاصمہ کے حالات بہتر ہو جاتے ہیں۔ وہ نسبتاً" پوش ایریا میں گھر لے لیتی ہے۔ اس کا کوچنگ سینٹر خوب ترقی کر جاتا ہے۔ اسے مثال بہت اچھی لگتی ہے۔ مثال' واثق کی نظروں میں آچکی ہے تاہم دونوں ایک دوسرے سے واقف نہیں ہیں۔

عاصمہ کا بھائی ہاشم ایک طویل عرصے بعد پاکستان لوٹ آتا ہے اور آتے ہی عاصمہ کی بیٹیوں اریشہ اور اریبہ کو اپنے بیٹوں وقار' وقاص کے لیے مانگ لیتا ہے۔ عاصمہ اور واثق بہت خوش ہوتے ہیں۔

مثال کو نیند میں محسوس ہوتا ہے کہ کوئی اسے گھسیٹ رہا ہے۔

—۲۱—

اکیسویں قسط

"میں جھوٹ نہیں کہہ رہی۔ وہ واقعی پورے گھر میں کہیں نہیں ہے۔ وہ چلی گئی ہے کہیں۔ اور عدیل! آپ کو شاید بہت برا لگے لیکن مجھے کئی دنوں سے مثال پر شک تھا۔" عفت مخصوص نرم تسلی دینے والے لہجے میں بول رہی تھی جس میں کوئی بہت بمباسٹک خبر پوشیدہ تھی۔

"کیا... کیا کہنا چاہتی ہو تم! کیا شک تھا تمہیں؟" عدیل باہر کی طرف جاتے ہوئے بے اختیار ٹھٹک کر رک سا گیا تھا۔

"اور پلیز کوئی بھی الٹی سیدھی بے بنیاد بات نہیں کرنا۔ میرا دماغ آل ریڈی بہت ڈسٹرب ہے۔" وہ آخر میں کچھ اکتائے ہوئے لہجے میں اسے وارن کرتے ہوئے بولا تھا۔

"میں جانتی ہوں آپ کی ڈسٹربنس کو۔ بشریٰ سے مثال کی ماں جو اپنی بیٹی سے کبھی بھی جدا نہیں ہونا چاہتی تھی' کس طرح کس وجہ سے اسے ہمیشہ کے لیے یہاں چھوڑ کر چلی گئی۔ کوئی تو وجہ ہو گی ناں۔ آپ نے یہ بات نہیں محسوس کی۔ اتنے سال تو اسے یہ بات ایک دن کے لیے بھی گوارہ نہیں تھی کہ مثال یہاں رہتی۔" وہ جتا جتا کر کوئی بھی واضح بات کیے بغیر بہت کچھ واضح کرتی چلی جا رہی تھی۔

عدیل نے اسے سخت ناراض نظروں سے دیکھا۔

"مجھے ان فضول پہیلیوں میں مت الجھاؤ۔ جو بات ہے وہ کرو۔" عدیل لہجے میں درشتی لیے ہوئے جھنجلا کر بولا۔

"مجھے لگتا ہے وہ کسی میں انوالو ہے اور ابھی بھی وہ جو نکل ہے۔ تو وہ چلی گئی ہے۔" وہ رک رک کر دھماکے دار لہجے میں بولی۔

"واٹ... چلی گئی... کہاں چلی گئی ہے وہ...؟" عدیل تو جیسے اچھل ہی پڑا اس کی بات سن کر!

"جس کے ساتھ انوالو ہو گی۔ اس کے کمرے میں جا کر دیکھ لیتے ہیں۔ اگر اس کا ضروری سامان وہاں نہیں ہو گا تو پھر اسے تلاش کرنے کا کوئی فائدہ نہیں۔" عفت جیسے کچھ طے کیے بیٹھی تھی کہ اب یہ ہونے والا ہے۔

"عفت! میرا دماغ خراب نہیں کرو۔ میری بیٹی ایسی نہیں ہے۔ سنا تم نے۔" وہ پاگلوں کی طرح زور سے چیخا تھا۔ عفت ڈر کر بے اختیار پیچھے ہو گئی۔

"تو ڈھونڈ لیں اسے جا کر۔ یوں آدھی رات کو غائب ہونے کا مطلب۔ مجھے جو لگا میں نے کہہ دیا۔" وہ ذرا دیر بعد ڈھٹائی سے بولی۔ عدیل اسے پرے دھکیل کر تیزی سے باہر نکل گیا۔

"ہونہہ! میری بیٹی ایسی نہیں ہے۔ شیشے کی طرح بے داغ شفاف ہے نا یہ مثال بی بی۔ جیسی ماں۔ ماں نے طلاق کے پانچویں مہینے پرانے عاشق سے شادی رچالی فوراً" تو کیا بیٹی دودھ کی دھلی ہو گی۔" بڑبڑا کر باہر نکل گئی۔

مثال کسی بھی سمت کا تعین کیے بغیر اونچی دوپٹہ پیچھے پر پھیلائے تیز تیز منتشر قدموں کے ساتھ چلی جا رہی تھی۔

وہ اب تنگ گلی سے نکل کر کھلی جگہ پر آ گئی تھی۔ خنک ہوا اس کے گھسے ہوئے کپڑوں کو کاٹتی اب اس کے جسم سے ٹکرا رہی تھی۔ اس کے بال ہوا میں اڑ رہے تھے۔

"مجھے اب واپس نہیں جانا۔ یوں بھی وہ کون سا میرا گھر ہے اور وہاں کسی کو بھی میری ضرورت نہیں۔ میں یہاں سے کہیں چلی بھی جاؤں، مر بھی جاؤں تو بھی کسی کو پریشانی نہیں ہو گی بلکہ سب کو خوشی ہو گی کہ ان کی جان چھٹ گئی مجھ سے۔ پتا نہیں اللہ نے مجھے پیدا ہی کیوں کیا تھا۔ ایک مثال ایک عبرت بنانے کے لیے۔" اس کی آنکھوں سے بے آواز آنسو بہتے چلے جا رہے تھے۔

وہ دائیں بائیں کہیں بھی دیکھے بغیر اب اور بھی تیز رفتاری کے ساتھ چلی جا رہی تھی کہ ایک دم سے سامنے سے ادھر آتے ہوئے کسی سے ٹکرا گئی۔

ایک دم سے اسے لگا جیسے وہ کسی محفوظ پناہ میں آ گئی ہو۔ خنک سرد ہواؤں سے گرم حصار۔ بھری پناہ گاہ میں! مضبوط گرم بازوؤں کی پناہ نے صرف چند ساعتوں کے لیے اسے گہرے سکون کا احساس دیا تھا۔ کسی کی گرم سانسوں کا ادراک ہوتے ہی وہ ایک جھٹکے سے سیدھی ہوئی۔

وہ زور لگا کر پیچھے ہونا چاہتی تھی مگر کسی مضبوط گرفت میں تھی۔ اس نے پول لائٹ میں سامنے اتنے قریب کھڑے شخص کو حیران نظروں سے دیکھا اور دوسرے لمحے وہ شاکڈ سی رہ گئی۔

"یہ تو وہی ہے۔" اس کے لب ہولے سے کانپے تھے۔

"واثق عثمان!" وہ اس کی نظروں کا مفہوم پڑھتے ہوئے بڑی اپنائیت سے بولا۔

"کتنی بار مجھے اپنا تعارف کرانا پڑے گا آپ سے؟" وہ اب کے مسکرایا تھا۔

مثال نے پوری طاقت سے اسے دھکا دے کر پرے کیا اور وحشت بھری نظروں سے کچھ کہے بغیر اسے دیکھتی وہاں سے بھاگ پڑی۔ واثق اسے یوں دیوانہ وار بھاگتے دیکھ کر حیران سا رہ گیا۔

دوسرے لمحے وہ بھی اس کے پیچھے تیزی سے گیا۔ وہ بھاگتے ہوئے پیچھے مڑ کر دیکھے بغیر چلی جا رہی تھی۔

"مجھے لگ رہا ہے یہ اپنے حواس میں نہیں ہے۔ اسے معلوم ہی نہیں یہ اس وقت کہاں ہے۔ مجھے اس کے پیچھے جانا چاہیے۔" وہ اب کے کچھ پریشان سا ہو کر تیز قدموں سے اس کے پیچھے چل پڑا۔

تیز ہوا میں اڑتا گلابی آنچل اس کی رہنمائی کر رہا تھا!



وہ کھلے گیٹ سے اندر آ رہی تھی۔

عفت اور عدیل اس کے سامنے کھڑے تھے۔ وہ سر جھکائے ان کے سامنے آ کر کھڑی ہو گئی۔

"کہاں سے آ رہی ہو تم اس وقت؟" عدیل کی آواز میں سرد مہری تو تھی عجیب سا کھردرا پن بھی تھا۔

مثال نے دونوں ہاتھوں کی انگلیوں کو آپس میں پکڑ کر ان کی کپکپاہٹ پر قابو پانے کی کوشش کی مگر۔ اس کی ٹانگیں۔ ان سے جیسے جان نکلی جا رہی تھی۔ یوں جیسے وہ ابھی گر پڑے گی۔

"کیا پوچھ رہا ہوں میں تم سے مثال؟" عدیل کی گرج دار آواز نے اس کی رہی سہی ہمت بھی ختم کر دی۔

"کیا وہ چھوڑ کر بھاگ گیا جس کے بھروسے پر تم نے یہ دہلیز عبور کی تھی۔ بس اتنی سے محبت تھی اسے تم سے۔" عفت نے بہت عجیب سے لہجے میں چٹخارے لے کر یوں کہا جیسے وہ اس کہانی کے آگے پیچھے ہونے والے ہر واقعے کی چشم دید گواہ ہے۔

مثال حیرت بھری نظروں سے چہرہ اٹھا کر اسے دیکھنے لگی۔

"عفت! تم جاؤ کمرے میں۔ میں بات کر رہا ہوں مثال سے۔" عدیل نے ہمیشہ کی طرح عفت کو اپنے اس انتہائی ذاتی معاملے سے دور ہٹانے کی کوشش کی۔

"کیوں جاؤں میں اندر یہ اب آپ کا ہی نہیں میرا بھی معاملہ ہے۔ کیونکہ یہ لڑکی اب میرے گھر پر رہ رہی ہے۔ میری بھی اتنی ہی ذمہ داری بنتی ہے جتنی آپ کی۔ اور جیسے یہ آج رات کو نکل گئی کل دن میں کسی بھی ٹائم پھر سے نکل گئی تو شام میں آ کر تو آپ مجھ سے ہی سوال کریں گے نا۔ اس وقت بھی تو مجھے ہی ذمہ دار ٹھہرایا جائے گا تو پلیز مجھے بھی معلوم ہو لینے دیجیے کہ اس لڑکی کے ارادے کیا ہیں۔ کیوں یہ سب کچھ کر رہی ہے جبکہ میں نے ہم نے اسے اس گھر میں ہر طرح کا آرام سہولت دے کر اپنی اولاد کی طرح ہی رکھا ہوا ہے پھر یہ سب کیوں کر رہی ہے کہ اسے اپنے باپ کی عزت کا ذرا بھی پاس نہیں۔" عفت بہت استحقاق بھرے انداز میں کہتی چلی گئی اور عدیل کی سمجھ میں آ گیا کہ وہ عفت کو اب کسی بھی طرح یہاں سے بھیج نہیں سکے گا۔

"ہوتی اگر اس کی جگہ میری بیٹی قسم خدا کی میں اب تک اس کی ٹانگیں توڑ کر ہاتھ میں پکڑا چکی ہوتی۔" وہ منہ پر ہاتھ پھیر کر پر عزم لہجے میں بولی جیسے وہ واقعی بیٹی کی ٹانگیں توڑ ہی تو چکی ہے۔

"تم سے میں کیا پوچھ رہا ہوں۔ تم مجھے جواب دو گی یا میں خود ہاتھ پکڑ کر تمہیں اس دروازے کے باہر کروں جس سے تم ابھی اندر آئی ہو۔" اور عدیل یہ سب کر سکتا تھا۔ مثال کو اس بات کا پتا تھا۔

اس وقت مسئلہ صرف عدیل کی عزت اور غیرت کا ہی تھا۔ عفت جس طرح بڑھ بڑھ کر باتیں کر رہی تھی اور جس طرح اس نے "تمہاری اور میری بیٹی" کے بیچ میں لکیر کھینچی تھی اس نے عدیل کو کچھ اور بھی غضب ناک سا کر دیا تھا۔

"پاپا۔ میں۔" وہ کانپتے لہجے میں انتہائی گھٹی آواز میں بول سکی تھی۔

"کس کے ساتھ گئی تھیں تم؟" وہ گرج کر بولا۔

"یہ بھی ہو سکتا ہے وہ ابھی باہر ہی موجود ہو اور یہ چپکے سے کچھ سامان سمیٹنے کے لیے آئی ہو۔" عفت کہہ کر تیزی سے باہر کی طرف لپکی اور باہر جھانکتے ہوئے دور تک دیکھنے لگی۔ واثق جو دور اندھیرے میں کھڑا تھا کچھ اور بھی پیچھے ہو گیا۔

عفت کچھ دیر کھڑی ادھر ادھر دیکھتی رہی پھر مایوس ہو کر گیٹ بند کر کے اندر آ گئی۔

"میرا۔ دم گھٹ رہا تھا کمرے میں۔ تو میں۔ نکل ہوا میں۔" وہ بہت رک رک کر ڈرے ہوئے لہجے میں بولی۔

اور عدیل نے شدید غصے میں اسے تھپڑ مارنے کے لیے ہاتھ اٹھایا تھا مگر جانے کیسے وہ فضا میں ہی رک گیا۔ اس نے ہونٹ زور سے بھینچ لیے تھے۔ مشال آنکھوں میں آنسو، حیرت اور دکھ لیے خود سے بہت محبت کرنے والے باپ کی اس تشنجی کیفیت کو دیکھ رہی تھی۔

"اللہ میری توبہ۔ بہانہ بھی دیکھو کیسا ہوا گھڑا۔ دم گھٹ رہا تھا۔ تم کیا قبر میں پڑی تھیں جو تمہارا کمرے میں دم گھٹنے لگا۔ سارے گھر میں سب سے ہوادار کمرہ ہے وہ اللہ مغفرت کرے اماں جان کا۔ اتنے سال اپنی آخری عمر کے انہوں نے اس کمرے میں گزارے اس بہشتن نے تو کبھی ایسی شکایت نہ کی۔ اور پوتی کی حالت دیکھیں۔ دو دنوں میں اس کا کمرے میں دم گھٹنے لگا۔ آگے آگے کیا ہونے والا ہے عدیل! آپ یہیں سے اندازہ کرلیں میں تو کہتی ہوں۔"

عفت کو برداشت کرنا نسیم بیگم سے بھی زیادہ مشکل تھا۔ اتنے سالوں میں آج پہلی بار اتنی شدت سے عدیل کو اندازہ ہوا تھا۔

"پاپا۔ آئی ایم سوری۔ سوری پاپا!" اس نے بے اختیار روتے ہوئے باپ کے آگے دونوں ہاتھ جوڑ دیے۔ اس کی بند آنکھوں سے آنسو ٹوٹ ٹوٹ کر گر رہے تھے۔

اور عدیل کو لگا "یہ آنسو نیچے مشال کے پیروں پر نہیں اس کے دل پر گر رہے ہیں۔ وہ شکست خوردہ سا خاموش اندر چلا گیا۔

"بہت خوب! اچھا ڈرامے بازی ہے۔ ماشاء اللہ مشال بی بی! تم تو کچھ اور ہی نکلیں۔ جیسے میں نے سوچ رکھا تھا۔" عفت جلے کٹے لہجے میں بولی۔

اس کی توقع کے برعکس عدیل نے کوئی بھی سخت ردعمل ظاہر نہیں کیا تھا اس اتنے بڑے واقعے پر۔ وہ سخت مایوس ہوئی تھی۔

مشال کچھ بھی کہے بغیر اس کے پاس سے گزر کر اندر چلی گئی۔ عفت وہیں کھڑی اسے جاتے دیکھ کر کچھ سوچتی چلی گئی۔

"عدیل جتنا بھی اس لڑکی سے ناراض ہو جائے۔ چیخ چلائے اور یہ کتنی بھی بڑی غلطی کرلے وہ اسے کبھی کچھ نہیں کہے گا۔ یہ لڑکی اس کی کمزوری ہے۔ اور یہ عنقریب اس گھر میں میرے بچوں کی جگہ لے لے گی۔ مجھے اس کو یہاں سے دفعان کرنے کے لیے کچھ نہ کچھ فوری طور پہ کرنا ہوگا ورنہ پھر یہ معاملہ میرے ہاتھوں سے نکل گیا تو سب کچھ اس کے ہاتھوں میں چلا جائے گا۔"

وہ کچھ دیر وہیں کھڑی غور کرتی رہی کہ مشال سے جان چھڑانے کا بہترین طریقہ کون سا ہو سکتا ہے کہ سانپ بھی مر جائے اور لاٹھی بھی نہیں ٹوٹے مگر فوری طور پر اسے کوئی موزوں حل نہیں سوجھ سکا مگر اسے یقین تھا وہ کوئی نہ کوئی راستہ ڈھونڈ لے گی۔



پھر کئی دن خاموشی سے سرک گئے۔

عدیل نے مشال سے کوئی بات نہیں کی۔ وہ بالکل خاموش تھا۔ اس کی باتوں کا جواب دیتا مگر خود سے کوئی بات نہیں کرتا تھا۔

مشال اس کے رویے سے افسردہ اور الجھی ہوئی تھی مگر یہ بھی غنیمت تھا کہ آج کل عفت نے بھی چلی گئی

سنانے کا پروگرام ملتوی کر رکھا تھا۔

پری کی کلاسز شروع ہو چکی تھیں۔ اس نے الگ سے وین لگوائی تھی۔ وہ مشال کی وین میں نہیں جاتی تھی۔

"پاپا! میری کلاسز دیر سے ختم ہوں گی۔ آپی کی کلاسز جلدی ختم ہو جاتی ہیں۔ ان کی وین میں یوں بھی لڑکیاں بہت زیادہ ہیں اور سب سینئر کلاسز سے ہیں۔ مجھے اپنی کلاس فیلوز کے ساتھ وین میں جانا ہے جس میں سب جاتی ہیں۔" اس نے بہت معصومیت اور سادگی سے مشال سے دور رہنے کے لیے الگ وین لگوانے کی باپ کو وجہ بتائی تو عدیل نے جواب میں کچھ بھی نہیں کہا۔

وہ صبح مشال سے پہلے کالج چلی جاتی اور وہ سہ پہر میں بہت دیر میں واپس آتی تھی۔

آج اتفاق کی بات تھی کہ مشال کی وین والے نے واپسی پر انہیں خود آنے کے لیے کہہ دیا تھا کہ اسے کسی ضروری کام سے شہر سے باہر جانا تھا۔

"سوری آپی! میری تو کلاسز ہیں پھر اس کے بعد پریکٹیکل بھی ہیں تو بہت لیٹ ہو جاؤں گی۔ تم بس میں یا رکشے میں چلی جانا۔"

مشال کو پری کلاس میں ملی تو اس نے صاف انکار کر دیا۔ مشال خاموشی سے واپس آگئی۔

لوکل بس یا وین سے وہ کبھی اکیلی نہیں گئی تھی اور رکشے میں بھی اکیلی نہیں جاتی تھی پھر اس کے پاس پیسے بھی بہت کم تھے۔

چھٹی کے بعد وہ پریشان سی باہر نکل کر یونہی پیدل چلنے لگی۔

"میں نے غلطی کی میں عروسہ سے کہتی وہ گھر کی طرف سے گزر کر جاتی ہے۔ وہ مجھے ڈراپ کر دیتی راستے میں۔" اسے خیال ستانے لگا۔

"لیکن اب تو وہ جا چکی ہوگی اور پیدل تو گھر نہیں جایا جا سکتا۔ کیا مصیبت ہے اگر یہ وین والے انکل صبح گھر ہی بتا دیتے تو میں آج چھٹی ہی کر لیتی۔" وہ یونہی سڑک کے کنارے فٹ پاتھ پہ الجھتی ہوئی چلی جا رہی تھی جب ایک گاڑی اس کے پاس سے گزری اور پھر ریورس کرتے ہوئے اس کے پاس آکر ہلکا سا ہارن دیتی رک گئی۔

مشال کو متوجہ ہونا پڑا۔

واثق اسے ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھا اجنبیت بھری نظروں سے دیکھتا گاڑی میں بیٹھنے کا اشارہ کر رہا تھا۔

وہ سینے سے لگی فائل پر گرفت مضبوط کرتی اس سے نظریں چرا کر تیزی سے آگے بڑھنے لگی۔ وہ گاڑی سے اتر کر اس کے پاس آگیا۔

"پلیز! اتنا تو بھروسے کے لائق سمجھ سکتی ہیں مجھے۔ ہم بہت دنوں سے مل رہے ہیں۔ مطلب ٹکرا رہے ہیں زبردستی۔ میں آپ کو آپ کے گھر تک ہی ڈراپ کروں گا۔" وہ اس کے ساتھ چلتے ہوئے ملتجی لہجے میں کہہ رہا تھا۔

"مجھے نہیں جانا آپ کے ساتھ تو کیوں خواہ مخواہ میرے ساتھ چل رہے ہیں۔" وہ اس کی طرف براہ راست دیکھے بغیر جھلا کر بولی۔

"میں صرف ساتھ چلنا ہی نہیں چاہتا۔ بلکہ آپ کا ہاتھ بھی تھام لینا چاہتا ہوں اور مشال! اب اگر تم نہیں رکیں اور میرے ساتھ گاڑی میں نہیں بیٹھیں تو میں تمہارا ہاتھ پکڑ لوں گا اور پھر تمہیں ساتھ لے جاؤں گا۔ کیا کرو گی تم۔"

"اس کی اتنی جرات!" مشال شاکڈ سی آنکھیں پھاڑے اسے دیکھتی رہ گئی۔

"تو پکڑ لوں ہاتھ؟" وہ شرارت سے بولا۔
"شٹ اپ! میں اتنا شور مچاؤں گی۔" وہ غصے میں بولی۔
"نہیں مچا سکو گی۔ اگر مچاؤ گی تو دیکھو یہاں سڑک پر تو کوئی بھی نہیں ہے۔ میں تمہارے شور مچانے سے پہلے تمہیں اٹھا کر لے جاؤں گا پھر کیا کرو گی؟" وہ اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولا وہ تو جیسے حیرانی سے مرنے والی ہو گئی۔
"تو اب چل پڑو نا یا واقعی اٹھا کر لے جاؤں۔" یہ کہہ کر اس نے تیزی سے اس کا ہاتھ پکڑا اور اسے کھینچتا ہوا اپنے ساتھ لے گیا۔
"پلیز چھوڑیں۔ چھوڑیں میرا ہاتھ ورنہ میں۔" اس نے زندگی میں کبھی خود کو اتنا بے بس محسوس نہیں کیا تھا جتنا اس لمحے کر رہی تھی۔
اس کا نازک ہاتھ واثق کی بہت مضبوط گرفت میں تھا۔
"پلیز چھوڑیں۔" وہ آخر میں رونے لگی۔
واثق نے اسے پسنجر سیٹ پر بٹھاتے ہوئے دروازہ بند کر کے تیزی سے آکر ڈرائیونگ سیٹ سنبھال لی۔
"پلیز رونا نہیں۔ میں قسم کھا کر کہتا ہوں تمہیں اغوا کرنے کا میرا کوئی ارادہ نہیں۔" وہ اس کی بھیگتی آنکھوں کو دیکھ کر فوراً ملتجی لہجے میں بولا۔
گاڑی روانہ ہو چکی تھی اور مشال کے آنسو بھی!
"پلیز۔ دیکھو۔ تمہیں تو میرا تھینک فل ہونا چاہیے کہ میں نے تمہیں لفٹ آفر کی ورنہ اس سڑک پر اس وقت کوئی ٹیکسی ملنا آسان نہیں ہے۔" یہ کہہ کر اس نے ٹشو باکس سے ٹشو نکال کر اس کی طرف بڑھایا اور مشال کو بھی فوراً اپنی حماقت کا احساس ہوا۔
وہ کیوں بھلا ایک اجنبی کے ساتھ بیٹھی اس طرح آنسو بہا رہی ہے۔ کوئی دیکھے تو کیا سمجھے۔ اس نے جلدی سے ٹشو سے آنکھیں اور چہرہ رگڑ ڈالا۔
"شاباش۔ بات تو سمجھ میں آئی ہو گی کہ آنسو کسی بھی مسئلے کا حل نہیں ہوتے۔ ہے نا۔" وہ مسکرا کر نصیحت کرنا نہیں بھولا تھا۔
مشال خاموشی سے ٹشو کو انگلیوں میں مسلتی رہی۔ گاڑی میں کچھ دیر کے لیے خاموشی چھا گئی۔
"آپ اس اکیڈمی میں گئی تھیں۔" اس خاموشی کو بھی واثق نے ہی توڑا تھا۔
"نہیں۔" وہ مختصراً بولی۔
"کیوں؟" واثق کو جواب میں یہی کہنا تھا۔
مشال نے پورا چہرہ گھما کر اسے یوں دیکھا جیسے وہ اس کے سوال کرنے پر حیران ہوئی ہو۔
"مشال! ہم اتنی بار مل چکے ہیں تو اجنبی بالکل بھی نہیں۔ کم از کم تم تو میرے لیے بالکل بھی نہیں ہو۔" وہ رک کر اسے دیکھتے ہوئے بولا۔
"بلکہ تم میرے لیے جتنی اپنی ہو۔ مطلب محسوس ہوتی ہو۔ میں اب کچھ بھی سوچوں۔ تم میری سوچ میں کہیں نہ کہیں موجود ہوتی ہو۔" وہ جیسے خود کلامی کر رہا تھا۔ کندھے اچکا کر بولا۔
"یہ کیا کہہ رہے ہیں آپ۔" وہ کچھ بوکھلا سی گئی۔
"میں آپ کے بارے میں ایسا کچھ نہیں سوچتی۔" وہ جلدی سے صفائی دینے والے انداز میں بولی۔ وہ بے

اختیار ہنس پڑا۔
"میں نے کوئی لطیفہ نہیں سنایا۔" وہ چڑ کر بولی۔
"وہ تو میں نے سنایا ہے۔" وہ جیسے محظوظ ہو کر بولا۔
"کیا مطلب؟" وہ اسے خفا نظروں سے دیکھ کر بولی۔
"ابھی جو میری ٹیلی فونک گفتگو تھیں تمہارے متعلق وہ میں نے تم سے شیئر کی ہیں لیکن میں نے تمہیں مجبور تو نہیں کیا کہ تم بھی ایسا ہی محسوس کرو میرے بارے میں۔ لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ میں ایسا چاہتا ہوں۔" وہ ذرا رک کر اس کی طرف دیکھتے ہوئے گہری آواز میں بولا۔
"کیا؟" بے اختیار مشال کے منہ سے نکلا۔
"کہ تم میرے بارے میں بھی ایسا سوچو جیسے میں تمہارے بارے میں سوچتا ہوں۔ میری خواہش ہے یہ اور دعا بھی۔"
"پلیز آپ یہیں ڈراپ کر دیں۔ میں آگے خود چلی جاؤں گی۔" وہ ناراض لہجے میں کہنے لگی۔
"خیر ڈراپ تو اب میں آپ کو کسی صورت نہیں کر سکتا۔" وہ معنی خیزی سے بولا۔
"کیا۔ کیا کہہ رہے ہیں یہ آپ؟" وہ ایکدم پریشان سی ہو کر اسے دیکھنے لگی تو واثق بے ساختہ ہنس پڑا۔
"آپ کی کوئی دوست ہے؟" وہ اسے دیکھتے ہوئے پوچھنے لگا۔ مشال کی گردن بے اختیار نفی میں ہل گئی۔
"چچ چچ۔ کیسا اکیلا وہ شخص ہو گا اس دنیا میں جس کا کوئی ایک بھی دوست نہیں ہے۔" وہ مصنوعی تاسف بھرے لہجے میں بولا۔
"آپ مجھے یہیں ڈراپ کر دیں پلیز۔"
"مشال! ایک بات پوچھوں۔" وہ سنجیدگی سے اس کی فرمائش ان سنی کرتے ہوئے بولا۔ وہ اسے دیکھ کر رہ گئی۔
"اس رات تم اکیلی۔ بالکل اکیلی عجیب ذہنی کیفیت میں راستوں میں بھٹک رہی تھیں۔ ایسا ہی تھا نا؟" وہ اسے دیکھ کر بولا۔ مشال نظریں چرا گئی۔
"مجھے اس لمحے پتا ہے کیا ڈر لگا۔" وہ جیسے سرگوشی میں بولا۔
"مجھے لگا میں کہیں تمہیں کھو نہ دوں۔" وہ گہری نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے بولا۔
"اور جب میں نے یہ محسوس کیا تو مجھے لگا اگر ایسا ہو گیا تو شاید میں خود کو بھی کھو دوں گا۔ گم کر دوں گا خود کو بھی۔" وہ عجیب کھوئے کھوئے لہجے میں کہہ رہا تھا۔
"مجھے اقرار کرنے میں کوئی جھجک محسوس نہیں ہو رہی۔ میں واقعتاً تمہارے بارے میں بہت سنجیدہ ہوں۔" وہ گمبھیر لہجے میں کہہ رہا تھا۔
"اگر بابا نے مجھے اس اجنبی کے ساتھ جو اس وقت مجھ سے ایسی باتیں کر رہا ہے۔ جو میرے دل کے تار ہلائے جا رہا ہے، دیکھ لیا تو وہ میرے بارے میں کیا سوچیں گے۔ کم از کم انہیں عفت ماما کی سب باتیں جو وہ میرے بارے میں اس رات کہہ رہی تھیں بالکل سچ لگنے لگیں گی اور میں اعتبار کھو بیٹھوں گی۔"
وہ بابا کا اعتبار کھو دے گی اس خیال سے اس کا دل بند ہونے لگا۔
"پلیز گاڑی روکیں یہیں۔" اس نے ایکدم سے اس کے اسٹیئرنگ پر رکھے ہاتھ پر زور سے اپنا ہاتھ رکھ دیا۔
"روکیں۔" وہ زور سے چیخی تھی۔
واثق نے ایکدم گھبرا کر گاڑی روک دی اور اس سے پہلے وہ اس سے وجہ پوچھتا وہ تیزی سے اپنی طرف کا

دروازہ کھول کر باہر نکل گئی۔

"مشال پلیز میری بات تو سنو۔" وہ اسے پکارتا رہ گیا۔ وہ وہ بنا ٹھیک کرتی تیزی سے سڑک کے دوسری طرف چلی گئی۔

"پتا نہیں میں اس ابھی دور جیسی لڑکی کو کبھی سمجھ بھی پاؤں گا یا نہیں۔ جو قریب آتی ہے اور ایکدم سے دور بہت دور چلی جاتی ہے کہ مجھے لگتا ہے یہ پھر مجھے کبھی نہیں ملے گی۔"

وہ افسردہ سا اس خالی راستے کو دیکھتے ہوئے سوچتا چلا گیا 'جہاں کچھ دیر پہلے مشال مڑ گئی تھی۔ اس نے گہرا سانس لیتے ہوئے گاڑی اسٹارٹ کرنے کے بعد گیئر کی طرف ہاتھ بڑھایا اور ٹھٹک گیا۔

مشال کا موبائل فون سیٹ کے پاس نیچے گرا ہوا تھا تو وہ بے اختیار مسکرا اٹھا۔

"تو ملنے کا بہانہ تو وہ چھوڑ گئی۔ اب تو وہ مجھ سے ضرور ملے گی۔" وہ سیل فون ہاتھ میں لے کر دیکھتے ہوئے سوچنے لگا۔

"اور اب مجھے اسی سے بات کرنا ہو گی مشال کے بارے میں۔ ایسا نہ ہو کہ وہ خدانخواستہ مجھ سے بچھڑ جائے 'کھو جائے میرا وہم حقیقت نہ بن جائے۔" وہ سر جھٹک کر گاڑی ڈرائیو کرنے لگا۔

☆ ☆ ☆

مشال اپنا بیگ پورا الٹ کر سب چیزیں دیکھتے ہوئے موبائل فون ڈھونڈ رہی تھی۔

کتابیں الٹ پلٹ کر دیکھ لیں۔ بیگ سارا چھان لیا۔

"کہاں گیا میرا موبائل۔" وہ پریشان ہو کر سوچنے لگی۔

"کہیں وہ اس واثق کی گاڑی میں تو نہیں گر گیا کیونکہ روڈ پر چلتے ہوئے تو وہ میرے ہاتھ میں ہی تھا۔ گاڑی میں بیٹھی تو بھی میرے پاس تھا۔ ہاں۔ یقیناً" وہیں اس کی گاڑی میں رہ گیا ہو گا۔" وہ سر پکڑ کر سوچتی چلی گئی۔

"اب اس سے واپس کیسے لوں گی۔ مجھے اس کا گھر ٹھکانا کچھ بھی تو معلوم نہیں۔" وہ مضطرب سی چیزیں واپس بیگ میں رکھتے ہوئے سوچنے لگی۔

"لائبریری تو وہ جاتا ہو گا۔ مگر ریگولر نہیں۔ کل شام کو وہ وہاں نہیں تھا۔" وہ موبائل لینے کے طریقے سوچنے لگی۔

"تم آج واپسی میں کس لڑکے کی گاڑی میں بیٹھ کر گھر آئی ہو مشال؟" اگر اس کے قریب آ کر کوئی بم پھوڑتا تو مشال کو اتنی حیرت نہ ہوتی جتنی اسے عفت کی اس اچانک بات سے ہوئی۔ وہ اس کے سر پر کھڑی بہت جارحانہ انداز میں پوچھ رہی تھی۔ پری اس کے پیچھے کھڑی تھی۔

"اب یہ مت کہنا کہ میں گپ مار رہی ہوں یا یہ میرا وہم ہے۔ ایسا کچھ بھی نہیں تھا۔" وہ مشال کی گمبھیر چپ پر بڑے طنزیہ لہجے میں بولی۔ مشال کچھ بول ہی نہیں سکی۔

"مما! میری دوست فریال نے خود دیکھا مشال آپی کو کسی لڑکے کی گاڑی میں جاتے ہوئے۔ اس نے مجھے فون کر کے فوراً" بتایا ہے۔" مشال کو پری کی بات پر معاملہ سمجھ میں آگیا۔

"جی اس میں جھوٹ تو واقعی کچھ نہیں ہے۔ وہ میری کلاس فیلو ایمان کا بھائی تھا۔ اس نے مجھے باہر مین روڈ پر ڈراپ کیا تھا کیونکہ وین والے انکل نے واپسی پر نہیں آنا تھا اور میں نے پری سے کہا تھا کہ وہ مجھے واپسی پر اپنی وین میں ساتھ لے جائے لیکن اس نے انکار کر دیا۔ پوچھ لیں آپ اس سے۔" وہ پہلے کی طرح کمپوزڈ لہجے میں بولی۔

جس سے عفت کو چڑ تھی۔

بہت پہلے جب مشال عفت کے سرد چہرے اور غصیلی آنکھوں سے سخت خوف زدہ ہو کر کانپتی آواز میں اس کی کسی کسی بات کا جواب دیا کرتی اور کسی پر بالکل کھسیا کر خاموش رہتی تو عفت کو بڑی کمینی سی خوشی ملتی تھی۔ مگر اب کچھ مہینوں سے وہ بہت بے نیاز لاتعلق سے لہجے میں عفت سے بات کرنے لگی تھی۔ جس سے صاف لگتا تھا کہ اسے عفت کی باتوں کی اس کی دہشت کی ذرا بھی پروا نہیں۔

"ہاں تو میں کیوں لے کر آتی ساتھ۔ ہماری کلاسز تھیں۔ پھر ہماری وین میں ایک بھی سیٹ خالی نہیں ہوتی۔" پری فوراً" جتانے والے انداز میں بولی۔

"لیکن اس کا یہ مطلب بھی نہیں کہ تم کسی بھی ایرے غیرے کے ساتھ گاڑی میں بیٹھ کر لفٹ لے لو۔" عفت رعب بھرے انداز میں بولی۔

"کیا تم نے اپنے باپ سے اس بات کی اجازت لے رکھی ہے۔" وہ جو تس جتانے والے لہجے میں بولی۔

"کیا آج گھر میں کھانے کے لیے کچھ نہیں ملے گا۔ جب بھی آؤ یہاں کوئی نہ کوئی ایشو چل رہا ہوتا ہے۔ سب کمرے کسی نہ کسی بحث میں الجھ رہے ہوتے ہیں۔ کیا میں ہوٹل سے کھا کر آیا کروں۔" واثق بہت اونچی آواز میں کمرے کے باہر کھڑے ہو کر چیخا تھا۔

"ارے نہیں 'نہیں۔ کچھ بھی نہیں میں تو ابھی کچن میں ہی تھی تم دیر سے آئے ہو۔ چلو میں نکالتی ہوں تمہارے لیے کھانا میں نے تمہارے انتظار میں کھایا بھی نہیں تھا ابھی تک۔" عفت بے اختیار لجاجت بھرے انداز میں کہتے ہوئے مشال کو بھول کر واثق کے ساتھ باہر نکل گئی۔ وہ اس کے ساتھ جاتے ہوئے بھی مسلسل خوشامدی لہجے میں بول رہی تھی۔

"اور اگر میں مما کو بتا دیتی کہ تمہاری دوست ایمان کا کوئی بھائی نہیں ہے نہ اس کے پاس گاڑی تو!" پری اس کی الماری کھول کر دیکھتے ہوئے بولی۔

"ضرور بتاؤ۔ بلکہ ابھی بھی دیر نہیں ہوئی۔ تم کچن میں جا کر بتا سکتی ہو۔ تمہیں کسی نے یہ نہیں بتایا کہ بغیر اجازت کسی کی یوں تلاشی لینا گھٹیا پن ہے۔" اس نے الماری آگے بڑھ کر بند کرتے ہوئے طنزیہ لہجے میں کہا تو پری لمحہ بھر کو اس کے اس انداز پر حیران سی ہو گئی۔

"صرف ایک ملاقات کا اتنا اثر۔ اتنا اعتماد!" وہ طنز کرتے ہوئے بولی مشال کا چہرہ سرخ ہو گیا۔

"تمہیں اگر کچھ اور بات نہیں کرنی تو تم چلی جاؤ یہاں سے۔" وہ منہ پھیر کر بے رخی سے بولی۔

"اور اگر میں نہیں جاؤں تو؟" وہ بھی ضدی لہجے میں بولی۔ مشال نے ایک طرف پڑے اپنے کپڑے تہ کرنے شروع کر دیے۔ انداز ایسا تھا جیسے کہہ رہی ہو 'بھلے رات تک بیٹھی رہو۔ پری کچھ لمحے کھڑی رہی پھر تلملاتی وہاں سے چلی گئی۔

اور اگر انہوں نے یہ بات پاپا کو بتا دی اور انہوں نے بھی مجھ سے پوچھ لیا۔ تو میں ان کے سامنے خود کو بے نیاز نہیں ظاہر کر سکوں گی کبھی بھی۔ پتا نہیں پاپا کے سامنے مجھے کیا ہو جاتا ہے۔ میرے سارے حوصلے ڈھے جاتے ہیں۔ میں وہی سات آٹھ سال کی مشال بن جاتی ہوں 'جسے صرف اور صرف ان کی محبت اور بے تحاشا پیار کی عادت تھی۔ وہ ان کے اس اجنبی روپ کو دیکھتے ہی خود پر سے ضبط کھو دیتی ہے۔

پاپا اگر پہلے کی طرح نہ سہی نارمل لہجے میں جس میں میرے لیے اعتماد ہو 'بات کر لیا کریں تو مجھے لگے گا میں زندگی میں کامیاب ہو گئی ہوں۔ اگر میں پاپا کا اعتماد جیت لوں۔ لیکن عفت مما اور پری کی موجودگی میں یہ آسان

نہیں اور مما نے اتنے دنوں سے مجھے فون بھی نہیں کیا۔ پوچھا بھی نہیں میرے بارے میں۔
اور میرا فون اس کے پاس ہے۔ اگر مما کی کال آگئی تو۔" وہ ایک دم بے چین ہو کر کھڑی ہو گئی۔
"مجھے مما سے پوچھ کر لائبریری جانا چاہیے۔ اللہ کرے وہ وہاں آجائے۔" وہ بے چین سی باہر نکل گئی۔



"عدیل!" عفت کچھ شاکڈ سی عدیل کو دیکھنے لگی۔
"اس میں اتنا حیرت زدہ ہونے کی کیا بات ہے؟" عدیل سرسری نظر اس کے چہرے پر ڈال کر بولا۔
"ابھی... میرا مطلب ہے وہ ابھی پڑھ رہی ہے۔" وہ ذرا سنبھل کر بولی۔
"اس کے ایگزام تک بات چیت اور دوسرے معاملات طے ہو جائیں گے۔ ایگزام کے فوراً بعد شادی۔" وہ جیسے سب کچھ طے کر چکا تھا۔ مطمئن لہجے میں بولا۔
عفت کچھ بول ہی نہ سکی۔
"میں بہت ڈر گیا تھا عفت! اس رات جب مشال بغیر بتائے گھر سے چلی گئی تھی میں نے اسی وقت فیصلہ کر لیا تھا۔ میں جلد سے جلد مشال کی شادی کر دوں گا۔" وہ سوچ سوچ کر بولا تو عفت کو وجہ سمجھ میں آگئی۔
"اور پھر وقار میرا بہت اچھا پرانا دوست ہے۔ بہت سال وہ لوگ امریکہ میں سیٹل رہے۔ اس کا بیٹا گولڈ میڈلسٹ انجینئر ہے۔ بہت اچھی فیملی ہے۔ اکلوتا بیٹا اور اتنا قابل۔ فائزہ بھابھی بھی بہت محبت کرنے والی رکھ رکھاؤ والی خاتون ہیں۔ فہد کے پاس تو وہاں کی نیشنلٹی بھی ہے۔ ہماری مشال ان شاء اللہ بہت خوش رہے گی۔ میں ایسا ہی رشتہ تو اس کے لیے چاہتا تھا۔" عدیل بہت خوش بہت مطمئن تھا۔
اور عفت کو لگا آگ کا کوئی جھلسا دینے والا شعلہ تھا جس نے یک لخت سر تا پا اسے جھلسا کر رکھ دیا ہو۔
"ایسی اچھی قسمت اس مشال کی ہو کیا میں یہ چاہوں گی۔ ارے وہ اپنے ماں باپ کی آنکھ کا تارہ بنی رہی اور اب جا کر شوہر اور سسرال والوں کی لاڈلی۔ کبھی نہیں۔"
وہ مٹھیاں بھینچے سوچ رہی تھی۔
"کل شام میں آئیں گے وہ لوگ۔ جسٹ فارملیٹی ہو گی۔ سب کچھ تو سمجھو ڈن ہے۔ کل ہی وہ لوگ رسم ڈال دیں گے اور فہد کے اگلے مہینے پاکستان آنے پر منگنی وغیرہ یا نکاح ہو جائے گا اور چار ماہ بعد شادی۔ تم سن رہی ہو ناں۔"
اتنی دیر تک عفت بھی چپ نہیں رہی تھی۔ عدیل اس کی لمبی چپ پر بولا۔
"ہوں... جی سن رہی ہوں۔" وہ بہت مشکل سے بول سکی تھی۔
"اور سب سے اچھی بات کہ وہ لوگ ڈیمانڈنگ بھی نہیں ہیں۔ انہیں جہیز وغیرہ کچھ نہیں چاہیے بلکہ سخت خلاف ہیں وہ جہیز کے لیکن خیر ابھی ہم اپنی مشال کو خالی ہاتھ تو رخصت نہیں کریں گے بہت کچھ سوچ لیا ہے میں نے تو۔" وہ تو اپنی ہی دھن میں کہے جا رہا تھا۔ بہت عرصے بعد عفت نے عدیل کو اتنا خوش اتنا مسرور دیکھا تھا۔
"ہماری مشال کوئی معمولی لڑکی نہیں ہے اور مجھے یقین تھا۔ میرے اللہ نے اس کی قسمت بھی بہت خاص بنائی ہوگی۔ عفت! مجھے لگ رہا ہے جیسے آج میں ہلکا پھلکا ہو گیا ہوں۔ میرے دماغ پر دل پر جو اتنے دنوں سے بوجھ تھا سب اتر گیا۔" وہ عفت کی طرف دیکھ بھی نہیں رہا تھا۔
"سچ پوچھو بشریٰ! مجھ پر جو یہ ذمہ داری ڈال گئی تھی۔ شروع میں تو میں بہت گھبرا گیا تھا۔ ظاہر ہے بیٹی کا معاملہ اور اس کو بیاہنا پھر آج کل جو سچویشن اچھے رشتوں کے معاملے میں چل رہی ہے۔ تھینک گاڈ!"

عفت تو جیسے پتھر کا بت بنی بیٹھی تھی۔
"میں نے وقار اور فائزہ بھابھی کو شام پانچ بجے کا ٹائم دیا ہے لیکن کچھ تیاری تو پہلے آکر کرنا ہو گی۔ کیا خیال ہے تمہارا۔" وہ اس کی ہم نوائی کو بولا۔
"جی... بالکل۔" وہ کسی معمول کی طرح سر ہلا کر مزید کچھ کہے خاموشی سے باہر نکل گئی۔ عدیل ریموٹ اٹھا کر ٹی وی دیکھنے لگا۔
"کیا کروں میں۔ وہ واثق تو لائبریری بھی نہیں آیا۔ میرا فون۔" وہ سخت پریشان سی پچھلے صحن میں ٹہل رہی تھی۔
ہاتھ میں کتاب تھی مگر پڑھنے کی طرف بالکل دھیان نہیں تھا۔



"اس کی قسمت بھی اس کی ماں جیسی شان دار ہو گی۔ پہلے ایک شان دار شوہر ملا۔ جو ابھی تک اس کے ہجر و فراق میں راتوں کو اٹھ اٹھ کر آہیں بھرتا ہے اور پھر دوسرا امیر کبیر شوہر جو اسے ہر عیش اور آرام دیتے ہوئے ملکوں ملکوں گھوم رہا ہے اور اب ایسی ہی قسمت اس کی بیٹی کی۔
کہتے ہیں ناکہ بیٹی کی قسمت بھی ماں جیسی ہوتی ہے۔ اس کی قسمت اپنی ماں جیسی اور میری پری کی۔ ایک برتا ہوا مرد۔ جس کے استعمال شدہ دل میں میرے لیے نہ کوئی جذبہ تھا نہ احساس۔
صرف گھر کو اس کی بچی کو سنبھالنے والی ایک دوسری عورت کی ضرورت!
اسی ضرورت سے ہم دونوں آج تک بندھے ہوئے ہیں۔
محبت تو ہمارے درمیان کبھی رہی نہیں۔ کبھی عدیل نے اس محبت سے میرا ہاتھ نہیں تھاما جس محبت سے وہ ابھی بھی بشریٰ کو سوچتا ہے۔ اس کے دل میں ابھی بھی وہی ہے۔ میں تو صرف گھر میں ہوں گھر کے دوسرے سامان کی طرح!
اور جس طرح وہ مشال کے لیے پریشان تھا اس نے ایک بار بھی پری کا ذکر نہیں کیا۔ بھلے دونوں کی عمروں میں سات آٹھ سال کا فرق ہے مگر دیکھنے والے تو یہی کہتے ہیں پری بڑی ہے مشال سے۔ اور باپ کو جب اتنا شان دار رشتہ مل رہا تھا تو کیا اسے ایک لمحے کے لیے بھی پری کا خیال نہیں آیا۔
غلطی میری ہے مجھے عدیل کو احساس دلانا چاہیے تھا کہ اگر رشتہ ایسا اچھا ہے تو پہلا حق پری کا ہو گا۔
وہ صحن میں ٹہل ٹہل کر کتاب پڑھتی مشال کو دیکھتے ہوئے سوچے جا رہی تھی۔
اس مشال کو تو اور بھی دس مل جائیں گے لیکن یہ اتنا شان دار پروپوزل صرف میری پری کے لیے ہونا چاہیے۔ میں اب سب کچھ قسمت پر چھوڑ کر نہیں بیٹھ سکتی کہ پری کی شکل اچھی ہے تو قسمت بھی اچھی ہو گی۔ مجھے اپنی بچی کی قسمت خود بنانی ہو گی۔ دیکھتی ہوں مشال کیسے میری بچی کا حق چھینتی ہے۔" وہ زہریلی نظروں سے مشال کو دیکھ رہی تھی۔



وہ سیل فون ہاتھ میں لیے اس میں موجود کال لاگ دیکھ رہا تھا۔
"او! اس میں گھر کا لینڈ لائن نمبر بھی موجود ہے۔" وہ چونکتے ہوئے سوچنے لگا۔
"لیکن اگر فون کسی اور نے اٹھایا تو... مشال کا نام لے کر میں اسے بلا بھی نہیں سکتا۔" وہ متذبذب سا سوچتے

لگا۔

"وہ نہیں مجھے بے صبرا پن نہیں دکھانا چاہیے۔ کل اس کے کالج کے باہر جا کر اسے فون لوٹا دینا چاہیے۔" اس نے اپنے سیل پر نمبر ڈائل کرتے ہوئے رک کر سوچا۔

"ایک بار کوشش کرنے میں کیا حرج ہے۔ ہو سکتا ہے فون مثال اٹھائے۔" بے قرار دل کو قرار نہیں آ رہا تھا' اس نے نمبر ڈائل کر لیا۔

مثال فون کے پاس سے گزرتے ہوئے اپنے کمرے کی طرف جا رہی تھی فون کی بیل پر چونک کر رک گئی۔

سب اپنے کمروں میں سونے کے لیے جا چکے تھے۔

سب ڈسٹرب نہ ہوں فون کی آواز سے اس نے یہ سوچ کر ریسیور اٹھا لیا۔

دوسری طرف خاموشی تھی۔

"ہیلو!" مثال کو جھلا کر بولنا پڑا۔

"ہیلو۔ بھئی بات کریں فون کس لیے کیا تھا۔" وہ کہہ کر فون بند کرنے لگی تھی کہ بے اختیار رک گئی۔

"میں کل کالج کے گیٹ کے باہر آپ کا فون دینے کے لیے آ رہا ہوں۔ میرا انتظار کیجئے گا۔" واثق مثال کی آواز پہچان کر آہستگی سے بولا۔

"اور وہ جو ساری شام میں نے لائبریری میں آپ کا انتظار کیا۔ وہ کیا۔ مجھے پاگل سمجھ رکھا ہے آپ نے۔" وہ ایکدم سے غرا کر بولی۔

"کیا۔ اوہ میرے خدایا! یہ کیا غضب ہو گیا۔ لائبریری میں میرا انتظار ہو رہا تھا اور میں بدنصیب فیکٹری کے بیکار حساب کتاب میں الجھا ہوا تھا۔ میری بدقسمتی اور کیا کہوں میں اس کو۔" وہ ٹھنڈی آہیں بھرتا ہوا بولا۔

"پلیز مجھے فون چاہیے میرا۔" وہ تیز لہجے میں بولی۔

"تو ابھی آ جاؤں۔ یہ پاس میں تو میرا گھر ہے۔ پانچ منٹ کی پیدل واک پر۔ آپ بھی باہر آ جائیں۔ تھوڑی واک کر لیں گے اور گپ شپ بھی۔" وہ بے تکلفی سے فوراً ہی بول اٹھا۔

"شٹ اپ! کل شام کو پانچ بجے لائبریری میں۔" خدا حافظ کہہ کر تیزی سے اندر چلی گئی۔

اس کے دل کی دھڑکنیں عجیب بے ہنگم انداز میں منتشر ہو رہی تھیں۔

"یہ کیا ہو رہا ہے مجھے اور میں کیوں دعائیں کر رہی تھی کہ کسی طرح اس سے بات ہو جائے۔ اس کی آواز سن لوں اور اس کی آواز سن کر میرے دل کی جو حالت تھی۔ نہیں نہیں مجھے ایسی باتیں نہیں سوچنی چاہیے۔" وہ بے قراری کمرے میں ٹہلنے لگی۔

میں جتنا اس سے دور بھاگنا چاہتی ہوں۔ حالات مجھے اس کے پاس لے آتے ہیں۔ جیسے وہ کہتا ہے کہ قسمت ہمیں یونہی راستوں میں نہیں ٹکراتی۔ کوئی مقصد ہے قدرت کا۔

اُف! میں یہ فضول باتیں کیوں سوچے جا رہی ہوں۔ مجھے اس کے بارے میں کچھ بھی نہیں سوچنا۔ صرف کل آخری بار اس سے مل کر اپنا موبائل فون لے کر آنا ہے۔ پھر میں اس سے کبھی نہیں ملوں گی۔" وہ دل میں ارادہ باندھنے لگی۔

"کبھی نہیں؟" اس کے دل نے بہت معصومیت سے فریادی انداز میں سوال کیا تھا۔ وہ بے اختیار مسکرا کر نہ چاہتے ہوئے بھی اسے سوچنے لگی۔

☼ ☼ ☼

"کیا واقعی۔ واثق! تم سچ کہہ رہے ہو۔" عاصمہ نے بے یقینی کے ساتھ واثق کی طرف دیکھتے ہوئے سرشار سے لہجے میں کہا۔

وہ مسکراتے ہوئے اثبات میں سر ہلانے لگا۔

عاصمہ آنکھوں میں چمک لیے اسے دیکھے جا رہی تھی۔

"اُف مما! ایسے کیا دیکھے جا رہی ہیں۔ میں نے تو بس یونہی ایک بات کی ہے آپ سے۔" وہ اس کے یوں دیکھنے پر بے اختیار جھینپ گیا تھا۔ عاصمہ بے ساختہ اپنی جگہ سے اٹھ کر اس کا ماتھا چومنے لگی۔ اس کا چہرہ دونوں ہاتھوں میں لے کر محبت بھری نظروں سے دیکھتے ہوئے مسکراتی رہی۔

"تمہیں نہیں پتا اس ایک دن کا ارمان اس کی خواہش ایک بیٹے کی ماں کے دل میں ٹھیک اسی دن سے جگہ بنا لیتی ہے، جب وہ بیٹے کی ماں بنتی ہے اور تم نے تو جیسے مجھے نہال ہی کر دیا یہ بات کر کے کہ تم کسی کو پسند کرتے ہو اور واثق میری جان! یقین کرو میرے دل کو ایسا اطمینان ہوا، ایسا بھروسہ ہے تم پر، تمہاری پسند پر، تمہارے انتخاب پر، میں جانتی ہوں تم بھی غلط ہو ہی نہیں سکتے۔ وہ لڑکی دنیا کی بہترین لڑکی ہوگی جسے میرے بیٹے نے پسند کیا۔ بہت زیادہ خوش ہوں میں۔" عاصمہ تو جذباتی پن میں اس کا چہرہ ہاتھوں میں لیے بولتی چلی گئی۔

واثق کچھ اور بھی جھینپ گیا۔ آہستگی سے عاصمہ کے دونوں ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر چومنے لگا۔

"مما پلیز! اتنی بڑی بڑی امیدیں نہ لگائیں۔ پہلے آپ اسے دیکھیں تو اور ویسے تو میرا ابھی دل کہتا ہے کہ وہ آپ کو بہت پسند آئے گی لیکن پھر بھی مما! میرے لیے آپ کی پسند آپ کی مرضی بہت زیادہ اہم ہے۔ آپ اس سے ملیں گی اسے دیکھیں گی، پسند کریں گی۔" وہ مسکراتے ہوئے سنجیدہ لہجے میں بولا۔

عاصمہ ابھی بھی محبت سے اسے دیکھتی جا رہی تھی۔

"ابھی چلیں۔" وہ شوخے پن سے بولی۔

واثق بے اختیار ہنس پڑا۔ عاصمہ کے چہرے پر خفگی سی آ گئی۔

"مما! ابھی تو میں فیکٹری جا رہا ہوں۔ شام میں ذرا جلدی آ جاؤں گا تو پھر آپ کو لے چلوں گا۔ صبح صبح تو میرے خیال میں کوئی بھی لڑکی دیکھنے نہیں جاتا۔" وہ ماں کو چھیڑنے والے انداز میں بولا۔

"بے وقوف ہم نے لڑکی دیکھنے تھوڑی جانا ہے۔ میں نے تو اسے شگن ڈالنے جانا ہے بلکہ میں۔ ابھی تھوڑا ٹائم نکال کر جیولر کی طرف سے ہو آتی ہوں۔ ایک اچھی سی انگوٹھی لے آتی ہوں۔ کیا خیال ہے واثق!" وہ سنجیدگی سے کہہ رہی تھی اور واثق نے پھر ہنسنا شروع کر دیا۔

"تم میرا مذاق اڑا رہے ہو کہ میں سٹھیا گئی ہوں۔" وہ خفگی سے بولی۔

"نہیں تو بالکل بھی نہیں اور مما بھی بنتا ہے کہ لڑکی کو پہلی بار دیکھنے کے لیے جائیں اور انگوٹھی پہنا آئیں۔ آپ بھی ناں بس۔" وہ ہونٹوں کا کونا دبا کر ہنسی روک رہا تھا۔

"اچھا تمہیں بڑا تجربہ ہے لڑکیوں کو جا کر دیکھنے کا۔ میں تو آج پہلی بار جاؤں گی۔ کون سا میرا کوئی تجربہ ہے یوں لڑکیاں دیکھنے کا۔ تمہاری بہنوں کا خیر سے اللہ کے کرم سے اتنی آسانی سے رشتہ شادی سب ہو گیا، دیکھنے دکھانے کی نوبت ہی نہیں آئی۔ اللہ تعالیٰ تم دونوں بہن بھائی کے معاملات بھی اسی طرح نمٹا دے تو پھر سمجھو میرے تو اس دنیا میں سارے فرائض تمام ہوئے۔ حج کروں گی اور پھر اللہ اللہ۔ تم جانو اس گھر کے معاملات کو اور تمہاری بیوی۔"

عاصمہ نے لمحوں میں سارا سلسلہ ہی پلان کر ڈالا۔

واثق پھر ہنس پڑا۔ اسے عاصمہ پر بے اختیار پیار آیا تھا۔

"میری بھولی سی مما! یوں تھوڑی ہوتا ہے۔ بہو آئے گی۔ کچھ برتن ٹوٹیں گے تھوڑی لڑائیاں ہوں گی۔ کچھ سازشیں ہوں گی پھر۔" وہ ماں کو چھیڑ رہا تھا۔

"خبردار تم نے اس سے آگے ایک لفظ بھی کہا تو۔ میں سچ میں تمہیں مار ڈالوں گی۔" وہ اسے ناراضی سے وارن کرتے ہوئے بولی۔

"او کے بالکل نہیں۔" وہ کان پکڑ کر بولا۔

"تمہاری بات چیت تو ہو گی واثق اس لڑکی سے؟" وہ کچھ دیر بعد سنجیدگی سے پوچھ رہی تھی۔

واثق نا سمجھی سے ماں کو دیکھ کر رہ گیا۔ اب جانے وہ کیا پوچھنا چاہ رہی تھیں۔

"میرا مطلب ہے لڑکی کے گھر پیغام آئی میں ایویں تو اٹھ کر کسی کے گھر نہیں چلے جاتے۔ تھوڑا بہت اس کے پیرنٹس کے نالج میں ہونا چاہیے کہ آنے والے لوگ کیوں آئے ہیں تو وہ بھی تھوڑا ذہنی طور پر تیار ہوتے ہیں۔" عاصمہ اسے سمجھانے والے انداز میں بولی تو واثق سوچ میں پڑ گیا۔

"کیا ہوا تم نے جواب نہیں دیا۔" عاصمہ اسے خاموش دیکھ کر بولی۔

"مما! ابھی تو رابطہ نہیں ہے۔ تو آج ہم یونہی چلے جاتے ہیں نا مطلب بس یونہی ملنے۔ آپ" وہ کچھ سوچنے لگا۔

"آپ کہہ دیجیے گا کہ وہ آپ کی اسٹوڈنٹ رہ چکی ہے تو آپ اس سے ملنے آئی ہیں۔" وہ چٹکی بجا کر جیسے مسئلہ حل کرتے ہوئے بولا۔ عاصمہ اسے گھورنے لگی۔ "کیا کچھ غلط کہہ دیا میں نے۔" وہ ماں کے یوں دیکھنے پر جلدی سے بولا۔

"بے وقوف ابھی ٹیچر بھی اپنے اسٹوڈنٹ سے یونہی ملنے جاتے ہیں۔" عاصمہ چڑے ہوئے انداز میں بولی۔

"تو پھر کیا کریں؟" واثق پریشان ہو کر بولا۔

"بیٹا! اسپیل اس کی مدر سے بات کر لیتے ہیں۔ میں کر لیتی ہوں۔ تم مجھے اس کا نمبر دو۔" عاصمہ رک کر بولی۔

واثق ماں کو دیکھتے ہوئے نفی میں سر ہلانے لگا۔

"کیا مطلب! نمبر نہیں ہے تمہارے پاس۔"

"وہ تو ہے۔ ایکچوئلی مما! اس کی مدر اس کے فادر۔ معلوم نہیں اس طرح ہمارے جانے سے کیا مطلب لیں۔ کہیں اس نے مثال نے کالج میں اس نے میرے ساتھ کوئی افیئر چلا رکھا ہے تو وہ شاید اس سے ناراض ہو جائیں اسی بات پر۔ کوئی اور ریزن سوچیں جس میں انہیں ایسا کوئی شک نہ ہو کہ میں مثال کو پہلے سے جانتا ہوں اور اس وجہ سے ہم آئے ہیں۔" وہ رک رک کر ماں کو سمجھانے والے انداز میں کہہ رہا تھا۔

عاصمہ بھی سوچ میں پڑ گئی۔

"خیر ابھی تم فیکٹری جاؤ لیٹ ہو رہے ہو۔ میں اس دوران کچھ سوچ لیتی ہوں۔ تمہاری بات ٹھیک ہے۔" عاصمہ سر ہلاتے ہوئے کہہ کر اٹھ کر اندر چلی گئی۔

☼ ☼ ☼

"مگر کیوں۔" مثال حیرت بھرے انداز میں عفت کو دیکھنے لگی۔

"تمہارے پاپا کہہ کر گئے ہیں۔" وہ سپاٹ سے لہجے میں بولی۔

آج عفت کی بیگانگی مثال سے کچھ زیادہ بڑھ کر تھی۔ وہ اس کی طرف دیکھ بھی نہیں رہی تھی۔
میکانکی انداز میں ناشتے کے خالی برتنوں کو ڈائننگ ٹیبل سے سمیٹ رہی تھی۔
"مگر کالج کیوں نہیں جاؤں۔ کوئی کام ہے آپ کو مجھ سے گھر میں۔" وہ عفت کے مختصر جواب سے مطمئن نہیں ہوتی تھی۔ سو کچھ اور بھی الجھ کر بولی۔
"بی بی! میں پہلے کون سے تم سے مل جوتی ہوں جو آج اپنے کسی کام کے لیے تمہیں کالج سے چھٹی کے لیے بولوں گی۔" وہ ایک دم جیسے ڈپٹ کر بولی۔
حالانکہ روز صبح کالج جانے سے پہلے پورے گھر میں بکھری ہوئی چیزیں سمیٹنا اب کچھ درست حالت میں رکھنا ڈسٹنگ کرنا کچن کی صفائی ناشتے میں عفت کی مدد کرنا اب مثال کی روز کی ڈیوٹی میں شامل تھا اور جس دن صفائی والی ماسی کے نہ آنے کا امکان ہوتا اس روز اور بھی جلدی اٹھ کر گھر کی صفائی بھی کرنا پڑتی تھی اور آج عفت کیسے اکھڑے ہوئے لہجے میں کہہ رہی تھی اسے مثال کے کام سے کوئی مطلب نہیں۔
مثال دکھ سے اسے دیکھ کر رہ گئی۔ خیر یہ دکھ تو کوئی نئی بات نہیں تھی۔
"مما! آج میرا اکنامکس کا بہت اہم ٹیسٹ ہے۔" وہ عفت کے پیچھے پیچھے کچن میں آتے ہوئے بولی۔
"تو اپنے باپ کو فون کر کے بتا دو۔" وہ سنک میں برتن پٹختے ہوئے مڑ کر اس کی طرف دیکھے بغیر بولی۔
"شام میں تمہیں دیکھنے کچھ لوگ آرہے ہیں۔ سمجھنے کیا سمجھو معاملہ طے ہو چکا ہے۔ شام کو صرف فارملیٹی ہوگی۔" وہ کچھ دیر بعد اسی بیگانے پن سے اسے اطلاع دیتے ہوئے بولی۔
"کون سا معاملہ؟" مثال کے سر کے اوپر سے عفت کی بات گزر گئی۔ عفت نے ہاتھ میں پکڑی پلیٹ زور سے سنک میں پٹخی۔
"اتنی معصوم نہیں ہو تم۔ تمہاری ماں یہاں تمہیں جس مقصد کے لیے ڈال گئی تھی۔ وہ پورا ہونے جا رہا ہے۔ فون ملا کر بتا دو اپنی جادوگرنی ماں کو۔ خود نکل گئی جان چھڑا کر مصیبت ساری ہمارے گلے ڈال گئی۔ جیسے ہم تو خدانخواستہ بے اولاد ہیں نا ہماری اپنی کوئی ذمہ داری ہے ہی نہیں۔" عفت سخت غصے اور ملال میں تھی۔
مثال ساکت سی کھڑی اسے دیکھتی رہی۔
"اب جاؤ یہاں سے۔ کہیں جانا ہے تو جاؤ۔ یوں میرے سر پر سوار ہو کر کھڑی مت ہو۔ اپنے ہی گھر میں آزادی سے سانس لینا محال ہو گیا ہے ہمارا تو۔" وہ سخت نفرت سے بولی۔
اور مثال کا جی چاہا وہ یہیں کھڑے کھڑے زمین کے اندر چلی جائے اس نے آنسو پی لیے۔
یوں بھی اب اسے آنسو پینے کی پریکٹس ہو چلی تھی۔ مرے مرے قدموں سے واپس مڑ گئی۔
"مہمان کون سے آنے والے ہیں اور معاملہ کون سا ہے صرف فارملیٹی ہوگی۔" وہ ڈائننگ ٹیبل کے پاس بیٹھ کر الجھی ہوئی خود ہی یہ گتھی سلجھانے لگی۔
"پاپا سے فون کرنے پوچھوں۔ وہ یہ بات مجھ سے خود بھی کہہ کر جا سکتے تھے کہ میں آج کالج نہیں جاؤں لیکن انہوں نے تو مجھ سے بات کرنا ہی ختم کر رکھا ہے۔ عجیب طرح سے وہ ناراض ہیں مجھ سے۔" وہ دل گرفتگی سے سوچے جا رہی تھی۔
"اور میرے پاس موبائل فون بھی نہیں ہے میں مما کو میسج کرتی کہ وہ مجھے فون کریں۔" وہ بے بسی سے سوچنے لگی۔
"لیکن نہیں۔ میں کیوں کہوں ان سے کہ وہ مجھے فون کریں۔ انہیں خود تو میرا خیال نہیں۔ جب پاس تھی تب

انہیں میری پروا نہیں تھی اب تو میلوں کے فاصلے ہیں۔" وہ نم آنکھوں سے سوچتی چلی جا رہی تھی۔
"تمہارے ابا نے گھر میں دس ملازم نہیں رکھے ہوئے جو یوں مزے سے ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھی ہو ملکہ پکھراج جی! اٹھ کر گھر کے کام کرو۔ پہلے ڈرائنگ روم دیکھ لو۔ اس کے پردے بدلنے ہیں اور کشنز کے کور بھی۔ ماسی آئی ہے تو اچھی طرح صفائی کراؤ پھر کچن میں آ کر میرا ہاتھ بٹاؤ۔ اس عذاب میں ادھر جو میری جان کو چمٹے ہوئے ہیں۔"
عفت نے کچن کی کھڑکی سے اسے یوں بیٹھے دیکھ کر وہیں سے چلانا شروع کر دیا۔
مثال بوکھلا کر کتابیں میز پر چھوڑ کر جانے لگی پھر خیال آنے پر تیزی سے مڑ کر اس نے کتابیں اٹھائیں اور اپنے کمرے میں آگئی۔
"مہمان۔۔۔ کہیں وہ والے تو نہیں۔" کمرے میں آتے ہی اس کے ذہن میں جھماکا سا ہوا۔
وہ ٹھٹک کر رک گئی۔ معاملہ کچھ کچھ اس کی سمجھ میں آنے لگا تھا۔
"پاپا کے دوست ایسے کون سے ہیں جنہیں میں نہیں جانتی۔ کیا پاپا میری شادی کرنے والے ہیں۔ مگر اتنی جلدی۔ ابھی تو میرے بی ایس ہونے میں بھی دو سال ہیں۔" وہ پریشان سی سوچتی چلی گئی پھر عفت کی اگلی آواز کا خیال آتے ہی تیزی سے یونیفارم بدلنے چلی گئی۔



"تمہارے گھر۔" پری حیران نظروں سے سامنے کھڑی اپنائیت بھری نظروں سے دیکھتی وردہ سے بولی۔
"ہاں میرے گھر یار۔ اور تم نے بتایا ہے نا جو ایڈریس تو وہ ہمارے گھر سے زیادہ دور نہیں ہے۔ یہ ہمارے گھر کا ایڈریس ہے۔" وردہ نے اپنے گھر کا ایڈریس جو عاصمہ کی اکیڈمی کے وزٹنگ کارڈ پر تھا نکال کر پری کو دیا۔
پری ایڈریس پڑھنے لگی۔
وردہ ابھی بھی اسے بہت پیار بھری نظروں سے دیکھ رہی تھی۔
"ہاں۔ یہ تو بالکل قریب ہے۔ ہماری دو ہی اسٹریٹس کا فاصلہ ہے۔" وہ بھی سرہلا کر بولی۔
"آف کورس!" وردہ خوش ہو کر بولی۔
"تو یار! تم آجاؤ ناں ہمارے گھر۔" پری کچھ سوچ کر اسے دعوت دیتے ہوئے کہنے لگی۔
"پہلے تم آجاؤ۔ ایکچولی میں تمہیں اپنی مما سے ملوانا چاہتی ہوں۔ میں نے اپنی مما سے تمہاری اتنی تعریفیں کر رکھی ہیں۔ وہ تم سے مل کر بہت خوش ہوں گی۔" وردہ بچوں کی سی معصومیت سے خوش ہو کر کہہ رہی تھی۔
"تم نے بھلا میری ایسی کیا تعریفیں کریں۔ مجھ میں تو کوئی ایسی بات نہیں۔" وہ اداسی سے بولی۔
"ارے یہ تو پورے کالج سے پوچھو۔ تمہاری یہ من موہنی صورت بیچاری لڑکیاں تمہیں دیکھ کر حسد اور رشک میں جلا ہو جاتی ہیں تو لڑکوں کا کیا حال ہوگا۔" وردہ اسے سراہتے ہوئے کہہ رہی تھی وردہ کو لگا اس کے گال تمتمانے لگے ہیں۔
"شٹ اپ یار! اب ایسی بھی کوئی بات نہیں ہے۔" وہ کچھ جھینپ کر بولی۔
"بات تو ہے یہ تو تم نہ کہو۔" وردہ مصر ہو کر بولی۔
"تم پھر تم آرہی ہو ناں میرے گھر۔ دیکھو یہاں تو تم میری مما کی اکیڈمی دیکھنے کے بہانے بھی آسکتی ہو۔" وہ

اسے اکساتے ہوئے بولی۔

"نہیں یار! پہلے میں اپنی مما سے پرمیشن لوں گی پھر تمہیں بتاؤں گی کہ پہلے میں آؤں گی تمہارے گھر یا تم۔" وہ ذرا سوچ کر بولی۔

"اوکے تو کب بتاؤ گی۔" وہ بے صبرے پن سے پوچھنے لگی۔

"صبر کرو یار! گھر پہنچوں گی تو پوچھوں گی نا۔" وردہ ہنس پڑی۔ دونوں باتیں کرتی ہوئی آگے نکل گئیں۔

وردہ باتوں کے دوران بھی متاثر ہو جانے والی نظروں سے پری کو دیکھتی رہی۔

☼ ☼ ☼

واثق بری طرح سے کام میں منہمک تھا جب اس کے بیگ میں موجود سیل فون کی بیپ بجنے لگی۔

اجنبی بیپ سنتے ہوئے وہ لمحہ بھر کو چونکا۔

کچھ دیر سوچتا رہا۔ پھر اسے خیال آیا کہ اس کے بیگ میں تو مثال کا سیل پڑا ہے۔

اس نے تیزی سے فون بیگ سے نکالا جو ابھی بھی بج رہا تھا۔

"بشری ماما کالنگ" بلنک ــــــ کر رہا تھا۔ واثق متذبذب سا فون کو دیکھنے لگا۔

"نہیں مجھے کال نہیں لینی چاہیے۔ اس کی مما کا فون ہے۔ جانے وہ کیا سمجھیں۔ لیکن اس نے ماما کے ساتھ ان کا نام کیوں فیڈ کیا ہوا ہے۔" وہ کچھ الجھ کر بجتے فون کو دیکھے جا رہا تھا۔ ذرا دیر بعد فون بند ہو گیا۔

وہ پھر سے کام میں مگن ہو گیا۔ فون پر میسج ٹون بجی تو وہ چونکا۔ بشری کا میسج تھا۔

"مثال جانو! کیسی ہو۔ شاید تم کالج میں ہو۔ میری کال نہیں لے رہیں۔ تمہارے پاپا کا رویہ کیسا ہے تمہارے ساتھ اور ان کی بیوی کا۔ ان کے بچوں کا۔ میں تم سے اتنی دور تو ہو گئی ہوں لیکن ایک پل کو چین نہیں۔ مثال! تم کو بہت یاد کرتی ہوں۔ جانو آئی لو یو۔ اپنا بہت خیال رکھنا۔ بہت زیادہ۔ میں تمہیں پھر فون کروں گی۔ لو یو۔" لمبا چوڑا میسج واثق کے سامنے ایک نئی کہانی کھول گیا۔

"تو گویا مثال اپنے اصل والدین کے ساتھ نہیں رہ رہی۔ اس کی ماما۔ کسی دوسرے ملک میں ہیں اور یہ۔"

وہ کچھ دیر سوچتا رہا پھر سر جھٹک کر فون بیگ میں رکھ کر کام کرنے لگا۔

☼ ☼ ☼

"تم جا کر چینج کر لو۔ تمہارے پاپا آنے والے ہیں اور ان کے ساتھ مہمان بھی۔ یوں سر جھاڑ منہ پہاڑ ان کے سامنے چلی آنا کہ وہ دیکھتے ہی انکار کر دیں فوراً۔" عفت جلے کٹے لہجے میں کمرے میں آ کر اس سے بولی۔

صبح سے کام کر کر کے اس کا سارا جسم دکھنے لگا تھا۔ سر میں بھی بہت درد تھا۔ وہ ذرا کمر کو آرام دینے کے لیے کمرے میں آ کر بیٹھی تھی کہ عفت آ کر اسے ہدایت دینے لگی۔

"کون سے مہمان مما؟" پری نے شال کے پیچھے سے سر نکالتے ہوئے متجسس لہجے میں پوچھا۔

"تمہارے پاپا کے جاننے والے ہیں۔ تم بھی جا کر اپنا حلیہ درست کر لو پری!" عفت اسے تنقیدی نظروں سے دیکھتے ہوئے بولی۔

"میں ٹھیک تو ہوں۔" وہ اپنے سراپے پر نظر ڈال کر لاپروا انداز میں بولی۔

عفت نظروں میں پیار سمو کر اسے دیکھنے لگی۔

"میری پیاری تم نہیں بھی ہو تو بھی اس مثال کے سامنے بہت خوب صورت ہے۔ ماشاءاللہ لاکھوں میں ایک ہے

میری بیٹی!" عفت یونہی پری کو پیار کر کے مسکرانے لگی۔

☼ ☼ ☼

مثال بے دلی سے تیار ہو کر خود کو آئینے میں دیکھنے لگی۔ وہ پیاری لگ رہی تھی مگر آنکھوں میں تھکن سی تھی۔ اس وقت اسے صرف آرام کرنے کی خواہش ہو رہی تھی۔ اسی وقت باہر گاڑی رکنے دروازے کھلنے اور بند ہونے کی آوازیں آنے لگیں۔ ذرا دیر میں گھر میں مہمانوں کے آنے کی آوازیں شور اور ہلچل سی ہونے لگی۔

"آ جاؤ تمہیں پاپا بلا رہے ہیں۔" پری خوب صورت گلابی رنگ کے ریشمی سوٹ میں کسی دیس کی پری ہی تو لگ رہی تھی۔ لمحہ بھر کو مثال مبہوت سی اسے دیکھتی رہ گئی۔

"اچھی لگ رہی ہوں نا میں۔" مثال کی نظروں سے اس نے فوراً "اخذ" کرتے ہوئے اترا کر پوچھا۔

مثال پیار سے مسکرا دی۔

"تھینک یو!" وہ خوش ہو کر گول گول گھوم گئی۔ اس کا پھولا پھولا سا فراک کچھ اور بھی پھول گیا۔

"لائیک اے پرنسس ہاں۔" وہ شوخی سے بولی۔

مثال اثبات میں سر ہلا کر اس کے ساتھ باہر نکل گئی۔

پری فوراً ہی اندر ڈرائنگ روم میں مہمانوں کے پاس چلی گئی۔ مثال کچھ جھجک کر وہیں رک گئی۔

"معلوم نہیں کون ہیں۔ کیسے لوگ ہیں اور پری کو دیکھ کر انہوں نے میرے بارے میں کیا اندازے لگا رکھے ہوں گے۔" خوامخواہ اس کی ہتھیلیاں پسینے میں بھیگنے لگیں۔

"اور وہ واثق۔" بے اختیار اس کے دل نے ایک "عجیب" کی سی کی۔ وہ کچھ ششدر سی کھڑی رہ گئی۔ اس موقع پر اس کے یاد آنے کا کیا مطلب تھا۔ وہ گم صم سی کھڑی تھی۔ جب بالکل اس کے ہاتھ کے پاس پڑا لینڈ لائن گنگنا اٹھا۔

اس نے گھبرا کر پہلی گھنٹی کے بعد فون اٹھا لیا۔

"ہیلو۔" بمشکل تم آواز میں وہ بولی تھی۔

"تھینک گاڈ مثال! فون تم نے اٹھایا۔ میں ابھی کچھ دیر میں اپنی مما کے ساتھ تمہارے گھر آ رہا ہوں۔ پلیز تم اپنے پیرنٹس کو بتا دینا کسی فارملٹی کی ضرورت نہیں۔ ہم بس یونہی ملنے آ رہے ہیں۔ مما تمہارے لیے میرا پروپوزل دیں گی۔ تمہیں کوئی اعتراض تو نہیں ناں؟" وہ شوخی سے پوچھ رہا تھا۔

"واثق!" اس کی آواز بے اختیار کانپی تھی۔

"اوکے بائے۔ ہم کچھ دیر میں روبرو ملتے ہیں اور ہاں تمہارا فون بھی میں ساتھ لیتا آؤں گا یار! اپنے گھر میں تھوڑا میرا سوفٹ امیج بنانا تاکہ میری مما کا کام آسان ہو جائے۔ اوکے بائے۔" کہہ کر اس نے فون بند کر دیا۔

مثال پریشان سی کھڑی رہ گئی۔

"مجھے ری ڈائل کر کے اس وقت یہاں آنے سے منع کرنا چاہیے۔ اگر وہ اس طرح اپنی والدہ کو لے کر آ گیا اور پاپا نے کچھ اور سمجھ لیا تو بہت مشکل ہو جائے گی۔" وہ جلدی سے نمبر ری ڈائل کرنے لگی۔

"کتنے لوگوں کو بھجوانا پڑے گا تمہیں بلانے کے لیے۔ مہمان تم سے ملنا چاہتے ہیں۔ آ جاؤ اب۔" عفت بے زاری سے اس کے سر پر آ کر بولی تو اس نے جلدی سے فون بند کر دیا۔

(باقی آئندہ ماہ ان شاءاللہ)

سلمیٰ فقیر حسین

دل کے فیصلے

وہ یقین کرو رائیل! وہ بہت اچھی ہے۔ اتنی پیاری کہ اسے پہلی نظر میں دیکھ کر ہی میرے دل میں یہ خواہش ابھری تھی کہ کاش وہ میرا نصیب ہو۔ تم جانتی ہو نا کہ مجھے ملائیشیا جانا کبھی بھی پسند نہیں رہا۔ مگر جب سے میں نے ساحل کو ملائیشیا میں دیکھا ہے۔ میرا دل چاہتا ہے میں کبھی وہاں سے واپس نہ آؤں۔ بس تم ماموں کو انکار کر دو کہ ہم شادی نہیں کریں گے۔ پہلے مجھے تم سے شادی کرنے پر کوئی اعتراض نہیں تھا۔ مگر اب جب کہ میں کسی سے محبت کرنے لگا ہوں۔ میں تم سے شادی کیسے کر سکتا ہوں۔ مجھے پتا ہے تم بھی اپنے باپ کے ٹکڑوں پر پل کر جوان ہونے والے شخص سے شادی نہیں کرنا چاہو گی۔"

ہمیشہ کی طرح اپنے دل کا حال مجھ سے شیئر کر رہا تھا۔ وہ پچھلے دو ماہ سے ڈیڈ کے کہنے پر آفس کے کسی کام سے ملائیشیا گیا ہوا تھا۔ اسے ملائیشیا جانا کبھی بھی اچھا نہیں لگتا تھا۔ مگر ڈیڈ کے کسی حکم پر انکار کرنا اس نے کہاں سیکھا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ وہ چند دنوں میں ہمیشہ کی طرح کام نمٹا کر واپس آجائے گا۔ مگر اس بار میرا اندازہ غلط ثابت ہوا تھا۔ وہ دو ماہ بعد بھی آنے کا نام نہیں لے رہا تھا۔

میرے واپس آنے کے اصرار اور ڈیڈ کی طبیعت کی خرابی کا سن کر وہ واپس آگیا اور اب اس کی واپسی میں دیر کی وجہ بھی میرے علم میں آگئی۔ میرا دل جیسے ڈوبنے لگا تھا۔ وہ دس برس کا تھا، جب پھوپھو بیوہ ہو کر ہمارے گھر آئی تھیں۔ ڈیڈی نے حذیفہ کو پھوپھو کی مرضی سے ہمارے پاس رکھ کر ان کی شادی کر دی تھی۔ ڈیڈی نے ہمیشہ اسے اپنا بیٹا سمجھا تھا اس کو میری طرح بہتر تعلیمی اداروں میں پڑھایا تھا اور وہ اس کی ہر خواہش پوری کرتے تھے۔ بے شک حذیفہ بہت کم فرمائش کرتا تھا۔ میں نے ہمیشہ اسے ایک اچھے دوست، ایک غمگسار ساتھی کی طرح ۔۔۔ ہمیشہ اپنے پاس پایا تھا۔ میرے جیسی مغرور اور اپنی منوانے والی لڑکی بھی کسی کمزور لمحے کی زد میں آکر اس سے محبت کرنے لگی پتا بھی نہیں چلا۔

اور جب ڈیڈی نے میری اور حذیفہ کی شادی کا اعلان اچانک حذیفہ کی برتھ ڈے پر کیا تو بے ساختہ مجھے اپنی خوش بختی کا یقین ہو گیا تھا۔ جس شخص کو ایک دن دیکھے بغیر میرا سارا دن بے چین اور بے مزا گزرتا ہے۔ وہ ہمیشہ کے لیے میرا ہو رہا ہے۔ اس سے بڑھ کر خوشگوار احساس میرے لیے اور کیا ہوتا تھا۔ مگر اب وہ مجھ سے کہہ رہا تھا کہ میں اس سے شادی سے انکار کر دوں۔ میرا دل چاہا میں اسے بتا دوں کہ میں اس سے کتنی محبت کرتی ہوں۔ اور جسے خود نے بڑھ کر چاہا جائے اس کے لیے انکار کیسے کیا جا سکتا ہے۔ مگر اس کی باتوں، اس کے چہرے پر جھلکتے محبت کے جگنوؤں نے مجھے گونگا سا کر دیا تھا۔ کتنے ہی پل میں کچھ بول نہیں پائی تھی۔ پھر بولی تو میرے لہجے میں صدیوں کی تھکن اتر آئی تھی۔

"کیا وہ مجھ سے بھی زیادہ خوب صورت ہے؟" مجھے اس کے شادی سے انکار کی یہی وجہ سمجھ میں آئی تھی۔ کیونکہ میں جانتی تھی کہ وہ میری طرح حسن پرست ہے۔ خوب صورتی کا شیدائی ہے۔ مجھے یقین تھا کہ وہ مجھ سے بڑھ کر خوب صورت نہیں ہو سکتی اور یہ یقین مجھے میری طرف اٹھنے والی ستائشی نظروں اور تعریفی جملوں نے دیا تھا۔

"پتا نہیں وہ تم سے زیادہ خوب صورت ہے یا کم۔ مگر مجھے وہ ساری دنیا سے زیادہ اچھی اور خوب صورت لگتی ہے۔ اتنی کہ جب میں اس کے پاس ہوتا ہوں تو مجھے وقت گزرنے کا احساس تک نہیں ہوتا اور جب وہ ہنستی ہے تو میں بھی یونہی بے وجہ ہنس دیتا ہوں اور جب وہ اپنے بیمار باپ کی دوائی خریدنے کے لیے پریشان ہوتی ہے تو۔ میرا دل چاہتا ہے میں اپنا آپ بیچ دوں۔ میں اسے پریشان نہیں دیکھ سکتا۔ مگر وہ میرا احسان نہیں لینا چاہتی۔ بہت خوددار ہے۔ بچوں کے کھلونوں کا اسٹال لگاتی ہے وہ۔ جانتی ہو۔ جب وہ مجھ سے پیسے نہیں لیتی تو میں کیا کرتا تھا۔"

وہ بولتے ہوئے ایک لمحے کے لیے رکا۔ اس کے ہونٹوں پر بڑی خوب صورت مسکراہٹ ٹھہر گئی۔

"جب میں وہاں کے مقامی لوگوں کے ذریعے اس کے چھتری والے اسٹال سے تمام کھلونے خرید لیتا تھا۔ تاکہ اس کی پریشانی حل ہو جائے اور اسے پتا بھی نہ چلے، جب وہ شام کو گھر واپس جاتے ہوئے مجھے بتاتی تھی کہ حذیفہ آج میرا پورا اسٹال بک گیا۔ منافع بھی پہلے سے زیادہ ہوا۔ میں بہت خوش ہوں۔ اس لمحے میں سانس تک لینا بھول جاتا تھا۔ وہ مجھے اس قدر پیاری لگتی تھی کہ میرا دل بے ساختہ اسے بانہوں میں بھر لینے کو چاہتا تھا۔ اپنا نام اس کے ہونٹوں پر بہت اچھا لگتا ہے مجھے۔۔۔ حذیفہ۔"

اس نے اپنے نام کو دہرایا تھا۔ یوں جیسے وہ اس لڑکی کو تصور میں لا کر اس کے انداز میں اپنا نام لے رہا ہو۔ وہ پاکستان واپس آکر بھی یہاں نہیں تھا۔ اس کا دل ابھی بھی ملائیشیا میں ہی تھا۔ میں ابھی بھی خاموش تھی۔ ساکت کسی بے جان مجسمے کی طرح بے حرکت۔ ان ہی ساکت آنکھوں سے میں اس کے لہجے میں اس لڑکی کے لیے محبت ہی محبت دیکھ رہی تھی۔ وہ محبت جو اس کی آنکھوں میں، میں اپنے لیے دیکھنا چاہتی تھی آج۔ کس قدر تکلیف دہ احساس تھا۔ جو سمے میں میری رگ و جاں میں اتر گیا تھا۔

پھوپھو مما کے ساتھ باتوں میں مصروف ہو گیا اور میں خاموشی سے اپنے کمرے میں آگئی تھی۔

"تمہاری لائٹ براؤن آنکھیں، رس بھرے ہونٹ، صراحی دار گردن اور شہد جیسی رنگت اور سب سے بڑھ کر تمہارے گھٹنوں تک آتے کالے گھنے بال۔ رائیل تمہاری ہر چیز تمہیں خاص اور منفرد بناتی ہے۔"

"ایسا مکمل اور سحر زدہ کر دینے والا حسن میں نے آج تک نہیں دیکھا۔ کسی اسکرین پر بھی نہیں۔"

"رائیل! تم بہت حسین ہو۔"

میرے دوستوں، یونیورسٹی فیلوز کے بہت سے ستائشی مغرور کر دینے والے جملے میرے کانوں میں گونجنے لگے۔ میں جو آئینے میں ابھرتے اپنے خوب صورت سراپے کو بغور دیکھ رہی تھی۔ دونوں ہاتھوں



میں یہاں چھپا کر روئی تھی۔
"جھوٹ بولتے ہو تم سب۔ اگر میں اتنی ہی منفرد اور خوب صورت ہوتی تو حذیفہ کبھی مجھے ریجیکٹ نہ کرتا۔ کبھی میرے سامنے کسی دوسری لڑکی کی تعریف میں زمین و آسمان کے قلابے نہ ملاتا۔ مجھے ایسی خوب صورتی نہیں چاہیے۔ جو حذیفہ کو میرے قریب نہ کر سکے۔"

میں رو رہی تھی بلک بلک کر۔ اس وقت میری حالت کسی قابل رحم فقیر سے بھی بدتر ہو رہی تھی۔ میں، جس نے بچپن سے ہی ہمیشہ دوسروں کو خود پر رشک کرتے ہوئے دیکھا تھا۔ لوگوں کی رشک آمیز نظروں اور تعریفی جملوں نے ہی تو مجھے خود پسند اور مغرور بنا دیا تھا۔ اتنا مغرور کہ حنان صدیقی کے اظہار محبت پر میں اس کی تذلیل کر کے رکھ دیتی تھی۔ مگر وہ بھی ایک نمبر کا ڈھیٹ تھا۔ میرے بار بار دھتکارنے کے باوجود وہ ہر روز میرے سامنے آجاتا تھا۔ آج صبح بھی وہ یونیورسٹی میں مجھے اپنی مخصوص جگہ برگد کے درخت سے ٹیک لگائے کھڑا نظر آیا تھا۔ مجھے پتا تھا وہ میرا ہی انتظار کر رہا ہے۔ میں اس پر ایک کڑی نظر ڈال کر آگے بڑھ جانا چاہتی تھی۔ مگر وہ میرے عین سامنے آکھڑا ہوا ہمیشہ کی طرح ہنستا مسکراتا ہوا۔

"آوارہ لڑکوں کی طرح میرا پیچھا کرنا چھوڑ دو اور جتنی جلدی ممکن ہو سکے یہ حقیقت جان لو کہ رابیل تمہاری قسمت میں نہیں ہے۔ مجھے میری قسمت کا ستارہ مل گیا ہے۔"

میں نے اچھے خاصے کڑے تیوروں سے اسے دیکھتے ہوئے جتایا تھا۔ تب مجھے یہ نہیں پتا تھا کہ میں جسے اپنی قسمت کا ستارہ سمجھ رہی تھی۔ وہ کسی اور آسمان کا تھا۔ تب وہ میری بات کا ہمیشہ کی طرح برا مانے بغیر بولا تھا۔

"کیسے مان لوں رابیل آفندی! کہ تم میری قسمت میں نہیں ہو حالانکہ جب بھی میں نے اپنے دونوں ہاتھوں کی لکیروں کو ملایا ہے۔ ہمیشہ تمہارا ہی عکس ابھرا ہے۔ تمہیں پانے کے لیے مانگی ہوئی میری دعائیں رائیگاں نہیں جائیں گی۔"

اور میں اس کی ڈھٹائی پر حیران ہوتے ہوئے چلی آئی۔ بظاہر تو اس میں کوئی برائی نہیں تھی۔ وہ ایک اچھی فیملی سے تعلق رکھتا تھا۔ انجینئرنگ کر رہا تھا۔ اچھی شکل و عادات کا مالک انسان تھا۔ جس پر پوری یونیورسٹی کی لڑکیاں نہیں تو کوئی تو ضرور فدا ہوتی تھیں۔ مگر اس کی آنکھوں میں اپنے لیے محبت دیکھ کر میں چڑ سی جاتی تھی۔ کیونکہ یہ محبت میں حذیفہ کی آنکھوں میں دیکھنا چاہتی تھی۔ اپنی مرضی کے خلاف کام مجھے یونہی چڑچڑا کر دیتے تھے اور حنان صدیقی کی محبت بھی میری مرضی کے خلاف تھی۔

☆☆☆

وہ ایک بار پھر میرے سامنے کھڑا تھا۔ میں اس سوال سے بچنے کے لیے کتنے دنوں سے اس سے کترا کر گزر جاتی تھی۔ اسے بات کرنے کا موقع نہیں دے رہی تھی۔ مگر آج اس نے مجھے گھیر لیا تھا اور وہی بچھو جیسا سوال مجھے ڈنک مار گیا تھا۔

"تم ماموں کو انکار نہیں کر سکتیں، کوئی بات نہیں میں تمہیں مجبور نہیں کروں گا۔" اس نے میری خاموشی کو میری جھجک سمجھا تھا۔

"تم ڈیڈی سے خود بات کرو گے؟" میں بے ساختہ بول اٹھی۔ میں جاننا چاہتی تھی کہ وہ آگے کیا کرنا چاہتا ہے۔ دل میں امید تھی کہ ہو سکتا ہے اس کے دل میں میرے لیے ذرا سی گنجائش ہو۔ اس لمحے مجھے اپنا آپ حنان صدیقی کی طرح ڈھیٹ لگا تھا۔ محبت کے سامنے جھکا ہوا اور کسی بھی بات کا برا نہ ماننے کا عزم لیے ہوئے۔

"میرے اوپر ماموں کے احسانوں کا اتنا بوجھ ہے رابیل! کہ میں ان سے کوئی فرمائش تو کر سکتا ہوں۔ مگر ان کے کسی طے کردہ فیصلے پر انکار نہیں کر سکتا۔ ہم دونوں کی شادی کا فیصلہ بھی وہ عرصہ ہوا طے کر چکے ہیں۔ تم سے انکار کے لیے اس لیے کہا تھا کہ وہ تمہاری کوئی بات نہیں ٹالتے۔ مجھے لگا تھا کہ تم بھی بس ماموں

جان کے کہنے پر ہی راضی ہوئی ہو۔ مگر تم نہ جانے کیوں خاموش ہو۔ تمہیں ہمیشہ وہ ملا ہے رابیل! جو تم نے چاہا ہے اور مجھے ہمیشہ وہ ملا جو ماموں نے چاہا ہے۔ جس میں ان کی خوشی ہے۔ پہلی بار دل نے اپنی کوئی خوشی پوری کرنے کی ضد کی ہے۔ مگر اتنا بدنصیب ہوں کہ وہ بھی پوری نہیں کر سکتا۔ میں ماموں کو انکار نہیں کر سکتا۔"

میں جانتی تھی کہ وہ مجھے اچھی دوست سمجھتا ہے۔ مگر پچھلے کچھ عرصے سے میں سمجھنے لگی تھی کہ اس سے میری کوئی بات چھپی ہوئی نہیں رہتی۔ وہ سمجھ جائے گا کہ میں، جس کو ناز نخرے اٹھوانے کی عادت ہے۔ کیوں اس کی پسند ناپسند کے پیچھے ہلکان ہونے لگی ہے۔ مگر آج میری ساری خوش فہمیاں ہوا ہو گئی تھیں۔ میں اس پر کوئی الزام بھی نہیں رکھ سکتی تھی۔ اس نے تو کبھی بھی مجھ سے کوئی وعدہ نہیں کیا تھا۔ کبھی مجھے سراہا نہیں تھا۔ میری تعریف نہیں کی تھی بلکہ ہمیشہ میں نے اس کی تعریف کی تھی۔ اس کی ذہانت کی اس کی سیاہ آنکھوں کی اور اس کی شاندار پرسنالٹی کی۔ محبت تو میں نے اس سے کی تھی۔ اس نے نہیں۔

مجھے پتا تھا۔ وہ ہمیشہ مجھے خوش رکھنے کی کوشش کرے گا۔ اس لیے نہیں کہ میں اس کی بیوی بن جاؤں گی بلکہ اس لیے کہ اس طرح ڈیڈی کے احسانوں کا بوجھ کچھ کم ہو جائے۔ مگر اس سب میں وہ خود کتنا خوش ہو جاتا اور اسے اداس دیکھ کر رابیل آفندی دن میں نہ جانے کتنی بار مرتی۔ مگر محبت میں قربانی تو دینی پڑتی ہے۔ تب ہی وہ فیصلہ جو پچھلے دس دن میں نہیں ہو رہا تھا۔ وہ دس سیکنڈ میں ہو گیا تھا۔

میں نے اسے اپنی محبت اپنے نام سے جدا ہونے کی نوید دی۔ اور وہ خوشی سے بے قابو ہوتے ہوئے بے اختیار مجھ سے لپٹ گیا تھا۔

"سچ رابیل! تم بہت اچھی بہت پیاری ہو مجھے یقین تھا تم میرا ساتھ ضرور دو گی۔ آخر دوست دوست کے کام نہیں آئے گا تو اور کون آئے گا۔"

وہ مجھے کندھوں سے تھامے خوشی سے کھلکھلاتے ہوئے صرف دوست بول رہا تھا اور مجھ میں اتنی ہمت بھی نہیں تھی۔ اپنی بے بس کھوئی سی آنکھوں کو اس کے چہرے کا طواف کرنے سے باز رکھ سکوں جو اس کے چہرے کی سچی خوشی میں کھو سی گئی تھیں۔

☆☆☆

میں نے حذیفہ سے شادی کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ جس پر ڈیڈی بہت خوب غصہ ہوئے تھے۔ مجھے نافرمان اور نہ جانے کیا کچھ کہہ ڈالا تھا۔ مگر میں خاموش کھڑی رہی تھی۔ مما نے بھی مجھے سمجھانے کی کوشش کی۔ مگر میرا فیصلہ نہیں بدلا۔ تب میرا اٹل انداز دیکھ کر انہوں نے مجھ سے کہا۔

"ٹھیک ہے۔ مجھے تمہارا فیصلہ منظور ہے۔ مگر اس شخص کو کہو جلدی رشتہ لے کر آئے۔ جس کو تم پسند کرتی ہو۔ تمہاری شادی کے بعد ہی میں حذیفہ کی شادی کروں گا۔ میں تمہاری نافرمانی کا سایہ بھی حذیفہ کی بیوی پر نہیں پڑنے دوں گا۔"

وہ غصے سے دوٹوک اور سخت انداز میں اپنا فیصلہ سنا گئے تھے۔ آج بھی میری مان لی گئی تھی۔ مگر جس شرط پر میری بات مانی گئی تھی۔ میں بے حد پریشان ہو گئی تھی۔ میں نے دل ہی دل میں فیصلہ کر لیا تھا کہ اگر حذیفہ نہیں تو پھر کوئی نہیں۔ مگر اس بار ڈیڈی کے لہجے کی سختی اور ناراضی نے مجھے باور کروا دیا تھا کہ مجھے ان کی شرط پوری کرنی ہی پڑے گی۔ اپنے لیے نہیں تو حذیفہ کی خوشی کے لیے۔ تب ہی میرے ذہن میں حنان صدیقی کا نام ابھرا تھا اور میں نے بے ساختہ لب بھینچ لیے تھے۔

☆☆☆

"حنان! اگر تم مجھ سے شادی کرنا چاہتے ہو تو اپنے پیرنٹس کو میرے گھر بھیج دو۔"

اس دن وہ لائبریری کی سیڑھیوں پہ اپنے دوستوں کے ساتھ بیٹھا کچھ ڈسکس کر رہا تھا۔ جب پاس سے

گزرتے ہوئے میں نے اسے ایک منٹ آنے کا کہا تھا' اور وہ میرے بلانے پر حیران سا شادی مرگ والی کیفیت لیے چلا آیا تھا جب میں نے رشتہ لانے والی بات کی تھی تو وہ پہلے سے بھی کہیں زیادہ حیران اور خوش ہوا تھا۔

"سچ رائبل! یہ سب تم کہہ رہی ہو۔ یقین نہیں آرہا۔" وہ خوشی کے بے تحاشا احساس میں گھرا پوچھ رہا تھا۔ "اور وہ تمہاری قسمت کا ستارہ کہاں گیا؟" آخر میں اس نے شرارت سے مسکرا کر پوچھا۔ میں نے جھٹکے سے سر اٹھا کر اسے دیکھا۔ شاید وہ مجھ پر ہنس رہا ہو۔ طنز کر رہا ہو۔ مگر اس کا انداز بہت سادہ سا تھا بس محبت اور خوشی لیے ہوئے۔ میں نے ایک لمبی سی سانس لی۔

"میری قسمت کا ستارہ ٹوٹ کر کسی اور کی جھولی میں جا گرا ہے اور تمہاری قسمت کا ستارہ خود چل کر تمہارے پاس آیا ہے۔ چاہو تو اسے تھام لو اور چاہو تو۔"

میں نے پھیکے پن سے کہتے ہوئے بات ادھوری چھوڑ دی تھی کہ اتنی ہی ہمت تھی مجھ میں کہ جس شخص کی ہمیشہ میں نے تذلیل کی تھی۔ آج خود اس کے پاس آئی تھی اس لیے مجھے لگا۔ محبت میں بہت خواریاں ہیں۔ عورت کو محبت نہیں کرنی چاہیے۔ عورت کو ہمیشہ معشوق ہونا چاہیے۔ عاشق نہیں۔

"میرے پاپا کہتے ہیں رائبل! انسان کو ہمیشہ وہی ملتا ہے۔ جو اس کی قسمت میں ہو۔ مجھے یقین تھا۔ تم میری قسمت میں ہو۔"



میرے ایگزام کے چند روز بعد میری شادی حنان سے ہو گئی تھی۔ حذیفہ نے ہر رسم میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا تھا۔ وہ بہت خوش تھا میں بھی خوش ہونے کی کوشش کرتی رہی۔

دلہن بنے اپنے پریوں سے روپ کو آئینے میں دیکھتے ہوئے بے ساختہ میرے دل میں سانعل کو دیکھنے کی خواہش ابھری تھی۔ میں دیکھنا چاہتی تھی کہ اس میں ایسا کیا ہے۔ جو حذیفہ کو مجھ میں نظر نہیں آیا۔ میں اس حسن کی دیوی کو دیکھنا چاہتی تھی۔ جس پر میرا حذیفہ مر مٹا تھا۔

حنان صدیقی کو رائبل کیا ملی تھی۔ اسے جیسے جنت مل گئی تھی۔ اس کی وارفتگیاں ہی کم نہیں ہو رہی تھیں۔ وہ میری سوچ سے بھی بڑھ کر مجھ سے محبت کرتا تھا۔

"وہ بہت اچھا ہے۔" اس کی محبتوں کے اعتراف میں میرے دل نے گواہی دی تھی۔

حذیفہ نے ملائیشیا میں ہی رہائش اختیار کر لی تھی۔ وہ اکثر مجھ سے فون پر بات کرتا تھا۔ فون کال دس منٹ کی ہو یا ایک گھنٹے کی۔ اس میں سانعل کا ذکر ہی ہوتا تھا۔ اس کی باتیں ہوتی تھیں۔ آج سانعل کی برتھ ڈے تھی۔ آج اس نے پرپل کلر کا سوٹ پہنا تھا۔ رائبل! تم جلدی ملائیشیا آنے کی کوشش کرنا۔ وہ تم سے ملنا چاہتی ہے۔ میں اس سے تمہارا بہت ذکر کرتا ہوں۔"

وہ بولتا رہتا اور میں اس کی خوشی کی خاطر بہت توجہ سے اس کا ذکر سنتی ورنہ سانعل کے متعلق بات کرنا ہمیشہ مجھے تکلیف دیتا تھا۔



آج بھی اس کا فون آیا تھا۔ جس میں بے پناہ خوشی سے لرزتی آواز میں اس نے مجھے بتایا تھا کہ وہ اور سانعل شادی کر رہے ہیں اور یہ کہ وہ اپنے بیمار باپ کے ساتھ پاکستان نہیں آسکتی۔ اس لیے تم سب یہیں پر آجاؤ۔"

میں نے جلد ملائیشیا آنے کی یقین دہانی کروا کر فون بند کر دیا تھا۔ مگر مجھے اپنے دوست اپنے غمگسار کی شادی میں شریک نہیں ہونا تھا کہ اسے کسی اور کے لیے دولہا بنا دیکھنا کس قدر تکلیف دہ احساس تھا۔ یہ مجھے۔ ابھی ابھی پتا چلا تھا۔ اور پھر حنان اور ممی ڈیڈی کے بارہا کہنے کے باوجود میں نہیں گئی تھی۔ بلکہ حنان کو بھی نہیں جانے دیا تھا۔ مجھے پتا تھا کہ وہ واپس آکر حذیفہ کی دلہن کے بارے میں مجھے ایک ایک بات

بتائے گا اور میں سانعل کے متعلق کچھ بھی سننا نہیں چاہتی تھی۔ بلکہ اسے خود اپنی آنکھوں سے دیکھنا چاہتی تھی۔ مگر حذیفہ کی دلہن بنے نہیں۔

میرے ملائیشیا نہ آنے پر حذیفہ خوب خفا ہوا تھا اور میں خاموشی سے سنتی رہی تھی کہ ناراض ہونا اس کا حق ہے۔



شادی کے بعد حذیفہ ملائیشیا میں ہی سیٹل ہو گیا تھا اور آج دو سال بعد میں حنان کے ساتھ ملائیشیا جا رہی تھی۔

سانعل کو دیکھنے کیونکہ اس کے حسن کو دیکھنے کی خواہش آج بھی میرے اندر روز اول کی طرح شدید تھی۔ بلکہ پہلے سے بھی زیادہ "اتنی کہ حنان کی بے پناہ چاہتوں کے جواب میں خوش ہونے کے بجائے میں اداس رہنے لگی تھی کہ اگر میں اتنی خوب صورت اور چاہے جانے کے قابل ہوں۔ پھر بھی حذیفہ مجھے چھوڑ کر دوسری طرف گیا ہے تو کچھ تو اس میں مجھ سے بڑھ کر ہو گا نا۔ تب ہی آج سانعل کے حسن کو دیکھنے رائبل آفندی اس کے دروازے پر کھڑی تھی۔

میں نے ایک نظر اپنے ہاتھ میں موجود کاغذ پر لکھے ایڈریس پر ڈالی اور دوسری نظر اپنے سامنے موجود خوب صورت اسٹائلش سے فلیٹ کو دیکھا اور بیل پر ہاتھ رکھ دیا۔ اگلے ہی لمحے دروازہ کھل گیا تھا اور دروازہ کھولنے والی کو دیکھ کر میں نے حیرانی کے عالم میں اپنے برابر کھڑے حنان کو دیکھا۔

"جی! کس سے ملنا ہے آپ کو؟" میں نے انگریزی میں بات کرتی اس سیاہ فام لڑکی کو دیکھا۔ موٹے موٹے سیاہ ہونٹ' درمیانی آنکھیں۔ پھولی سی ناک۔ سکرٹ اور اسکارف میں ملبوس یہ لڑکی پہلی ہی نظر میں مجھے بہت بدصورت لگی تھی۔

"بات کرو۔" حنان نے مجھے یوں خاموش دیکھ کر ٹوکا دیا تھا۔ اس سیاہ فام لڑکی کے چہرے پر بھی تشویش سی تھی۔

"میں رائبل ہوں۔ حذیفہ کی کزن اور یہ میرے ہزبینڈ ہیں حنان صدیقی اور تم؟" میں نے اپنا تعارف کروایا۔

"آپ رائبل ہیں؟" وہ خوشگوار حیرت سے مجھے دیکھنے لگی۔

مجھے حیرت ہوئی۔

"ہاں! حذیفہ بہت ذکر کرتا ہے آپ کا۔ آپ آئیے وہ آتے ہی ہوں گے۔" وہ کہتے ہوئے ایک طرف ہو گئی۔ میں حیران سی اندر داخل ہو گئی۔

"سانعل یار کہاں ہو۔ کتنی بار کہا ہے آفس سے آتے ہی مجھے نظر آیا کرو تم۔ تمہیں دیکھ کر مجھے یقین آجاتا ہے کہ میں اپنے جنت میں آگیا ہوں اور تم میری جنت کی حور ہو۔"

حذیفہ کی آواز پر دل کی دنیا اتھل پتھل ہو گئی تھی۔ تب ہی وہ سیاہ فام لڑکی تیزی سے کچن سے نکل کر دروازے کی سمت بڑھی۔ اور حذیفہ نے اسے اپنی بانہوں کے حصار میں لے لیا۔ میں اس سیاہ فام لڑکی کے سانعل ہونے پر ششدر بے یقین نظروں سے حذیفہ کی بانہوں کے گھیرے میں اس سیاہ فام لڑکی کو دیکھ رہی تھی۔ جسے میں اب تک حذیفہ کی میڈ

"ارے! رائبل تم!"

وہ ہم پر نظر پڑتے ہی سانعل کو چھوڑ کر ہماری طرف بڑھا۔ اور حنان سے گلے ملتے ہوئے وہ مسلسل مجھ سے مخاطب رہا تھا۔ مگر میں تو جیسے کچھ سن ہی نہیں رہی تھی۔ بس خالی اور ویران سی نظروں سے اسے دیکھ رہی تھی۔

"کیا ہوا۔ ایسے کیوں دیکھ رہی ہو؟" وہ سامنے والے صوفے پر بیٹھا مسکراتے ہوئے مجھے دیکھ رہا تھا۔ وہ واقعی مجھے اپنے گھر میں دیکھ کر بہت خوش ہوا تھا۔ ہم نے سرپرائز کے چکر میں اسے بتایا نہیں تھا۔

"یہ سانعل ہے۔ تمہاری بیوی؟" میں نے دیگر واٹ سامنے ٹیبل پر رکھتی اس سیاہ فام لڑکی کی طرف آنکھوں سے اشارہ کیا۔ دل میں ابھی بھی یہ امید



تھی کہ وہ کہہ دے کہ یہ میری بیوی نہیں ہے۔ مگر اس کے جواب پر بے ساختہ میرے لب بھنچ گئے تھے۔ جب اس نے محبت سے اس سیاہ فام لڑکی کا ہاتھ پکڑ کر اپنے قریب بٹھاتے ہوئے کہا تھا۔

"یہی سانول ہے۔ میری محبت' میری بیوی۔"

"کاش! حذیفہ تم نے مجھے کسی میرے برابر کی لڑکی کی وجہ سے ٹھکرایا ہوتا تو اتنی تکلیف نہ ہوتی۔"

مزید وہاں رکنا میرے لیے مشکل ہو گیا تھا مگر مجبوراً کھانے تک مجھے رکنا تھا۔ میں نے دل ہی دل میں اس بات پر شکر کیا تھا کہ حنان نے ہوٹل میں بکنگ کروالی تھی۔ حذیفہ کو ایک بد صورت لڑکی کا دم بھرتا دیکھ کر مجھے اپنے آپ سے نفرت ہونے لگی۔

"تمہیں سانول اچھی نہیں لگی؟" میں کھانے کے بعد واش روم میں ہاتھ دھونے کے لیے آئی تو وہ میرے پیچھے چلا آیا تھا اور اب مجھ سے پوچھ رہا تھا۔

"اس میں اچھا لگنے والا کچھ ہے؟" میں نے ایک نظر اسے دیکھا اور تلخ لہجے میں اسی سے پوچھا کہ دل ابھی تک اس بات پر رو رہا تھا کہ اس شخص نے مجھے کس کے لیے ٹھکرا دیا۔

"میری سمجھ میں نہیں آ رہا حذیفہ! تم جیسا حسن پرست بندہ کیسے سانول جیسی سیاہ فام کا انتخاب کر سکتا ہے؟"

میں واقعی ابھی تک حیران و بے یقین سی تھی کہ وہ جو ڈیڈی کے لائے گئے اپنی پسند کے خلاف کپڑوں کو ڈبوں سے نکالتا ہی نہیں تھا کہ اسے ڈیڈی کے لائے پھیکے نہیں بلکہ شوخ رنگ پسند تھے۔ وہ سانول سے کیسے شادی کر سکتا ہے۔

"میں آج بھی حسن پرست ہوں۔ مجھے آج بھی ہر خوب صورت چیز اٹریکٹ کرتی ہے۔"

وہ میری بات کے جواب میں چند ثانیے خاموش بے تاثر نظروں سے مجھے دیکھتے رہنے کے بعد ایک لمبی سانس لے کر بولا تھا۔

"میں آج بھی اپنے جوتے' موزے' ٹائی تک خریدنے کے لیے کئی بار بازاروں کے چکر لگاتا ہوں۔ تب کہیں جا کر مجھے میرے معیار میری پسند کی چیز ملتی ہے۔ مگر رابیل! تم شاید ایک بات نہیں جانتیں کہ محبت پسند ناپسند کا معیار نہیں رکھتی۔ محبت حسن پرست نہیں ہوتی۔ یہ بس ہو جاتی ہے۔ جو مجھے سانول سے ہو گئی۔ پہلی نظر کی محبت ایسی ہی ہوتی ہے۔ یہ نہیں دیکھتی کہ جس سے محبت کی جا رہی ہے وہ گورا ہے یا کالا' خوب صورت ہے یا بد صورت۔ وہ بس محبوب ہوتا ہے۔ معشوق ہوتا ہے اور دراصل عاشق کی نظر میں ہی سارا حسن ہوتا ہے۔"

وہ بڑے سنجیدہ سے انداز میں مجھے بتا رہا تھا۔ اس کے لہجے میں دور دور تک سانول سے شادی پر کوئی افسوس کوئی پچھتاوا نہیں تھا۔ وہ اس کے ساتھ کتنا خوش ہے۔ یہ پوچھنے کی مجھے ضرورت نہیں رہی تھی۔

"میرے ابا کہتے ہیں کہ محبت سوچنے سمجھنے کی صلاحیت سے محروم ہوتی ہے۔ آج اس کی عملی تصویر دیکھ بھی لی تو مجھے یقین آ گیا کہ محبت دلوں کا رشتہ ہے' جو ایک دل سے دوسرے دل میں بڑی خاموشی سے سرایت کر جاتا ہے۔ یوں کہ بندہ اپنی ساری سوجھ بوجھ بھول جاتا ہے۔"

واپسی پر گاڑی ڈرائیو کرتے ہوئے حنان نے [illegible] ایک نظر اس کو دیکھا اور رخ شیشے کے پار بھاگتے دوڑتے مناظر پر جما دیا۔

"کیا واقعی محبت سوچنے سمجھنے کی صلاحیت سے محروم ہوتی ہے۔" میں نے سوچا۔ "تب ہی حذیفہ جیسے حسن پرست نے مجھ جیسی حسین و جمیل لڑکی کو چھوڑ کر اس سیاہ فام سانول سے شادی ــــ کرلی اور میرے جیسی مغرور اور اپنی منوانے والی نے بھی اپنی محبت کو کسی اور کے حوالے کر دیا۔ اور تب ہی حنان صدیقی میرے بارہا دھتکارنے [illegible] کرنے کے باوجود آنکھوں میں محبت و امید لیے میرا منتظر رہا۔

یہی زندگی ہے۔ یہی محبت ہے۔ دل کے فیصلے انوکھے ہی ہوتے ہیں۔ یہ کب کسے خاص ہونے کا سرٹیفکیٹ دے دے، پتا ہی نہیں چلتا۔ ☆

میمونہ صدف

مٹی بڑی زرخیز ہے

ملک میں سیلاب آیا اور سب کچھ بہا لے گیا۔ جانیں' مال مویشی' گھر بار' کھیت' کھلیان اور ہمارے اسٹاف میں سیاسی بحران زیر بحث تھا۔

دلائل پر دلائل۔

کیچڑ اچھالنا۔

الزامات کی بوچھاڑ۔

حاصل بحث۔ تعلقات میں بگاڑ۔

ہوں ہی میں نے ببانگ دہل اعلان کیا۔ "سب لوگ اپنی استطاعت کے مطابق آئی ڈی پیز اور سیلاب زدگان کے لیے پیسے اس ڈبے میں ڈال دیں۔"

سب کو سانپ سونگھ گیا۔

کچھ نے نظریں چرائیں۔ کچھ نے بغلیں جھانکیں۔ کچھ کتابیں نوٹس سنبھالتی کلاس لینے چل دیں۔ کسی نے یوں ظاہر کیا کہ بے حد مصروفیت کے باعث سنا ہی نہیں اور جنہوں نے ڈالا انہوں نے چند چھوٹے نوٹ نکال کے یوں اچھالے جیسے بھیک دی جا رہی ہو۔

میں حیرت سے منہ کھولے دیکھتی ہی رہ گئی۔

محفل برخاست۔

بحث ختم۔

دلائل زائل۔

پانچ ہزار کا ایک سوٹ پہننے والیوں سے پانچ لاکھ افراد کے لیے ایک روپیہ نہ نکلا۔

جیب کی اجازت تو تھی مگر دل کی اجازت نہ ملی۔

اتنے میں پرنسپل نے مجھے بلوا بھیجا۔

"حفصہ آپ کس کے کہنے پر فنڈز اکٹھے کر رہی ہیں؟"

لو جی۔ کیا ملک کی اس صورت حال میں بھی کسی سے پوچھ کر کام کرنا ہوگا۔

"میڈم میں تو بحیثیت پاکستانی اپنا فرض پورا کر رہی ہوں۔"

"ہمارے اسکول کو ابھی آفیشلی طور پر لیٹر نہیں ملا کہ ہم فنڈز اکٹھے کریں' اس لیے اس قسم کی ایکٹویٹی میں آپ کو پرمیشن نہیں دیتی۔"

میری زبان گنگ ہو گئی۔

"آفیشل لیٹر"

ہاں۔ آفیشل لیٹر اوپر سے آئے۔ پھر فنڈز اکٹھے کیے جاتے۔ تصاویر بنوائی جاتیں اور واہ واہ سمیٹی جاتی۔ جذبہ حب الوطنی کو تو بھاڑ میں بھیجا ہی بھیجا انسانیت بھی ہم کو باقی نہیں رہی۔ ہم وطن بھیڑ بکریوں کی طرح پانی پر تیر رہے ہیں اور یہاں لوگ آفیشل لیٹر کے منتظر تھے۔

ہماری یہ بے حسی کسی سیاسی جماعت کی سازش تھی۔ دینے والے تو جان' مال کے نذرانے دے گئے اور پیچھے رہ جانے والے چند ہزار نہ دے سکے۔

اس مردہ دلی کا ذمہ دار کون تھا؟

دل زندہ کرنے' احساس پیدا کرنے' جذبہ حب الوطنی اجاگر کرنے کو کسے کھڑا ہونا تھا؟

"حکمرانوں کو برا مت کہو۔ جیسی قوم ہوگی ویسے اس کے حکمراں ہوں گے۔" "میرے کانوں میں عالم کا جملہ گونجا۔

"پورے بازار میں کوئی ایک دو تاجر ہوں گے ایمان دار ہوں گے۔ ناپ تول میں کمی' فحاشی' جوئے کے اڈے' رشوت کے بازار گرم' زکوۃ کا مال بینکوں میں جمع' سود پر سود کھانا' عقل و فراست بھسم ہو گئے۔ یہ سب کس کی سازش ہے۔ کس سیاسی جماعت کی۔ بھارت کی۔ امریکہ کی۔؟ یہ سب ہمارے اپنے کرتوت ہیں۔ عالم آپی کے۔

جب عوام کرپٹ ہوں تو حکمران بھی کرپٹ ہوتا ہے۔



پھر زلزلے نہ آئیں۔

پھر سیلاب تباہ کاریاں نہ مچائیں۔

پھر سونامی کے خطرے نہ ہوں۔

پھر دشمن کی یلغار نہ ہو۔

پھر دل خوف زدہ نہ ہوں۔ تو کیا ہو؟ اور پھر بھی قوم توبہ نہ کرے۔ برائیوں میں حد سے تجاوز کر جائے؟

امی نے مجھے پریشان حال دیکھا تو سر پر ہاتھ پھیرتے پوچھنے لگیں۔





"کیوں پریشان ہو حفصہ؟"

"امی! کیا ہم کبھی ایک قوم نہیں بن سکیں گے۔؟ صوبوں نے تقسیم کیا' پھر فرقہ واریت نے 'انسانیت' نے 'مذہبی گروہ بندی اور پھر سیاسی گروہ بندی۔ بانی پاکستان تو کہتے تھے کہ ہم بس پاکستانی ہیں۔ ہم کیوں بھول گئے امی۔" میں روئی۔ روتی نہ تو کیا کرتی۔؟

"ہر شخص کو خود میں بدلاؤ کی ضرورت ہے۔ انفرادی تبدیلی ہی اجتماعی تبدیلی کا باعث بنتی ہے۔ اندر تبدیلی ہو تو باہر خود بخود تبدیلی آتی ہے حفصہ۔ خالی دعوؤں سے بھی کچھ نہیں ہوتا۔ صرف جاگنا ہی نہیں ہوتا' جاگ کر حرکت بھی کرنا ہوتی ہے۔ قومیں بیٹھے بیٹھے نہیں بدلتیں' قومیں اتحاد سے بدلتی ہیں۔ جس چیز کی ہم میں کمی ہے وہ اتحاد ہی ہے بیٹا۔" امی نے مجھے سمجھایا۔

"اماں کہتی تھیں 1965 کی جنگ کے وقت عوام میں بے پناہ جوش و جذبہ تھا۔ فوجیوں کی امداد کے لیے عورتوں نے اپنے جسم پر موجود واحد زیور تک قربان کیا' لاٹھیاں اٹھائے میدان جنگ کی جانب مردوں نے دوڑ لگا دی کہ ہم بھی دشمن کا مقابلہ کریں گے۔ ناشتا' دوپہر اور رات کا کھانا بنا بنا کر فوجی بھائیوں کو پہنچایا جاتا تھا۔ کوئی فرقہ واریت نہ تھی' سب پاکستانی تھے بس۔ ایسے ایسے جوشیلے ترانے فنکاروں نے دن رات بیٹھ کر ریکارڈ کروائے کہ جو حب الوطنی کا جذبہ تازہ کر دیتے۔

پھر اماں تو بھرتیں۔ "اب دشمن محاذوں پر نہیں لڑتا۔ اس سے اس کو منہ کی کھانی پڑتی ہے۔ اب اس کا طریقہ کار تبدیل ہو گیا ہے۔ اس نے قوم میں لاکھوں "میر جعفر" پیدا کر دیے۔ اور جب کوئی "میر جعفر" نقصان پہنچاتا ہے نا تو اس کے دیے زخم صدیوں نہیں بھرتے۔"

اور میں نے سوچا امی ٹھیک کہتی ہیں۔ اب دشمن کے حربے بدل گئے۔ دشمن نے بغیر اطلاع پانی چھوڑ دیا۔ دریا ابل پڑے۔ ملک ڈوب گیا اور ہم قتل و غارت میں مصروف ہیں۔ آپس میں لڑ رہے ہیں۔ غیر ملکی کرواتا ہے اور عوام تماشا دیکھتے ہیں۔ ہم کبوتر کی طرح آنکھیں بند کیے بیٹھے رہتے ہیں کہ دوسروں کا گھر جل رہا ہے' ہمیں کیا۔ کیونکہ ہم نے ملک کو "اپنا گھر" سمجھنا چھوڑ دیا۔" امی نے سرد آہ بھری۔ ان کی آنکھیں بھی ڈبڈبا گئیں۔

میں اٹھی اور خاموشی سے گھر سے نکل کر دادی امی کی قبر کی طرف چل دی۔ میری دادی نے 1947ء اور پھر 1965ء کی جنگوں میں ملک کی بڑی خدمت کی تھی۔ تب ہی بچپن سے یہ سب قصے سن کر بڑی ہونے والی حفصہ رحیم بھی ملک کے لیے اتنا جذباتی تھی۔ اور میرے خیال میں یہ کچھ غلط نہ تھا۔ ہر پاکستانی کو ہی جذباتی ہونا چاہیے۔ جذبات مر گئے تب ہی تو قومیت کا تصور کھو گیا۔

دادی کی قبر پر بیٹھی میں کتنی دیر روتی رہی۔ میرے کندھے پر کسی نے ہاتھ رکھا تو میں نے مڑ کر دیکھا۔ ایک پیارا سا معصوم بچہ کھڑا مسکرا رہا تھا۔

"مجھے کسی نے بتایا کہ آپ سیلاب زدگان کے لیے چندہ جمع کر رہی ہیں۔" میں نے تعجب سے اسے دیکھا۔

"یہ میری طرف سے ہے۔" اس نے مٹھی میں دبے چند نوٹ میری طرف بڑھائے۔ چھوٹے بچے نے بڑے نوٹ تھمائے۔

"جب آپ فوجی بھائیوں کو دیں تو انہیں بتایئے گا کہ منو نے اپنے آدھے کھانے کے پیسے اپنے بھائیوں کے لیے دے دیے۔" اور میں اس سے لگ کر پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔

دادی صحیح کہتی تھیں۔ میں نے مڑ کر ان کی مٹی کی جانب دیکھا جہاں وہ خود مٹی کا ڈھیر بن چکی تھیں۔

"ذرا نم ہو تو یہ مٹی بڑی زرخیز ہے ساقی۔"

*

راشدہ رفعت

یہ سلگتا ہوا موسم

موبائل فون پر بجتا چنگھاڑتا ہوا الارم سیٹ کیا تھا سویرا صاحبہ نے۔ الارم بجنے پر ماہا کی آنکھ کھلی تھی۔ اس نے بیڈ پر اپنے ساتھ سوئے گدھے بیچ کر سوتی سویرا کا شانہ پکڑ کر جھنجوڑا۔

"سویرا کی بچی... تمہارا سیٹ کیا ہوا الارم بج رہا ہے۔ اٹھو جاؤ۔"

اور وہ سویرا ہی کیا جو ارلو ماؤنٹ اور الارم لگنے کے باوجود اتنی سویرے اٹھ سکتی کروٹ بدل کر پھر سو گئی۔ ماہا نے اسے قہر بار نگاہوں سے گھورا۔ پھر ہاتھ بڑھا کر اس کے سرہانے پڑا موبائل اٹھا کر آف کر دیا۔ تکیے پر سر رکھ کر اس نے دوبارہ سونے کی کوشش کی لیکن باقی دس منٹ تک کروٹیں بدل کر آخر اٹھ بیٹھی۔ بیس منٹ بعد وہ دوبارہ سونے کی کوشش کر رہی تھی۔ دل کو اطمینان تھا کہ آج فجر کی نماز ادا کر لی ہے۔ باقی چار نمازیں تو وہ اور سویرا باقاعدگی سے پڑھتی تھیں بس فجر کے وقت کم بخت شیطان خوب ورغلاتا تھا اور پھر جو اٹھ کر بی بی جان کی خشمگیں نگاہوں کا سامنا بھی ضرور کرنا پڑتا تھا۔ بی بی جان کا خیال آیا تو سوچا کیا ایک چکر ان کے کمرے کے سامنے لگا کر اپنا "نیک نامہ" درج کروا دیا جائے۔ ماہا نے دوبارہ دوپٹہ نماز کے اسٹائل میں باندھا اور بیڈروم سے باہر نکلی۔

بی بی جان کے کمرے کا دروازہ کھلا تھا اور وہ اپنی تسبیح ہاتھ میں لیے بیٹھی تھیں۔ حسب توقع اسے گزرتا دیکھا تو آواز دے کر بلایا۔

"صبح بخیر بی بی جان!" اس نے انہیں ادب سے مخاطب کیا۔

مکمل ناول



"خیریت تو ہے' آج اتنی صبح کیسے اٹھ گئیں؟"

"نماز کے لیے اٹھی تھی۔ نماز پڑھ کر پیاس لگی۔ فریج میں سے ٹھنڈے پانی کی بوتل لینے جارہی تھی۔" اس نے وضاحت دی۔

"اچھا۔ اٹھ گئی ہو تو چائے بنالو۔" بی بی جان کے کہنے پر ملہا اس گھڑی کو کوسنے لگی' جب اس نے بی بی جان کے سامنے سے گزرنے کا فیصلہ کیا تھا۔ کچھ نیند تو ان کی شکل دیکھ کر اڑ گئی تھی اور باقی چائے بناکر اڑ جاتی تھی۔

"دو کپ چائے اور زیادہ دیر مت لگانا۔" بی بی جان کی بات سن کر وہ پھر مڑی تھی۔

"میرا اتنی صبح چائے پینے کا موڈ نہیں ہے۔ میں نے نماز پڑھ کر دوبارہ سونا تھا۔ آپ کو بناکر لادیتی ہوں۔" اس نے انہیں رسانیت سے آگاہ کیا۔

"تمہارا خیال ہے کہ میں صبح سویرے تمہیں اپنے ساتھ چائے پینے کا شرف بخش رہی ہوں۔" بی بی جان نے جیسے مذاق اڑایا یا کم از کم اسے تو ایسا ہی لگا' ویسے تو وہ مسکرا رہی تھیں۔

"پھر اکٹھے دو کپ چائے خود ہی پئیں گی کیا۔" اس نے چڑ کر پوچھا۔

بی بی جان پھر مسکرادیں' لیکن وہ اسے نہیں دیکھ رہی تھیں۔ ان کی نگاہوں کا محور کوئی اور تھا۔ ملہا ان کی نگاہوں کا تعاقب کرتے ہوئے پلٹی اور دروازے میں ایستادہ مغیث کو دیکھ کر حیران رہ گئی تھی۔

"مغیث بھائی! آپ کب آئے؟" کوفت پر خوشی نے غلبہ پالیا تھا۔ کتنے دنوں بعد مغیث کی آمد ہوئی تھی۔

"ابھی کچھ دیر پہلے ہی پہنچا ہوں۔ بیگ رکھا' پھر مسجد چلا گیا' ہرگز اندازہ نہ تھا کہ اتنے سویرے تم سے ملاقات ہوجائے گی۔" مغیث نے پیار سے اس کا سر تھپتھپایا تھا۔

"پھپھو کو کیوں ساتھ نہیں لائے اور ندا' سارہ' طلحہ کیسے ہیں سب۔ ندا کے تو پریکٹیکلز بھی ختم ہوگئے۔ تم از کم اسے تو ساتھ لے آتے اور اپنی آمد کی کوئی اطلاع بھی نہیں دی' مجھے پہلے پتا ہوتا تو اس ندا کی بچی سے کہتی۔"

"ملہا! چائے کا کہا تھا تم سے۔ باتیں بعد میں کرلینا۔" بی بی جان نے ٹوکا تو وہ منہ بناکر چپ ہوگئی۔

"چائے نہیں ناشتا۔ بہت زوروں کی بھوک لگی ہے بی بی جان۔" مغیث نے بے تکلفی سے فرمائش کی تھی۔

"ناشتا؟" فرمائش بی بی جان سے ہوئی تھی' ہوش ملہا کے اڑے۔ اس گھر میں ناشتے کا کوئی خاص رواج نہ تھا۔ سویرا تو وزن بڑھنے کے خوف سے ناشتا کرتی ہی نہ تھی۔ ملہا بھی جیم اور دودھ کے گلاس سے کام چلالیتی تھی۔ وہ تو ڈیڈی جب گھر آتے' تب ناشتے پر خوب اہتمام ہوتا تھا' لیکن اہتمام رحمت بوا کرتی تھیں۔ ڈیڈی دیر سے سوکر اٹھتے تھے۔ رحمت بوا تب تک آچکی ہوتی تھیں' بلکہ جن دنوں ڈیڈی آئے ہوئے ہوتے وہ جلدی آجاتی تھیں۔ روزانہ بی بی جان کا ناشتا بھی رحمت بوا کے آنے کے بعد بنتا تھا۔ ملہا' بی بی جان ناشتے میں صرف ایک چپاتی ہی لیتی تھیں۔ کالج جانے سے پہلے بارہا ان کی چپاتی پکانے کی پیش کش کرچکی تھی۔ "اتنے سویرے اٹھتی ہیں آپ اور اتنی دیر میں ناشتا کرتی ہیں۔ ٹیڑھی میڑھی سہی' ایک چپاتی تو میں بھی آپ کو ڈال کردے سکتی ہوں۔ روٹی کا گول ہونا اتنا بھی ضروری نہیں بی بی جان۔"

"روٹی کا گول ہونا ہرگز بھی بہت ضروری نہیں بچی جان! لیکن صاف ستھرے ہاتھوں سے روٹی کا پکنا انتہائی ضروری ہے۔ ان چڑیلوں جیسے بڑھے ہوئے ناخنوں سے پیڑا بناؤ گی۔ پھر ان ہی ہاتھوں سے توے پر روٹی ڈالو گی' تمہارے خیال میں ایسی روٹی میرے حلق سے اتر سکتی ہے۔"

"اتنی تیز آنچ پر جب توے پر روٹی ڈالی جاتی ہے' بی بی جان تو سارے جراثیم مرجاتے ہیں۔" سویرا کی بے چاری سی شکل دیکھ کر ملہا کو بہن پر ترس آجاتا اور وہ فوراً اس کی مدد کو آتی۔

"مجھے مرے جراثیم کھانے میں بھی کوئی دلچسپی نہیں۔ جاؤ میرا سر نہ کھاؤ۔ جاکر اپنے کالج کی تیاری کرو۔" بی بی جان بے زاری سے کہتیں۔

"تم ہمارا منہ بی بی جان کا سر کیوں کھاتی ہو۔" کمرے میں آکر ملہا بہن پر بگڑتی۔

"وہ ہماری دادی ہیں ملہا۔" سویرا جیسے اسے یاد دلاتی۔

"سوتیلی دادی۔" ملہا منہ بناتی۔ سویرا اسے کاٹ کھانے والی نگاہوں سے گھورتی گویا کہہ رہی ہو "شرم سے ڈوب مرو۔"

"ہاں۔ لیکن مجھے اپنی سگی دادی سے بھی بڑھ کر پیاری ہیں۔" ملہا جھٹ اپنی پوزیشن کلیئر کرتی۔

"بی بی جان کا وجود ہمارے لیے چھتنار درخت کی مانند ہے ملہا! ورنہ سوچو' اگر ہمیں سوتیلی دادی کے بجائے اپنی سوتیلی ماں کے ساتھ زندگی گزارنی پڑتی تو کیا بنتا ہمارا۔"

"آلو کا بھرتہ۔" ملہا جیسے جھرجھری لے کر کہتی۔

"اب یہ آلو کہاں سے آگیا۔" سویرا بہن کو گھورتی۔

"ڈیڈی کے کچن سے' نوشابہ آنٹی کو آلوؤں سے کتنا شغف ہے۔ بھول گئیں تم ناشتے سے لے کر رات کے کھانے تک ہر ڈش میں آلو ضرور ہی شامل ہوتے ہیں۔"

"تم بات کو کہاں سے کہاں لے جاتی ہو۔" سویرا چڑ جاتی اور وہ واقعی بات کو کہاں سے کہاں لے جاتی تھی۔

مغیث بھائی ناشتے کی فرمائش کیے بیٹھے تھے۔ بی بی جان طنزیہ نگاہوں سے اس کے چہرے کے تاثرات ملاحظہ کررہی تھیں اور وہ جانے کیا کچھ سوچے جارہی تھی۔

"میں آپ کو ناشتا کرواسکتی ہوں مغیث بھائی! اگر آپ کا ناشتا ابلے ہوئے انڈے' دودھ کے گلاس یا سینکے ہوئے توس اور آملیٹ پر مشتمل ہو' لیکن جیسا ہیوی ناشتا آپ کرنا پسند کرتے ہیں' وہ تو میں قیامت تک نہیں بناسکتی۔" اس نے صاف گوئی سے کہا تھا۔

"تمہاری شادی کے لیے میں قیامت تک انتظار نہیں کروں گی۔ اس سے پہلے کچھ گھرداری سیکھ لو تو اچھا ہے۔" بی بی جان اس کا جواب سن کر تلملا گئی تھیں۔

"غضب خدا کا' اگلے گھر جاکر سسرال والوں کے سامنے انڈا ابال کر' دودھ کا گلاس بھر کر رکھ دیں گی۔ لو جی ہوگیا ناشتا۔ ناک تو میری ہی کٹے گی کہ دادی نے کچھ نہ سکھایا۔" انہیں سخت تاؤ چڑھ گیا تھا۔

"انڈا اور دودھ مکمل غذا ہیں بی بی جان۔" وہ ملہا ہی

کیا جس پر بی بی جان کی تلملاہٹ کا اثر ہو جائے۔ اس نے کھکھلاتے ہوئے ان کی معلومات میں اضافہ کیا۔ مغیث دونوں دادی، پوتی کی نوک جھونک سن کر بہت مشکل سے مسکراہٹ ضبط کیے بیٹھا تھا۔ مگر جب بات زیادہ بڑھتی دیکھی تو سیز فائر کروائے بنا نہ رہ پایا۔

"تم ناشتا بنانے کی زحمت نہ کرو ملا! وہ جو تمہاری سحر خیز آپی ہیں اب تک تو یقیناً" جاگ چکی ہوں گی ان کی مدد لے لو۔" مغیث نے تو لہجے کو بہت سرسری سا بنا کر کہا تھا، لیکن ملا نے شرارتی انداز میں اسے دیکھا۔ وہ مغیث کی ناشتے کی خواہش کا پس منظر جان چکی تھی۔

"وہ جو میری سحر خیز آپی ہیں نا مغیث بھائی! ان کی نائٹ ڈیوٹی تھی، وہ ابھی تک گھر نہیں لوٹی ہیں۔" اس نے مسکراتے ہوئے جواب دیا اور یہ خبر سن کر مغیث کی تو جیسے بھوک ہی اڑ گئی۔

"اچھا۔ میں ایک، دو گھنٹے کی نیند لے لوں۔ ویسے بھی بہت تھکاوٹ ہو رہی ہے۔ رحمت بوا کے ہاتھ کے بنے خستہ کرارے پراٹھوں سے ہی ناشتا کریں گے۔" مغیث نے تھکے ہارے انداز میں جمائی لی تھی۔ ملا مسکرا دی اور بی بی جان لاتعلق سے انداز میں تسبیح پڑھنے لگی تھیں۔

☼ ☼ ☼

ملا اور سویرا کالج سے گھر لوٹیں تو مختلف کھانوں کی اشتہا انگیز خوشبو گھر میں پھیلی ہوئی تھی۔

"بچیو آ گئی ہو تو جلدی سے کپڑے بدل کر دسترخوان لگانے میں میری مدد کرو۔" کچن میں سے رحمت بوا نے جھانک کر انہیں پکارا تھا۔

"ابھی آئے رحمت بوا۔" دونوں نے مستعدی سے جواب دیا تھا اور جب دسترخوان سج گیا تو بی بی جان اپنے لاڈلے نواسے کے ساتھ آن موجود ہوئیں۔

"رحمت! پودینے کی چٹنی نہیں بنائی کیا؟" بی بی جان نے دسترخوان پر طائرانہ نگاہ ڈال کر پوچھا تھا۔

"یہ رہی پودینے کی چٹنی۔" اسی لمحے سویرا پودینے کی چٹنی سمیت حاضر ہو گئی تھی۔

"پودینے کی چٹنی کی کمی محسوس کرلی آپ نے بی بی جان اور کسی کی کمی کا احساس نہیں ہوا کیا؟" ملا جو مغیث کی جانب متوجہ تھی اور پہلے اس کی متلاشی نگاہیں اور پھر ان میں چھلکتی مایوسی کو محسوس کر چکی تھی بی بی جان کو مخاطب کیے بنا نہ رہ پائی۔

مغیث نے سر اٹھا کر ملا کو دیکھا اس لڑکی کی جی داری سے وہ ہمیشہ ہی متاثر ہوتا تھا۔ بی بی جان نے البتہ پوتی کو خشمگیں نگاہوں سے گھورا تھا۔

"اسپتال سے آکر بھوکی پیاسی سو گئی ہوں گی ہنیہ آپی! لنچ کے لیے تو بلا لیں انہیں۔" ملا نے انہیں مخاطب کیا۔ بی بی جان کی تیوریوں پر بل پڑ گئے تھے۔

"وہ مہمان نہیں ہے کہ نخرے اٹھائے۔ باقاعدہ دعوت نامہ دے کر مدعو کیا جائے۔ کھانے کا وقت ہے۔ اسے خود اس وقت دسترخوان پر موجود ہونا چاہیے اور جہاں تک تعلق ہے اسپتال سے واپس آکر سونے۔" بی بی جان کی بات ادھوری ہی رہ گئی تھی۔

"السلام علیکم!" کمرے میں سب کو سلام کر کے دسترخوان پر بیٹھنے والی شخصیت ہنیہ کی ہی تھی۔

"وعلیکم السلام۔" جواب مغیث کی جانب سے ہی آیا تھا۔ جس کی آنکھیں ہنیہ کو دیکھ کر جگمگانے لگی تھیں۔

"کیسی ہیں ڈاکٹر صاحبہ! ہاؤس جاب کیسی چل رہی ہے۔" مغیث نے شگفتگی سے مسکراتے ہوئے پوچھا تھا۔

"فائن۔ آپ سنائیں۔ گھر میں سب کیسے ہیں۔ خالہ جان، ندا، طلحہ وغیرہ۔" ہنیہ نے بھی رسم نبھائی تھی یہ اور بات کہ اس نے مغیث کی طرف دیکھنے سے گریز کیا تھا۔ اس کی جذبے لٹاتی نگاہوں کا سامنا کرنا ہنیہ کے بس کی بات نہ تھی۔

"تم نے نوٹ کیا سویرا! جب دوپہر کو مغیث بھائی ہنیہ آپی کو دیکھ رہے تھے تو یوں لگ رہا تھا جیسے ان کی آنکھوں میں سو، سو واٹ کے بلب جل رہے ہوں۔" رات سوتے وقت ملا نے بہن کو مخاطب کیا تھا۔

"مغیث بھائی کو جذبے لٹانے میں اتنی فضول خرچی نہیں کرنی چاہیے۔ سو واٹ کے بلب کے بجائے انرجی سیور سے بھی تو کام چلایا جا سکتا تھا نا۔" سویرا نے کہہ کر خود ہی اپنی بات کا لطف لیا۔ وہ بھی کبھی کبھار ملا کی طرح بے تکی بات کر ہی دیتی تھی۔

"تمہارے خیال میں مغیث بھائی اور ہنیہ آپی کی لو اسٹوری کا کیا انجام ہوگا۔ بی بی جان اپنے لاڈلے نواسے کے ساتھ ہنیہ آپی کی شادی کر دیں گی۔" ملا کو جانے کیا خدشہ ستایا کہ پوچھ بیٹھی۔

"لو اسٹوری تو نہ کہو اسٹوپڈ۔ بے چاری ہنیہ آپی تو مغیث بھائی کو نظر اٹھا کر دیکھتی تک نہیں۔" سویرا نے ہنیہ کی پوزیشن واضح کی۔

"دیکھنے کے لیے مغیث بھائی کم ہیں کیا۔ محبت بھری نرم نرم نگاہوں سے ہنیہ آپی کو دیکھے چلے جاتے ہیں۔ بے چاری ہنیہ آپی تو پلکوں کی لرزش اور دل کی دھڑکن کو سنبھالنے میں ہی ہلکان ہوئے رہتی ہیں۔" ملا نے گویا درست نقشہ کھینچا تھا۔

"میرے خیال میں تو مغیث بھائی اور ہنیہ آپی کی شادی میں کوئی رکاوٹ آڑے نہیں آئے گی۔ مغیث بھائی بی بی جان کے لاڈلے نواسے ہیں تو ہنیہ آپی نواسی۔ پھوپھو بھی اپنی بھابھی کو خوب جانتی ہیں۔ مناسب وقت آنے پر دونوں شادی کے بندھن میں بندھ جائیں گے۔" سویرا اسد کی خوش فہمی تھی لیکن ملا کا اس سے متفق ہونا ضروری نہ تھا۔

"مغیث بھائی بی بی جان کے سوتیلے نواسے ہیں اور ہنیہ آپی ان کی سگی نواسی۔ لیکن بی بی جان کو مغیث بھائی سے بے حد پیار ہے انہیں اور بے چاری ہنیہ آپی سے تو وہ سوتیلوں سے بڑھ کر سلوک کرتی ہیں۔ وہ ہرگز مغیث بھائی کی شادی ہنیہ آپی سے نہیں ہونے دیں گی۔"

"یہ تم ہر بات میں سگے، سوتیلے کی بحث مت چھیڑا کرو۔ مہربانی ہوگی تمہاری۔" سویرا حسب توقع برا مان گئی تھی۔ ملا نے نہ اقرار کیا نہ انکار، محض ہنس پڑی تھی۔

☼ ☼ ☼

موسم کے تیور اچانک بدلے تھے۔ دوپہر تک سورج اپنی تابناک شعاعیں بکھیر رہا تھا اور دوپہر ڈھلتے ہی آسمان پر چہار سمت سے گھٹائیں امڈ آئیں۔

"اتنا زبردست موسم ہو رہا ہے مغیث بھائی! آج تو آپ کو ہمیں آؤٹنگ پر لے کر جانا پڑے گا۔" ملا اسے ڈھونڈتی ہوئی اسٹڈی روم تک آ گئی تھی۔

"ایسے خطرناک موسم میں بی بی جان باہر نکلنے کی اجازت دیں گی؟" مغیث نے مسکراتے ہوئے سوال کیا۔

ملا سوچ میں پڑ گئی۔

"صحیح کہہ رہے ہیں مغیث بھائی! بی بی جان بھی باہر جانے کی اجازت نہیں دیں گی اور ہنیہ آپی بھی ہمارے ساتھ چلنے پر مشکل سے راضی ہوں گی۔ صرف میں اور سویرا تو کیا خاک انجوائے کریں گے۔" اس نے مایوسی سے گردن ہلائی۔

"اگر تم ڈاکٹر صاحبہ کو راضی کر لو تو میں بی بی جان سے اجازت لے سکتا ہوں۔" مغیث بخوشی اس کے بچھائے جال میں پھنسا تھا۔

"تو چلیں! آپ بی بی جان سے بات کریں اور میں ہنیہ آپی سے۔" وہ خوشی خوشی اسٹڈی روم سے باہر جانے لگی تھی مگر پھر ایکدم مڑی تھی۔

"لیکن مغیث بھائی! ہم باہر پر تکلف ڈنر بھی کریں گے۔" اس نے یاد دلایا تھا۔

"وائے ناٹ شیور۔" مغیث شگفتگی سے مسکرایا تھا۔ ملا مسکراتے ہوئے پلٹ گئی تھی۔

☼ ☼ ☼

ایک بھرپور شام گزار کر اور مزے کا ڈنر کرنے کے بعد رات گئے وہ گھر لوٹے تھے۔ ملا نے موسم انجوائے کیا تھا۔ سویرا نے ڈنر اور مغیث نے ڈاکٹر صاحبہ کی اٹھتی گرتی پلکوں سے لطف اٹھایا تھا۔

وہ کانچ سی لڑکی محض اس کی نظروں کی تپش سے ہی گھبرا جاتی تھی۔ مغیث جب بھی یہاں آتا دل میں ٹھان کر آتا کہ اس بار نہ صرف وہ ہنیہ کو حال دل

سنائے گا، بلکہ اس کی رائے اور رضامندی بھی معلوم کرکے رہے گا۔ دل کو یہ یقین تو تھا کہ محبت کے اس سفر میں وہ اکیلا نہیں ہے، لیکن دماغ اپنی پوری تسلی کے لیے ہنبہ کا زبانی اقرار بھی سننا چاہتا تھا۔

وہ بزنس کے جھمیلوں سے تھوڑی سی فرصت پاتے ہی ڈیڑھ دو مہینے بعد یہاں بھاگا چلا آتا تھا۔ بی بی جان کی بے پایاں محبتیں، سویرا، ماہا کی محبت بھری شوخیاں، شرارتیں اسے سرشار کردیتیں، لیکن ڈاکٹر صاحبہ کی ایک جھلک دیکھنے کے لیے بھی اسے انتظار کرنا پڑتا۔ جب تنہائی میسر ہوتی تو ڈاکٹر صاحبہ غائب ہوتیں اور جب ان کی جھلک دیکھنے کو ملتی تو بات کرنے کا موقع میسر نہ آتا۔ وہ تین دن بعد وہ حال دل سننے اور سنانے کی تشنہ آرزوؤں سمیت گھر لوٹ جاتا۔

اس بار بھی یہی ہوا تھا، ہاں البتہ ماہا کی مہربانی سے اسے ہنبہ کو بڑی فرصت سے دیکھنے کا موقع ملا تھا۔ اسے ہرگز اندازہ نہ تھا کہ ماہا بھی اتنی ہی فرصت سے اس کی سرگرمی ملاحظہ کررہی ہے۔ آخر ماہا نے اسے میسج کیا تھا۔

"فی الحال کھانے پر توجہ دیں۔ مغیث بھائی! آپ نہ خود کھا رہے ہیں نہ ہنبہ آپی کو کھانے دے رہے ہیں۔ سویرا ساری جیلی کا صفایا کردے گی۔"

مغیث میسج پڑھ کر مسکرایا اور ڈاکٹر صاحبہ کو چھوڑ کر کھانے کی طرف متوجہ ہوا تھا۔

☆ ☆ ☆

مغیث کے جانے کے دو دن بعد ہی ڈیڈی آگئے تھے۔ ماہا دوپہر کو کالج سے آنے کے بعد جو سوئی تو سہ پہر ڈھلنے پر اس کی آنکھ کھلی تھی۔ بی بی جان کے نزدیک اتنی دیر تک سونا نحوست شمار ہوتا تھا۔ وہ ان کی ناراض نظروں کا سامنا کرنے کے لیے خود کو تیار کرتی لاؤنج میں آئی تھی۔ مگر سامنے ہی صوفے پر ڈیڈی کو بیٹھے دیکھ کر خوشی سے اچھل پڑی تھی۔

"آپ نے تو اگلے ہفتے آنا تھا۔" وہ ان کے کھلے بازوؤں میں سما گئی تھی۔ سویرا پہلے ہی ان سے جڑی بیٹھی تھی۔

"کیسا ہے میرا بچہ۔" ڈیڈی نے اس کی پیشانی پر محبت بھرا بوسہ دیا تھا۔ اس سے پیشتر وہ کوئی جواب دیتی۔ سامنے سے نوشابہ آنٹی آتی دکھائی دیں۔ ماہا کے چہرے کی مسکراہٹ یک لخت گئی تھی۔ اسے ہرگز اندازہ نہ تھا کہ ڈیڈی کے اس ٹرپ پر ان کی مسز بھی ان کے ہمراہ ہوں گی۔

"السلام علیکم آنٹی۔" ڈیڈی سے الگ ہوتے ہوئے اس نے ٹھنڈے ٹھار لہجے میں نوشابہ آنٹی کو سلام کیا تھا۔

"وعلیکم السلام!" جواب میں انہوں نے بھی کسی گرم جوشی کا مظاہرہ کرنے کے بجائے محض سلام کا جواب دینے پر اکتفا کیا تھا۔ حالانکہ کتنے مہینوں بعد ان کی ملاقات ہورہی تھی۔

"میں نے آپ کے کپڑے سوٹ کیس سے نکال دیے ہیں۔ عثمان! آپ فریش ہولیں۔" نوشابہ آنٹی نے ڈیڈی کو مخاطب کیا۔ وہ یہاں ان کی بیٹیوں کا وجود بمشکل برداشت کرتی تھیں۔ سویرا اور ماہا کے چہرے پھیکے پڑے تھے۔

"میں نے اپنی بیٹیوں کی شکل دیکھ لی ہے نوشابہ! میں آل ریڈی فریش ہوچکا ہوں۔" ڈیڈی نے اپنے ارد گرد بیٹھی بیٹیوں کو دوبارہ اپنے بازوؤں میں بھرا تھا۔ نوشابہ آنٹی بنا کچھ کہے واپس پلٹ گئی تھیں۔ لیکن اگلے ہی پل بی بی جان لاؤنج میں داخل ہوئی تھیں۔

"باپ کی جان چھوڑو اور جاکر کچن دیکھو۔ رحمت جاچکی ہے۔ رات کا کھانا تم دونوں نے بنانا ہے۔" انہوں نے دونوں کی سماعتوں پر بم گرایا تھا۔

"دوپہر کو رحمت بوا نے اتنے مزے کے آلو انڈے بنائے تھے، میں سالن میں مزید دو انڈے ابال کر ڈال دیتی ہوں، کیوں ڈیڈی۔" ماہا نے بی بی جان کے بجائے ڈیڈی کی رائے لینے کو ترجیح دی تھی۔

"نوشابہ آنٹی کو آلوؤں سے بنی ہر ڈش بے حد مرغوب ہے۔" ماہا بولی۔ اس کا ڈیڈی کے پاس سے اٹھنے کو دل ہی نہ کررہا تھا۔ بی بی جان نے خشمگیں نگاہوں سے گھورا تو سویرا جلدی سے اٹھ کھڑی ہوئی۔

"میں چکن ہانڈی بنالیتی ہوں ٹھیک ہے نا بی بی جان، تو ماہا! تم بھی میری ہیلپ کروادو۔" اس نے ماہا سے کہا۔ وہ برا سا منہ بناتے ہوئے اٹھ گئی تھی۔ دونوں کے لاؤنج سے چلے جانے کے بعد ڈیڈی اور بی بی جان ایک دوسرے کی جانب دیکھ کر مسکرادیے۔

"سویرا کی مجھے ہرگز فکر نہیں۔ لیکن ماہا بہت موڈی ہے۔ اس کے مزاج کا کچھ پتا مجھے ڈراتا ہے۔ بس میری تو یہی دعا ہے کہ اللہ ان دونوں کو میری زندگی میں اپنے گھربار کا کردے۔" وہ اپنی دونوں پوتیوں سے جس قدر مرضی سختی سے پیش آتیں، لیکن دونوں میں ان کی جان تھی۔ تب ہی نوشابہ آگئیں۔

"ہنبہ، ماہا اور سویرا سے بڑی ہے۔ آپ نے اس کے متعلق کچھ نہیں سوچا۔" بات معمولی تھی، لیکن انداز ایسا چبھتا ہوا اور جتاتا ہوا تھا، بی بی جان کے دل کو کسی نے مٹھی میں لے کر مسل دیا۔ ایک پل کے لیے وہ خاموش ہوئی تھیں۔ پھر چند ثانیوں کے توقف کے بعد انہوں نے بہت پرسکون اور ہموار لہجے میں جواب دیا تھا۔

"ہنبہ ایک سمجھ دار اور دل کی سمجھ دار بچی ہے۔ اس نے اپنے مستقبل کا فیصلہ اپنی مرضی سے کیا تھا تو بھی یقیناً اس کی راہ پر چلے گی۔ حق انسان اپنا بنا سکتا ہے اور میرے اپنوں کی فہرست میں ہنبہ شامل ہے۔"

کہتے ہوئے بی بی جان کا دل ڈوب ڈوب کر ابھرا تھا۔ لیکن ان کے چہرے پر دلی تاثرات کا عکس تک نہ تھا۔

"بی بی جان!" عثمان نے کچھ کہنا چاہا۔ بی بی جان کو تو وہ کچھ نہ کہہ سکے البتہ نوشابہ کو ضرور جتا دیا تھا۔

"ہنبہ بھی میرے لیے میری بیٹیوں جیسی ہی ہے نوشابہ! اس کے لیے بھی جو سوچنا ہے، ہم نے ہی سوچنا ہے۔"

وہ چہرے پر استہزائیہ مسکراہٹ سجا کر رہ گئی تھیں۔

☆ ☆ ☆

رات بہت اذیت ناک اور تکلیف دہ تھی۔ نوشابہ نے تو محض ایک بات کہہ دی تھی، مگر زینب خاتون کے دل پر لگے گھاؤ پھر سے ہرے ہوگئے تھے، بلکہ شاید ان زخموں پر تو کبھی کھرنڈ جما ہی نہ تھا۔ لیکن جب بھی وہ اپنے جگر کے ٹکڑے کی نشانی سے بے اعتنائی برتتیں دل کا درد سوا ہوجاتا۔ وہ ساری رات بستر پر کروٹیں بدلتی رہیں اور اوراق زندگی نظروں کے سامنے پھڑپھڑاتے رہے۔

ان کی شادی شدہ زندگی کا پہلا باب شادی کے محض چار سال بعد ہی بند ہوگیا تھا اور یہ چار سال ان کی زندگی کے اذیت ناک سال تھے۔ وہ پانچ بھائیوں کی اکلوتی بہن تھیں۔ میکے میں شہزادیوں کی سی زندگی گزاری۔ ماں، باپ نے تو اپنے تئیں ان کے لیے شہزادہ ہی ڈھونڈا تھا۔ لیکن اس شہزادے کا ساتھ ان کی زندگی کو کٹھنائیوں سے عبارت کرگیا۔ بے تحاشا دولت مند گھرانے سے تعلق رکھنے والے زبیر شاہ انتہائی اخلاقی گراوٹ کا شکار تھے۔ ایک نیک اور پارسا عورت بیوی بن کر ان کی زندگی میں شامل ہوئی، تب بھی ان کی عادتوں میں کوئی سدھار نہ آیا، بلکہ وہ اپنی برائیوں کا عکس اپنی بیوی کی ذات میں بھی تلاش کرتے رہتے۔ زینب خاتون ہر وقت ان کے شک و شبے کی زد میں رہتیں، وہ انہیں اذیت دینے کے لیے نت نئے حربے آزماتے۔

مشرقی عورت ہونے کے ناتے شوہر کو چھوڑنے کا تو کوئی سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا، وہ صرف شوہر کے راہ راست پر آنے کی دعا کرتی رہتیں۔ شادی کے سوا سال بعد بیٹی نے ان کی گود میں آنکھ کھولی تو ناقابل برداشت ہوتی زندگی پھر سے جینے کے قابل لگنے لگی، لیکن من موہنی صورت والی بیٹی پاکر بھی زبیر شاہ کی روش نہ بدلی، انہیں بیٹی کی ذات سے بھی قطعاً کوئی دلچسپی نہ تھی۔ بلکہ سسرال والے بھی بیٹی کی پیدائش کے بعد ان کی ذات سے بالکل لاتعلق ہوگئے۔ بیٹی کو جنم دے کر

زینب نے ان سب کو مایوس کیا تھا۔ اب زبیر شاہ کو زینب پر ہر طرح کا ظلم و ستم روا رکھنے کی کھلی چھوٹ تھی۔

زینب تو صبر و شکر کے ساتھ زندگی کے دن گزار رہی تھیں، لیکن زبیر شاہ کی زندگی کے دن پورے ہو گئے تھے۔ جانے انہیں کثرت مے نوشی کا نتیجہ تھا یا کوئی اور وجہ، بہرحال ڈاکٹروں نے انتقال کا سبب حرکت قلب بند ہونا ہی بتایا تھا۔ زینب کو پتا ہی نہ چلتا تھا کہ آزمائش شروع ہوئی ہے یا ختم ہوئی ہے۔ وہ بچی کو سینے سے چمٹائے واپس ماں باپ کی دہلیز پر آ گئیں۔ ماں تو ان کی شادی کے بعد اس کی شادی شدہ زندگی کا حال دیکھ کر اپنے غم سمیت منوں مٹی تلے جا سوئی تھیں۔ بوڑھے باپ نے اپنی بانہیں وا کر کے بیٹی کے ساتھ نواسی کو بھی سمیٹا تھا۔ بھائی اپنی اپنی زندگی میں مگن تھے۔ بھابھیوں کا رویہ بہت برا نہ سہی، مگر بہت اچھا بھی نہ تھا۔ زینب متوحش ہو کر آئندہ زندگی کے متعلق سوچنے چلی جاتیں۔ گھٹا ٹوپ اندھیرے کے سوا انہیں کچھ دکھائی نہ دیتا۔ لیکن ابھی ان کے دامن میں قدرت نے اتنی خوشیاں ڈالنی تھیں کہ دامن چھوٹا پڑ جانا تھا۔ ان کے لیے نجیب رضا کا رشتہ آیا تھا۔ ابا جان کے دوست کے بھانجے تھے۔ بیوی تیسرے بچے کو جنم دیتے ہوئے دوران زچگی انتقال کر گئی تھی۔ بچہ بھی جانبر نہ ہو سکا تھا۔ نجیب کھاتے پیتے گھرانے سے تعلق رکھتے تھے۔ ان کا رشتہ زینب کے گھر والوں کو نعمت غیر مترقبہ لگا تھا، لیکن زینب دوبارہ شادی کا جوا کھیلنے کی ہمت خود میں نہ پاتی تھیں۔ پھر بوڑھے باپ نے بہت پیار اور لجاجت سے انہیں زمانے کی اونچ نیچ سمجھاتے ہوئے فیصلہ قبول کرنے کی استدعا کی تھی۔ بھائی تو فیصلہ کر ہی چکے تھے۔ وہ نجیب رضا کے سنگ رخصت ہو کر نجیب ہاؤس آ گئیں۔

ملیحہ کو ان کی بھابھیوں نے یہ کہہ کر اپنے پاس رکھ لیا تھا کہ شادی کے شروع کے دنوں میں ملیحہ کا ان کے ساتھ رہنا مناسب نہیں۔ چند دن بعد وہ نجیب رضا کی اجازت سے ملیحہ کو اپنے ساتھ لے جائیں۔

منجھلی بھابھی کی یہ بات سن کر وہ ہکا بکا رہ گئی تھیں۔ انہیں تو بتایا گیا تھا کہ نجیب رضا کو ان کی بچی اپنانے پر کوئی اعتراض نہیں۔

"صورت حال کی نزاکت کو سمجھتی ہی نہیں ہو۔" ان کے احتجاج پر منجھلی بھابھی ترخ کر بولی تھیں اور وہ واقعی خاموش ہو گئیں۔ دل میں بہت سی بدگمانیاں اور خدشات چھپائے وہ دلہن بن کر نجیب ہاؤس پہنچی تھیں۔ یہ نجیب کی اور ان کی پہلی نہیں، بلکہ دوسری شادی تھی۔ گھر میں رشتے دار اور مہمان موجود تھے۔ لیکن شادی والے گھر جیسی کوئی گہما گہمی اور رونق نہیں تھی۔ بنا کوئی رسم کیے انہیں نجیب رضا کے کمرے میں پہنچا دیا گیا۔ نجیب اپنے دونوں بچوں کو ان کے پاس لے کر آئے تھے۔ تین سالہ مدحت اور اس سے بڑا عثمان وہ تو تقریباً ان کی ملیحہ کا ہی ہم عمر تھا۔ بچے بہت پیارے اور مہذب تھے۔ شرماتے ہوئے وہ اپنی نئی امی سے اپنا تعارف کروا رہے تھے اور تب ہی نجیب نے انہیں مخاطب کیا۔

"میں نے تو آپ کے بچوں سے آپ کو ملوا دیا۔ آپ میری بیٹی سے مجھے کب ملوا رہی ہیں۔ کہاں ہے ملیحہ؟ بلائیے اسے۔" انہوں نے ملائم لہجے میں زینب کو مخاطب کیا۔ زینب نے بے یقینی سے سر اٹھا کر انہیں دیکھا۔ انہیں لگا انہیں سننے میں غلطی ہوئی ہے۔

دور پرے کی ان کی ایک پھوپھی جو رواج کے مطابق ان کے ہمراہ آئی تھیں اور اس وقت بھی ان کے پاس بیٹھی تھیں۔ انہوں نے دولہا میاں کا سوال سن کر کچھ گڑبڑاتے ہکلاتے ہوئے وضاحت دینا چاہی۔

"نجیب میاں! کچھ دنوں بعد ملیحہ بھی آ جائے گی، دراصل نئی نئی شادی اور پھر..."

نجیب رضا نے پھوپھی کی پوری بات سنی بھی نہ تھی۔ انہوں نے مدحت اور عثمان کو اپنی نئی امی سے باتیں کرنے کی ہدایت کی اور خود ذرا دیر کی غیر حاضری کی معذرت کرتے ہوئے اٹھ کر چلے گئے۔

زینب سوچ بھی نہ سکتی تھیں کہ وہ کہاں گئے ہوں گے۔ ڈیڑھ گھنٹے بعد ان کی واپسی ہوئی تھی۔ وہ اکیلے نہیں تھے، ملیحہ ان کے ہمراہ تھی۔ کچھ حیران پریشان، گھبرائی گھبرائی سی ملیحہ کا ہاتھ پکڑ کر وہ اس کی ماں کے پاس لے کر آئے تھے۔

زینب کے پاس بولنے کے لیے الفاظ نہ تھے۔ وہ حیران ہو کر اس فرشتہ صفت انسان کو دیکھے جا رہی تھیں۔ نجیب ملیحہ کا اس کے بہن بھائی سے تعارف کروانے لگے اور جب تینوں بچے ان کے بیڈ روم سے ملحق بہت پیارے انداز میں ڈیکوریٹ کیے ہوئے بیڈ روم میں سو گئے تب نجیب اپنی نئی نویلی دلہن کے پاس آئے تھے۔

"ہم اب میچور ہو گئے ہیں۔ اس لیے میں نے اپنے بیڈ روم کو سجانے کے بجائے بچوں کا کمرہ نئے سرے سے ڈیکوریٹ کروانے کو ترجیح دی۔ میں چاہتا تھا کہ آج کے حوالے سے ہمارے بچوں کے دلوں میں خوش گوار یادیں باقی رہیں۔ بچے اپنے نئے کھلونے اور کمرے کی ڈیکوریشن دیکھ کر بہت خوش ہوئے ہیں۔"

نجیب انہیں مسکراتے ہوئے آگاہ کر رہے تھے۔ انہوں نے روایتی شوہروں کی طرح سہاگ رات بیوی کو حقوق و فرائض پر کوئی لیکچر نہ دیا۔ حتیٰ کہ انہوں نے نصیحت تک کرنا ضروری نہ جانا کہ وہ ان کے بچوں کو اپنا بچہ سمجھیں اور شاید یہ نصیحت بالکل غیر ضروری تھی۔ نجیب نے ان سے کوئی ڈیمانڈ کرنے کے بجائے خود ایک عمل کر کے دکھایا تھا۔ جب وہ ملیحہ کے باپ بن گئے تھے تو زینب مدحت اور عثمان کی ماں کیوں نہ بنتیں۔

وہ شخص جس کو شادی کی پہلی رات انہوں نے محبوب کا درجہ دے دیا تھا۔ اس کے بچوں سے انہیں کیوں کر پیار نہ ہوتا۔ وہ انہیں اپنی کوکھ سے جنے بچے لگتے تھے۔ وہ اپنی ممتا اپنے تینوں بچوں پر بے دریغ لٹاتی تھیں اور نجیب رضا ایک بہت اچھے باپ ہی نہ تھے، بلکہ وہ ایک بہت اچھے انسان تھے۔ زینب کو لگتا وہ ہر گزرتے دن کے ساتھ ان کے عشق میں مبتلا ہوتی جا رہی ہیں۔

وہ شخص انہیں اتنی محبت، اتنی عزت، اتنا مان، اتنی اپنائیت دیتا تھا کہ زینب کو اپنی خوش نصیبی پر رشک آ آتا تھا، پر یقین نہ آتا۔ سسرالی رشتے داروں میں محض ان کی ایک بڑی نند تھیں جو شادی شدہ تھیں اور قریبی شہر میں بیاہی ہوئی تھیں۔

آپا بی زینب کے لیے روایتی نند ہی ثابت ہوئی تھیں۔ انہیں زینب کے کیے گئے ہر کام پر اعتراض ہوتا۔ ملیحہ کے لیے نجیب کی محبت اور التفات بھی انہیں بہت کھٹکتا اور تو اور وہ مدحت اور عثمان کو بھی زینب سے برگشتہ کرنے کی اپنی سی کوشش کرتی رہتیں۔ البتہ مدحت اور عثمان اپنی بی بی جان کے خلاف ایک لفظ سننے پر تیار نہ ہوئے۔

پہلے شوہر کی وفات کے بعد جب زینب نے ملیحہ کے ساتھ چند برس اپنے میکے میں گزارے تو ان کے بھائیوں کے بچوں کی دیکھا دیکھی ننھی ملیحہ بھی انہیں بی بی کہنے لگی تھی اور پھر ماں کے لیے یہی نام اس کی زبان پر چڑھ گیا۔ مدحت اور عثمان نے بھی ان کے لیے ملیحہ والا طرز تخاطب اپنایا تھا۔ اب وہ ملیحہ، مدحت اور عثمان کی بی بی جان تھیں۔ اس شخص کی سنگت میں زندگی ہر قدم پر اپنی رعنائیاں منکشف کرتی جا رہی تھی۔ وہ ہر گھڑی خدا کا شکر ادا کرتے نہ تھکتیں اور جب بھی آپا بی کی آمد ہوتی تو زینب کچھ سہم جاتیں۔ وہ حیران ہوتی تھیں کہ ایک ماں کے جنے دو بہن بھائی ایک دوسرے سے اتنے مختلف کیسے ہو سکتے ہیں۔ آپا بی اپنے قیام کے دس، بارہ دنوں میں زینب کو زچ کرنے کی ہر ممکن کوشش کرتی تھیں۔ ان کے کاموں میں جی بھر کر مین میخ نکالتیں، سارا دن انہیں اپنے اور اپنے بچوں کے کاموں میں الجھائے رکھتیں اور ان باتوں کے باوجود جب زینب کی پیشانی پر بل پڑتے نہ دیکھتیں تو ان کی اپنی پیشانی پر بل پڑ جاتے۔ وہ نجیب اور ان کی پہلی بیوی کی محبت کے قصے بہت ذوق و شوق سے زینب کی سماعتوں میں انڈیلتیں۔ ایک دن زینب نے انہیں مسکراتے ہوئے کہہ ہی دیا تھا۔

"میں اچھی طرح جانتی ہوں آپا بی! کہ نجیب روحی سے کس قدر محبت کرتے تھے۔ نجیب تو سراپا محبت ہیں آپا بی! میں خوش نصیب ہوں کہ نجیب کی محبت کا ایک

حصہ مجھے بھی ملا اور نجیب بے وفا بھی نہیں۔ وہ آج بھی روحی کی قبر پر باقاعدگی سے حاضری دیتے ہیں اور اسے یاد بھی کرتے ہیں' بس مجھ سے شادی کے بعد اتنا فرق آیا ہے کہ وہ روحی کو تنہائی میں یاد نہیں کرتے اپنی فیلنگز مجھ سے شیئر کرتے ہیں اور اللہ کا مجھ پر خاص کرم ہے کہ مجھے روحی سے بالکل جلاپا نہیں' جب اس کی نشانیاں میری آنکھوں کی ٹھنڈک ہیں' وہ خود مجھے کیوں بری لگے گی؟" تفصیلی جواب سن کر آپا بی کی طبیعت صاف ہو گئی تھی۔ لیکن پھر بھی وہ گھر کی پرسکون فضا میں ہلچل مچانے کی فطرت سے باز نہ رہ سکتی تھیں۔

وقت اپنی رفتار سے آگے سرکتا رہا۔ نجیب ہاؤس کی رونقیں اسی طرح قائم تھیں۔ بچے اب بڑے ہو گئے تھے۔ زینب اور نجیب کی اپنی جوانی رخصت ہو گئی تھی۔ اب وہ اپنے جوان ہوتے بچوں کو دیکھ کر سرشار ہوتے تھے۔ ملیحہ' مدحت اور عثمان تینوں' بہن بھائی ایک دوسرے پر جان چھڑکتے تھے۔

زینب اپنے آشیانے کی رونقیں دیکھ کر خدا کا شکر ادا کرتے نہ تھکتیں۔ بچے بڑے ہونے کے بعد آپا بی اب یہاں اتنے تواتر سے نہ آپاتی تھیں کہ ان کے اپنے بچوں کی پڑھائیوں کے شیڈول آڑے آتے تھے' لیکن گزرے وقت نے ان کی عادتوں اور مزاج پر کوئی اثر نہ ڈالا تھا۔ ان کے بچوں کا ماموں کے ہاں آکر خوب دل لگتا تھا۔ لیکن زینب نے نوٹ کیا تھا کہ ان کی تینوں بیٹیاں مزاج کے اعتبار سے آپا بی پر ہی گئی تھیں۔ ہاں سب سے بڑا اور اکلوتا بیٹا اویس سب میں مختلف تھا۔ وہ بہت کم گو' دھیمے مزاج اور سلجھی ہوئی عادتوں کا مالک تھا۔ مکینیکل انجینئرنگ کر رہا تھا۔

نجیب اپنے بھانجے کو بے حد چاہتے تھے اور نجیب کی شباہت رکھنے والا ان کا بھانجا زینب کو بھی اچھا لگتا تھا۔ لیکن زینب کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ آپا بی اپنے لائق فائق اور خوبرو بیٹے کے لیے ان کی ملیحہ کا ہاتھ مانگیں گی۔

ملیحہ کا ماسٹرز کا فائنل ایئر چل رہا تھا۔ اس کی بے تحاشا خوب صورتی کے سبب اس کے لیے بہت سے رشتے آئے ہوئے تھے۔ لیکن نجیب کا کہنا تھا کہ وہ پڑھائی کا سلسلہ مکمل ہونے تک اس بارے میں نہیں سوچیں گے۔

ان ہی دنوں آپا بی نے نجیب کو اپنے پاس بلوایا۔ اویس سے چھوٹی فرحانہ کے رشتے کی بات چل رہی تھی اور آپا بی چاہتی تھیں کہ نجیب بھی لڑکے اور اس کے گھر والوں سے مل کر اپنی رائے دیں۔ نجیب اپنے ہمراہ زینب کو بھی لے گئے تھے۔ انہیں بھی لڑکا پسند آیا تھا۔ گھر والے بھی معقول تھے۔ نجیب کی رائے میں ان کی بھانجی کے لیے یہ رشتہ مناسب ترین تھا۔

"بس آپ اللہ کا نام لے کر ہاں کہیے اور بات پکی ہونے کی مٹھائی لے کر آپ خود ہمارے ہاں آئیے گا۔ ان تکلفوں سے آپ کا وہاں کا چکر نہیں لگا۔" نجیب نے بہن سے محبت بھرا شکوہ کیا۔

"ایک ہاں میں نے تم دونوں کے منہ سے بھی سنی ہے' پھر جتنی کہو گے مٹھائی کھلاؤں گی۔" آپا بی نے مسکراتے ہوئے انہیں مخاطب کیا۔ دونوں نے نا سمجھی سے انہیں دیکھا۔

"فرحانہ پانچ برس چھوٹی ہے اویس سے۔ پہلے تو اسی کے سر پر سہرا سجاؤں گی نا۔" انہوں نے پاس بیٹھے بیٹے کو محبت سے دیکھتے ہوئے کہا۔ بلاشبہ اکلوتے بیٹے میں ان کی جان تھی۔ اویس ان کی بات سن کر قدرے جھینپ گیا تھا۔ اس نے فوری طور پر اٹھنے کی کوشش کی' لیکن آپا بی نے اس کا ہاتھ پکڑ کر بٹھا لیا۔

"یہ میرا اکلوتا بیٹا تمہاری ملیحہ کا طلب گار بنا بیٹھا ہے۔ حالانکہ اس کے لیے ایک سے بڑھ کر ایک رشتہ موجود ہے۔ اسی کی خواہش پر تمہارے آگے جھولی پھیلا رہی ہوں' دیکھتے ہیں مایوس لوٹاؤ گے یا ہماری بات کا مان رکھتے ہوئے ہاں کرو گے۔"

آپا بی کا رشتہ مانگنے کا انداز قدرے عجیب تھا' لیکن زینب اور نجیب کے لیے تو ان کی بات ہی اتنی غیر متوقع تھی کہ وہ انداز پر غور ہی نہ کر پائے۔ وہ دونوں اپنی اپنی جگہ حیران بیٹھے تھے۔

"کس سوچ میں پڑ گئے ہو تم دونوں' کہیں نہ کہیں تو ملیحہ کی شادی کرنی ہے نا پھر میرے اویس میں کیا کمی ہے' دیکھا بھالا بچہ ہے تمہارا' پھر ملیحہ کے عشق میں گوڈے گوڈے ڈوبا ہے۔ رانی بنا کر رکھے گا اسے۔"

"آپ کی بات ہمارے لیے اتنی اچانک اور غیر متوقع ہے آپا بی کہ سچ مانیں تو ہم حیران ہی رہ گئے ہیں۔" نجیب نے اپنی خاموشی کی توجیہہ پیش کی تھی۔

"میں جانتی ہوں بھیا! اپنی بیوی کے ابرو کے اشارے کے بغیر ایک لفظ نہیں کہو گے تم۔ زینب! میں تم ہی سے بات کر رہی ہوں۔ آخر کو تمہاری بیٹی ہے۔ نجیب خود کو لاکھ اس کا باپ کہے' کوئی خونی رشتہ تو نہیں ہے نا ملیحہ کا نجیب کے ساتھ۔ اگر نجیب کی بیٹی ہوتی تو پھر میں رشتہ نہ مانگتی' بلکہ اپنا فیصلہ سناتی۔ اپنے بھائی پر کم از کم اتنا تو بھروسا ہے مجھے۔ میرے فیصلے کے آگے سر تسلیم خم کرتا' ایک لفظ نہ بولتا آگے سے۔"

آپا نے زینب کو گھیرنے کی کوشش کی اور وہ اس کی کوشش میں کامیاب بھی ہوئی تھیں۔

"آپ یہ باتیں کیوں کر رہی ہیں آپا بی! مدحت کی طرح ملیحہ بھی نجیب کی بیٹی ہے اور نجیب ملیحہ کی زندگی کا ہر فیصلہ کرنے کا اختیار رکھتے ہیں۔" زینب آپا بی کی بات سن کر تڑپ ہی تو گئی تھیں۔

"چلو نجیب! تمہاری بیوی نے تو سارا اختیار تمہیں ہی دے دیا' پھر جاؤ کیا جواب ہے تمہارا۔" آپا بی نجیب کی طرف متوجہ ہوئیں۔

"اویس میرا بھانجا ہے آپا بی! مجھے اولاد کی طرح عزیز ہے۔ پڑھا لکھا ہے' قابل ہے' خوب صورت ہے۔ میری خوش قسمتی ہے کہ آپ نے اپنے لائق فائق بیٹے کے لیے میری بیٹی کا ہاتھ مانگا لیکن پھر بھی سوچنے اور فیصلہ کرنے کے لیے تھوڑا سا وقت..."

"ساری باتیں تو تم نے خود ہی کہہ دیں' میرا بیٹا خوبرو ہے' تعلیم یافتہ ہے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ تمہاری بیٹی کو دیوانگی کی حد تک چاہتا ہے' بالکل ویسے جیسے تم اپنی بیوی کو چاہتے ہو۔ تمہارا بھانجا بھی تم پر ہی پڑا ہے۔ پلکوں پر بٹھا کر رکھے گا تمہاری بیٹی کو' بس اب کسی لیکن ویکن کی گنجائش نہیں' مجھے تمہارے منہ سے ہاں ہی سننی ہے۔"

آپا بی کا انداز قطعیت بھرا تھا۔ نجیب نے سوالیہ نگاہیں بیوی کے چہرے پر گاڑ دیں۔ زینب جانتی تھیں کہ نجیب کو اس رشتے پر کوئی اعتراض نہ ہو گا۔ اعتراض تو خود انہیں بھی نہ تھا۔ اویس ہر لحاظ سے بہترین لڑکا تھا' بس آپا بی کے مزاج سے ڈر لگتا تھا' لیکن کسی انجان جگہ اور اجنبی لوگوں میں ملیحہ کا رشتہ طے کرتیں تو کوئی گارنٹی تو نہ تھی کہ وہاں سسرالی رشتے ہم مزاج مل سکتے' پھر آپا بی بار بار کہہ رہی تھیں کہ اویس ملیحہ کو پسند کرتا ہے' تب بھی وہ بہت بے تاب نگاہوں سے ماموں' مامی کے چہرے تک رہا تھا۔

زینب نے صرف چند لمحوں کے لیے سوچا تھا' پھر دھیرے سے مسکراتے ہوئے نجیب کو گردن ہلا کر ہاں کہہ دی۔

"ٹھیک ہے آپا بی' آج سے ملیحہ آپ کی بیٹی ہوئی۔" نجیب مسکراتے ہوئے' بہن کو مخاطب کیا۔

واپسی کے سفر میں نجیب بہت سرشار تھے۔

"اویس ہر لحاظ سے بہترین لڑکا ہے۔ ان شاء اللہ ہماری ملیحہ بہت خوش رہے گی اس کے ساتھ۔ گھر بیٹھے قدرت نے کیا بہترین بر بھیج دیا ہماری بیٹی کے لیے۔" بلا کی خوشی نجیب کے چہرے سے چھلک رہی تھی۔

"مجھے تمہارا بھی شکریہ کہنا ہے زینب! تم نے میری بہن کے سامنے میرا مان رکھا۔ میں جانتا ہوں' آپا بی کے مزاج کی وجہ سے تمہارے ذہن میں کچھ خدشات نے جنم لیا ہو گا' لیکن ہر سسرال میں تھوڑی بہت اونچ نیچ تو ہوتی ہے۔ اگر میاں' بیوی میں آپس میں محبت اور انڈر اسٹینڈنگ ہو تو یہ باتیں بے معنی ہو جاتی ہیں۔ تم نے بھی تو ساری زندگی آپا بی سے سمجھوتا کیا ہے' صرف میری خاطر۔ ان شاء اللہ ملیحہ بھی اویس کے ساتھ بہت خوش رہے گی۔" نجیب بول رہے تھے اور زینب انہیں محبت پاش نگاہوں سے دیکھ رہی تھیں۔

"اویس واقعی ملیحہ کے لیے بہترین انتخاب ہے۔

رہی بات تایابی کے مزاج کی تو اب ان کے مزاج میں پہلے والی سختی نہیں رہی۔ وقت کے ساتھ اور بدل جائیں گی۔" انہوں نے نجیب کو تسلی دی۔

"تایابی کا مزاج بدلے نہ بدلے، مجھے ملیحہ پر پورا بھروسا ہے۔ ہماری بیٹی بہت سمجھ دار ہے۔ تایابی کے گھر آسانی سے ایڈجسٹ کرے گی۔"

نجیب کے لہجے میں ملیحہ کے لیے بہت سا مان اور پیار چھپا تھا۔ زینب مسکرا دیں۔ ان کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ ان کی "سمجھ دار بیٹی" عنقریب اپنے باپ کا مان توڑنے والی ہے۔

گھر جا کر انہوں نے اپنی دانست میں ملیحہ کو اس کی بات طے ہو جانے کی خوش خبری سنائی تھی۔ ان کا خیال تھا کہ اویس کی پسندیدگی یک طرفہ نہیں ہوگی۔ تایابی ملیحہ کے لیے اویس کی جس دیوانہ وار چاہت کا تذکرہ کر رہی تھیں، ملیحہ یقیناً" اویس کی چاہت سے واقف ہوگی۔ وہ دونوں ہم عمر تھے۔ جب بھی اویس یہاں آتا ملیحہ اور عثمان اس کی آمد پر بہت خوش ہو جاتے تھے۔ تینوں کی خوب دوستی تھی۔ اکٹھے محفلیں جمتیں۔ سیر سپاٹے کو اکٹھے نکلتے۔ اویس نے یقیناً" کبھی نہ کبھی تو ملیحہ سے حال دل کہا ہوگا۔ زینب کو اس بات کا پورا یقین تھا جب ہی تو انہوں نے مسکراتے ہوئے ملیحہ کو مخاطب کیا تھا۔

"میری بیٹی نے تو ماں سے اپنے دل کا حال چھپالیا تھا، لیکن ماں اولاد کے دل کی خواہش سے کیسے بے خبر رہ سکتی تھی۔ تایابی نے اویس کے لیے تمہارا رشتہ مانگا ہے اور تمہارے بابا جان نے انہیں ہاں کہہ دی ہے۔ اویس تو ایسے خوش ہو رہا تھا جیسے اسے ہفت اقلیم کی دولت مل گئی ہو۔ بہت خوش قسمت ہے میری بیٹی جو اتنے چاہنے والے شخص کا ساتھ ملا ہے۔"

زینب نے محبت پاش نگاہوں سے بیٹی کا چہرہ دیکھتے ہوئے اسے آگاہ کیا تھا۔ لیکن چند سیکنڈ بعد ہی انہیں احساس ہو گیا کہ بیٹی کے چہرے پر تاثرات ہرگز ایسے نہیں ہیں جیسے کسی خوشی کی خبر سننے کے بعد ہونے چاہئیں وہ آنکھیں پھاڑے حیرانی سے انہیں تک رہی تھی۔ اگر یہ صرف حیرت بھرے تاثرات ہوتے تو بھی غنیمت تھا۔ اس کے چہرے سے تو شدید دکھ جھلک رہا تھا۔

"آپ نے پھوپھو کو ہاں بھی کہہ دی۔ یوں اچانک مجھ سے پوچھے بغیر ہی بی بی جان۔" وہ دکھ سے چور لہجے میں پوچھ رہی تھی۔

"ہمارے خیال میں یہ رشتہ ہر لحاظ سے بہترین تھا۔ نجیب سوچنے کے لیے کچھ مہلت لینا چاہ رہے تھے، لیکن تایابی نے ایسی جلدی مچائی کہ انہیں ہاں کہتے ہی بنی، پھر انہیں یقین تھا کہ تمہیں اس رشتے پر کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔" انہوں نے پیار سے بیٹی کی ٹھوڑی چھوئی۔

"آپ میرے ساتھ ایسا کس طرح کر سکتے ہیں۔" ملیحہ نے سرسراتے لہجے میں انہیں مخاطب کیا۔ زینب نے چونک کر بیٹی کو دیکھا۔ وہ یہ سمجھ رہی تھیں کہ ملیحہ اچانک یہ خبر سن کر ہکا بکا رہ گئی ہے۔ لیکن اس کے تاثرات تو نا قابل فہم تھے۔

"اویس کی پسندیدگی پر یہ رشتہ جڑا ہے۔ وہ بہت چاہتا ہے تمہیں۔" انہوں نے اس بار بھی مسکرانے کی کوشش کرتے ہوئے بیٹی کو آگاہ کیا۔

"اور میں کیا چاہتی ہوں یہ جاننے کی آپ لوگوں نے زحمت بھی نہیں کی۔"

آنسو اب ملیحہ کے گال بھگو رہے تھے۔ اب ہکا بکا ہونے کی باری زینب کی تھی۔

"مجھے اویس سے شادی نہیں کرنی بی بی جان۔ ہرگز نہیں۔ کسی قیمت پر نہیں۔ آپ بس پھوپھو کو انکار کر دیں۔"

"تم تایابی کی وجہ سے انکار مت کرو، اویس کا سوچو وہ کتنا چاہتا ہے تمہیں۔" زینب نے اسے دوبارہ اویس کی چاہت یاد دلائی تھی۔

"لیکن میں اویس کو نہیں چاہتی بی بی جان۔ میں کسی اور کو چاہتی ہوں۔" ملیحہ نے ان کے حواسوں پر بم گرایا تھا۔

"اس کے آگے ایک لفظ مت کہنا ملیحہ! چپ

ہو جاؤ۔" زینب اس کی بات سن کر سخت متوحش ہو گئی تھیں، لیکن ملیحہ چپ نہیں رہی تھی۔

وہ تو کسی مناسب موقع کا انتظار کرتے کرتے پہلے ہی بہت دیر کر چکی تھی۔ اس نے ماں کو سب کچھ بتا ڈالا۔ عاشر اس کا کلاس فیلو تھا۔ دونوں ایک دوسرے کو ٹوٹ کر چاہتے تھے۔ دونوں کا خیال تھا کہ جب عاشر پڑھائی مکمل کر کے اپنے پاؤں پر کھڑا ہو جائے گا، جب ملیحہ کے والدین کے آگے دست سوال بلند کرے گا۔

ملیحہ کے تو وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ یوں اچانک اس کی بات ہی پکی کر دی جائے گی۔ وہ ماں کے سامنے بلک بلک کر رو پڑی تھی۔ انہیں بتا دیا تھا کہ عاشر اس کے لیے کیا حیثیت رکھتا ہے اور یہ کہ وہ عاشر کے بغیر زندگی گزارنے کا سوچ بھی نہیں سکتی۔

"اگر تمہیں اپنے باپ کی عزت کا ذرا سا بھی خیال ہے تو اپنی محبت سے دست برداری اختیار کرنا پڑے گی، تمہارے بابا اپنی بہن کو زبان دے چکے ہیں۔ اویس بہت اچھا لڑکا ہے۔ اپنے دل کو جتنا جلدی سمجھا لو تمہارے حق میں اتنا ہی اچھا ہوگا۔"

زینب نے اسے قطعی انداز میں باور کروا دیا تھا۔ ملیحہ بس روتی ہی رہی تھی۔ زینب کا خیال تھا کہ ملیحہ آہستہ آہستہ صورت حال سے سمجھوتا کر لے گی، لیکن ان ہی دنوں تایابی کی طرف سے باقاعدہ رسم کرنے کا شوشا چھوڑ دیا گیا۔

"تم تو جانتے ہو نجیب! کہ آج کل اویس کے تایا پاکستان آئے ہوئے ہیں۔ جلد ہی ان کی امریکہ واپسی متوقع ہے۔ اویس کے ابو چاہ رہے ہیں کہ بڑے بھائی کی موجودگی میں اویس کی منگنی کی رسم ادا ہو جائے۔ ہم کل ہی تمہاری طرف آ رہے ہیں۔ فرحانہ کے سسرال والے بھی ہمارے ساتھ ہوں گے۔ تمہاری طرف سے ان کی خاطر مدارت میں کوئی کمی نہیں ہونی چاہیے۔ میری بیٹی کے سسرال کا معاملہ ہے۔" تایابی نے چھوٹتے ہی جتا دیا تھا۔

"آپ فکر ہی نہ کریں تایابی۔ سب کچھ آپ کی خواہش کے مطابق انجام پائے گا۔" نجیب نے بہن کو تسلی دی۔ پھر بیوی کو بہن کے فون کے بارے میں بتایا تھا۔

زینب سن کر سخت پریشان ہو گئی تھیں۔ ابھی تو ملیحہ پہلے دھچکے سے ہی نہیں سنبھلی تھی۔ تایابی کی عقابی نگاہیں۔ ملیحہ کی اجڑی شکل دیکھ کر کچھ بھانپ ہی نہ لیں۔

"کیا ہوا بیوی، تم تو پریشان ہی ہو گئیں۔ میں ہوں نا تمہارے ساتھ۔ سارے انتظامات کروانا میری ذمہ داری۔" نجیب نے ان کی پریشان شکل دیکھ کر یہی نتیجہ اخذ کیا تھا کہ وہ تقریب کے انتظامات کی وجہ سے پریشان ہیں۔ سو فوراً" انہیں اپنی مدد کا بھرپور یقین دلوایا۔

زینب نے بدقت مسکراتے ہوئے اثبات میں گردن ہلا دی۔ مدحت اور عثمان بھی بہن کی منگنی کی خبر سن کر پرجوش انداز میں اپنی تیاریاں کرنے لگے تھے۔ عثمان تو ملیحہ سے چھیڑ چھاڑ بھی کر رہا تھا، لیکن ملیحہ اس کے چھیڑنے پر بری طرح رو ہی تو پڑی۔

"ارے بابا! صرف منگنی کرنے آ رہی ہیں پھوپھو، ابھی سے تمہیں رخصت کروا کر ساتھ تھوڑی لے جائیں گی۔" عثمان نے بہن کو بازو کے حلقے میں لے کر تسلی دی۔

"بھائی! آپ آپی کو بلاوجہ تنگ کر رہے ہیں۔ اس موقع پر لڑکیوں کو رونا آ ہی جاتا ہے۔" بہن کی [illegible] سے مدحت کی اپنی آنکھیں بھر آئی تھیں۔

زینب کا دل ملیحہ کی شکل دیکھ کر ڈوب رہا تھا۔ اگر یہ بے وقوف لڑکی پہلے ہی اپنے دل کے حال سے آگاہ کر دیتی تو یہ نوبت درپیش نہ آتی۔ نجیب روشن خیال شخص تھے۔ وہ بیٹی کی پسند کو سند قبولیت بخش سکتے تھے۔ لیکن اب کچھ بھی ہونا ناممکن تھا۔ رات کو تنہائی پاتے ہی زینب پھر ملیحہ کو سمجھانے چلی آئی تھیں۔

"اپنے آپ کو سنبھالو ملیحہ! تایابی تمہاری شکل دیکھ کر کھٹک ہی نہ جائیں۔"

"اب بھی وقت ہے بی بی جان! آپ بابا کو کہیں کہ وہ پھوپھو کو انکار کر دیں۔" ملیحہ ان سے روتے ہوئے چمٹ گئی تھی۔

"بے وقوفی کی باتیں مت کرو ملیحہ۔" انہوں نے ڈپٹتے ہوئے اسے خود سے الگ کیا۔

"میں عاشر کے سوا کسی اور کے ساتھ زندگی گزارنے کا سوچ بھی نہیں سکتی۔" وہ بلک بلک کر روئی تھی۔ زینب نے ایک زوردار طمانچہ اس کے گال پر رسید کیا تھا۔

"آج کے بعد میں عاشر کا نام تمہارے منہ سے نہ سنوں۔ سمجھو مر گیا ہے وہ تمہارے لیے۔" ملیحہ کی جذباتیت کا شاید یہی علاج تھا۔ اسے درشتی سے ڈپٹتے ہوئے وہ کمرے سے چلی گئیں۔

اگلا طلوع ہونے والا دن ان کی زندگی کا سیاہ ترین دن تھا۔ ملیحہ کے گال پر تھپڑ مارنے کی بہت کڑی سزا بھگتنی پڑی تھی انہیں۔ آپا بی ڈھیروں مہمانوں کے ہمراہ بہت دھوم دھام سے منگنی کی رسم کرنے پہنچ چکی تھیں۔ ملیحہ صبح بغیر بتائے یونیورسٹی کے لیے نکل گئی تھی۔

"آپ کیوں فکر کرتی ہیں بی بی جان! آپی جلد آنے کا کہہ کر گئی ہیں۔"

مدحت کی زبانی ہی انہیں ملیحہ کے یونیورسٹی جانے کا پتا چلا تھا اور اس نے ہی ان کی پریشانی بھانپ کر تسلی دی تھی۔ حالانکہ اسے اندازہ بھی نہ تھا کہ ماں کے دل میں کن خدشات نے جنم لیا ہے۔ وہ صرف یہی سوچ سکی تھی کہ وہ مہمانوں کی آمد اور کاموں کے دباؤ کی وجہ سے پریشان ہیں۔ گھریلو کام کاج میں بالکل اناڑی ہونے کے باوجود اس روز مدحت نے ان کا ہاتھ بٹانے کی ہر ممکن کوشش کی تھی۔ عثمان نے بھی آج اپنے اکیڈمی ٹیوشن سے چھٹی کی تھی۔

آپا بی اور ان کے مہمانوں کا استقبال کرنے کے لیے سب ہی جی جان سے مصروف تھے، لیکن زینب کا دل خدشات کا شکار تھا۔ ان کی نگاہیں بار بار گھڑی کی طرف اٹھ رہی تھیں۔ آپا بی اپنے سسرالی عزیزوں اور دیگر مہمانوں کے ہمراہ پہنچ چکی تھیں، لیکن ملیحہ کا نام و نشان تک نہ تھا۔ مہمانوں کی طرف سے پہلا سوال ملیحہ کے متعلق ہی کیا گیا تھا۔ وہ لوگ اویس کی منگیتر دیکھنے کے آرزو مند تھے۔

"ملیحہ یونیورسٹی گئی ہے، بس آتی ہی ہوگی۔" زینب نے اپنے فق پڑتے چہرے پر زبردستی کی مسکراہٹ لاتے ہوئے بتایا تھا۔

"یہ بھی خوب رہی زینب! آج کے دن بھی بیٹی کو یونیورسٹی بھیج دیا۔ کچھ تو سوچا ہوتا۔" آپا بی نے سب کے سامنے ہی ناراضی کا اظہار کیا۔

"آج اس کا بہت ضروری ٹیسٹ تھا۔ بس اب پہنچنے ہی والی ہوگی۔" انہوں نے دل کی خواہش کو لفظوں میں ڈھال کر جواب دیا۔ دل یہی راگ الاپ رہا تھا کہ کاش جلدی سے ملیحہ آجائے اور ان کے تمام خدشات غلط ثابت ہوں۔ گھڑی کی سوئیاں آگے سرکتی جا رہی تھیں اور ان کا دل اندر ہی اندر ڈوبتا جا رہا تھا۔ بھاگ دوڑ اور کاموں میں مصروف نجیب کو بھی اب پتا چلا تھا کہ ملیحہ گھر پر موجود نہیں ہے۔

"تمہیں آج اسے یونیورسٹی نہیں بھیجنا چاہیے تھا زینب! آپا بی سخت خفا ہو رہی ہیں اور وہ خفا ہونے میں حق بجانب ہیں۔ مہمانوں سے گھر بھرا پڑا ہے۔ تقریب کے سب انتظامات مکمل ہیں اور ملیحہ گھر پر موجود نہیں۔" نجیب ان سے ناراضی سے گویا ہوئے۔

"بس آتی ہی ہوگی۔" وہ گھڑی پر نگاہیں جما کر دھیرے سے بولی تھیں۔ نجیب کو ان کا انداز کچھ غیر معمولی لگا تھا۔ وہ کچھ کھٹکے تو تھے، لیکن اپنا وہم سمجھ کر نظر انداز کر گئے۔

"اچھا اب تم بھی تیار ہو جاؤ۔ آپا بی کو دیکھا ہے، کیسے زرق برق کپڑے پہنے ہیں آج۔ وہ دولہا کی ماں ہیں تو دلہن کی ماں کو بھی کسی سے کم تو نہیں لگنا چاہیے نا۔"

اپنی کچھ لمحوں پہلے والی بات کا اثر زائل کرنے کو وہ ہلکے پھلکے انداز میں گویا ہوئے۔ زینب نے سر اٹھا کر شوہر کو دیکھا۔ انہوں نے جیسے نجیب کی بات سنی ہی نہ تھی۔ ان کی نگاہیں پھر گھڑی کی طرف اٹھیں۔ عام دنوں میں ملیحہ اس وقت تک گھر آچکی ہوتی تھی۔ آج کے دن ملیحہ کی گھر سے غیر موجودگی کا صرف ایک ہی مطلب تھا۔ وہ اویس سے منگنی کرنا ہی نہ چاہتی تھی۔ ایک دن پہلے والے تھپڑ مار کر یہ سمجھے بیٹھی تھیں کہ انہوں نے ملیحہ کو باور کروا دیا ہے۔ ماں، باپ کے کیے ہوئے فیصلے کو حتمی فیصلہ سمجھے۔ ملیحہ نے بحث مباحثے کے بجائے منظر سے غائب ہو کر ان کے فیصلے کو چیلنج کر دیا تھا۔ بیٹی کی پلاننگ ان کی سمجھ میں آگئی تھی۔ ان کا جی چاہ رہا تھا کہ وہ بھی کوئی سلیمانی ٹوپی پہن کر منظر سے غائب ہو جائیں۔

نجیب جانے کیا بول رہے تھے۔ انہوں نے خالی خالی نگاہوں سے نجیب کو دیکھا۔ یہ فرشتہ صفت شخص ان کا شوہر ہی نہیں ان کا محبوب بھی تھا۔ ملیحہ کو سگے باپ سے بڑھ کر چاہا اس نے اور ان کی بیٹی نے اس چاہت کا کیا اچھا جواب دیا تھا۔ کیا وہ آج کے بعد نجیب سے نگاہیں ملا پائیں گی۔ وہ بے دم سی ہو کر بیڈ پر بیٹھی تھیں۔

"کیا ہوا زینب، تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے؟" نجیب نے پوچھا تب ہی عثمان داخل ہوا۔ وہ بھی گھبرایا ہوا اور پریشان تھا۔

"بی بی جان! ابھی ملیحہ کی ایک دوست کا فون آیا ہے۔ اس نے یہ بتانے کے لیے فون کیا تھا کہ کل بھی یونیورسٹی میں اسٹرائیک ہے، کوئی کلاس نہیں ہوگی، جب میں نے اس سے کہا کہ ملیحہ تو آج بھی یونیورسٹی گئی ہے تو وہ کہہ رہی تھی کہ آج بھی اسٹرائیک کے سبب کوئی کلاس نہیں ہوئی تھی۔" عثمان نے پریشانی کے عالم میں ماں کو آگاہ کیا۔ وہ چپ چاپ بیٹے کی شکل تکتی رہیں۔

"میں خود یونیورسٹی جاتا ہوں اور پلیز یہ اسٹرائیک والی بات پھوپھو کے سامنے مت کہیے گا۔ پہلے ہی ان کا موڈ سخت آف ہے۔ پتا نہیں کیا معاملہ ہے۔ ملیحہ یونیورسٹی گئی ہی کیوں اور پھر اب تک لوٹی کیوں نہیں۔" عثمان کی پریشانی اس کے چہرے سے جھلک رہی تھی۔

"مجھے معاف کر دیں نجیب!" زینب نے یک لخت نجیب کے سامنے ہاتھ جوڑ دیے تھے۔ وہ اب زار و قطار رو رہی تھیں۔ ان کے اعصاب مزید بوجھ برداشت کرنے کے قابل نہ تھے۔ انہیں یہ بوجھ نجیب کے کندھوں پر منتقل کرنا ہی تھا۔

"ملیحہ جان بوجھ کر آج کے دن گھر سے باہر نکلی ہے۔ وہ ابھی واپس نہیں آئے گی اور پتا نہیں واپس آئے گی بھی یا نہیں۔" نجیب پریشانی کے عالم میں ان کے قریب آئے تھے جب انہوں نے روتے ہوئے انہیں آگاہ کیا۔

"کیا کہہ رہی ہو زینب۔" نجیب ان کی بات سن کر ہکا بکا رہ گئے تھے۔ پاس کھڑے عثمان کا حال بھی کچھ مختلف نہ تھا۔

"وہ اویس سے منگنی نہیں کرنا چاہتی تھی۔ اپنے کلاس فیلو کو پسند کرتی تھی۔ میں نے بہت سمجھایا۔ بہت سمجھایا اسے۔ مار کر بھی دیکھ لیا۔ کیا خبر تھی یوں بدلہ لے گی مجھ سے۔ اپنی چند دن کی محبت ماں باپ کی عزت سے زیادہ قیمتی لگی اسے۔ وہ ہمیں رسوا کر گئی نجیب۔"

زینب بری طرح رو پڑی تھیں۔ ان کے جڑے ہاتھ جو نجیب نے اپنی گرفت میں لے لیے تھے یک لخت وہ گرفت کچھ ڈھیلی پڑی تھی۔ سامنے آپا بی کھڑی تھیں۔ قہر برساتی نگاہوں سے زینب کو گھور رہی تھیں۔

"میں یہی سن گن لینے آئی تھی کہ بند کمرے میں کون سا ڈرامہ ہو رہا ہے۔ ارے میں تو پہلے ہی کھٹک گئی تھی کہ دال میں کچھ کالا ہے۔ ایسی مردنی چھائی ہوئی تھی اس کے چہرے پر۔" انہوں نے نفرت سے روتی ہوئی زینب کو دیکھا تھا۔

"اس حرافہ ماں کی بیٹی سے اسی طرح کے کرتوت کی توقع تھی۔ ساری عمر میرے بھائی پر جادو کیے رکھا بیوی کے سوا اسے کچھ نظر ہی نہ آیا۔ بیٹی نے ویسا ہی سحر میرے بچے پر پھونک ڈالا۔ باولا ہو گیا وہ اس کی چاہت میں۔ کہتا تھا مر جاؤں گا۔ ملیحہ کے سوا کسی سے شادی نہ کروں گا۔ دل پر جبر کر کے صرف اس کی خوشی کی خاطر تمہارے آگے دامن پھیلایا۔ اب بتاؤ کیا کروں میں۔

جن پچیس لوگوں کو اپنے ساتھ لائی ہوں' انہیں کیا جاکر بتاؤں کہ لڑکی اپنے کسی یار کے ساتھ فرار ہوگئی ہے۔"

"پھوپھو پلیز' آگے ایک لفظ نہیں۔" عثمان نے اپنے اندر اُمڈتی اشتعال کی لہر کو بہت مشکل سے کنٹرول کرتے ہوئے انہیں ٹوکا۔

"محض بی بی جان کا خدشہ ہے کہ ملیحہ واپس نہیں آئے گی۔ میں اسے ڈھونڈنے جا رہا ہوں۔ وہ وہیں یونیورسٹی میں ہی ہوگی۔" عثمان کا لہجہ پریقین تھا۔

"نہ بھائی! ہمیں تو تم معاف کرو جانتے بوجھتے کسی ایسی لڑکی کو اپنے بیٹے کے گلے کا طوق نہیں بناؤں گی۔ شادی کے بعد اپنے آشنا کے ساتھ فرار ہوگئی تو۔"

"خدا کے لیے آپا بی چپ ہو جائیں۔" نجیب نے ان کے سامنے باقاعدہ ہاتھ جوڑ دیے تھے۔ دماغ ابھی زینب کی بتائی گئی بات کے صدمے سے نکلا نہ تھا کہ آپا بی نے الگ ہنگامہ شروع کر دیا تھا۔

"ہاں بھئی' چپ بھی آپا بی کو ہی کرواؤ اپنی بیوی سے کیوں نہیں پوچھتے کہ پہلے یہ منہ میں کیوں گھنگھنیاں ڈالے بیٹھی رہی' اگر پہلے منہ سے پھوٹ دیتی تو کاہے کو آج ہم یوں رسوا ہوتے' اب بتاؤ اپنے ساتھ آئے مہمانوں سے کیا کہوں جاکر۔ ارے...... میری تو بیٹی کے سسرالی بھی ساتھ آئے ہیں۔ کتنے فخر اور مان سے آئی تھی سب کو لے کر اپنے بھائی کے گھر کیا پتا تھا بھائی کے گھر جاکر۔"

"آپ کے مہمانوں کے سامنے میں ہاتھ جوڑ کر معذرت کر لیتا ہوں۔ اس کے سوا اور کیا کر سکتا ہوں میں۔" نجیب تھکے ہارے انداز میں بولے تھے۔

زینب نے تڑپ کر شوہر کو دیکھا۔ آپا بی کی تیوریوں کے بل کم نہ ہوئے تھے۔ صورت حال ان کے لیے بھی کم پریشان کن نہیں تھی۔ اپنے سسرال والوں اور بیٹی کی ہونے والی سسرال کے سامنے ہونے والی سبکی کا تصور ہی ان کے لیے سوہان روح تھا۔ انہوں نے ملیحہ کا رشتہ صرف اور صرف اویس کی ملیحہ کے لیے دیوانگی دیکھ کر مانگا تھا۔

لیکن اب۔ انہوں نے تنفر سے سوچا۔ نجیب اور زینب چاہے ان کے سامنے ہاتھ جوڑ لیں وہ کبھی ملیحہ کو اویس کی زندگی میں شامل نہیں کریں گی' لیکن مہمانوں کے سامنے سبکی کا تصور ان کے لیے خاصا پریشان کن تھا۔

"کچھ دیر انتظار کر لیں پھوپھو! ان شاء اللہ ملیحہ آجائے گی۔" ماں کا ستا ہوا چہرہ اور باپ کا پریشان چہرہ دیکھ کر عثمان نے ہی دوبارہ اپنی پھوپھی کو مخاطب کرنے کی ہمت کی۔

"بس عثمان۔" آپا بی نے بہت نخوت سے اپنا ہاتھ فضا میں بلند کیا۔ "سب کچھ جانتے بوجھتے میں اپنے بیٹے کی زندگی برباد نہیں کر سکتی۔ مجھے تو ملیحہ ویسے بھی پسند نہیں تھی۔ صرف اویس کی ضد نے مجھے مجبور کر دیا تھا۔ اب جب اویس کو صورت حال کا علم ہوگا تو اپنی حماقت کا احساس بھی ہو جائے گا۔ لیکن میں جب آج تمہارے گھر اپنے بیٹے کی منگنی کی رسم کرنے آئی ہوں تو رسم کر کے ہی جاؤں گی۔" آپا بی کی اس بے سروپا بات پر سب نے ہی انہیں الجھ کر دیکھا تھا۔

"مدحت میری بھتیجی ہے' میرا اپنا خون' اویس راضی نہ ہوا تھا' ورنہ میں تو تم سے پہلے مدحت کا رشتہ ہی مانگنا چاہ رہی تھی۔ آج میں مدحت کی انگلی میں اویس کے نام کی انگوٹھی پہناؤں گی۔"

آپا بی نے مدحت کا رشتہ نہ مانگا تھا' بلکہ اپنا فیصلہ سنایا تھا۔ زینب نے تڑپ کر انہیں دیکھا۔

"مدحت تو ابھی بہت چھوٹی ہے آپا بی! اویس کی اور اس کی عمروں میں بھی بہت فرق ہے وہ تو۔"

"میں تم سے مخاطب نہیں ہوں زینب!" انہوں نے تنفر سے زینب کی بات کاٹی۔

"ہاں نجیب! بتاؤ۔ گھر آئی رسم کو ڈیل کر کے واپس بھیجو گے یا مجھے مدحت کو انگوٹھی پہنانے دو گے۔" وہ نجیب سے مخاطب ہوئی تھیں۔ نجیب کے چہرے پر برسوں کی تھکن سمٹ آئی تھی۔ زینب ملتجی نگاہوں سے شوہر کو دیکھ رہی تھیں۔ کاش وہ آپا بی کو انکار میں جواب دے دیں۔ مدحت تو ابھی بہت چھوٹی تھی۔ ان کی کم عمر' بے وقوف سی بے حد حساس طبیعت والی بیٹی۔ جس کو ایف ایس سی میں داخلہ لیے چند ماہ ہی ہوئے تھے۔ ڈاکٹر بننا جس کا جنون تھا۔ اویس بھی جس کے چھوٹی بہنوں کی طرح ہی لاڈ اٹھاتا تھا۔ آپا بی یہ کیسا بے جوڑ رشتہ جوڑنا چاہ رہی تھیں۔

وہ نگاہوں ہی نگاہوں میں شوہر کو کچھ بولنے سے باز رکھنا چاہ رہی تھیں' لیکن نجیب نے ان کی سمت دیکھا ہی نہ تھا۔

"آپ مدحت کو انگوٹھی پہنا دیں آپا بی! مجھے کوئی اعتراض نہیں۔" انہوں نے سنجیدہ اور سپاٹ سے انداز میں جواب دیا تھا۔ آپا بی شاداں و فرحاں واپس مڑ گئی تھیں۔

"یہ آپ نے کیا کر دیا نجیب! مدحت ذہنی طور پر اس رشتے کو۔"

"میں نے جو کیا' میرے پاس اس کے سوا کوئی آپشن ہی نہ تھا زینب۔" نجیب نے شاکی انداز میں ان کی بات کاٹی۔ وہ چپ کی چپ رہ گئیں۔

"تمہیں ملیحہ کی پسند کے متعلق مجھے لاعلم نہیں رکھنا چاہیے تھا۔ وہ جو پسند کرتی ہے' کوئی برا ایشو نہیں۔ اگر مجھے پہلے علم ہوتا تو میں اویس کے رشتے پر ہامی ہی نہ بھرتا۔"

"مجھے بھی پہلے کہیں پتا تھا نجیب۔" زینب نے تڑپ کر ان کی بات کاٹی تھی۔

"آج سے پہلے تو علم ہو چکا تھا نا زینب! تم نے پھر بھی مجھے بتانا گوارا نہ کیا۔" نجیب ان سے بے پناہ خفا لگ رہے تھے۔

زینب انہیں بے بسی سے دیکھ کر رہ گئیں۔ جس شوہر کی آنکھوں میں زندگی بھر اپنے لیے محبت دیکھی تھی ان کی سرد مہر نگاہیں سہنا زینب کے بس سے باہر تھا۔ جو کچھ ہوا' وہ اس کے لیے ملیحہ کو نہیں' بلکہ زینب کو قصوروار سمجھ رہے تھے۔ اگر معاملہ پہلے ان کے علم میں آجاتا تو وہ سلیقے سے بھاؤ سے آپا بی کو انکار کر سکتے تھے۔ حالانکہ آپا بی نے پھر بھی طوفان ہی مچانا تھا' لیکن اب جب وہ اپنے سسرال والوں کے علاوہ اپنی بیٹی کے ہونے والے سسرالیوں سمیت بھائی کے گھر آن پہنچی تھیں۔ نجیب چاہ کر بھی انہیں خالی ہاتھ نہیں لوٹا سکتے تھے۔

دل پر پتھر رکھ کر انہوں نے مدحت اور اویس کے رشتے کے لیے ہاں کر دی تھی۔ زینب چپ چاپ آنسو بہانے لگی تھیں۔ نجیب نے رک کر بیوی کے آنسو پونچھنے کی ضرورت محسوس نہ کی' وہ کمرے سے باہر چلے گئے تھے۔ پیچھے عثمان' ماں کو ساتھ لگائے تسلی دینے لگا تھا۔

جس وقت آپا بی حیران پریشان اور حواس باختہ سی مدحت کو انگوٹھی پہنا رہی تھیں' ملیحہ گھر واپس لوٹی تھی۔ وہ بھی حیرت بھری نگاہوں سے ماں کو تکنے لگی۔ زینب نے اس کی جانب سے منہ پھیر لیا۔ سچ یہی تھا کہ وہ اپنی بیٹی کی شکل تک نہ دیکھنا چاہتی تھیں۔

اس سے پہلے ملیحہ پر کسی اور کی نگاہ پڑتی عثمان بہن کا ہاتھ پکڑ کر ایک طرف لے گیا تھا۔ آپا بی رسم کر کے بہت مسرور انداز میں واپس لوٹی تھیں' لیکن نجیب ہاؤس میں جیسے مرگ کا سماں تھا۔ مدحت کو تو ابھی تک ساری صورت حال کا ٹھیک سے علم بھی نہ ہو سکا تھا۔ نجیب نے محض اس سے اتنا کہا تھا کہ آج اسے اپنے باپ کی عزت کی خاطر لب سیے رکھنے ہیں اور جو کچھ ہو رہا ہے' اسے ہونے دینا ہے۔

کم عمر اور کم عقل سی مدحت کی سمجھ میں یہ بات آگئی تھی۔ اس نے باپ کا مان اور عزت رکھ لی تھی۔ وہ دل میں مچلتے سوالوں کو زبان پر نہ لائی تھی۔ آپا بی نے اسے انگوٹھی پہنائی اور اس نے پہن لی۔ زینب کا دل اس کی سعادت مندی پر دھاڑیں مار کر رو رہا تھا۔ ملیحہ نے ثابت کر دیا تھا کہ وہ نجیب کو اپنا باپ سمجھتی ہی نہیں۔ سمجھتی ہوتی تو مدحت کی جگہ وہ بیٹھی ہوتی۔

نجیب نے ساری عمر ان کی بیٹی کی کتنے پیار سے پرورش کی اور وہ اس پیار کو اپنا حق سمجھ کر وصول کرتی رہی۔ اپنی چند روزہ محبت اسے باپ کی عزت سے قیمتی لگی تھی۔ ہمیشہ سر اٹھا کر چلنے والے نجیب کے کندھے

آج کتنے جھٹکے لگ رہے تھے۔ زینب خود میں ان سے نگاہیں ملانے کی ہمت نہ پا رہی تھیں۔ اویس عمر میں مدحت سے دس گیارہ سال بڑا تھا۔ رات کو ملیحہ ڈرتے ڈرتے ان کے پاس آئی تھی۔

"مجھے معاف کر دیں بی بی جان! ہائے گاڈ آج جو ہوا میں ایسا ہرگز نہ چاہتی تھی۔" اس نے ماں کو صفائی دینے کی کوشش کی۔ زینب نے اس پر تنفر بھری نگاہ ڈالی۔

"عاشر کا ایکسیڈنٹ ہو گیا تھا بی بی جان ورنہ مجھے۔" اس کے گلے میں آنسوؤں کا گولا سا اٹکا تھا۔ ماں کی خاموش نفرت بھری نگاہیں اس کا دل چیر رہی تھیں۔ پھر بھی وہ وضاحت دینے کی اپنی سی کوشش کرنے لگی۔

"آپ میرا یقین کریں۔ اگر آپ یہ سمجھ رہی ہیں کہ میں منگنی سے بچنے کی خاطر اتنی دیر گھر سے باہر رہی تو یہ غلط ہے، حالات ہی کچھ ایسے ہو گئے تھے۔ عاشر کو ہوش آنے سے پہلے میرا کسی اور طرف دھیان ہی نہ گیا، ورنہ ہم نے سوچا تھا کہ میں آج چپ چاپ آپا سے انگوٹھی پہن لوں، بعد میں، میں بابا کو ساری حقیقت بتا دیتی۔ آپ نے تو میری بات سنی ہی نہ تھی۔ بابا یقیناً میرا ساتھ دیتے ہوئے یہ رشتہ ختم کر دیتے۔" اپنی دانست میں وہ صفائی پیش کر رہی تھی۔ زینب کا چہرہ غصے سے سرخ پڑ گیا تھا۔

"جب تم نے یہ سوچ ہی رکھا تھا کہ تمہاری خاطر تمہارا باپ اپنے قول سے پھر جائے گا تو پھر ملال کیوں کر رہی ہو۔ جو ہونا تھا آج ہو گیا، منگنی ٹوٹنا تمہارے نزدیک مذاق تھا، پھر تمہارے باپ کا شملہ نیچا نہ ہوتا؟ شکر ہے آج مدحت نے قربانی دے کر ہمیں ذلیل ہونے سے بچا لیا۔ تم نے تو اپنے باپ کو رسوا کرنے میں کوئی کسر نہ چھوڑی تھی۔" وہ بولتے بولتے ہانپ گئی تھیں۔ غصے کی شدت سے ان کے لب کپکپا رہے تھے۔ ملیحہ انہیں بے بسی سے دیکھے جا رہی تھی۔

"اور میں بے وقوف ہوں جو بار بار نجیب کو تمہارا باپ کہہ کر مخاطب کر رہی ہوں۔ تمہاری رگوں میں تو زبیر شاہ جیسے کم ظرف شخص کا خون دوڑ رہا ہے۔ آج ثابت ہو گیا۔"

"زینب! بس ایک لفظ مزید مت کہنا۔" نجیب جانے کس لمحے کمرے میں داخل ہوئے تھے۔ انہوں نے بیوی کو انتہائی ناگواری سے ٹوکا۔ وہ یک لخت چپ ہو گئی تھیں۔ نجیب ملیحہ کی جانب متوجہ ہوئے جو خفت اور شرمندگی کے زیر اثر انگلیاں چٹخا رہی تھی۔

"تم اس لڑکے سے کہو کہ مجھ سے آکر ملے، بلکہ اپنے گھر والوں کے ساتھ آئے۔ اگر مجھے لوگ مناسب لگے تو میں تمہاری خواہش پوری کر دوں گا۔" انہوں نے ملیحہ کو قدرے نرمی سے مخاطب کیا۔

"سوری بابا! سوری فار ایوری تھنگ۔" ملیحہ ان سے بے ساختہ لپٹ کر زار و قطار رونے لگی۔ انہوں نے دھیرے سے اس کا سر تھپتھپا کر خود سے الگ کیا۔ زینب عجیب سے محسوسات میں گھر گئی تھیں۔ ملیحہ کمرے سے چلی گئی، پھر بھی وہ شوہر سے نظریں نہ ملا پا رہی تھیں۔

"ملیحہ کا قصور اتنا بڑا نہیں ہے، غلطی میری تھی کہ اس سے پوچھے بنا اس کی زندگی کا فیصلہ کر دیا۔ لیکن کاش زینب! جب تمہیں معاملے کا علم ہو گیا تھا تو تم مجھے بے خبر نہ رکھتیں۔ تم ملیحہ کو دوش دے رہی ہو لیکن تم نے خود مجھے اس کا باپ سمجھا ہی نہیں۔ اگر تم مجھے حقیقت حال سے باخبر کر دیتیں، چاہے وہ دن پہلے ہی سہی تو وہ نہ ہوتا جو آج ہوا۔"

زینب نے خاموشی سے شوہر کا شکوہ سنا تھا۔ وہ جواب میں کچھ نہ بولیں۔ ان کے پاس بولنے کے لیے کچھ بچا ہی نہ تھا۔ ملیحہ نے انہیں شرمندگی کے مستقل عذاب میں مبتلا کر دیا تھا۔ مدحت کے لبوں پر بھی چپ لگ گئی تھی۔ وہ ملیحہ کے لیے اویس کی چاہت سے بخوبی آگاہ تھی۔ باپ کی عزت کی خاطر وہ اس بے جوڑ اور ان چاہے رشتے میں بندھ تو گئی تھی، لیکن اس کا ذہن اس حقیقت کو قبول ہی نہ کر پا رہا تھا۔

"بابا نے یہ میرے ساتھ کیا کر دیا بی بی جان! اویس بھائی تو میرے لیے بالکل بھائیوں جیسے ہیں۔ اویس بھائی ملیحہ آپی کو دیوانوں کی طرح چاہتے ہیں۔ ان کی شریک سفر ملیحہ آپی کو ہی بننا چاہیے تھا بابا نے"

"تم اپنے بابا کو بار بار کیوں دوش دے رہی ہو مدحت!" زینب نے آزردہ لہجے میں بیٹی کی بات کاٹی۔ "یہ سب ملیحہ کا کیا دھرا ہے، وہ کسی اور کو پسند کرتی ہے۔" ان کے لہجے میں برسوں کی تھکن تھی۔

"اویس بھائی سے زیادہ آپی کو کون چاہ سکتا ہے بھلا۔ آپ نے بھی اویس بھائی کو ملیحہ آپی کی جانب تکتے ہوئے دیکھا ہے بی بی جان! ان کی آنکھوں میں قندیلیں سی جلنے لگتی ہیں۔ مجھے حیرت ہوتی ہے کہ اویس بھائی کے جذبوں کی تپش ملیحہ آپی تک کیوں نہیں پہنچی۔" مدحت حیران ہو رہی تھی اور زینب اس سے بڑھ کر حیران تھیں۔ وہ تو مدحت کو کم عقل اور بے وقوف سا سمجھتی تھیں۔ اسے تو اس چیز کی بھی خبر تھی، جس سے پورا گھر بے خبر تھا۔

"اویس بھائی کی دیوانہ وار چاہت ملیحہ آپی سے اپنا آپ منوا ہی لیتی۔ میں سب کچھ جانتے بوجھتے کیسے اویس بھائی کی زندگی میں شامل ہو سکتی ہوں۔" مدحت آنکھوں میں آنسو بھر کر ماں سے وہ سوال کر رہی تھی، جس کا ان کے پاس کوئی جواب نہ تھا۔

☆ ☆ ☆

نجیب نے ملیحہ سے کہا تھا کہ وہ عاشر کو ان سے ملوانے لے آئے۔ عاشر اگلے ہی روز نجیب ہاؤس پہنچ گیا تھا۔ نجیب کے کہنے کے باوجود زینب اس سے نہ ملیں۔ ان کی بیٹی نے ان کا اتنا دل دکھایا تھا کہ اب ان کا دل خود بخود پتھر بن گیا تھا۔

نجیب نے عاشر کو قبولیت بخش دی تھی۔

"اچھا لڑکا ہے عاشر، سلجھی ہوئی شخصیت کا مالک، مہذب اور تعلیم یافتہ، ماں باپ فوت ہو چکے، والدین کی اکلوتی اولاد ہے۔ ان کے انتقال کے بعد اس کی خالہ نے اس کی پرورش کی ہے، مالی لحاظ سے فیملی بیک گراؤنڈ مضبوط نہیں ہے، لیکن لڑکا پڑھا لکھا ہے، ذہین، پھر آگے بڑھنے کی لگن ہے۔ ان شاء اللہ ملیحہ اس کے ساتھ اچھی زندگی گزارے گی۔" نجیب بیوی کے بغیر پوچھے انہیں تفصیلات سے آگاہ کر رہے تھے۔

"وہ جیسا بھی ہے، مجھے اس سے کوئی سروکار نہیں۔ میرے بس میں ہوتا تو آج اسے اپنے گھر کی دہلیز پار نہ کرنے دیتی۔" زینب، ملیحہ کا قصور بخشنے پر تیار نہ تھیں۔

"مسائل کا حل نکالنے کے لیے حقیقت پسند بن کر سوچنا پڑتا ہے زینب بیگم! اولاد کی غلطی چاہے جتنی مرضی بڑی ہو، والدین کا ظرف اس سے بھی بڑا ہونا چاہیے۔" نجیب نے انہیں رسانیت سے مخاطب کیا۔ زینب چند لمحوں کے لیے خاموش ہو گئی تھیں۔

"مدحت بہت پریشان ہے، وہ جانتی ہے اویس ملیحہ کو چاہتا تھا۔ وہ اویس اور اپنے درمیان جڑے رشتے کو ذہنی طور پر قبول نہیں کر پا رہی۔" انہوں نے دھیرے سے نجیب کو مخاطب کیا۔ اس بار چند لمحوں کے لیے خاموش ہونے کی باری نجیب کی تھی۔

"اسے سمجھائیے، وقت گزرنے کے ساتھ سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔ اویس سمجھ دار لڑکا ہے۔ وہ اپنے طرز عمل سے خود ہی مدحت کے دل میں چھپے خدشات ختم کر دے گا۔" بھانجے کے متعلق نجیب حد سے زیادہ خوش گمان تھے۔ زینب نے دل میں دعا کی تھی کہ ان کی خوش گمانی درست ثابت ہو۔

☆ ☆ ☆

ملیحہ کے پیپرز ختم ہونے کے ساتھ ہی عاشر کی خالہ شادی کی تاریخ لینے آ گئی تھیں۔ عاشر پارٹ ٹائم جاب پہلے ہی کر رہا تھا۔ اس کی ذہانت اور تعلیمی قابلیت کی بنا پر شہر کے مشہور پرائیویٹ کالج میں لیکچرر شپ کی آفر ہوئی تھی۔ تنخواہ ٹھیک ٹھاک تھی۔ عاشر نے آفر قبول کر لی تھی۔ لیکن اسے امید تھی کہ وہ بہت جلد سرکاری ملازمت بھی حاصل کر لے گا۔

نجیب نے عاشر کی خالہ کو ان کی خواہش کے مطابق شادی کی تاریخ دے دی تھی۔ زینب بھی بیٹی سے کب تک خفا رہتیں۔ بے شک ان کے اور ملیحہ کے درمیان

تجک اور سرد مہری کی عجیب سی فضا قائم تھی۔ (ججک ملیحہ کی جانب سے اور سرد مہری ان کی جانب سے) لیکن اب بیٹی کی متوقع جدائی کے خیال سے ان کا دل پگھل سا گیا تھا۔ وہ شادی کی تیاریاں کرنے لگی تھیں۔ مدحت بھی اپنا غم پس پشت ڈالتے ہوئے بہن کی خوشی میں دل سے شریک تھی۔ عثمان ذمہ دار بھائی کا ثبوت دیتے ہوئے سب کام اپنی نگرانی میں کروا رہا تھا۔ کس دھوم دھام سے ان کی بیٹی وداع ہونے جا رہی تھی۔ زینب کی آنکھیں احساس تشکر سے بھیگ بھیگ جاتیں، لیکن جانے کیوں ان کا دل کسی انہونے خدشے سے ڈر رہا تھا اور وہ انسوئی ہو کر رہی۔ شادی سے ٹھیک پندرہ دن پہلے آپا بی کی آمد ہوئی تھی۔ وہ بے حد جلالی موڈ میں تھیں۔

"چپ چپاتے ملیحہ کی شادی کی تاریخ رکھ دی اور مجھے خبر تک نہ ہونے دی۔"

"ایک، دو روز میں کارڈ لے کر میں آپ کے پاس آنے ہی والا تھا آپا بی!" نجیب نے انہیں رسانیت سے مخاطب کیا، جبکہ زینب، نند کے تیور دیکھ کر انتہائی خائف ہو رہی تھیں۔ جانے وہ اب کیا کہنے والی تھیں۔

"مانا ملیحہ سے میرا کوئی رشتہ نہیں۔ نہ ہی مجھے اس کے کسی معاملے میں بولنے کا حق ہے، لیکن مدحت تو تمہارے گھر میری امانت ہے۔ تم اپنی بیوی کی بیٹی کو دھوم دھام سے رخصت کرنے لگے ہو تو مجھے میرا قصور بتاؤ۔ ہمیں انتظار میں کیوں لٹکا رکھا ہے۔ مجھے ملیحہ کے ساتھ مدحت کی رخصتی چاہیے۔" آپا بی نے قطعی انداز میں اپنا مطالبہ بھائی کے سامنے رکھا۔

"لیکن آپا بی! یوں اچانک۔" نجیب صحیح معنوں میں ان کی بات سن کر گڑبڑا گئے تھے۔

"کیوں ملیحہ کی شادی یوں اچانک طے نہیں کی تم نے؟" وہ چمک کر بولی تھیں۔

"ملیحہ پڑھائی سے فارغ ہو چکی ہے آپا بی! شادی کے لیے اس کی یہی عمر مناسب ہے، جبکہ مدحت تو ابھی انتہائی کم عمر ہے۔ آپ کی خواہش پر میں نے اس کی منگنی تو کر دی، لیکن میں ابھی اس کی شادی نہیں کر سکتا۔" نجیب نے ٹھہرے ٹھہرے لہجے میں بہن کو مخاطب کیا۔

"بہت خوب! یعنی میری خواہش پر تم نے بیٹی کی منگنی کی۔" آپا بی استہزائیہ انداز میں ہنسی تھیں۔

"ارے یہ کیوں نہیں کہتے کہ تمہاری بیوی کی بیٹی نے ذلت کا جو گڑھا تمہارے اور میرے لیے کھودا تھا، اس سے بچنے کی خاطر تم میری تجویز پر راضی ہوئے، اس کے سوا تمہارے اور میرے پاس کوئی راستہ بچا تھا کیا؟" وہ چمک کر پوچھ رہی تھیں۔

"گزری باتوں کو دہرانے سے کیا حاصل آپا بی! جوڑے آسمانوں پر بنتے ہیں، اویس کا جوڑ مدحت سے ہی لکھا ہو گا۔ مدحت میرے پاس آپ کی امانت ہے، لیکن آپ خود سوچیں، کیا شادی کے لیے اس کی عمر مناسب ہے۔ پھر ابھی اس کی تعلیم بھی ادھوری ہے۔" نجیب اپنے تئیں نرم لہجے میں بہن کو سمجھانے کی کوشش کر رہے تھے۔

"اور میرے بیٹے کے متعلق کیا کہتے ہو، کیا اس کی شادی کے لیے یہی مناسب عمر نہیں ہے۔ مدحت کی پڑھائی ختم ہونے کے انتظار میں، میں اسے بوڑھا کر دوں۔ دونوں کی عمروں میں جتنا فرق ہے، وہ تو ہونے سے رہا۔ میری جگہ پر تم اپنے آپ کو رکھ کر سوچو۔ اویس میرا اکلوتا بیٹا ہے۔ اس کے سر پر سہرا سجانے کا ارمان کب سے میرے دل میں دبا ہے۔ سو بیماریاں میری جان کو چمٹی ہیں۔ میں کچھ ہوں، کل رہوں، نہ رہوں، تم چاہتے ہو بیٹے کی شادی کا ارمان میرے سینے میں دبے کا دبا ہی رہ جائے۔"

آپا بی نے یک لخت ٹون بدلی تھی۔ ان کی آنکھوں سے گرتے آنسوؤں نے نجیب کو بوکھلا دیا تھا۔

"آپ کا کہنا بجا آپا بی۔ لیکن مجھے تھوڑی سی تو مہلت دے دیں۔ میرا بزنس آج کل ڈاؤن جا رہا ہے۔ دو بچیوں کی بیک وقت شادی کی تیاریاں، وہ بھی اتنے شارٹ نوٹس پر۔ پہلے ذہن میں ہو تو۔"

نجیب نے پریشان ہو کر بات ادھوری چھوڑ دی تھی۔

آپا بی نے زینب پر ایک کٹیلی نگاہ ڈالی۔ وہ شرمندگی سے زمین میں گڑ سی گئیں۔ نجیب نے ان سے مالی مشکلات کا تذکرہ تک نہ کیا تھا۔ وہ بہت دھوم دھام سے ملیحہ کی شادی کی تیاریاں کرنے میں مصروف تھے۔ اب بھی آپا بی پر نظر نہ ڈالتیں تو شاید یہ بات ان کے منہ سے نہ نکلتی۔

"میں تمہاری بہن ہوں نجیب! تمہاری مشکلات سمجھ سکتی ہوں میرے بھائی۔ میری وجہ سے ان مشکلات میں اضافہ ہو، یہ مجھے ہرگز گوارا نہیں۔ تم صرف ملیحہ کی شادی کے خرچے پورے کرو۔ وہ غیروں میں جا رہی ہے، وہاں تمہاری ناک اونچی رہنی چاہیے، جبکہ مدحت تو میری اپنی بھتیجی ہے، میرا اپنا خون، وہ مجھے دو جوڑوں میں بھی قبول ہے۔ میرا تم سے کوئی مطالبہ نہیں ہے۔ بس تم مجھے خالی ہاتھ نہ لوٹاؤ۔ مجھے بھی مدحت کی رخصتی کی تاریخ دے دو۔" آپا بی اس بار بہت رسانیت سے بھائی کو مخاطب کر رہی تھیں۔ زینب ان کے پل پل بدلتے رنگ دیکھ کر حیرت سے ساکت تھیں۔ نجیب بھی بہن کے آگے بے بس سا ہو کر خاموش ہو گئے تھے۔

"جس طرح تم نے مجھے اپنا جان کر میرے سامنے اپنا مسئلہ رکھا، مجھ دکھیاری کی زندگی میں بھی سکون نہیں ہے۔ اب میں تم سے کیا چھپاؤں کہ صرف اور صرف اویس کی خاطر میں تمہارے سامنے جھولی پھیلانے پر مجبور ہوئی ہوں۔ ورنہ میں کاہے کو شادی کی اتنی جلدی مچاتی۔ میرا بیٹا اس عورت کی بیٹی کے سوگ میں نیم دیوانہ ہوا ہے۔ نجیب! اندر ہی محبت کرتا تھا وہ ملیحہ سے، لیکن ملیحہ کسی اور کو پسند کرتی ہے، اسے ایسا دھچکا لگا ہے کہ وہ آپ سے بے گانہ ہو گیا ہے۔ مدحت ہی ہے جو شادی کے بعد میرے ٹوٹے بکھرے بیٹے کو سمیٹ سکتی ہے۔ مجھے مایوس نہ لوٹاؤ نجیب! بہن نہ سمجھو، یہ سمجھو کہ ایک دکھی ماں تمہارے پاس فریاد لے کر آئی ہے۔" آپا بی نے نجیب کے آگے اپنے ہاتھ جوڑ دیے تھے۔

زینب خاموشی سے کمرے سے اٹھ کر چلی گئیں۔

وہ زندگی میں کبھی بھی اتنی شرمندگی سے دوچار نہ ہوئی تھیں۔ ان کی بیٹی نے ان کے شریک سفر کو کس امتحان میں ڈال دیا تھا۔ ملیحہ کے لیے غصے اور ناراضی کے جو جذبات ذرا سرد پڑے تھے، وہ نفرت بن کر ابھر آئے۔

ملیحہ ٹیلی فون پر کسی سے بات کر رہی تھی۔ اس کے چہرے پر پھوٹتی شفق بتا رہی تھی کہ فون عاشر کا ہے۔ زینب کا جی چاہا، اپنی بیٹی کا خوشی سے تمتماتا چہرہ تھپڑوں سے سرخ کر دیں۔ اس کی خود غرضی اور احسان فراموشی کی وجہ سے باپ کے کندھے وقت سے پہلے جھک گئے تھے۔ چھوٹی بہن بے قصور مصلوب ہونے جا رہی تھی۔

زینب جانتی تھیں، نجیب کا فیصلہ کیا ہو گا۔ وہ بہن کے آنسوؤں کے آگے ہار گئے تھے۔ ملیحہ کے ساتھ مدحت کی رخصتی کی تاریخ بھی دے دی گئی تھی۔

مدحت جو اپنی قسمت کو حالات کے دھارے پر چھوڑتے ہوئے ساری سوچوں کو ذہن سے جھٹک کر ملیحہ کی شادی میں گائے جانے والے گیتوں کی پریکٹس کر رہی تھی۔ اسے اپنی شادی کی خبر ملی تو وہ ششدر رہ گئی تھی۔

"پاپا نے ایک بار پھر پھوپھو کی بات مان لی۔ میرے لیے کوئی اسٹینڈ نہیں لیا۔ میں تو خود کو یہ سوچ سوچ کر تسلی دیتی تھی کہ اویس بھائی خود ہی یہ رشتہ توڑ دیں گے۔ میری خوش گمانی تھی کہ کچھ نہ کچھ ضرور ایسا ہو جائے گا کہ اس ان چاہے بندھن سے میری جان چھوٹ جائے گی۔ لیکن پاپا تو مجھے جانتے بوجھتے کنویں میں دھکیل رہے ہیں۔ آخر کیوں ماما جان۔"

وہ ماں سے شاکی ہو کر ماں کے سینے میں سر چھپائے سسک رہی تھی۔ زینب اس کے کیوں کا کیا جواب دیتیں، بس مضمحل انداز میں اس کے سر کے بالوں میں انگلیاں پھیرتی رہیں۔

پہلے سے آپا بی نے کہہ دیا تھا کہ انہیں مدحت کپڑوں کے دو جوڑوں میں بھی قبول ہے۔ لیکن نجیب نے اس پیشکش کو رد ہی کیا تھا۔ انہوں نے زینب کو معقول رقم تھما کر مدحت کے جہیز کی تیاری شروع

کرنے کا کہا تھا۔

"دو چار دن تک اور رقم کا انتظام ہو جائے گا۔ آپ فی الحال کپڑے اور کراکری خریدیں۔ زیور اور فرنیچر اس کے بعد لے لیں گے۔"

زینب نے شوہر کی سمت دیکھا۔ وہ جانتی تھیں، نجیب آج کل کس قدر پریشان ہیں۔ مدحت کی شادی کے اچانک فیصلے پھر اور دو شادیوں کے اخراجات کی وجہ سے بھی۔ انہوں نے اپنا زیور لاکر میں سے نکلوا کر نجیب کو دینا چاہا تھا۔

"یہ ذرا پرانے ڈیزائن کا ہے ورنہ بچیوں کو یہی چڑھا دیتے۔ آپ اسے فروخت کرکے شادی کے دوسرے خرچے نمٹا لیں۔"

"یہ زیور آپ اپنی بہو کے لیے رکھ لیں۔ شادیوں کے خرچے نپٹ جائیں گے، آپ فکر نہ کریں۔" نجیب نے انہیں مسکرا کر مخاطب کیا۔ مگر زینب کسی طور شرمندگی کے اثر سے باہر نہیں نکل پا رہی تھیں۔

سچ تو یہ تھا کہ وہ خود میں اس اعلا ظرف شخص سے نگاہیں ملانے کا حوصلہ نہ پاتی تھیں۔ جس نے کبھی یہ جتایا تک نہ تھا کہ ملیحہ کی وجہ سے فیملی کس قدر کرائسس میں مبتلا ہو چکی ہے۔ نجیب کی لاڈلی مدحت باپ سے شاکی اور خفا تھی۔ عثمان بھی ایک، دو بار ان سے الجھ چکا تھا کہ انہیں آپابی کی اموشنل بلیک میلنگ کے آگے سر نہیں جھکانا چاہیے تھا۔ نجیب کے لیے اولاد کی یہ خفگی اور ناراضی بہت تکلیف دہ تھی۔

زینب، نجیب کے چہرے سے ان کے دل کا حال پا جاتی تھیں۔ ایسے میں زینب کا اپنا دل بہت کرلاتا تھا، انہیں اس سب کی ذمہ دار اپنی ملیحہ لگتی تھی۔ اگرچہ گھر میں کوئی دوسرا ملیحہ کو مورد الزام نہ ٹھہرا رہا تھا اور یہ چیز زینب کی پشیمانی اور شرمندگی میں مزید اضافہ کر رہی تھی۔ انہوں نے رد عمل کے طور پر ملیحہ سے دوبارہ بے گانگی بھرا رویہ اپنا لیا تھا۔ ملیحہ خود بھی شرمندہ تھی۔ ماں سے معافی مانگنا چاہتی تھی، لیکن انہیں نہ ملیحہ سے کوئی سروکار تھا، نہ اس کی معافی سے۔ وہ مایوں کے زرد جوڑے میں ملبوس مدحت کو سینے سے چمٹا کر آنسو بہاتی تھیں اور پاس بیٹھی ملیحہ ماں کو منتظر اور پیاسی نگاہوں سے تکتی رہ جاتی۔

دو جوڑوں میں مدحت کو بیاہ کرلے جانے کا دعوا کرنے والی آپابی نے مطالبہ کیا تھا کہ مدحت اور ملیحہ کی رخصتی الگ الگ دن رکھی جائے۔ وہ شہر کے بہترین ہوٹل میں دونوں بہنوں کی رخصتی کے انتظامات کرچکے تھے۔ عین موقع پر اس فرمائش سے نجیب پریشان ہوگئے۔ کس مشکل سے اس اچانک شادی کے خرچے کا بندوبست کیا تھا۔ ہوٹل کی اگلے روز کی دوبارہ بکنگ کرواتے ڈبل خرچ پڑتا، سو ہوٹل والوں نے بھی معذرت کرلی تھی۔ شادیوں کا سیزن تھا۔ ایک اور شادی کے لیے پہلے ہی ہوٹل کی بکنگ ہو چکی تھی۔ بھاگ دوڑ کے بعد بہت مشکل سے ایک اوسط درجے کے میرج ہال کی بکنگ مل سکی تھی۔

شہر کے بہترین ہوٹل میں عاشر بارات لے کر آیا تھا، اور پوری دھوم دھام سے ملیحہ اس کے سنگ رخصت ہو گئی۔

اگلے روز آپابی نے اویس کی بارات لے کر آنا تھا۔ بارات کسی بہت دور دراز کے شہر سے نہیں آنی تھی۔ ڈیڑھ، دو گھنٹے کی مسافت تھی، لیکن گھڑی کی سوئیاں آگے سرکتی جارہی تھیں اور بارات کا کوئی نام و نشان نہ تھا۔ نجیب بار بار آپابی کو فون کر رہے تھے، لیکن وہاں سے کوئی فون نہ اٹھا رہا تھا۔ مدحت بیوٹی پارلر سے تیار ہو کر آچکی تھی۔ نکاح خواں موجود تھے۔ مہمانوں سے پنڈال بھرا ہوا تھا اور اب تو سب ہی اس تاخیر کا سبب دریافت کر رہے تھے۔ شادی بیاہ میں ایسی دیر سویر بھی کبھار ہو ہی جاتی ہے، یہ زیادہ تشویش کی بات نہیں تھی۔ زیادہ فکر اس بات کی تھی کہ دولہا والوں سے رابطہ ہی ممکن نہ ہو رہا تھا۔ پھر آخر آپابی کا فون آیا تھا۔ وہ فون نہیں تھا، نجیب کے لیے موت کا پروانہ تھا۔

"اویس گھر چھوڑ کر کہیں چلا گیا ہے نجیب! میرا اکلوتا بیٹا، میری زندگی بھر کی پونجی۔ ہائے، ہائے میں کس سے فریاد کروں۔ اس حرافہ ملیحہ کی وجہ سے ہوا ہے یہ سب۔ جانے کیا جادو پڑھ کر پھونکا تھا اس نے

میرے بیٹے پر۔ دیوانہ ہو گیا ہے وہ اس کے پیچھے۔ کہتا تھا ملیحہ نہیں تو کوئی نہیں اور مدحت تو ہرگز نہیں۔ میں سمجھتی تھی، شادی کے بعد عشق کا بھوت سر سے اتر جائے گا، لیکن وہ تو اپنی بات کا پکا نکلا۔ صبح سے گھر سے غائب ہے، کوئی اتا پتا نہیں۔ ہم برباد ہو گئے نجیب، تباہ ہو گئے۔"

آپابی بین کر رہی تھیں۔ نجیب نے بنا کچھ کہے فون بند کر دیا۔ ان کے چہرے کی رنگت خطرناک حد تک زرد پڑ چکی تھی۔ پاس کھڑی زینب نے گھبرا کر ان کے شانے پر ہاتھ رکھا۔ نجیب نے ٹوٹے پھوٹے الفاظ میں انہیں آپابی کی گفتگو سے آگاہ کیا تھا۔ پھر وہ سینے پر ہاتھ رکھ کر جھکتے چلے گئے۔

وہ رات زینب کے لیے قیامت کی رات تھی۔ آج بھی اس رات کا تصور کرکے وہ پہروں روتی تھیں۔ وہ زندگی سے بھرپور شخص ان کے سر کا سائبان، ان کا شریک سفر، جوانی کی بہاریں گزار لینے کے باوجود وہ اس وقت بھی کتنا وجیہ اور خوب صورت تھا۔ بچے کہتے تھے، "بابا تو ہمارے بڑے بھائی لگتے ہیں۔" اس شخص کو زینب نے ٹوٹ کر چاہا تھا اور وہ چاہے جانے کے ہی لائق تھا۔ سراپا محبت، سراپا خلوص۔ وہ شخص اب آئی سی یو میں پڑا زندگی اور موت کی جنگ لڑ رہا تھا۔ زندگی لمحہ بہ لمحہ اس سے روٹھتی جارہی تھی اور اس کے چاہنے والوں کے دل شدت غم سے پھٹے جارہے تھے۔ مگر کوئی کچھ کرنے پر قادر نہ تھا۔

شدت غم سے آپابی بھی نڈھال تھیں۔ مگر وہ زینب کی سماعتوں میں زہریلے فقرے انڈیلنے سے باز نہ آرہی تھیں۔ وہ کہہ رہی تھیں کہ اگر نجیب کو کچھ ہوا تو ذمہ دار زینب اور ملیحہ ہوں گی۔ اگر ملیحہ اویس سے رشتے پر راضی ہو جاتی، منگنی والے روز غائب نہ ہوتی تو یہ سب کچھ نہ ہوتا، جو اب ہوا تھا۔

"تمہاری بیٹی نے میرے بیٹے کا دل اجاڑا اور میرے بھائی کی زندگی اجاڑی۔ میرا بھائی آستین میں سانپ پالتا رہا۔ ہائے میرا بھائی، میرا شہزادوں جیسا بھائی۔ کیسے لاچار ہو کر بستر پر پڑا ہے۔"

آپابی تڑپ تڑپ کر رو رہی تھیں اور پھر وہیں اویس بھی آگیا تھا۔ جانے اسے کس نے نجیب رضا کے ہارٹ اٹیک کی اطلاع دی تھی۔ وہ خود شرمندہ، نڈھال اور مضمحل سا تھا اور جب زینب کی بار بار کی التجاؤں کے بعد ڈاکٹرز نے انہیں اور عثمان کو ذرا دیر کے لیے نجیب کے پاس جانے کی اجازت دی تھی تو آپابی بھی اویس کا ہاتھ پکڑ کر روتی اندر گھس گئی تھیں۔

نجیب کو اگرچہ ہوش آگیا تھا، لیکن حالت اب بھی تشویش ناک تھی۔

"دیکھو نجیب! اویس آگیا ہے۔ تم جلدی سے ٹھیک ہو جاؤ، پھر اپنے ہاتھوں سے اپنی مدحت کو اویس کے ساتھ رخصت کرنا۔" آپابی بھائی کا ماتھا چوم کر رو پڑی تھیں اور جب ڈاکٹر کے ناراض ہونے پر نا چاہتے ہوئے انہیں نجیب کے پاس سے ہٹنا پڑا تھا تب نجیب نے نقاہت بھرے لہجے میں زینب اور عثمان کو مخاطب کیا۔

"میرے بعد غصے اور جذبات میں کوئی غلط فیصلہ مت کرنا۔ مدحت نے اویس کے نام کا جوڑا پہن لیا تھا۔ دنیا یہ بات کبھی نہیں بھولے گی۔ عثمان جذباتی اور ناسمجھ ہے اور زینب! تم بھی سدا گھر کی چار دیواری میں رہی ہو، دنیا کو پرکھنے کی صلاحیت تم میں بھی نہیں۔ اجنبی اور انجان لوگوں کو آزمانے کے بجائے اویس کو ایک موقع اور دے دینا۔ آگے میری مدحت کا نصیب۔"

"اللہ آپ کا سایہ ہمارے سروں پر قائم رکھے۔ آپ ٹھیک ہو جائیں، باقی باتیں بعد میں دیکھی جائیں گی۔"

زینب ان کے ہاتھ تھام کر سسک پڑی تھیں۔ وہ نحیف آواز میں مزید کچھ کہہ رہے تھے، لیکن وہ آواز سماعت کے قابل نہ تھی۔ نجیب کی حالت بتا رہی تھی کہ ان کی زندگی کی لو بجھنے والی ہے اور محض چار گھنٹے بعد زینب کے بدترین خدشات سچ ہو گئے۔ زندگی کا ساتھی ساتھ چھوڑ گیا تھا۔ پہاڑ جیسا غم سینہ چیر رہا تھا، لیکن انہیں نجیب کی نشانیوں کے لیے خود کو سنبھالنا پڑا۔

نجیب کی لاڈلی مدحت باپ کے بچھڑنے پر ہوش و حواس کھو بیٹھی تھی۔ لمبا چوڑا عثمان ماں کے سینے میں سر چھپا کر بچوں کی طرح بلک بلک کر رو رہا تھا۔ رونے والوں میں ملیحہ بھی شامل تھی۔ شدت غم سے وہ بھی نڈھال ہوتی جارہی تھی، لیکن اس کی ماں دوسری اولادوں کی طرح اسے اپنے سینے سے چمٹا کر چپ نہ کروا رہی تھی۔ زینب کا بس چلتا تو وہ ملیحہ کو نجیب کا چہرہ تک نہ دیکھنے دیتیں اور یہ کام زینب سے پہلے آپا بی نے کرلیا تھا۔

"تم اپنا منحوس چہرہ لے کر دفع کیوں نہیں ہوجاتیں۔ میرا بھائی تمہاری وجہ سے اپنی جان سے گیا ہے۔" وہ ملیحہ پر دھاڑی تھیں۔

"میرے بابا کی موت کی ذمہ دار آپ ہیں پھپھو! مجھے دوش مت دیں۔" غم کی شدت سے ملیحہ کے حواس بھی ساتھ چھوڑ رہے تھے۔ وہ چلائی تو اس کی آواز آپا بی سے بھی زیادہ بلند تھی۔

"مکار حرافہ! پہلے میرے بیٹے کو اپنے عشق کے جال میں پھنسایا، پھر اسے۔" آپا بی کی بات سن کر ملیحہ مزید بپھری تھی۔

"مجھ پر بہتان مت لگائیں۔ آپ کی ان ہی الٹی سیدھی باتوں کی وجہ سے میری ماں مجھ سے بدگمان ہو گئی ہے۔ آپ اور آپ کے بیٹے کی وجہ سے ہماری فیملی برباد ہو گئی۔ میرے بابا کو آپ نے اتنا ایموشنل بلیک میل کیا کہ ان کے اعصاب جواب دے گئے، رہی سہی کسر آپ کے بیٹے نے پوری کردی۔ میں نے تو محض منگنی سے انکار کیا تھا، وہ بارات والے دن گھر سے بھاگ گیا۔ میرے بابا یہ صدمہ سہار ہی نہ سکے۔ میری چھوٹی بہن کی زندگی برباد کرنے میں آپ نے کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ آپ بہت ظالم ہیں۔ بہت ظالم ہیں آپ۔" ملیحہ چلا رہی تھی۔ زینب سے مزید برداشت نہ ہوا اور وہ اس کا ہاتھ پکڑ کر کھینچتی ہوئی دوسرے کمرے میں لے گئیں۔

"نجیب نے تم پر جتنی محبت اور شفقت لٹائی ہے اس کا ہی لحاظ کرلو۔ خدا کے لیے میت کا گھر تماشا گاہ نہ بناؤ۔ رحم کرو ہمارے حال پر۔" انہوں نے ملیحہ کے آگے دونوں ہاتھ جوڑ دیے تھے۔

"بی بی جان!" ملیحہ نے تڑپ کر انہیں دیکھا تھا۔

"میں تم سے کلام نہیں کرنا چاہتی تھی۔ اس گھر سے چلی جاؤ ملیحہ۔ میں دوبارہ تمہاری شکل تک نہیں دیکھنا چاہتی۔"

"بی بی جان! آپ مجھے گھر سے نکال رہی ہیں۔" ملیحہ سسک پڑی تھی۔

"تمہیں عزت سے رخصت کرچکے ہیں ہم۔ پوری دھوم دھام سے تمہارے حق سے کہیں زیادہ دے کر نجیب نے تمہیں تمہارے منتخب کردہ شخص کے ساتھ تین دن پہلے رخصت کردیا ہے۔ جاؤ اپنے گھر، اپنی محبت کے ساتھ ہنسی خوشی زندگی گزارو۔ اس گھر میں بسنے والے بے سائبان تو ہو ہی چکے ہیں۔ ہمیں دنیا کے سامنے مزید رسوا کرنے پر تلی ہو۔"

زینب بولتے بولتے نڈھال ہو گئی تھیں۔ ملیحہ کچھ نہ بولی تھی۔ بس سامنے اور بے یقینی سے ماں کو دیکھتی رہی۔

"دنیا کے سامنے مدحت کی شادی میں تاخیر کا سبب نجیب کو ہونے والا ہارٹ اٹیک تھا۔ تم نے تو بھرم بھی توڑ دیا۔ میری معصوم بچی پر رحم کھاتیں۔ تمہاری ہٹ دھرمی کی سزا مدحت کو بھگتنا پڑی تھی۔ جانے ابھی اس کے نصیب میں کیا لکھا ہے۔ نجیب کے لبوں پر آخری وقت تک مدحت کا نام تھا۔ وہ مدحت کی فکر لیے دنیا سے رخصت ہوئے اور اس کا سبب تم ہو ملیحہ! تم ہماری زندگیوں سے دور چلی جاؤ۔ میں جیتے جی تمہاری شکل نہیں دیکھنا چاہتی۔" زینب نے کرب سے آنکھیں میچ لی تھیں۔ ملیحہ پھٹی پھٹی نگاہوں سے ماں کو دیکھتی رہی۔ پھر منہ پر ہاتھ رکھ کر اپنی گھٹی گھٹی چیخیں روکتی تیزی سے کمرے سے نکل گئی تھی۔

اس نے ماں کے کہے کی لاج رکھ لی تھی۔ اس دن کے بعد اس نے دوبارہ نجیب ہاؤس کی دہلیز پار نہ کی۔

نجیب کے چہلم کے بعد آپا بی سادگی سے مدحت کو اویس کے سنگ رخصت کروا کے لے گئی تھیں۔

حالانکہ عثمان اس شادی پر راضی نہ تھا۔

"اس قصے کو یہیں ختم کردیں بی بی جان۔ مدحت ابھی بہت کم عمر ہے۔ اس کے سامنے پوری زندگی پڑی ہے۔ ہم مدحت کے لیے کوئی اچھا سا بندہ اور معقول سا گھرانہ ڈھونڈ لیں گے۔ بابا زندگی کی آخری سانسوں میں مایوسی کی انتہا پر تھے۔ ہمیں ان کے خدشات کی بنیاد پر مدحت کی زندگی کا فیصلہ نہیں کرنا چاہیے۔" عثمان ماں کو قائل کر رہا تھا۔

زینب نے محبت سے بیٹے کو دیکھا، وہ کتنا ذمہ دار اور سمجھ دار ہو گیا تھا۔ لیکن مدحت کو بھائی کی بات سے اتفاق نہ تھا۔

"آپ بابا کے جن خدشات کا ذکر کر رہے ہیں۔ وہ درست ثابت ہوں گے یا غلط، مجھے اس سے کوئی سروکار نہیں، لیکن وہ الفاظ میرے بابا کی وصیت تھے۔ میری زندگی کا فیصلہ میرے بابا کر گئے ہیں۔ بھائی اور مجھے بابا کا کیا ہر فیصلہ قبول ہے۔"

زینب نے بے ساختہ مدحت کی پیشانی چومی۔ سب میں ہی، ہوش کی بھی اچھی تھی۔ کاش ان کی ملیحہ بھی باپ کے کہے کی لاج رکھ لیتی۔ پچھتاوے کی یہ انی شاید ہمیشہ ہی ان کے سینے میں گڑی رہتی۔ اگر شادی کے بعد مدحت خوش گوار ازدواجی زندگی بسر کرتی تو شاید زندگی کے کسی موڑ پر وہ ملیحہ کا قصور معاف کر دیتیں، لیکن مدحت کی زندگی میں آزمائش اور کٹھنائیوں کے سوا کچھ نہ تھا۔

اویس نے نجیب کے انتقال کے بعد احساس شرمندگی میں مبتلا ہو کر مدحت کو جیون ساتھی بنا تو لیا تھا، لیکن مدحت کو کبھی بھی توجہ اور محبت کے قابل نہ سمجھا۔ آپا بی جب تک حیات رہیں، بھتیجی کا خیال رکھنے کی اپنی سی کوشش کی۔ ان کے انتقال کے بعد ان کے گھر کی کمان اقتدار ان کی بیٹیوں کے ہاتھ میں آگئی۔ اویس سے پانچ برس چھوٹی فرحانہ جو شادی کے بعد سسرال والوں سے لڑ جھگڑ کر میکے آن بیٹھی تھی اور کچھ عرصے بعد اس کا میاں بھی اس کے پاس آگیا تھا۔ گھر کا ایک پورشن ان کے زیر تصرف تھا۔

فرحانہ سے چھوٹی نرگس بھی بہن کے نقش قدم پر چلی تھی۔ اس کا خیال تھا کہ اس کا میاں بھی ارشد بھائی (بہنوئی) کی طرح اس کی محبت میں گرفتار ہو کر دوڑا چلا آئے گا۔ لیکن وہ ارشد کی طرح کاٹھ کا الو ثابت ہوا، اس نے نرگس کو طلاق دے کر دوسرا بیاہ رچالیا تھا۔

سب سے چھوٹی نوشابہ شادی کرنے پر تیار ہی نہ ہوتی تھی۔ مدحت کے گھر پر اس کی نندوں کا راج تھا۔ شوہر اس سے لاتعلق اور بے نیاز۔ گھر میں مدحت کی حیثیت کام کرنے والی ملازمہ کی سی تھی۔ وہ کم عمر تھی۔ اپنے سے بڑی عمر کی نندوں کے رعب میں آسانی سے آجاتی۔ مغیث کی پیدائش کے وقت مدحت مرتے مرتے بچی تھی۔ کم عمری اور کمزوری۔ گائناکولوجسٹ نے کیس لینے سے ہی انکار کردیا تھا۔ زینب، مدحت کو اپنے ہاں لے آئی تھیں۔ وہ اس کی حالت دیکھ کر روتی تھیں۔ عثمان بھی پیچ و تاب کھاتا تھا۔

"بچہ پیدا ہو جائے، پھر مدحت کو واپس نہیں بھیجیں گے۔ اگر وہ اپنا بچہ لے کر جانا چاہیں گے تو شوق سے لے جائیں۔"

لیکن جب مغیث کی پیدائش ہوئی تھی بھانجے کی شکل دیکھ کر عثمان کے اپنے دل میں پیار بھرے جذبات امڈ آئے۔ وہ صرف اویس کا بچہ تھوڑی تھا، وہ مدحت کا بھی تو بیٹا تھا۔ مدحت تو آپریشن کے بعد کتنے دن تک چلنے پھرنے سے قاصر تھی۔ مغیث کو اس کی نانی اور ماموں نے ہی سنبھالا تھا، اسی لیے وہ ہمیشہ سے ننھیال کا لاڈلا ترین بچہ رہا۔

مدحت کی حالت سنبھلی تو فرحانہ اور اس کا میاں اسے لینے آگئے تھے۔ اسے جانا ہی تھا۔ چلی گئی۔ گھر میں اب بھی اس کی حیثیت وہی تھی بس مغیث کے بعد زندگی جینے کے قابل لگنے لگی تھی۔

وقت کچھ اور آگے سرکا تو زینب نے عثمان کی شادی کا ارادہ باندھا۔ نجیب کا کاروبار تو ان کے انتقال کے بعد ختم ہو کر رہ گیا تھا۔ عثمان نے بہت محنت اور جدوجہد سے نئے سرے سے کام کا آغاز کیا تھا۔

درمیان کا عرصہ بہت تنگی ترشی میں گزرا تھا لیکن اب گھر کے مالی حالات پھر سے مستحکم ہونے لگے تھے۔

زینب نے بیٹے کے لیے لڑکی ڈھونڈنا شروع ہی کی تھی کہ اس نے ماں کو اپنی مرضی سے آگاہ کر دیا۔ بیلا اس کے دوست کی بہن تھی۔ پہلی نگاہ میں ہی زینب کے دل کو بھی بھا گئی۔ وہ بہت خوش شکل اور ملنسار لڑکی تھی۔ نجیب ہاؤس کے سناٹے کو ختم کرنے کے لیے ایسی ہی لڑکی چاہیے تھی۔

زینب بھی خوشی خوشی بیلا کو عثمان کے سنگ رخصت کروا کر نجیب ہاؤس لے آئی تھیں، لیکن شادی میں مدحت کی نندوں کے تیور انہیں بہت اکھڑے اکھڑے لگے۔ انہوں نے خدشے سے مدحت سے بھی اس بارے میں استفسار کیا تھا۔

"آپ کیوں فکر کرتی ہیں بی بی جان! اللہ کا شکر ہے خیر خیریت سے بھائی کی شادی ہو گئی۔ دراصل فرحانہ باجی وغیرہ کی خواہش تھی کہ میں عثمان بھائی کو نوشابہ سے شادی پر راضی کروں، بلکہ شاید یہ نوشابہ کی اپنی بھی خواہش تھی۔ میں نے ان کی بات کو زیادہ سیریس لیا ہی نہیں۔ بس اس لیے سب کے موڈ آف تھے۔"

مدحت نے آرام سے بتایا تھا۔

"تو نے پہلے کیوں نہ بتایا مدحت۔" زینب کی آنکھوں میں آنسو آ گئے تھے۔ جانے مدحت کی آزمائشیں کب ختم ہونا تھیں۔ سسرال میں اب اس کے ساتھ کیسا سلوک ہوتا تھا، وہ خوب واقف تھیں۔

"کیا ہو گیا ہے بی بی جان! کیا ہم اپنی مرضی سے اپنی زندگی جی ہی نہیں سکتے۔ پھوپھو کی فیملی نے ساری زندگی ہماری زندگیوں پر حق جتانے اور انہیں خراب کرنے کے سوا کیا ہی کیا ہے۔ یہ خود غرضی ہے کہ اس بار میں نے بہادری دکھائی، ان لوگوں کے دباؤ کو قبول نہیں کیا۔ بیلا بھابھی بہت اچھی ہیں۔ اللہ میرے بھائی، بھابھی کو ڈھیروں خوشیاں دکھائے۔" مدحت اپنے کیے پر مطمئن تھی۔ زینب نم آنکھوں سے بیٹی کو دیکھ کر رہ گئیں۔

بیلا واقعی بہت اچھی تھی۔ اس کے دم سے نجیب ہاؤس کے در و دیوار پھر سے مسکرانے لگے تھے۔ اللہ نے بیلا کو یکے بعد دیگرے دو بیٹیوں سے نوازا تھا۔ سویرا اور اس سے دو برس چھوٹی ماہا۔ بی بی جان کو اپنی نٹ کھٹ اور شرارتی سی پوتیاں دل و جان سے عزیز تھیں، لیکن ہر ماں کی طرح ان کی بھی فطری خواہش تھی کہ اللہ ان کے عثمان کو ایک بیٹا بھی عطا کرے۔ یہ بیلا کی اپنی بھی خواہش تھی، لیکن اس بے ضرر سی خواہش کا کیا خمیازہ بھگتنا پڑا تھا۔

بچے کی پیدائش کے وقت طبی پیچیدگی کے باعث بیلا زندگی کی بازی ہار گئی۔ بچہ بھی جانبر نہ ہو سکا تھا۔ سویرا آٹھ برس کی اور ماہا فقط چھ برس کی تھی۔ بی بی جان نے پوتیوں کو اپنی مہربان آغوش میں سمیٹ لیا تھا۔

بچیاں کم عمر تھیں۔ انہیں یہ بڑا صدمہ بھلانے میں زیادہ عرصہ نہ لگا تھا، لیکن عثمان بکھر کر رہ گیا تھا۔ اسے دوبارہ سے زندگی کی طرف لانے کا ایک ہی طریقہ تھا۔ دوسری شادی۔ لیکن وہ شادی کا نام سننے پر تیار نہ ہوتا تھا۔ بی بی جان بھی ہار ماننے والی نہ تھیں۔ وہ بیٹے کو منانے کی کوشش میں لگی رہیں۔

"میرا دل نہیں مانتا بی بی جان! پھر کیا گارنٹی ہے کہ سوتیلی ماں میری بچیوں کو اپنا سکے گی، بیلا کے بعد۔" عثمان اپنی ہی رو میں بولے جا رہا تھا۔ اس کی نگاہ ماں کے چہرے پر پڑی۔ اسے احساس ہوا کہ وہ کیسی سنگین غلطی کا مرتکب ہو گیا ہے۔

"آئی ایم سوری بی بی جان! آئی ایم رئیلی ویری سوری۔" اس نے بے ساختہ ماں کے ہاتھ تھام لیے۔

"معذرت کی کیا بات ہے بیٹا! سچ تو یہی ہے کہ میں بھی تمہاری سوتیلی ماں ہوں۔" زینب نے بیٹے کو جذباتی انداز میں گھیرا تھا اور وہ اس کوشش میں کامیاب بھی رہیں۔ عثمان نے تڑپ کر انہیں دیکھا تھا۔

"آپ جیسی ماں تو دنیا میں کوئی ہو ہی نہیں سکتی۔"

"تو پھر ماں کی بات مان لو بیٹا۔ تمہاری یہ اجڑی ہوئی حالت دیکھ کر تمہاری ماں کا دل کیسے کٹتا ہے، تمہیں اس کا اندازہ ہی نہیں۔ ابھی تمہارے آگے ساری زندگی پڑی ہے۔ جذبات کو ایک طرف رکھو اور حقیقت پسند بن کر سوچو جیسے برسوں پہلے تمہارے بابا نے سوچا تھا۔ اگر وہ بھی روحی کی یاد کو سینے سے لگا کر بیٹھے رہتے تو زندگی آگے کیسے چلتی۔ گھر بسا لو میری جان۔ تمہارے دل کو آہستہ آہستہ قرار مل ہی جائے گا۔"

انہوں نے محبت بھرے لہجے میں منت کی تھی۔

"ٹھیک ہے بی بی جان! آپ کوشش کر کے دیکھ لیں، ویسے دو بچیوں کے باپ کو کون رشتہ دے گا۔"

عثمان ذرا سا مسکرایا تھا۔

"جو تمہارے نصیب میں ہو گی مل کر رہے گی۔"

انہوں نے مطمئن انداز میں جواب دیا۔ اس وقت دونوں ماں، بیٹے کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ نصیبوں کے اس کھیل میں نوشابہ کو عثمان کی شریک حیات بننے کا اعزاز حاصل ہونے والا ہے۔

نوشابہ، جو بی بی جان کو قطعی نہ بھاتی تھی اور عثمان نے بھی اپنی پھوپھی زاد کو کبھی بھی اس نظر سے نہ دیکھا تھا، مگر نوشابہ جانے کب سے عثمان کے خاموش عشق میں مبتلا تھی۔ اسی لیے انہوں نے پہلے بھی مدحت پر دباؤ ڈالا تھا کہ وہ میکے میں عثمان اور نوشابہ کے رشتے کی بات کرے، لیکن تب مدحت نے ان کا دباؤ قبول نہ کیا تھا۔

مدحت کا یہ قصور اب تک معاف نہ ہو سکا تھا اور اب بیلا کے انتقال کے بعد فرحانہ نے بی بی جان سے مل کر خود ہی عثمان کے لیے نوشابہ کا رشتہ پیش کر دیا۔

"نوشابہ ہماری چھوٹی اور لاڈلی بہن ہے۔ مانا اس کی عمر زیادہ ہو گئی ہے، لیکن عثمان سے کہیں اچھا رشتہ اسے اب بھی مل سکتا ہے، لیکن عثمان کو اس وقت جذباتی سہارے کی ضرورت ہے۔ اگر اپنے ہی اپنوں کا خیال نہ کریں تو پھر اپنوں کا کیا فائدہ۔" فرحانہ بول رہی تھی اور بی بی جان کو برسوں پہلے کا منظر یاد آ رہا تھا۔ جب آپا بی نے نجیب کا رشتہ مانگا تھا۔ وہی انداز وہی لہجہ، اس وقت فرحانہ کا تھا۔ ان کے لبوں پر زخم خوردہ سی مسکراہٹ پھیل گئی تھی۔ "میں عثمان سے پوچھ کر تمہیں فیصلے سے آگاہ کروں گی۔" انہوں نے فرحانہ کو رسانیت سے جواب دیا تھا۔

مدحت کا بھی ماں کے پاس فون آ گیا تھا۔

"نوشابہ کے مجبور کرنے پر فرحانہ باجی کو آپ کے پاس آنا پڑا ہے بی بی جان۔ وہ عثمان بھائی کے عشق میں کب سے گرفتار ہے۔ کبھی کبھی تو مجھے لگتا ہے اسی کی بد نظر بیلا بھابھی کو کھا گئی۔ اب نوشابہ کو دوسری بار موقع ملا ہے کہ وہ عثمان بھائی کی زندگی میں شامل ہو جائے اور وہ اس موقع کو کسی طور ضائع نہیں کرنا چاہتی۔ اسی نے فرحانہ باجی اور نرگس باجی۔"

"تم کیا کہتی ہو، ہم انہیں انکار کر دیں؟" بی بی جان نے بیٹی کی بات کاٹتے ہوئے استفسار کیا۔ مدحت ایک لمحے کو سوچ میں پڑ گئی تھی۔

"میں کیا بتاؤں بی بی جان! ویسے تو نوشابہ میں کوئی کمی نہیں۔ خوب صورت ہے، تعلیم یافتہ ہے اور عثمان بھائی سے محبت بھی کرتی ہے۔ مزاج تیکھا ہے، لیکن ہم کسی اور لڑکی کو دیکھ کر یہ اندازہ تھوڑی لگا سکیں گے کہ اس کا مزاج کیسا ہے۔ اگر کوئی اور اچھا سا رشتہ مل سکے تو ٹھیک ورنہ یہ آپشن بھی ذہن میں رکھیں۔ عثمان بھائی کو دو بچیوں کے ساتھ آئیڈیل رشتہ ملنا مشکل ہی ہو گا۔" مدحت نے حقیقت پسندانہ تجزیہ کیا تھا۔

اور جب عثمان کو اس پروپوزل کا پتا لگا تھا تو خلاف توقع اس نے اپنی رضامندی دے دی تھی۔ لیکن ساتھ ہی ایک شرط بھی عائد کر دی۔

"مدحت نے آپ لوگوں کی بہت چاکری کر لی ہے۔ اگر اویس اسے اور بچوں کو لے کر الگ گھر میں شفٹ ہو جائے تو میں نوشابہ سے شادی پر تیار ہوں۔" اس نے کچھ لگی لپٹی رکھے بنا فرحانہ کو مخاطب کیا۔

"اپنی شرطیں اپنے پاس رکھو۔ ہم مرے نہیں جا رہے نوشابہ اور تمہاری شادی کے لیے۔" وہ تلملاتی ہوئی واپس لوٹی تھیں، لیکن ان کی لاڈلی بہن عثمان کے لیے مری ہی جا رہی تھی۔

"عثمان کا مطالبہ ناقابل عمل تو نہیں۔ کرائے داروں سے دوسرا گھر خالی کروا کر اویس بھائی فیملی سمیت وہاں شفٹ ہو جاتے ہیں۔ اس میں مسئلہ ہی کیا

ہے۔"

"مسئلہ عثمان کی سوچ کا ہے۔ وہ یہ رشتہ سراسر اس لیے کر رہا ہے کہ وہ اپنا پاؤں ہمارے اوپر رکھ سکے۔ وہ مدحت سے کی جانے والی زیادتیوں کا بدلہ تم سے لے گا بے وقوف لڑکی۔" فرحانہ اور نرگس چھوٹی بہن کو سمجھانا چاہ رہی تھیں۔ لیکن وہ کوئی بات سمجھنے کے موڈ میں ہی نہ تھی۔

"فرحانہ باجی میں پہلے ہی اوور ایج ہو چکی ہوں۔ سال چھ مہینے میں ایک آدھ اوٹا بونگا رشتہ آتا ہے۔ اب اگر میرے من پسند بندے کے ساتھ میرا گھر بس رہا ہے تو بسنے دیں۔ بعد کی بعد میں دیکھی جائے گی۔ آپ اویس بھائی سے کہیں کہ وہ عثمان کی شرط مان لیں۔" نوشابہ اپنی ضد پر اڑ گئی تھی، بلکہ اس نے شرم جھجک بالائے طاق رکھتے ہوئے خود ہی اویس سے یہ بات کر ڈالی تھی۔

"آپ نے ملیحہ کو چاہا۔ وہ آپ کو نہ مل سکی بھائی اور نہ ملنے کا کرب کیا ہوتا ہے، یہ آپ مجھ سے بہتر جانتے ہیں۔ قدرت نے مجھے عثمان کی زندگی میں شامل ہونے کا موقع دیا ہے اور میں یہ موقع ضائع نہیں کرنا چاہتی۔ آپ فرحانہ باجی اور نرگس باجی کی باتوں کا اثر مت لیں اور عثمان کی بی بی جان کو ہاں کہلوا دیں۔"

"لیکن نوشابہ۔" اویس نے بھی بہن کو کچھ سمجھانا چاہا تھا۔

"کوئی لیکن ویکن نہیں بھائی اور ہاں آپ مدحت سے اپنا لاتعلقی بھرا بے گانہ رویہ بہتر بنالیں۔ وہ آپ کے بچوں کی ماں ہے، آپ اسے اس کا جائز مقام دیں، ورنہ آپ کے کیے کی سزا مجھے بھگتنا پڑے گی۔" نوشابہ بہت آگے کی سوچ رہی تھی۔ آخر اس کی ضد رنگ لے ہی آئی۔

عثمان نے اپنی بہن کے حالات میں بہتری لانے کے لیے جوا کھیلا تھا اور وہ آج تک یہ فیصلہ کرنے سے قاصر تھا کہ یہ جوا کامیاب ہوا یا ناکام۔ مدحت کو نندوں کے تسلط سے آزادی مل گئی تھی۔ اویس کے سرد رویے کی تو خیر وہ عادی ہو ہی گئی تھی، لیکن بچے بڑے ہونے کے بعد گھر میں اس کی حیثیت بہت مضبوط اور مستحکم تھی۔ بچے "ماں" پر جان چھڑکتے تھے اور وہ اپنے بچوں کے ساتھ بہت مطمئن اور مسرور زندگی گزار رہی تھی۔ مگر نوشابہ سے شادی کے بعد عثمان کو اپنی بیٹیوں کی دوری سہنی پڑی تھی۔ صرف بیوی کی حیثیت سے دیکھا جاتا تو نوشابہ ایک اچھی بیوی ثابت ہوئی تھی۔ وہ واقعی عثمان سے بہت محبت کرتی تھی۔ اپنی بہنوں کے برعکس وہ بہت خدمت گزار قسم کی بیوی تھی۔ عثمان کا ہر طرح سے خیال رکھتی تھی بلکہ اس پر جان چھڑکتی تھی۔

لیکن اس نے سویرا اور ملایا کی سگی ماں جیسا بننا تو درکنار سوتیلی ماں بننا بھی گوارا نہ کیا تھا۔ اسے عثمان کی بچیوں سے کوئی سروکار نہ تھا۔ شادی کے بعد بھی بچیاں بی بی جان کی ہی ذمہ داری تھیں اور اس ذمہ داری میں ان کا ہاتھ بٹانے کو رحمت بوا موجود تھیں۔ رحمت بوا تو کئی برسوں سے گھر میں کام کاج کے لیے آ رہی تھیں۔ لیکن انہیں ملازمہ کے بجائے گھر کے فرد کی حیثیت ہی حاصل تھی۔ نوشابہ کی طرح سویرا اور ملایا کو بھی اس سے کوئی سروکار نہ تھا۔ ان پر شفقت لٹانے کو بی بی جان اور لاڈ اٹھانے کو ڈیڈی کافی تھے۔ لیکن مسئلہ جب ہوا جب کاروبار کی وجہ سے عثمان کو قریبی شہر شفٹ ہونا پڑا۔

عثمان کے بہت قریبی دوست کی لیدر مصنوعات کی چلتی ہوئی فیکٹری تھی۔ کچھ خاندانی مجبوریوں کی وجہ سے وہ بزنس وائنڈ اپ کر کے ملک سے باہر سیٹل ہو رہا تھا۔ عثمان نے کل جمع پونجی اکٹھی کر کے وہ فیکٹری خریدنے کا رسک لیا تھا۔ تجربہ کامیاب ٹھہرا۔ فیکٹری عثمان کے پرانے کاروبار کی نسبت زیادہ منافع بخش تھی۔ اس لحاظ سے نوشابہ اس کے لیے بھاگوان ثابت ہوئی تھی۔ کچھ ہی عرصے بعد اسی شہر میں عثمان نے مناسب سا گھر بھی خرید لیا تھا۔ اس کی خواہش تھی کہ سب گھر والے اس کے ساتھ وہاں رہنے لگیں، لیکن گھر والوں کو اس کی "گھر والی" کے مزاج کا اندازہ تھا سو کوئی بھی وہاں جانے پر تیار نہ ہوا۔ نہ بی بی جان اور نہ ہی ملایا، سویرا۔

"میں اس گھر کو چھوڑ کر نہیں جا سکتی عثمان! اس کے چپے چپے پر میری یادیں نقش ہیں۔" بی بی جان کا لہجہ دھیما مگر قطعی تھا۔

"آپ یہاں اکیلی کیسے رہیں گی؟" وہ جانتا تھا کہ ماں کو منانا بہت مشکل ہے، لیکن انہیں چھوڑ کر جانا بھی تو ناممکن تھا۔

"میں اکیلی کیوں رہنے لگی۔ میری پوتیاں ہیں میرے پاس۔ پھر رحمت بھی تو ہوتی ہے۔" عثمان خاموشی سے ماں کو دیکھے گیا، پھر گہری سانس اندر کھینچی تھی۔

"میں جانتا ہوں۔ آپ کیوں نہیں جانا چاہ رہیں، لیکن آپ خود سوچیں میں آپ کے اور بچیوں کے بغیر کیسے رہ پاؤں گا۔"

"ارے آخر کو عثمان تم کون سا پردیس جا رہے ہو۔ ڈیڑھ دو گھنٹے کی مسافت ہے۔ دس پندرہ دن بعد چکر لگا لیا کرنا، ہم بھی آتے جاتے رہیں گے۔" انہوں نے بیٹے کو تسلی دی۔

اور پھر زندگی اسی ڈگر پر چل پڑی۔ ہر ویک اینڈ پر عثمان بچیوں اور ماں سے ملنے آ جاتا۔ شروع شروع میں نوشابہ بھی اس کے ساتھ ہوتی تھی، لیکن جب وہ نئے گھر سے مانوس ہو گئی تو اس نے [illegible] ہوئے اکیلے رہنے کے خوف پر غلبہ پا لیا۔ ہر ویک اینڈ پر عثمان کے آبائی گھر حاضری دینا اس کے لیے ضروری نہ رہی تھی۔ وہ اپنے گھر رہنے کو ہی ترجیح دیتی۔ اسکول کالج کی چھٹیوں میں ڈیڈی کے بے پناہ اصرار پر سویرا اور ملایا کو ان کے ہاں جا کر رہنا پڑتا تھا، لیکن یہ عرصہ فریقین کے صبر کا امتحان ہوتا تھا۔ سویرا اور ملایا کو ڈیڈی پر حق جتاتی نوشابہ آنٹی زہر لگتی تھیں، تو نوشابہ آنٹی کو بھی ڈیڈی سے لاڈ اٹھواتی بچیاں زہر سے بدتر لگتی تھیں۔ لیکن عثمان کی محبت اور لحاظ میں فریقین اپنی اپنی ناپسندیدگیاں دل میں رکھنے پر مجبور تھے۔ یہاں گھر واپس جا کر ملایا اور سویرا اپنے دل کی بھڑاس ضرور نکالتی تھیں۔ بی بی جان کے سامنے ہرگز نہیں کہ وہ ہر گزرتے دن کے ساتھ زیادہ جلالی ہوتی جا رہی تھیں۔ (بچپن کے لاڈ پیار تو قصہ پارینہ بن گئے تھے۔)

گھر میں سویرا اور ملایا کے دل کا حال سننے کو ایک بہت اچھی خاموش سامع موجود تھی۔ ہنیہ آپی جو بہت تحمل سے سویرا اور ملایا کو سنتی تھیں، پھر مسکراتے ہوئے کوئی ہلکی پھلکی سی نصیحت کر دیا کرتیں۔ سویرا اور ملایا اپنی ہنیہ آپی کو بہت آئیڈیلائز کرتی تھیں اور وہ تھیں ہی اس قابل کہ انہیں چاہا اور سراہا جائے۔ بلا کی حسین، ذہین، کم گو اور نرم خو سی ہنیہ۔ جب شہر کے بہترین میڈیکل کالج میں اس کا ایڈمیشن ہوا تو ایک عرصے تک سویرا اور ملایا اپنی سہیلیوں میں یوں اتراتی پھریں جیسے یہ کارنامہ انہوں نے ہی سرانجام دیا ہو اور جب ڈیڈی نے اس خوشی میں ایک تقریب منعقد کی تو نوشابہ آنٹی کے سڑے بسے سے چہرے پر جلے بجھے تاثرات دیکھ کر انہیں خوب ہی لطف آیا تھا۔

ہنیہ عاشر جیسے نجیب ہاؤس آئے اک عرصہ بیت گیا تھا۔ ملیحہ نے مرنے کے بعد اپنی جیتی جاگتی نشانی ماں کے پاس بھیج دی تھی۔ ملیحہ شادی کے کچھ عرصے بعد ہی عاشر کے ساتھ بیرون ملک شفٹ ہو گئی تھی۔

نجیب کے انتقال کے چند بعد جب عثمان کی جذباتی حالت میں سدھار آیا تو اس نے ماں کو بتائے بغیر بہن سے ملنے کی کوشش کی۔ تب پتا چلا کہ عاشر کی خالہ زاد بہن جو شارجہ میں مقیم ہے اس نے وہاں عاشر کو بلوا لیا۔ ملیحہ بھی اس کے ساتھ تھی۔ وہ تینوں بہن بھائی کچھ ایسے اٹوٹ بندھن میں بندھے تھے کہ دل میں ایک دوسرے کے لیے کوئی گلہ یا غلط فہمی تھی ہی نہ تھی۔ ملیحہ کا جو جرم بی بی جان کی نظر میں ناقابل معافی تھا، وہ مدحت اور عثمان کی نظر میں جرم تھا ہی نہیں۔ وہ عاشر کو چاہتی تھی۔ ماں باپ نے اس سے بنا پوچھے اس کا رشتہ طے کر دیا اور اس نے رشتہ تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔ اس کی چھوٹی سی غلطی جرم بن گئی۔

سب سے زیادہ قصور آپابی کا تھا، لیکن حالات نے کچھ ایسے پلٹے کھائے کہ ملیحہ ماں کی نگاہوں میں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے معتوب ٹھہری، لیکن عثمان یہ بھی جانتا تھا

کہ بی بی جان بظاہر ملیحہ نامی ورق زندگی سے پھاڑ چکی ہیں۔ ان کے لبوں پر بھولے سے بھی بیٹی کا نام نہ آتا' لیکن وہ ساری ساری رات اسی بیٹی کو یاد کرکے روتی بھی ہیں۔ مرنے والے پر صبر آجاتا ہے۔ بچھڑنے والے پر نہیں۔ کتنا عرصہ چھپکے چھپکے وہ اسی ناخلف بیٹی کے لیے تڑپی تھیں۔

اور پھر ایک دن عاشر کی خالہ زاد بہن ایک بہت پیاری گھبرائی' بوکھلائی سی لڑکی کا ہاتھ تھامے نجیب ہاؤس پہنچی تھیں۔

"یہ ہنیہ ہے عاشر اور ملیحہ کی بیٹی۔" انہوں نے بتایا تھا۔ وہ نہ بھی بتاتیں تو بی بی جان ملیحہ کی نشانی کو پہچان چکی تھیں۔ وہ ہو بہو سولہ سال کی ملیحہ کا عکس تھی۔

"ایک روڈ ایکسیڈنٹ میں عاشر اور ملیحہ کی ڈیتھ ہوگئی ہے۔" دھیمے سے افسردہ لہجے میں کی جانے والی بات بی بی جان کے وجود کے پرخچے اڑا گئی تھی۔ پتا نہیں عاشر کی بہن آگے کیا کہہ رہی تھی۔ وہ غش کھا گئی تھیں۔

"پتا نہیں آپ لوگوں کے آپس میں کیا اختلافات ہوئے کہ ملیحہ یہاں مڑ کر نہ آئی۔ بہرحال اس بارے میں نہ ہم نے کریدا نہ اس نے بتایا میں جانتی ہوں کہ عاشر کے سنگ وہ بہت خوش تھی۔ لیکن اس کی آنکھوں میں مستقل اداسی نے ڈیرا ڈال رکھا تھا۔" عاشر کی بہن عثمان سے مخاطب تھیں۔

"ایکسیڈنٹ اتنا شدید تھا کہ دونوں میاں' بیوی موقع پر جاں بحق ہوگئے۔ ہنیہ گھر پر ہی تھی۔ قدرت کو بچی کی زندگی مقصود تھی۔ ورنہ عاشر اور ملیحہ بیٹی کو ہر پل ساتھ رکھتے تھے۔ اکلوتی بیٹی میں جان تھی دونوں کی۔ ہمارے پاس آپ لوگوں کا رابطہ نمبر نہیں تھا۔ ویسے تو اس وقت اطلاع دینے کا بھی کوئی فائدہ نہ ہوتا۔ چند گھنٹوں میں ہی تدفین کردی گئی تھی۔"

"آپ کی بہت مہربانی' آپ نے ہماری بیٹی کو ہم تک پہنچادیا۔" عثمان ممنون ہورہے تھے۔

"عاشر میرا خالہ زاد بھائی تھا' لیکن مجھے بھائیوں کی طرح ہی عزیز تھا۔ اس کی بچی بھی مجھے کم عزیز نہیں' لیکن میری اپنی زندگی کا بھروسا نہیں۔ پچھلے دو سال سے میں ڈائیلاسز پر ہوں۔ میرے تین بیٹے ہیں لیکن تینوں شادی شدہ اور بال بچوں والے۔ ہنیہ کے بہتر مستقبل کی خاطر میں نے یہی سوچا کہ اس کو اس کے اپنے وطن اور اپنوں کے پاس لے جاؤں۔ اگر میں تندرست ہوتی شاید میرے لیے یہ فیصلہ کرنا آسان نہ ہوتا۔" صوفیہ بیگم آبدیدہ ہوگئی تھیں۔

غم سے نڈھال مدحت بھی بھانجی سے ملنے فوراً پہنچی تھیں۔ مغیث ان کے ہمراہ تھا۔ پہلی نگاہ میں ہی مغیث کو وہ چپ چپ سی لڑکی بہت اچھی لگی تھی اور عمر بڑھنے کے ساتھ شعور بڑھا تو پتا چلا کہ پسندیدگی نہ جانے کب محبت میں ڈھل چکی ہے۔ ہنیہ کو ننھیال میں خالہ' ماموں اور ان کے بچوں کی بے لوث محبت حاصل تھی' لیکن نجیب ہاؤس میں اس کی ذات کا سب سے مضبوط حوالہ ان کی سگی نانی جنہیں دوسروں کی دیکھا دیکھی وہ بھی بی بی جان کہنے لگی تھی۔ ان کا اس کے ساتھ عجیب گریز بھرا رویہ تھا۔ حالانکہ وہ تھی بیٹی کی حادثاتی موت نے انہیں بہت عرصے تک بری طرح نڈھال کیے رکھا تھا۔ ان کی آنکھیں ہر وقت متورم رہتیں' لیکن ہنیہ نے ان کی زبان سے کبھی اپنی ماں کے متعلق ایک لفظ نہ سنا تھا۔

اسے حسرت ہی رہی کہ ماں کی جھلک دیتی نانی اسے اپنے سینے سے بھینچ کر پیار کرے۔ وہ آنسو جو وہ اپنی بیٹی کے لیے دنیا سے چھپ کر بہاتی تھی۔ وہ آنسو نانی' نواسی مل کر بہاتیں' لیکن بی بی جان کے سرد رویے سے ہنیہ اپنے خول میں مزید سمٹ گئی تھی۔ وہ جھجک دونوں کے مابین روز اول سے قائم تھی بہت عرصہ گزرنے کے بعد بھی وہ اسی طرح برقرار تھی۔

ہنیہ اس رویے سے چاہے دل میں ہرٹ ہوتی ہو' لیکن وہ اظہار نہ کرتی تھی۔ وہ ان کے سرد سپاٹ رویے کی عادی ہوچکی تھی۔ اگرچہ بی بی جان ماہا اور سویرا کے لیے بھی سخت گیر دادی جان تھیں' لیکن وہ سختی تھی سرد مہری نہیں۔

کبھی کبھار ماہا کی بے تکی اور احمقانہ سی بات پر ان

کے لبوں پر مسکراہٹ دوڑ جاتی' تو ماہا بی بی جان کی ہنسی سے شہ پاکر وہ خود بھی ہنستے ہوئے ان سے لپٹ جاتی' ایسے میں ہنیہ کی آنکھوں میں عجیب سی حسرت اتر آتی' لیکن بلی کی طرح اسے بھی جذبات چھپانے میں ملکہ حاصل تھا' سو کوئی اس کے دل کا حال نہ پاتا تھا۔



آج کل بی بی جان کی توجہ کا مرکز سویرا تھی۔ ان کے حساب سے سویرا کی شادی کی عمر ہوچکی تھی۔ وہ شد و مد سے اس کے لیے رشتہ تلاش کررہی تھیں۔ سویرا کا تھوڑا بڑھتا وزن اس کے اچھے سے رشتے کی راہ میں رکاوٹ ثابت ہورہا تھا۔ وہ بہت موٹی نہیں تھی' لیکن لڑکے والوں کو جتنی سلم اور اسمارٹ لڑکی درکار ہوتی تھی' سویرا اس معیار پر پورا نہ اترتی تھی۔ رحمت بوا نے ایک رشتے کروانے والی ڈھونڈی تھی۔ وہ ہر پندرہ دن میں ایک رشتہ لے کر آجاتی۔ بی بی جان مہمانوں کی خاطر تواضع کے لیے خاطر خواہ اہتمام کرواتیں اور مہمانوں کے رخصت ہونے کے بعد سویرا بہت فرصت سے [illegible] خاطر تواضع کرتی۔ ماہا اس کے سامنے سے پلیٹیں اٹھاتی رہ جاتی۔

"کیا ہے ماہا! سارا دن کچن میں رحمت بوا کے ساتھ لگی رہی ہوں۔ سخت تھک گئی ہوں ساتھ بھوک بھی لگی ہے۔" سویرا ایک اور چکن رول اپنی پلیٹ میں ڈالتی۔

"اگر اسی رفتار سے تمہارے رشتے آتے رہے تو تمہارا وزن کہاں سے کہاں پہنچ جائے گا۔" ماہا زبردستی چکن رول کی پلیٹ اس کے ہاتھ سے کھینچتی' سویرا منہ بنا کر رہ جاتی۔

پڑوس میں ایک نئی فیملی آکر آباد ہوئی تھی۔ بی بی جان نئے لوگوں سے تعلقات بنانے کی قائل نہ تھیں۔ گھر میں کسی مرد کی غیر موجودگی کے باعث بی بی جان لوگوں سے ملنے ملانے میں بہت محتاط طرز عمل اپناتی تھیں۔ لیکن پڑوس میں آکر بسنے والی اس نئی فیملی میں بہت پیارے پیارے ڈھیر سارے بچے تھے۔ سویرا کو بچے بہت اچھے لگتے تھے۔ اس کا بس نہ چلتا کہ بچوں کو اکٹھا کرکے اپنے گھر لے آئے یا خود ان کے پاس چلی جائے۔

"ویسے سمجھ میں نہیں آتا اتنے ڈھیر سارے بچے ہیں کس کے۔ گھر میں ایک بوڑھے سے انکل ہیں وہ تو یقیناً بچوں کے دادا ہوں گے۔ ایک پیاری سی اسمارٹ خاتون ہیں۔ ان کے تھوڑے موٹے سے شوہر ہیں اور واں گھر میں سے بچوں کی فوج کے علاوہ مجھے کوئی دکھائی نہیں دیتا۔" ماہا نے سویرا کو مخاطب کیا۔

"نہیں کل شام کو جب میں اور ہنیہ آپی واک کرکے آرہے تھے۔ ایک بندہ بائیک باہر نکال رہا تھا۔ بہت گیلو گیلو ڈفنگ سا بندہ تھا۔ پیچھے سے ایک بچہ چاچو چاچو کرتا اس کے پیچھے باہر آیا تھا۔" سویرا کے کہنے پر ماہا نے اسے گھور کر دیکھا تھا۔

"توبہ ہے سویرا۔ کیسی باتیں کرتی ہو تم۔ گیلو گیلو ڈفنگ سا بندہ۔" ماہا نے اس کے لہجے کی نقل اتاری تھی۔

"جس طرح ایک میان میں دو تلواریں نہیں رہ سکتیں۔ اسی طرح ایک شخص میں دو خصوصیات بیک وقت اکٹھی نہیں ہوسکتیں۔ وہ یا تو گیلو ہوگا یا ڈفنگ ہوگا۔" ماہا نے سویرا کا مذاق اڑایا تھا۔

"اچھا بھئی۔ جیسا بھی تھا مجھے تو اچھا لگا۔ خصوصاً جب اس نے اپنے بھتیجے کو گود میں اٹھا کر چٹاچٹ اس کے گال چومے تو۔"

"تمہارا دل کیا کہ اس کے بھتیجے کو جھپٹ کر تم اس کے چٹاچٹ گال چوم لو۔" ماہا نے ہنستے ہوئے اس کی بات مکمل کی۔

"کس کے؟" سویرا نے غرا کر پوچھا۔ اس کی موٹی عقل میں فوراً بات نہ سمائی تھی اور ماہا نے جب اسے گھور کر دیکھا تو اسے اپنی بات کی نامعقولیت کا خود ہی احساس ہوگیا تھا۔

اور اگلے دن ان بچوں کی والدہ محترمہ ایک بچی کو گود میں اٹھائے اور دو بچوں کو ساتھ لیے نجیب ہاؤس پہنچی تھیں۔ نئے گھر منتقل ہونے کے بعد وہ خیر و برکت کے لیے گھر میں قرآن خوانی کروا رہی تھیں اور اس میں

شرکت کا بلاوا دینے آئی تھیں۔

سویرا کی تو دلی مراد بر آئی تھی۔ جب سب ابتدائی تعارف میں مگن تھے تو اس نے پہلے ایک بچے کو پاس بلا کر گود میں بٹھایا۔ چار منٹ بعد دوسرے کو پھر آخر میں ماں سے اس کی گود والی بچی بھی مانگ لی۔

"یہ تو تمہارے بچے ہیں۔ باقی تین بچے وہ کس کے ہیں آپی۔" جب محفل میں بے تکلفی کا رنگ جما تو ماہا نے دل میں کلبلاتا سوال پوچھ ڈالا۔ عائشہ شرمندہ سی ہو گئی تھیں۔

"میرے ہی ہیں۔ ماشاء اللہ چھ بچے ہیں میرے۔"

"ماشاء اللہ۔ ماشاء اللہ۔ بہت خوشی ہوئی سن کر۔ ورنہ آج کل تو لوگ بچے دو ہی اچھے والے محاورے پر یقین رکھتے ہیں۔ مجھے تو سخت اختلاف ہے اس منطق سے۔" بی بی جان نے عائشہ کے چہرے پر چھائی خجالت مٹانے کو یہ بات کی تھی۔

"ہم بھی اسی محاورے پر یقین رکھتے تھے آنٹی۔" عائشہ کو ہنسی آگئی تھی۔ "ریان اور عالیان بچے دو ہی اچھے والے فارمولے کا نتیجہ تھے۔ سفیان اور ثوبان بس ایسے ہی اچانک تشریف لے آئے۔ پھر میرے میاں، سسر اور دیور کی خواہش تھی کہ ان بھائیوں کی کم از کم ایک بہن تو ضرور ہونی چاہیے۔ بیٹی کے بنا گھر بالکل ادھورا ہے۔ بس اللہ نے دو رحمتیں اکٹھی بھیج دیں۔ ثنائلہ یہ رہی اور عائلہ گھر میں سو رہی ہے۔" ہنس مکھ سی عائشہ نے اپنے چھ بچوں کی تفصیلات سے آگاہ کیا تھا۔

ماہا، سویرا کے ساتھ بی بی جان کو بھی یہ ملنسار سی لڑکی بہت اچھی لگی تھی۔ اسے زبردستی چائے پلا کر قرآن خوانی میں شرکت کا وعدہ کیا گیا تھا اور پھر دونوں گھرانوں میں آنا جانا شروع ہو گیا تھا۔ یہ آنا جانا یہ رنگ لایا کہ دو ماہ بعد عائشہ سویرا کے لیے اپنے "کیلو کیلو ڈشنگ" سے دیور کا رشتہ لے آئیں۔ احمر کو دیکھ کر اور اس سے مل کر ماہا کو سویرا کی بات ماننا پڑی تھی کہ واقعی کوئی شخص بڑھے وزن کے باوجود ڈشنگ لگ سکتا تھا۔ عثمان نے ہر طرح کی چھان بین اور جانچ پڑتال کے بعد بی بی جان کو احمر کے متعلق اوکے رپورٹ دی تھی۔ بی بی جان کو تو پہلے ہی یہ فیملی بہت شریف، ملنسار اور خوش اخلاق لگی تھی۔ انہوں نے استخارہ کرنے کے بعد ان لوگوں کو ہاں کہلوا دی تھی۔

سویرا کے سسرال والوں کی خواہش پر منگنی کی رسم بھی منعقد کی گئی۔ طویل عرصے بعد عجیب ہاؤس میں ایسی خوشیوں بھری شام اتری تھی۔ مدحت اپنے تینوں بچوں سمیت ایک روز قبل پہنچ چکی تھیں۔ عثمان اور نوشابہ، ثمن چار دن پہلے ہی پہنچ چکے تھے۔ یہ ایک چھوٹے پیمانے پر منعقد کیا گیا فیملی فنکشن تھا۔ لیکن ندا، طلال اور ماہا نے خوب ہی رونق لگائی۔ عائشہ کے چھ عدد پیارے پیارے بچے تقریب میں سب کی نگاہوں کا مرکز تھے۔

عائشہ کی ٹوئنز بیٹیوں میں ایک ہنبہ کی گود میں تھی۔ دوسری رحمت بوا کے پاس تھی۔ انہیں بی بی جان نے کسی کام سے پکارا تھا۔

"مغیث بیٹا ذرا ایک منٹ کو ثنائلہ کو پکڑنا۔ میں ابھی آئی۔" رحمت بوا کو مغیث ہی فارغ نظر آیا سو اس کی گود میں بچی منتقل کرتی بی بی جان کی بات سننے لگیں۔

مغیث بچی کو کندھے سے لگائے ہنبہ کے پاس آن کھڑا ہوا۔ سفید لباس میں وہ اسے آسمان سے اتری حور لگ رہی تھی۔

"سویرا کی جیٹھانی مزے سے فوٹو سیشن کروا رہی ہیں اور بچے سنبھالنے کی ذمہ داری ہمارے سپرد کر دی۔" اس نے ہنبہ کو شگفتگی سے مسکراتے مخاطب کیا۔ وہ کچھ نہ بولی، محض مسکرا دی تھی۔

"آپ اتنی کم گو کیوں ہیں ڈاکٹر صاحبہ۔ یہ کم گوئی ہمیشہ میری بولتی بند کر دیتی ہے۔ کبھی تو کچھ بول لیا کریں، تاکہ میرے کچھ بولنے کا بھی جواز پیدا ہو سکے۔" اس نے ٹھنڈا سانس بھرتے ہوئے ہنبہ کو مخاطب کیا۔

"اتنی چھوٹی بچی ہے آپ کی گود میں اس کی گردن کے نیچے ہاتھ رکھیں۔" ڈاکٹر صاحبہ بولیں بھی تو کیا۔ مغیث جی بھر کر بدمزہ ہوا تھا۔ اسی لمحے ماہا وہاں سے

گزری تھی۔

"ہیلو ٹل ٹل۔" وہ انہیں ساتھ ساتھ کھڑا دیکھ کر رک گئی۔ بے ساختہ لبوں سے توصیفی کلمہ بھی برآمد ہوا۔ ہنبہ نے اسے گھورا تھا۔ "آپ دونوں اجازت دیں تو ایک تصویر لے لوں۔" اس نے اپنا موبائل والا ہاتھ آگے کیا۔ ہنبہ کی گھورتی نگاہوں کا اس پر مطلق اثر نہ ہوا تھا۔

"عائشہ باجی شاید مجھے ڈھونڈ رہی ہیں۔" ہنبہ تیزی سے منظر سے غائب ہوئی تھی۔ ماہا اور مغیث ایک دوسرے کو دیکھ کر ہنس پڑے تھے۔

"آئی ہوپ مغیث بھائی! اس گھر میں بہت جلد ایک مزید منگنی کی رسم ادا کی جائے گی۔" اس نے شرارتی انداز میں مغیث کو مخاطب کیا۔

"آئی ہوپ سو ماہا۔" مغیث بھی دھیرے سے مسکرا دیا تھا۔



بی بی جان کے وہم و گمان میں نہ تھا کہ ان کی چپ چاپ کم گو اور شرمیلی سی نواسی اپنی ماں کے نقش قدم پر چلتے ہوئے اپنی مرضی سے اپنے جیون ساتھی کا انتخاب کر سکتی ہے۔

ڈرائنگ روم میں اس وقت ڈاکٹر عمر ہاشم کی ماں اور دو بہنیں موجود تھیں۔ بہت شائستگی سے انہوں نے بی بی جان سے ہنبہ کا رشتہ مانگا تھا۔

"ہمیں مایوس مت لوٹایئے گا آنٹی۔ عمر ہمارا اکلوتا لاڈلا بھائی ہے۔ ہمارا بھائی یقیناً آپ لوگوں کے معیار پر پورا اترے گا۔ پھر بھی ہنبہ آپ کو خود عمر کے مزاج اور عادتوں سے آگاہ کرے گی۔ دونوں پانچ سال اکٹھے پڑھے ہیں۔ ہاؤس جاب بھی اکٹھے کی اور پھر اتفاق سے ایک ہی ہاسپٹل میں جاب بھی مل گئی۔ عمر کے متعلق ہنبہ کی گواہی ہی سب سے معتبر ہوگی۔ آپ ہنبہ سے پوچھ کر اپنے دل کی تسلی کر لیجیے۔"

ڈاکٹر عمر کی بہن نے شگفتگی سے مسکراتے ہوئے بی بی جان کو مخاطب کیا۔ اسے کیا اندازہ تھا کہ عام سے پیرائے میں کی جانے والی یہ بات بی بی جان کے دل و دماغ میں کیسا اودھم مچا چکی ہے۔

ابھی وہ چار دن پہلے کی ہی تو بات تھی، مدحت نے ان سے ٹیلی فون پر بات کی تھی۔

"سویرا کی منگنی میں تو اویس کسی مصروفیت کی وجہ سے نہ آسکے تھے۔ لیکن اگلے ہفتے میں اور اویس آپ کے پاس آرہے ہیں بی بی جان۔" مدحت نے ماں کو مسکراتے ہوئے بتایا۔

"سو بار آؤ، تمہارا اپنا گھر ہے۔" انہوں نے بھی مسکرا کر کہا تھا۔

"میں اور اویس اپنے گھر کے لیے آپ کے گھر سے کچھ مانگنا چاہتے ہیں بی بی جان۔"

مدحت نے سرپرائز برقرار رکھنے کی خاطر صاف بات نہ کی تھی۔ لیکن وہ بیٹی کے خوشی سے کھنکتے لہجے سے اس کی بات کا مفہوم پا گئی تھیں۔ طمانیت کی لہر ان کے رگ و پے میں دوڑ گئی تھی۔ بظاہر وہ ہنبہ سے جتنا مرضی لاتعلقی بھرا رویہ روا رکھتی تھیں۔ لیکن سچ تو یہ تھا کہ ان کی زندگی کی سب سے بڑی خواہش یہی تھی کہ وہ اپنی دونوں پوتیوں اور اکلوتی نواسی کو اپنی زندگی میں ہی ان کے گھربار کا کر دیں۔

سویرا کی منگنی میں انہوں نے مغیث کو ہنبہ کی جانب والہانہ تکتے ہوئے دیکھا تو دل میں بے ساختہ دعا کی تھی کہ ان کا یہ پیارا سا نواسا ان کی جان سے پیاری نواسی کا نصیب بن جائے۔ وہ چاہتیں تو مدحت سے اس بارے میں بات کر سکتی تھیں۔ لیکن پھر یہ خیال ذہن کو جکڑ لیتا تھا کہ ہنبہ، ملیحہ اور عاشر کی بیٹی ہے۔ بے شک ایک عمر گزار لینے کے بعد اویس مدحت کے لیے نرم خو اور خیال رکھنے والے شوہر کا روپ دھار چکا تھا۔ مدحت نے بھی محبت کے بجائے اویس کی توجہ پر ہی قناعت کر لی تھی۔

انہیں انتظار تھا کہ مدحت اویس کی رضامندی کے ساتھ مغیث کے لیے ہنبہ کا ہاتھ مانگے اور ان کی دعائیں مستجاب ہوئی تھیں۔ پتا نہیں اویس آسانی سے مان گیا تھا یا مدحت کو اسے قائل کرنے میں محنت

کرنا پڑی تھی۔ ان کے لیے تو یہی بہت تھا کہ اویس اور مدحت اکٹھے ہنیہ کا ہاتھ مانگنے آرہے ہیں 'لیکن انہوں نے سوچ رکھا تھا کہ جب ان کی بیٹی یہاں آکر اشاروں' کنایوں کے بجائے کھل کر بات کرے گی تو وہ اسے رضامندی دینے سے قبل اس کے سامنے ہنیہ کو بلا کر اس کی رضامندی بھی دریافت کریں گی۔

وہ ماضی کی غلطی نہیں دہرانا چاہتی تھیں 'لیکن لگتا تھا تاریخ اپنے آپ کو دہرانے پر تلی ہے۔ محبت کے سفر میں مغیث کو اپنے باپ کی طرح نامراد رہنا تھا۔ ان کی نواسی نے ماں کی طرح انہیں اعتماد میں لیے بغیر اپنے مستقبل کا فیصلہ خود ہی کرڈالا تھا۔ ان کی بھولی بھالی نواسی جس پر انہیں دل ہی دل میں ٹوٹ کر پیار آتا۔ وہ اس سے لاتعلقی اختیار کرکے اس کی ماں کے کیے کی سزا اسے دیتی تھیں 'لیکن ایسا کرتے ہوئے ان کا اپنا دل کیسے کرلاتا تھا کوئی نہیں جانتا تھا' اپنی دانست میں وہ مغیث جیسے بندے سے اس کا رشتہ طے کرکے ہنیہ کی زندگی بھر کی محرومیوں کی تلافی کررہی تھیں' لیکن ہنیہ نے اپنے مستقبل کا فیصلہ خود کرنے کو ترجیح دی تھی۔

ظاہر ہے وہ اپنی ماں کی طرح ذی شعور اور پڑھی لکھی لڑکی تھی۔ اسے ایسا کرنے کا پورا حق تھا۔ تمسخر بھری طنزیہ مسکراہٹ ایک لمحے کو ان کے چہرے پر نمودار ہو کر غائب ہوگئی۔ وہ ڈرائنگ روم میں بیٹھے مہمانوں کی جانب متوجہ ہوئیں۔ شکر ہے وقت ابھی ان کے ہاتھ سے نہ نکلا تھا۔ مدحت نے ابھی صرف اشارے کنایوں میں بات کی تھی۔ وہ ہنیہ کے مستقبل کا فیصلہ ہنیہ کی مرضی سے کرنے کے لیے آزاد تھیں۔ وہ نہیں چاہتی تھیں 'ہنیہ بھی ملیحہ والے انجام سے دوچار ہو۔

"جب بیٹیاں والدین کو اعتماد میں لیے بغیر اپنی زندگی کے فیصلے اپنی مرضی سے کرنے لگیں تو زور زبردستی سے ان کے فیصلے بدلوانے کے بجائے ان کے فیصلے کے آگے سر تسلیم خم کردینا ہی عین دانش مندی ہے۔" یہ سبق ان کی زندگی کے تلخ ترین تجربے کا نچوڑ تھا۔

انہوں نے مزید دیر کرنا مناسب نہ سمجھا۔ وہ مدحت اور اویس کی آمد سے پہلے اس قصے کو منطقی انداز سے نمٹانا چاہتی تھیں۔ سو ایک بردبار سی مسکراہٹ چہرے پر سجاتے ہوئے انہوں نے ڈاکٹر عمر کی والدہ کو مخاطب کیا تھا۔

"میری اپنی خواہش بھی یہی تھی کہ ہنیہ کو اسی کے پروفیشن سے وابستہ کسی شخص کا ساتھ نصیب ہوجائے۔ آپ لوگوں سے مل کر مجھے واقعی بہت خوشی ہوئی ہے۔ جس چاہت اور محبت سے آپ نے میری نواسی کا رشتہ مانگا یہ ہماری عزت افزائی ہے۔ میں چاہتی تو آپ سے رسمی طور پر سوچنے کی مہلت مانگ سکتی تھی 'لیکن جیسا کہ آپ نے کہا کہ عمر ہنیہ کا کلاس فیلو ہے' اتنے عرصے تک دونوں اکٹھے پڑھے ہیں طبیعت اور مزاج کا اندازہ تو ہو ہی جاتا ہے۔ زندگی بچوں نے گزارنی ہے۔ ان کی ذہنی مطابقت قائم ہوجائے تو ہمیں اور کیا چاہیے۔ مجھے یہ رشتہ منظور ہے۔"

دل کے درد کو دل میں دبا کر بہت نرم مسکراہٹ چہرے پر سجاتے ہوئے بی بی جان نے ان لوگوں کو مثبت عندیہ دے دیا تھا۔ اتنا فوری اقرار ان لوگوں کے لیے بھی غیر متوقع تھا۔ پھر بھی ان کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہ تھا۔

"ہم آپ کا شکریہ کس منہ سے ادا کریں۔ بے شک ہم بہت آس لے کر آئے تھے لیکن اندازہ نہ تھا کہ آپ ہماری درخواست کو فورا" شرف قبولیت بخش دیں گی۔" خوشی کے مارے ڈاکٹر عمر کی ماں کی آنکھوں میں نمی اتر آئی۔

"میری زندگی کا کوئی بھروسا نہیں بیٹا۔ میری اپنی بھی خواہش ہے کہ میں جلد از جلد ہنیہ کے فرض سے سبک دوش ہوجاؤں۔ اس کے ماں' باپ سلامت ہوتے تو اور بات تھی' جب آپ لوگوں سے مل کر میرا دل مطمئن ہوگیا ہے تو رسمی باتوں میں وقت ضائع کرنے کا کیا فائدہ۔" انہوں نے گویا فوری اقرار کی توجیہہ پیش کی تھی۔

"بالکل ٹھیک کہا آپ نے۔ اگر ہنیہ گھر پر ہے تو

اسے بلوائیے۔ باقاعدہ رسم تو دھوم دھام سے کریں گے میں اسے شگن کے طور پر اپنی ہی انگوٹھی پہنادیتی ہوں۔"

ڈاکٹر عمر کی ماں کا چہرہ خوشی سے تمتما رہا تھا۔ بی بی جان نے مسکرا کر سر ہلادیا۔ سویرا اور ماہا بازار گئی ہوئی تھیں' انہوں نے کچن میں مصروف رحمت بوا کو آواز دی تھی کہ وہ ہنیہ کو اس کے بیڈروم سے بلالیں۔ نائٹ ڈیوٹی کرنے کے بعد وہ بہت گہری نیند سو رہی تھی جب رحمت بوا نے اسے بی بی جان کا پیغام دیا تھا۔

"کون مہمان ہیں' مجھے کس سے ملوانے کے لیے اٹھایا ہے؟" وہ حیران ہوتی ڈرائنگ روم تک آگئی تھی۔

ڈرائنگ روم میں ڈاکٹر عمر کی والدہ اور بہنوں کو دیکھ کر وہ ٹھٹھک کر رک گئی۔

"آنٹی! آپ لوگ یہاں کیسے؟" خوش دلی سے انہیں سلام کرکے اس نے اپنی حیرت کا بھی اظہار کیا تھا۔

بی بی جان نے ایک چبھتی ہوئی نگاہ انجان بنتی نواسی پر ڈالی۔ جب وہ عمر کی ماں بہنوں سے واقف تھی تو ان کی آمد سے کیسے لاعلم ہوسکتی تھی۔

"ہاتھ آگے کرو ہنیہ! عمر کی والدہ تمہیں انگوٹھی پہنانے آئی ہیں۔"

بی بی جان نے گویا اس کے حواس پر بم گرایا تھا۔ بھونچکی سی اس نے نانی کو دیکھا۔ اس کے تاثرات سے بے نیاز ڈاکٹر عمر کی والدہ نے خوشی خوشی اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیتے ہوئے انگوٹھی پہنادی تھی۔



"ہم مارکیٹ تک گئے تھے دوسری دنیا تک نہیں' آپ نے ہمارے پیچھے سے ہنیہ آپی کا رشتہ بھی طے کردیا۔" ماہا چیخ رہی تھی۔

"آہستہ بولو۔ تمہارا رشتہ طے نہیں کیا جو یوں اچھل رہی ہو۔ جس کا رشتہ طے کیا ہے اس کی پسند پر طے کیا ہے۔ حسن کا نمبر ملا کر دو مجھے۔ میں اسے آگاہ کروں۔"

ماہا ان کی بات سنی ان سنی کرتی ہنیہ کے کمرے کی طرف بڑھی تھی۔ سویرا بھی اس کے پیچھے لپکی۔

"تمہارا ابھی جواب نہیں رحمت! فورا" بچیوں کو رپورٹ دی۔" بی بی جان نے اندر کا غصہ رحمت بوا پر نکالا۔ وہ خفیف سی ہو کر پھر باورچی خانے میں گھس گئیں۔

اور وہاں ماہا' ہنیہ کے کمرے کا دروازہ بجا بجا کر تھک چکی تھی۔

"میں سو رہی ہوں ماہا! میرے سر میں شدید درد ہے۔ پلیز تنگ نہ کرو۔" ہنیہ نے بند دروازے کے پیچھے سے ہی جواب دیا تھا۔

ماہا نے اپنے پیچھے کھڑی سویرا کو دیکھا۔ سویرا ابھی حیرت سے گنگ کھڑی تھی۔

"بی بی جان نے اپنی سگی نواسی سے سوتیلا پن دکھایا نا۔ مجھے اسی چیز کا خدشہ تھا۔" اس نے غصے سے سر جھٹکا تھا۔

"آہستہ بولو ماہا! ابھی آؤ اپنے کمرے میں۔ ہنیہ آپی ابھی دروازہ نہیں کھولیں گی اور ان کا موقف لیے بغیر معاملہ پوری طرح ہماری سمجھ میں نہیں آئے گا۔" سویرا دھیرے سے اسے سمجھاتی' اس کا ہاتھ پکڑ کر کمرے میں لے گئی تھی۔

رات کے کھانے کے بعد دونوں نے پھر ہنیہ کے کمرے کا رخ کیا۔ صد شکر اس بار دروازہ کھلا ملا۔ ہنیہ نماز سے فارغ ہو کر جائے نماز تہہ کررہی تھی۔ اس کی سوجی ہوئی متورم آنکھیں اور گلابی ناک دیکھ کر اندازہ لگانا چنداں مشکل نہ تھا کہ وہ اتنے گھنٹوں تک متواتر روتی رہی ہے۔

"کھانا کھانے کیوں نہیں آئیں آپ۔ کم از کم بی بی جان کو آپ کی شکل تو دیکھنے کو ملتی' وہ تو یہی سمجھ رہی ہوں گی کہ آپ شرما کر کمرے سے باہر نہیں نکل رہیں۔" ماہا نے ذرا تیز لہجے میں ہنیہ کو مخاطب کیا۔

"ماہا!" سویرا نے اسے فہمائشی انداز میں ٹوکا۔

"بی بی جان کا کہنا ہے کہ انہوں نے آپ کی پسند کا

احترام کرتے ہوئے ڈاکٹر صاحب کے گھر والوں کو ہاں کی۔ میں یہ بات تسلیم کر ہی نہیں سکتی کہ آپ کسی شخص میں انوالو ہوں گی تو کیا وہ شخص آپ کی محبت میں گرفتار تھا اور مجھے اس کا بایو ڈیٹا تو بتائیں۔" ماہا جرح کے موڈ میں تھی۔

"میرا کولیگ ہے وہ۔" ہنیہ نے مختصر سا جواب دیا تھا۔ رونے کی وجہ سے اس کی آواز بہت بوجھل اور بھاری ہو رہی تھی۔

"آپ کے علم میں تھا کہ اس کے گھر والے آپ کا رشتہ لے کر آرہے ہیں؟" ہنیہ نے دھیرے سے نفی میں گردن ہلادی۔

"کیا وہ آپ کو پسند کرتے ہیں ہنیہ آپی؟" سویرا نے بھی گفتگو میں حصہ لیا۔

"سلام دعا اور پروفیشنل باتوں کے علاوہ ہماری آپس میں کبھی بات تک نہیں ہوئی اور بی بی جان یہ سمجھ بیٹھیں کہ میں ڈاکٹر عمر کو پسند کرتی ہوں اور میں نے لائف پارٹنر کا انتخاب اپنی مرضی سے کیا ہے۔" ہنیہ کی آواز بھرا گئی تھی۔

"خیر' کسی کو پسند کرنا جرم تو نہیں اور سچ تو یہ ہے کہ ڈاکٹر عمر نہ سہی مگر کسی اور کو تو آپ چاہتی ہی ہیں مگر اس چاہت کا آپ نے کبھی اظہار نہیں ہونے دیا۔" ماہا کے کہنے پر سویرا نے اسے گھورا مگر وہ آج صاف صاف بات کرنے کے موڈ میں تھی۔

"چاہت پر کسی کا اختیار نہیں ماہا! لیکن میں نے اپنی ذات سے متعلق ہر فیصلے کا اختیار بی بی جان کو سونپ رکھا تھا۔ میں آج تک اپنی ماں کے کردہ یا شاید ناکردہ جرم کی سزا بھگتی آئی ہوں۔ میں نے کوشش کی کہ میں اپنے کردار کی مضبوطی سے بی بی جان کا دل جیت لوں شاید اس بہانے وہ میری ماں کا قصور بھی بھلادیں۔ لیکن ساری عمر پھونک پھونک کر قدم رکھنے کے بعد بھی میرے حصے میں یہ بے اعتباری آئی۔" ہنیہ بری طرح رو پڑی تھی۔ سویرا نے اسے کندھے سے لگا کر چپ کروانے کی کوشش کی تھی۔

"میں مشعل کی شادی میں ایک بار ڈاکٹر عمر کی والدہ اور بہنوں سے ملی تھی۔ مشعل کے سسرالی عمر وغیرہ کے رشتہ دار ہیں۔ ہم ایک ہی ٹیبل پر بیٹھے تھے۔ ہماری اچھی گپ شپ ہوئی تھی وہ فیملی مجھے بہت اچھی لگی تھی لیکن مجھے حیرت ہے کہ انہوں نے بی بی جان سے غلط بیانی سے کام کیوں لیا۔ میری اور عمر کی کمٹمنٹ کا ذکر کیوں کیا اور ان اجنبی لوگوں کی باتوں پر بی بی جان نے ایک پل میں اعتبار کر لیا میری زندگی کا ہر پل ان کے سامنے گزرا میں پھر بھی اعتبار کے لائق نہ ٹھہری۔" صدمے سے ہنیہ کا برا حال ہو رہا تھا۔

"آپ صرف یہ سوچ کر ہلکان ہو رہی ہیں کہ بی بی جان نے آپ کا اعتبار نہ کیا۔ ذرا مغیث بھائی کا سوچیں جب انہیں پتا چلے گا کہ آپ نے کسی اور کے نام کی انگوٹھی پہن لی تو وہ تو جیتے جی مر ہی جائیں گے۔"

"میری مغیث سے کوئی کمٹمنٹ نہیں تھی۔" وہ دھیرے سے بولی تھی مگر آنکھوں میں پھر سے آنسو امڈ آئے۔

"آپ فکر نہ کریں ہنیہ آپی! میں آپ کو آپ کا اعتبار بھی لوٹاؤں گی اور محبت بھی۔" ماہا نے اسے ٹھوس لہجے میں یقین دہانی کروائی تھی۔

"تم یہ سب کیسے کرو گی ماہا۔" اپنے کمرے میں واپس آکر سویرا نے پوچھا۔ بہن کی صلاحیتوں سے وہ بخوبی واقف تھی پھر بھی فطری تجسس آڑے آرہا تھا۔

"سب سے پہلے ڈاکٹر عمر کا پتا صاف کرنا ضروری ہے اور اس کے لیے ڈاکٹر صاحب کی طبیعت صاف کرنا ضروری ہے۔ میں کل اسپتال جا کر اس سے ملنے گئی ہوں۔" ماہا نے اپنے ارادے سے آگاہ کیا۔

"اگر بی بی جان کو پتا لگ گیا تو؟" سویرا فکر مند ہو کر بولی تھی۔

"مجھے صبح آٹھ بجے جگا دینا۔" ماہا اس کے سوال کا جواب دیے بنا لحاف سر تک تان کر سو گئی تھی۔

☆ ☆ ☆

"السلام علیکم ناجیہ آپی!" او پی ڈی کی سیڑھیاں چڑھتے ہوئے ہی اسے ہنیہ کی کولیگ نظر آگئی تھی۔ ماہا نے لپک کر اسے جالیا۔

"ماہا تم یہاں کیسے خیریت؟" ناجیہ اسے جانتی تھی سو سلام کا جواب دے کر حیرت کا بھی اظہار کیا۔ ناجیہ کے ساتھ کھڑے اس کے ایک کولیگ کی وجہ سے وہ کھل کر اپنے یہاں آنے کا مقصد نہ بتا سکی بس سیدھے سبھاؤ سے پوچھا تھا۔

"ڈاکٹر عمر ہاشم کہاں ہوں گے' مجھے ان سے ملنا ہے۔"

"اوہ۔" ناجیہ خوشگوار انداز میں ہنسی تھی۔ "یوں کہو نا ہونے والے جیجاجی سے ملنے آئی ہو۔" ناجیہ کی بات سے پتا چل گیا تھا کہ وہ سارے قصے سے واقف ہے۔

"اللہ نہ کرے کہ ڈاکٹر عمر میرے جیجاجی بنیں۔" اس نے کڑوا سا منہ بنایا تھا۔ ناجیہ اس کی بات سن کر ہکلا سی گئی تھی۔

"یہ ہیں ڈاکٹر عمر تم ان سے بات کرو۔ میں ابھی آئی۔" ایک لمحے کے لیے ہکلا تو ماہا بھی گئی۔ کیا پتا تھا ناجیہ کے ساتھ کھڑی ہستی ڈاکٹر موصوف کی ہی ہے۔

"میں ہنیہ آپی کی کزن ہوں۔" ڈاکٹر صاحب کی گھورتی' جانچتی نگاہوں سے خائف ہو کر اس نے فوراً تعارف کروایا۔

"میں چائے پینے کیفے تک جا رہا تھا' آئیے وہاں چل کر بات کرتے ہیں۔" عمر ذہین بندہ تھا۔ سمجھ گیا تھا کہ بات کی نوعیت ایسی ہو گی کہ یوں سیڑھیوں پر کھڑے کھڑے بات نہیں ہو سکے گی سو اسے کینٹین چلنے کی آفر کی۔ ماہا بھی بنا کسی چوں چراں کے ساتھ ہو لی تھی۔

"ڈاکٹر ہنیہ کا موبائل کل سے آف ہے۔ وہ آج ڈیوٹی پر بھی نہیں آئیں۔ میں سمجھ گیا تھا کہ کل کمانڈو ایکشن کی طرز پر میرے گھر والے جو رشتہ جوڑ کر آئے ہیں۔ وہ سچ سے جڑا نہیں۔ کچھ نہ کچھ گڑبڑ ضرور ہے۔ میں ابھی ناجیہ سے اسی بارے میں بات کر رہا تھا' وہ ہنیہ کی بہت اچھی دوست ہے۔ لیکن پھر آپ چلی آئیں۔ آپ ڈاکٹر ہنیہ کے گھر سے آئی ہیں۔ آپ ہی بتائیں کہ مسئلہ کیا ہے۔" ڈاکٹر عمر نے چائے کے ساتھ اسنیکس کا آرڈر دے کر اسے مخاطب کیا۔

"واہ جی واہ' اسے کہتے ہیں الٹا چور کوتوال کو ڈانٹے۔ مسئلہ آپ کا پیدا کردہ ہے اور آپ مجھ سے پوچھ رہے ہیں کہ مسئلہ کیا ہے۔" ماہا چمک کر بولی تھی۔ ڈاکٹر عمر کے چہرے پر ایک لمحے کو خفیف سی مسکراہٹ دوڑ گئی۔ لڑکی کافی دلچسپ معلوم ہوتی تھی۔

"مجھے واقعی کچھ اندازہ نہیں۔ جب ہی تو میں آپ کو یہاں لے کر آیا ہوں کہ ہم سکون سے بیٹھ کر بات کر سکیں۔" عمر نے اسے رسانیت سے مخاطب کیا۔

"آپ کے گھر والوں نے میری دادی جان سے غلط بیانی سے کام لیا انہوں نے کہا کہ آپ اور ہنیہ آپی ایک دوسرے کو پسند کرتے ہیں۔ میری دادی نے اسی بنیاد پر رشتہ پکا کر دیا حالانکہ ہنیہ آپی آپ کو سخت ناپسند کرتی ہیں۔" ماہا نے لگی لپٹی رکھے بنا صاف صاف بات کرنے کی ٹھانی تھی۔ سیاست میں زور پیدا کرنے کو ہنیہ کی ناپسندیدگی کا بھی ذکر کر دیا۔ عمر سر ہلا کر اس کی بات سنتا رہا۔

"آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے میرے گھر والوں نے قطعاً ایسا ذکر نہیں کیا ہو گا۔ ہنیہ اور میں کئی برسوں سے ایک دوسرے کو جانتے ضرور ہیں لیکن یہ رشتہ سو فیصد میرے گھر والوں کی پسند پر طے ہونے جا رہا ہے۔" ڈاکٹر عمر نے وضاحت ضروری سمجھی تھی۔

"یعنی آپ ہنیہ آپی کو پسند نہیں کرتے۔" ماہا نے تصدیق کرنا چاہی۔

"ہنیہ بہت اچھی لڑکی ہیں' ایسی لڑکی جس کا خود بخود احترام کرنے کو جی چاہے لیکن محبت' وحبت کا کوئی چکر نہیں۔ ان فیکٹ ہماری ایک اور کولیگ کی شادی میں میرے گھر والوں نے ہنیہ کو دیکھا۔ وہ انہیں بہت پسند آئیں۔ میں نے شادی کا ڈیپارٹمنٹ اپنی والدہ کے سپرد ہی کر رکھا تھا۔ اتفاق سے ان کی پسندیدہ لڑکی میری کولیگ نکل آئی۔ لیکن میں نے اپنی امی کو کہہ دیا تھا کہ رشتہ آپ خود لے کر جائیں۔ ہنیہ اور میرا روز کا آمنا سامنا ہوتا ہے اگر وہاں سے انکار ہوتا ہے تو معاملہ وہیں ختم ہو جائے گا۔ کم از کم ہمیں ایک دوسرے کا سامنا

کرنے میں جھجک تو محسوس نہیں ہوگی اس لیے میں نے اس بارے میں ہنیہ سے تذکرہ تک نہ کیا۔ میری دانست میں یہ ایک انتہائی شریفانہ عمل ہے۔ آپ جانے کس بنیاد پر مجھ سے جرح کرنے آگئیں۔" عمر کے کہنے پر ملاہا ایک لمحے کو خاموش ہو گئی اس سے کوئی جواب نہ بن پڑا تھا۔

"اگر ہنیہ کو اس رشتے پر اعتراض ہے تو آپ لوگوں کو کل ہی انکار کر دینا چاہیے تھا۔ ہنیہ کی مرضی کے بغیر ہاں کیوں کی۔ میری والدہ تو شاید انہیں رنگ بھی پہنا آئی ہیں۔ ہمارے گھر میں خوشیاں منائی جا رہی ہیں' آپ لوگوں کو چاہیے کہ میرے گھر والوں تک اپنا انکار پہنچا دیں۔ اس میں اتنا پریشان ہونے کی کیا ضرورت ہے۔" وہ ملاہا کی پریشانی بھانپ گیا تھا جب ہی اسے رسانیت سے مخاطب کیا۔

"آپ ہمارے گھر آکر میری دادی سے وضاحت دیں کہ آپ کے اور ہنیہ آپی کے بیچ کوئی کمٹمنٹ نہیں تھی۔"

"آپ کی دادی میری کیا لگتی ہیں بھئی؟" وہ حیران ہوا۔

"جب آپ ہنیہ آپی کو پسند بھی نہیں کرتے۔ رشتہ ٹوٹنے سے آپ کو کوئی فرق بھی نہیں پڑتا تو اک ذرا سی وضاحت دینے سے آپ کا کیا جاتا ہے۔" وہ اس پر بگڑی تھی۔

"کمال نہیں ہنیہ آپ کی کزن ہے وہ اتنی کم گو ہیں اور آپ؟"

"کیا میں؟" ملاہا نے تنک کر پوچھا تھا۔

"ناشتے میں ہری مرچوں والا آملیٹ لینا بند کریں۔ افاقہ ہوگا۔ چلتا ہوں۔" چائے کا آخری گھونٹ لے کر وہ اٹھ کھڑا ہوا تھا۔ ملاہا ہکا بکا ہو کر رہ گئی۔ عجیب بے نیاز سا بندہ تھا۔ وہ جو کچھ سوچ کر گھر سے آئی تھی پچویشن اس کے بالکل برعکس تھی۔

"میں اتنی دور سے 'اپنے گھر والوں سے چھپ کر آپ سے ملنے آئی' آپ مجھے یوں چھوڑ کر چل پڑے۔" حیرانی اور خفگی میں خاصا فضول فقرہ لبوں سے برآمد ہوا اور اگر ڈاکٹر عمر کے چہرے پر بے ساختہ مسکراہٹ نہ ابھرتی تو اسے پتا بھی نہ چلتا کہ وہ کیا بول چکی ہے۔

"یہ میرے ڈیوٹی آورز ہیں اور ویسے بھی میرا خیال تھا 'بات' کلیئر ہو گئی۔ ڈاکٹر ہنیہ مجھے سخت ناپسند کرتی ہیں۔ آپ کی دادی نے ان سے بنا پوچھے میری امی کو ہاں کردی۔ آپ الٹا میری جواب طلبی کرنے پہنچ گئیں۔ میں نے وضاحت کردی کہ اس معاملے سے میرا کوئی تعلق ہی نہیں۔ آپ کے گھر والے میرے گھر والوں سے مل کر بلکہ صرف ایک فون کال کرکے بات ختم کردیں۔ سو سمپل۔"

"خیر یہ تو میں نے ایسے ہی بول دیا تھا کہ ہنیہ آپی آپ کو سخت ناپسند کرتی ہیں' دراصل میری پھوپھو کے بیٹے ہیں مغیث بھائی' وہ ہنیہ آپی سے بے حد محبت کرتے ہیں ہنیہ آپی بھی انہیں چاہتی ہیں لیکن یہ بڑی پاکیزہ سی خاموش محبت تھی اب میری پھوپھو انہیں باضابطہ طور پر مغیث بھائی سے منسوب کرنے آرہی تھیں کہ درمیان میں آپ کی فیملی ٹپک پڑی' پتا نہیں آپ کی امی وغیرہ نے کچھ ایسا کہا یا پھر واقعی میری بی بی جان کو غلط فہمی ہوئی۔ آپ ہماری فیملی ہسٹری سے واقف نہیں۔ بے چاری ہنیہ آپی کو ناکردہ گناہ کی سزا بھگتنی پڑی ہے۔ مجھے آپ سے صرف اتنی سی فیور چاہیے تھی کہ آپ کے گھر والے یہ وضاحت کردیں کہ وہ یہ پروپوزل اپنی مرضی اور خوشی سے لائے۔ آپ کی اور ہنیہ آپی کی کوئی انوالومنٹ نہیں۔" ملاہا نے اس بار بہت تحمل' رسانیت اور رسان سے بات کی تھی۔

"بہت بہتر اور کوئی حکم؟" اس نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

"اور کوئی حکم سے کیا مراد؟ پہلے آپ نے میرے کتنے حکم مان لیے؟" ملاہا کو ذرا غصہ سا آیا۔ پل پل موڈ بدلتی اس لڑکی سے مل کر عمر کو واقعی مزہ آیا تھا۔ اس کا جی چاہا کہ اسے تھوڑا سا مزید غصہ دلا کر اس کے لبوں سے اپنے لیے کچھ "مزید" سنے لیکن اس نے دل کی خواہش کو دل میں ہی دبا لیا تھا۔

"آپ بے فکر ہو کر گھر جائیے۔ ہنیہ کو بھی تسلی دے دیجیے' ہماری طرف سے یہ رشتہ ختم سمجھے' میرے گھر والے آپ کے گھر والوں سے رابطہ کرکے یہ بات کرلیں گے۔"

"تھینک یو تھینک یو سو مچ۔ آپ نے تو مسئلہ ہی حل کردیا۔ اللہ آپ کو خوش رکھے۔" اس بار ملاہا نے خوش ہوتے ہوئے اس کا شکریہ ادا کیا۔ عمر مسکرا دیا تھا۔



ہنیہ بخار میں پھنک رہی تھی۔ سویرا اس کے ماتھے پر پٹیاں رکھ رہی تھی۔ پاس ہی متفکر سی بی بی جان بیٹھی تھیں۔

"ڈاکٹر یاجوہ کو کب سے فون ملا رہی ہوں۔ کوئی فون اٹھا ہی نہیں رہا۔ گھر پر کوئی مرد نہیں کس طرح اسے ڈاکٹر تک لے کر جائیں۔"

بے سدھ پڑی ہنیہ کو دیکھ کر بی بی جان بری طرح پریشان ہو رہی تھیں۔ اسی پریشانی میں انہیں ملاہا سے پوچھنا بھی یاد نہ رہا کہ وہ ان سے پوچھے بنا کہاں گئی تھی جو اتنی دیر بعد واپسی ہوئی ہے۔

"ہنیہ آپی دنیا کی واحد لڑکی ہیں جنہیں بات پکی ہونے کی خوشی میں بخار چڑھ گیا۔" ملاہا نے بی بی جان کو کن انکھیوں سے دیکھتے ہوئے کہا تھا وہ جواب میں کچھ نہ بولی تھیں۔

"کتنے گھنٹوں سے بھوکی پیاسی کمرے میں بند ہیں ہنیہ آپی اور ہم ایسے سنگ دل لوگ کہ وجہ پوچھنے کی زحمت بھی گوارا نہیں کی۔"

بی بی جان کی خاموشی سے شہ پا کر ملاہا نے ایک اور طنز کر ڈالا۔ سویرا اسے خاموش رہنے کا اشارہ کرتی رہی مگر ملاہا نے اس کے اشاروں پر توجہ دینا قطعاً ضروری نہ سمجھا تھا۔ اسی لمحے ہنیہ کراہی تھی۔ ملاہا لپک کے اس کے پاس گئی۔ بخار کی شدت سے ہنیہ پر غنودگی چھا رہی تھی۔ وہ کچھ بڑبڑائی تھی یہ بڑبڑاہٹ ملاہا کی سمجھ میں بھی نہ آئی لیکن اس سے ذرا فاصلے پر بیٹھی بی بی جان تک اس بڑبڑاہٹ کی "ٹرانسلیشن" پہنچانا ضروری سمجھا تھا۔

"بی بی جان' مجھ پر اعتبار کریں۔" اس نے خود کلامی کے سے انداز میں ہنیہ کی بات دہرائی تھی۔

"کیا ہو گیا ہے ہنیہ آپی! ہوش کریں۔ سب اعتبار کرتے ہیں آپ پر۔" ملاہا نے "جذباتی" ہو کر اس کے گال تھپتھپائے سویرا گہری سانس اندر کھینچتے ہوئے اس کی اوور ایکٹنگ ملاحظہ کر رہی تھی۔

"مدحت بیگم پہنچ گئی ہیں۔" اسی لمحے رحمت بوا نے کمرے میں جھانک کر اطلاع دی۔ بی بی جان ایک پل کو متفکر ہوئی تھیں لیکن اگلے لمحے ہی وہ پرسکون ہو گئیں۔

"چلو شکر ہے ڈاکٹر کے پاس لے جانے کا مسئلہ تو حل ہوا۔ مدحت کی گاڑی میں لے جاتے ہیں ہنیہ کو۔" بی بی جان کے پیش نظر اس وقت صرف اور صرف ہنیہ کی بگڑتی طبیعت تھی دوسری تمام باتیں ذہن سے محو ہو چکی تھیں۔

"رحمت بوا نے بتایا۔ ہنیہ کی طبیعت بہت خراب ہے۔ کیا ہوا ہے ہنیہ کو؟" متفکر اور متوحش ملاحت پھوپھو سیدھی ہنیہ کے کمرے میں ہی آئیں ان کے پیچھے مغیث کا پریشان چہرہ نمودار ہوا۔

"جو ہونا تھا ہو گیا اب آپ لوگ آئے ہیں تو سب کچھ صحیح ہو جائے گا۔" ملاہا کے سر سے جیسے منوں ٹنوں وزن اتر گیا تھا۔

اور پھر واقعی سب کچھ صحیح ہو گیا تھا۔ ملاہا نے بلاوجہ ڈاکٹر عمر کے پاس جانے کی زحمت کی تھی۔ اپنی خالہ کی مہربان بانہوں کا لمس پا کر ہنیہ ایسے ٹوٹ کر روئی کہ مدحت کو اسے سنبھالنا دشوار ہو گیا۔ نواسی کی اجڑی بکھری حالت دیکھنے کے بعد بی بی جان کو مزید کسی صفائی کی ضرورت نہ تھی۔ پشیمانی کے شدید احساس نے انہیں لپیٹ میں لے لیا تھا لیکن ہنیہ چپ رہ رہ کر تھک چکی تھی۔ اس نے رو رو کر نانی کو یقین دلایا تھا کہ وہ اسے غلط سمجھی ہیں۔ ڈاکٹر عمر سے اس کا کوئی تعلق' واسطہ نہیں۔

"آپ نے ڈاکٹر عمر سے میرا رشتہ طے کر دیا۔ میں اس فیصلے کے خلاف نہیں جاؤں گی۔ میں آپ کا ہر فیصلہ مانوں گی بی بی جان! لیکن آپ مجھ پر اعتبار تو کریں۔ آپ کی بیٹی نے آپ کے اعتماد کو ٹھیس پہنچائی تھی لیکن آپ کی نواسی نے کوئی ایسا کام نہیں کیا۔ آپ نواسی پر اعتبار کریں۔ اور بیٹی کی خطا معاف کر دیں۔ اب تو میری ماں کو مرے ہوئے بھی اتنا عرصہ گزر گیا بی بی جان۔"

وہ بلک بلک کر رو رہی تھی۔ بی بی جان سے مزید ضبط نہ ہوا۔ انہوں نے نواسی کو سینے سے چمٹا لیا تھا۔ وہ اس کا منہ چوم رہی تھیں اسے پیار کر رہی تھیں ان کی آنکھوں سے مسلسل آنسو گر رہے تھے۔

"غلطی صرف بچوں سے نہیں ہوتی غلطی بڑوں سے بھی ہوتی ہے۔ مجھے معاف کر دے میری بچی۔ میری ملیحہ کی نشانی۔" انہوں نے پھر اسے خود سے چمٹا لیا تھا۔ مدحت اور مغیث معاملے سے لاعلم تھے اور حیران پریشان سے کھڑے تھے۔

"کیا بات ہے بی بی جان۔ بتایئے تو سہی اور ہنیہ تم یوں رو رو کر کیوں حالت خراب کر رہی ہو' چلو ڈاکٹر کے پاس۔" مدحت نے پہلے ماں اور پھر بھانجی کو مخاطب کیا۔

"میں میڈیسن لے لوں گی خالہ۔!" ہنیہ نے نقاہت بھرے لہجے میں جواب دیا۔ اس کی آنکھوں میں اب بھی آنسو تھے لیکن شاید یہ خوشی کے آنسو تھے۔ بی بی جان کا شفیق لمس اور محبت بھرے بوسے آج تو زندگی کا خوش قسمت ترین دن تھا۔

"اویس میاں نہیں آئے۔" بی بی جان نے خود کو سنبھالنے کی کوشش کرتے ہوئے مدحت کو مخاطب کیا۔

"طلحہ کا پریکٹیکل تھا آج۔ ندا اور طلحہ کل اپنے پاپا کے ساتھ پہنچ جائیں گے مجھے تو مغیث آج زبردستی لے آیا کہہ رہا تھا جانے کیوں دل بے چین سا ہو رہا ہے۔ شام تک عثمان بھائی اور نوشابہ بھی پہنچ رہے ہیں میں نے انہیں بھی فون کر دیا تھا۔" مدحت نے بتایا تھا۔ بی بی جان محض ہنکارہ بھر کر خاموش ہو گئیں۔

"ہنیہ کو آرام کرنے دیں۔ آیئے باہر چل کر بات کرتے ہیں۔" مدحت بی بی جان کو ان کے کمرے میں لے گئیں۔ مغیث بھی ماں کے پیچھے گیا تھا۔

"اب بتائیں بی بی جان! کیا معاملہ ہے میرا تو دل ڈوب رہا ہے اتنی خوشی خوشی میں آپ کے پاس آئی تھی۔ عثمان بھائی کو بھی فون کر کے بلوایا۔ ہنیہ کیا کہہ رہی تھی۔ آپ نے کس سے اس کا رشتہ طے کر دیا۔"

مدحت متوحش انداز میں ماں کو مخاطب کر رہی تھی۔ مغیث بھی بے چین ہو کر نانی کی شکل دیکھ رہا تھا۔ بی بی جان پھر رو پڑی تھیں۔

"میں ڈر گئی تھی مدحت! ماضی والا قصہ پھر نہ دہرایا جائے۔ میں نے اپنی بچی کا اعتبار نہ کیا۔ انجانے میں مجھ سے ماضی والی غلطی دہرا دی۔ ہنیہ سے پوچھا تک نہیں۔ شدید غم اور غصے نے میری عقل سلب کر لی۔ بنا سوچے سمجھے ان لوگوں کو ہاں کر دی۔ لڑکے کی ماں ہنیہ کو انگوٹھی تک پہنا گئی۔" بی بی جان نے روتے ہوئے اپنی غلطی کا اعتراف کیا۔ مدحت اور مغیث کو تو جیسے سانپ سونگھ گیا تھا۔

"میں ہنیہ کو آپ سے مانگنے آ رہی تھی بی بی جان اور آپ نے کسی اور کو زبان دے دی۔" رنج، حیرت، افسوس کیا کچھ نہیں تھا مدحت کے لہجے میں۔ مغیث بھی بے دم سا ہو کر صوفے پر بیٹھ گیا۔ اس کی بے چینی بے سبب نہیں تھی۔

پشیمانی اور پچھتاوے کے شدید احساس کے زیر اثر بی بی جان روئے جا رہی تھیں جب دروازے سے کان لگا کر کارروائی سنتی ماہا سے مزید ضبط نہ ہوا وہ اندر آ گئی تھی۔

"پلیز آپ لوگ اتنی ٹینشن مت لیں۔ بی بی جان نے غلط فہمی کی بنیاد پر انہیں ہاں کہہ دی اب تو بات کلیئر ہو گئی ہے ڈاکٹر عمر کے گھر والوں کو انکار کر دیں گے۔" اس نے سب کو ٹینشن سے نکالنا چاہا تھا۔ مدحت ہنوز سر پکڑے بیٹھی تھیں مغیث لب کچل رہا تھا اور آہنی اعصاب والی بی بی جان اب بھی آنسو بہا رہی

تھیں۔

"آپ نے واقعی انہیں زبان دے دی بی بی جان۔" مدحت اب تک بے یقینی کے عالم میں تھیں۔

"ریلیکس پھوپھو! ہم ان کی انگوٹھی واپس کر کے اپنی زبان واپس لے آئیں گے۔" ماہا نے پھر تسلی دی تھی لیکن کوئی اس کی جانب متوجہ ہی نہ تھا۔ شام کو عثمان اور نوشابہ بھی پہنچ گئے تھے۔ معاملہ عثمان کے علم میں آیا۔ خلاف توقع وہ بہت زیادہ حیران و پریشان نہ ہوئے تھے۔

"یہ کوئی ایسا بڑا مسئلہ نہیں۔ جیسا کہ بی بی جان نے بتایا کہ وہ شریف' وضع دار اور خاندانی لوگ ہیں۔ ہم سلیقے بھاؤ سے ان سے معذرت کر لیں گے۔ مانا قول سے پھرنا اچھی بات نہیں۔ لیکن جب زندگی بھر کا معاملہ ہو تو محض قول نبھانے کی خاطر اپنے چاہے رشتے توڑنا سراسر حماقت ہے۔ ہمیں ماضی کی المناک روایت سے سبق سیکھنا ہو گا۔"

عثمان ٹھوس لہجے میں بولے تھے۔ سب کے تنے اعصاب ذرا ڈھیلے پڑے تھے۔ عثمان پہلی فرصت میں ڈاکٹر عمر کے ہاں جانا چاہتے تھے لیکن اس سے پہلے عمر کی والدہ اپنی بڑی بیٹی کے ہمراہ خود ہی پہنچ گئی تھیں۔ ڈاکٹر عمر نے اپنی کمٹمنٹ بھلائی تھی۔ بس شائستگی سے ان لوگوں نے بات کی تھی۔

"ہنیہ کی دوست نابیہ کے ذریعے پتا چلا کہ آپ لوگوں کو یہ غلط فہمی ہوئی کہ عمر اور ہنیہ ایک دوسرے کو پسند کرتے ہیں۔ اسی لیے آپ لوگوں نے اقرار کر لیا۔ ایسی کوئی بات نہیں تھی۔ ہم ہنیہ سے اس کی ایک سہیلی کی شادی میں ملے تھے۔ ہنیہ ہمیں بہت پسند آئی' اتفاق سے اس روز یہ تذکرہ کرنا بھول گئے تھے اس کے لیے ہم معذرت خواہ ہیں اور ویسے بھی رشتے آسمانوں پر بنتے ہیں اگر آپ لوگوں کی رضامندی نہیں ہے تو اس بات کو یہیں ختم سمجھیے۔"

ڈاکٹر عمر کی والدہ نے بات مکمل کی تو ڈرائنگ روم میں بیٹھے سب لوگوں کے دل و دماغ پر سے بھاری بوجھ ہٹ گیا۔ مہمانوں کو کولڈ ڈرنک سرو کرتی ماہا نے ڈاکٹر عمر کی عقل مندی کو سراہا تھا۔ اگر وہ لوگ نابیہ کا حوالہ نہ دیتے تو یہ وضاحت ممکن نہ ہوتی کہ ان کے علم میں سارا معاملہ کیسے آیا اور اس پہلو پر ماہا بی بی نے غور ہی نہ کیا تھا۔ بہرحال ایک بہت بڑی ٹینشن کا خاتمہ ہو گیا تھا۔ ڈرائنگ روم میں موجود مہمان اور میزبان خوش دلی سے ایک دوسرے سے گپ شپ کرنے لگے تو وہ ہنیہ کو ڈھونڈتی ڈھونڈتی گھر کے عقبی لان میں پہنچ گئی۔ ہنیہ کو بھی خوش خبری سنانا ضروری تھا نا۔

"امید ہے' مہمانوں کے جاتے ہی مدحت پھوپھو آپ کو مغیث بھائی کے نام کی انگوٹھی پہنا دیں گی۔ بس اب آپ مغیث بھائی کو منانے کا طریقہ سوچیں۔ وہ آپ سے سخت روٹھے بیٹھے ہیں۔" اس نے ہنیہ کو شرارتی انداز میں مخاطب کیا۔ ہنیہ نے ناسمجھی سے اسے دیکھا تھا۔

"اب اتنی انجان مت بنیں۔ آپ خود ہی تو کہہ رہی تھیں کہ بی بی جان اگر آپ نے ڈاکٹر عمر سے میرا رشتہ طے کر بھی دیا تو میں آپ کا فیصلہ قبول کر لوں گی۔ بس آپ مجھ پر اعتبار کریں۔" اس نے ہنیہ کے لہجے کی نقل اتاری۔

"مغیث واقعی ناراض ہیں کیا؟" ہنیہ کو فکر دامن گیر ہوئی۔

"ناراض ہیں بھی تو اتنا فکر کرنے کی کیا ضرورت ہے بھئی۔ مغیث بھائی کے کان میں جا کر تین لفظ بول دیں' خود ہی مان جائیں گے۔" اس نے مسکراتے ہوئے راہ سجھائی۔

"کون سے تین لفظ۔" ہنیہ نے اسے بری طرح گھورا تھا۔ ماہا ذرا گڑبڑائی تھی۔

"اب مان بھی جائیں نا۔ بس یہ ہی تو بولنا ہے۔" اس نے بات سنبھالی۔ ہنیہ کے چہرے پر مسکراہٹ دوڑ گئی۔

"یہ تین نہیں پانچ لفظ ہیں۔" ہنیہ نے مسکراتے ہوئے تصحیح کی۔

"اب اور بتا دیں پھر تو تین ہی بچیں گے نا۔"

"ماہا بی! اگر آپ مجھے موقع دیں تو میں تین' پانچ یا

ساتھ لفظ خود ہی بول لوں اور یہ ڈس انفارمیشن کیوں پھیلا رہی ہیں کہ میں ہنیہ سے ناراض ہوں۔" جانے کب مغیث اس کے پیچھے آکر کھڑا ہوا تھا۔ اس نے مسکرا کر ماہا کو مخاطب کیا۔ وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی تھی۔

"جانتی ہوں' آپ ہنیہ آپی سے ناراض ہو ہی نہیں سکتے اور اس میں کمال آپ کا نہیں' ہماری ہنیہ آپی ہیں ہی اتنی اچھی کہ کوئی ان سے ناراض ہو ہی نہیں سکتا۔ اتنے برسوں سے بی بی جان بلاوجہ ناراض تھیں۔ شکر ہے آج اس ناراضی کا بھی خاتمہ ہوا۔" وہ ہنسی تھی اتنے میں پھولے سانسوں کے ساتھ سویرا بھی اسے ڈھونڈتی ہوئی یہاں پہنچ گئی۔

"ماہا! تمہارا رشتہ آیا ہے۔" اس نے ماہا کو نئی اطلاع دی۔

"کہاں سے؟" اس نے ہکا بکا ہو کر پوچھا۔

"ڈاکٹر عمر کے گھر والوں نے اب تمہیں پروپوز کیا ہے۔" سویرا نے اس کے حواسوں پر بم گرایا تھا۔

"ابھی میں نے ادھوری بات سنی۔ تمہیں بتانے کے لیے آئی تھی۔ اب دوبارہ وہیں جارہی ہوں۔"

سویرا تیزی سے واپس مڑی تھی۔

ماہا بھی اس کے پیچھے لپکی تھی۔

☆ ☆ ☆

"ہمیں آپ کی فیملی بے حد پسند آئی ہے۔ ہماری خواہش ہے عمر کا رشتہ اسی خاندان کی کسی بچی سے جڑ جائے۔ آگے آپ کا جو بھی فیصلہ ہوگا ہمیں قبول ہے۔" ڈاکٹر عمر کی ڈیسنٹ سی والدہ نے جاتے جاتے ایک بار پھر سب کو حیران کیا تھا۔

"میری دو بھتیجیاں ہیں۔ سویرا کی تو منگنی ہوچکی۔ ماہا کے لیے ابھی ہم نے کچھ نہیں سوچا۔" مدحت پھوپھو نے متانت سے کہا۔

"جی۔ جی ماہا۔ ہم ماہا کی ہی تو بات کر رہے ہیں۔" عمر کی آپا پرجوش ہوئی تھیں۔ اس کی والدہ نے ہلکا سا کھنکھار کر بیٹی کو مزید پرجوش ہونے سے روکا۔

"آپ لوگوں سے مل کر ہمیں بھی بہت اچھا لگا۔ ایک ملاقات صاحب زادے سے بھی کرلیں' پھر باہمی مشورے سے آپ کو جواب سے آگاہ کریں گے۔" عثمان نے شائستگی سے جواب دیا۔

"جی جی ضرور۔" مطمئن انداز میں ان لوگوں کی واپسی ہوئی تھی۔ ڈرائنگ روم میں پھر گول میز کانفرنس منعقد ہوگئی۔

"بہت اچھی سلجھی ہوئی فیملی تھی۔" عثمان نے پہلی رائے دی تھی۔

"اور ماشاء اللہ ہماری بچیاں اتنی پیاری ہیں کہ لوگ پہلی نگاہ میں ہی فریفتہ ہوجاتے ہیں۔ چند لمحوں کے لیے ماہا کولڈ ڈرنک سرو کرنے اندر آئی تھی اور ان لوگوں نے ماہا کو پسند کرلیا۔" مدحت پھوپھو کے خیال میں سارا کمال گھر کی بچیوں کی پیاری پیاری صورتوں کا تھا۔

"لوگ واقعی اچھے ہیں۔ لیکن اب کوئی فیصلہ جلد بازی میں مت کرنا اور ماہا سے ضرور پوچھ لینا وہ میری بہت کٹ کھنی پوتی ہے۔" بی بی جان نے مسکرا کر بیٹے کو مخاطب کیا۔ عثمان نے مسکرا کر اثبات میں گردن ہلادی۔

☆ ☆ ☆

"مجھے آج صبح سے منہ دھونے کی فرصت نہیں ملی اور مدحت پھوپھو کا خیال ہے کہ ڈاکٹر عمر کی ماں بہنوں نے مجھے پہلی نگاہ میں پسند کرلیا۔" ماہا کو اس بیان کی صداقت پر رتی برابر یقین نہ آیا تھا۔ اسے جب سے یہ بات پتا لگی تھی وہ کمرے میں بے چینی سے چکر کاٹ رہی تھی۔

"خیر' صبح تو تم منہ دھو کر ہی ڈاکٹر صاحب سے ملنے گئی تھیں۔ یقیناً" انہوں نے ہی اپنی امی کے سامنے تمہارا نام لیا ہوگا۔" سویرا پر یقین لہجے میں بولی۔

"یہ کوئی بات ہے بھلا۔ ہنیہ آپی سے جڑا رشتہ توڑنے آئے تھے اور منہ اٹھا کر میرا رشتہ مانگ لیا۔ بظاہر تو وہ بندہ ٹھیک ٹھاک لگتا ہے' ڈاکٹر ہے' پرسنالٹی بھی ٹھیک ٹھاک ہے' پھر آخر اسے رشتوں کی ایسی کیا کمی کہ جس گھر کی ایک لڑکی سے رشتہ جڑتے ہی ٹوٹ گیا' اگلے دن وہ دوسری لڑکی کا رشتہ مانگنے پہنچ گئے۔"

"کہنا کیا چاہتی ہو؟" سویرا نے پوچھا۔

"اس بندے میں یقیناً" کوئی نہ کوئی ایسی خامی ہے جس کی وجہ سے اس کے گھر والے اجنبی اور انجان لوگوں میں ایسے جھٹ پٹ اس کا رشتہ طے کر رہے ہیں۔ بی بی جان کو بتادو کہ میں کسی مشکوک شخص کا ساتھ قبول نہیں کرسکتی۔"

"بات تو صحیح ہے۔ وہ بندہ اتنا قابل ڈاکٹر ہے۔ بھلا اسے رشتوں کی کیا کمی ہوگی۔ پہلے ہماری بھولی بھالی سی ہنیہ آپی سے رشتہ جوڑنا چاہا۔ بی بی جان نے فوری اقرار کرلیا تو ان کی اتنی ہمت ہوگئی کہ آج ہنیہ آپی کو چھوڑ کر تمہارا رشتہ مانگ لیا۔ ان کا خیال ہوگا' بغیر کسی چھان بین اور جانچ پڑتال کے ہم اس بار بھی ہاں کردیں گے۔ لیکن تم بہت عقل مند ہو ماہا۔ جس پہلو پر تم نے سوچا' میرا تو اس طرف دھیان ہی نہ گیا تھا۔" سویرا نے نہ صرف بہن کی "سازشی تھیوری" سے اتفاق کرلیا تھا بلکہ اس کی عقل مندی کو بھی سراہا تھا۔ فخر سے ماہا کی گردن تن سی گئی۔ واقعی اس کے نزدیک اس سے عقل مند اور کون تھا۔

"کل شام کو ڈیڈی کی واپسی ہے۔ پھوپھو' چند دن سے پہلے کہاں آپائیں گے۔ اس لیے فی الحال تو یہ معاملہ ملتوی سمجھو۔ اس عرصے میں' میں ڈاکٹر عمر کی اصلیت جان ہی جاؤں گی۔" ماہا کے پاس اس بارے میں کوئی واضح حکمت عملی تو نہ تھی۔ لیکن اسے اپنی صلاحیتوں پر پورا بھروسا تھا۔ سویرا نے بہن کے پریقین لہجے پر بہت متاثر ہو کر اسے دیکھا۔ وہ واقعی سب کچھ کرسکتی تھی۔

☆ ☆ ☆

مدحت پھوپھو کی فیملی واپس جاچکی تھی۔ انہوں نے ہنیہ اور مغیث کی منگنی کے بجائے شادی کی تاریخ طے کروالی تھی۔ دو ماہ بعد ان کی شادی تھی۔ ہنیہ کے چہرے پر بکھرا گلال دیکھ کر بی بی جان اللہ کا شکر ادا کرتے نہ تھکتیں۔ ماہا اور سویرا بھی ہنیہ کو مغیث کے حوالے سے خوب ہی چھیڑتیں۔ ڈاکٹر عمر کے گھر والوں نے ایک بار فون پر رابطہ کرکے بی بی جان کو فیملی سمیت اپنے ہاں مدعو کیا تھا۔ انہیں یقین دہانی کروادی گئی کہ عثمان جب دوبارہ چکر لگائیں گے تو ضرور ان لوگوں کو شرف میزبانی بخش دی جائے گی۔

ہنیہ' ماہا کی سازشی تھیوری سے اتفاق نہ کرتے ہوئے اسے مسلسل ڈاکٹر عمر کی اچھائیاں گنواتی اور اس کے حق میں قائل کرنے کی کوشش میں لگی ہوئی تھی۔

"ہنیہ آپی۔ آپ بہت معصوم ہیں' زمانے کی چالاکیوں سے آپ آگاہ ہی نہیں۔ ہوسکتا ہے کہ آپ کی باتیں درست ہوں اور یہ سب میرا وہم ہو لیکن میں اس بندے سے صرف ایک بار ملی ہوں۔ جب تک اس سے ایک دو بار مزید نہ مل لوں میرا دل مطمئن نہیں ہوگا۔" اس نے آخر دل کی بات کہہ ہی ڈالی۔

"ویسے تو عمر خود بھی تم سے ملنا چاہ رہا ہے' لیکن میں نے اس سے کہا۔" ہنیہ نے بات ادھوری چھوڑی تھی۔ چند لمحوں کے لیے کچھ سوچا۔ پھر دوبارہ ماہا کو مخاطب کیا۔

"اگر چاہو تو کل ہاسپٹل آکر مل لو اس سے۔" ماہا نے بھی تھوڑا سا سوچنے کے بعد دھیرے سے اثبات میں گردن ہلادی۔

☆ ☆ ☆

"میں چار بہنوں کا اکلوتا بھائی ہوں۔ میرے والد حیات نہیں۔ خاندان میں میرے والد ہی سب سے بڑے تھے۔ ویسے بھی ہمارے خاندان میں میری بہنوں کے علاوہ لڑکیوں کی خاصی قلت ہے اور فیملی کی سب سے بڑی لڑکی بھی مجھ سے چودہ سال چھوٹی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ میرا فیملی میں رشتہ طے نہیں ہوسکا۔ ہنیہ نے مجھے بتایا تھا کہ آپ میرے بارے میں خاصے تحفظات رکھتی ہیں۔ میں مرحلہ وار سب باتوں کا جواب دینے کو

تیار ہوں، پوچھیے اور کیا پوچھنا ہے۔"

بہت سکون سے کہنیاں میز پر ٹکائے وہ ملاہا سے مخاطب تھا۔ بندہ صاف گو تھا۔ ملاہا یہ جانتی تھی، لیکن وہ چھوٹتے ہی پہلی بات یہ کرے گا یہ اس نے نہ سوچا تھا۔ وہ دل ہی دل میں کچھ شرمندہ سی ہوئی۔ پتا نہیں ہنیہ آپی نے اسے کیا کچھ بتا ڈالا تھا۔

"دیکھیے ڈاکٹر عمر! شادی زندگی بھر کا معاملہ ہے۔ دل کی پوری تسلی کے بغیر کوئی رشتہ کیسے جوڑا جا سکتا ہے۔" اس نے بہت مدبر بن کے اپنی صفائی دی۔

"بالکل درست فرمایا آپ نے۔" عمر نے بھی سنجیدگی سے اس کی بات کی تائید کی، لیکن اس کی بھوری آنکھیں مسکرا رہی تھیں۔

"اپنی کولیگز لڑکیوں کے علاوہ میری کسی لڑکی سے ہائے ہیلو نہیں۔ موبائل میں نے صرف فون سننے اور الارم لگانے کے لیے رکھ رکھا ہے۔ سگریٹ میں نہیں پیتا۔ بڑوں کا ادب کرتا ہوں، چھوٹوں کا لحاظ کرتا ہوں، مریضوں سے بہت خندہ پیشانی سے پیش آتا ہوں۔ یہ تو میری کچھ اچھائیاں ہیں۔ ہاں غصے کا کچھ تیز ہوں۔ لیکن شاید سال میں دو تین بار ہی آتا ہے۔ کھانے پینے میں بہت نخرے کرتا ہوں۔ لیکن اس میں بھی میرا قصور نہیں۔ اکلوتا ہوں۔ اس لیے ماں بہنوں نے بگاڑ دیا اور اسی اکلوتے پن کی وجہ سے میری امی اور بہنیں جلد از جلد میرے سر پر سہرا دیکھنے کی خواہش مند ہیں۔ میری شادی ان لوگوں کی زندگی کی سب سے بڑی خواہش بن چکی ہے۔ اسی جلد بازی میں انہوں نے اسی روز آپ کے گھر والوں کے سامنے دوسری بار میرا رشتہ پیش کر دیا۔ حالانکہ میں نے ان سے کہا تھا۔"

"یعنی اس رشتے میں آپ کی مرضی شامل نہیں۔" ملاہا نے اس کی بات کاٹی تھی۔

"ملاہا بی بی! آپ نتیجہ بہت جلد اخذ کر لیتی ہیں۔ بات پوری تو ہو لینے دیا کریں۔" وہ ذرا خفا ہوا تھا۔ پھر گہری سانس اندر کھینچتے ہوئے اسے دوبارہ مخاطب کیا۔

"ایک جوک سناؤں آپ کو۔" بہت سنجیدگی سے اس نے ملاہا سے پوچھا۔ پھر اس کے جواب کا انتظار کیے بنا شروع ہو گیا تھا۔

"ٹرین کے ایک کمپارٹمنٹ میں دو ہی مسافر تھے۔ آدھی رات کا وقت تھا۔ ایک مسافر نے دوسرے سے پوچھا۔ آپ کو بھوتوں پر یقین ہے؟ دوسرے نے کہا نہیں، یہ سن کر پہلا مسافر پلک جھپکتے میں غائب ہو گیا۔" بہت سنجیدگی سے اس نے یہ ڈراؤنا سا لطیفہ سنایا تھا۔ ملاہا کو ہنسی تو خاک آتی اسے تو سنانے کا مقصد بھی سمجھ نہ آیا تھا۔

"جس طرح مسافر کو بھوتوں پر یقین نہیں تھا اسی طرح مجھے بھی لو ایٹ فرسٹ سائٹ پر یقین نہیں تھا۔ لیکن جو مسافر کے ساتھ بنی وہی میرے ساتھ ہوا۔" معصومیت سے اظہار محبت فرمایا گیا تھا۔ پھر بھی ملاہا بری طرح بوکھلائی تھی۔ وہ تو صرف انوسٹی گیشن کرنے آئی تھی۔ کیا خبر تھی ڈاکٹر موصوف اس طرح کی بات بھی کر سکتے ہیں۔

"اب اگر آپ چاہیں تو میں آپ کے ساتھ کورٹ جا کر آپ کو بیان حلفی بھی تیار کروا کے دے سکتا ہوں کہ میں ہرگز کسی مشکوک سرگرمی میں ملوث نہیں۔ میرے گھر والوں نے آپ کے گھر جا کر آپ کا رشتہ مانگا۔ وہ صرف پہلی نگاہ کی محبت کا معاملہ ہے۔ اس کے سوا ہمارے پس پردہ عزائم کچھ نہیں ہیں۔" وہ اب مسکرا رہا تھا۔ ملاہا بی بی کی ساری تیزی طراری ہوا ہو گئی۔ انوسٹی گیشن جائے بھاڑ میں، اس شخص کی نرم نرم سی بولتی نگاہوں کا سامنا اب ملاہا کے بس کی بات نہ تھی۔

"جب بی بی جان کو پتا چلے گا کہ میں نے آپ سے ملاقات کی ہے تو وہ میرا جو حشر کریں گی، آپ جانتے ہیں۔ بس میں اب چلتی ہوں۔" اس نے میز پر دھرا اپنا ہینڈ بیگ اٹھایا۔ عمر اس کی اتنی اچانک روانگی پر ہرگز تیار نہ تھا۔ بس نے بوکھلا کے اسے روکنے کی کوشش کی۔

"آج میرا ڈیوٹی کا آف تھا۔ میں اتنی دور سے گھر والوں کو بتائے بغیر آپ سے ملنے آیا۔ آپ مجھے یوں چھوڑ کر کیسے جا سکتی ہیں۔" کمال کی یادداشت تھی اس بندے کی۔ ایسے ہی تو ڈاکٹر نہیں بنا تھا۔

"اچھا ایسے خونخوار نگاہوں سے مت گھوریں۔ بیٹھ جائیں اور رہی بات آپ کی بی بی جان کی تو کون بتائے گا انہیں، صرف ہنیہ آپ کی یہاں آمد سے واقف ہیں۔ کیا آپ کو ہنیہ پر اعتبار نہیں۔" وہ پوچھ رہا تھا۔

"مجھے ہنیہ آپی پر اعتبار کیوں نہ ہو گا اور جہاں تک بات ہے بی بی جان کو بتانے کی تو انہیں کوئی اور کیوں بتائے گا۔ انہیں میں خود بتاؤں گی۔ بی بی جان ویسے تو ہماری دادی ہیں، لیکن وہ میرے لیے ماں کی جگہ ہیں۔ ماؤں سے ہرگز کوئی بات نہیں چھپانی چاہیے۔ خصوصاً جب لڑکیاں کسی کو پسند کرنے لگیں تو سب سے پہلے یہ بات اپنی ماں کو بتانی چاہیے۔ ماں راضی ہو گی تو معاملے کو منطقی انجام تک وہی پہنچائے گی اور اگر ماں منع کر دے تو لڑکیوں کو بنا کسی جرح کے ماں کی بات مان لینی چاہیے۔" ملاہا فلسفیانہ موڈ میں آ چکی تھی۔ ڈاکٹر عمر کے چہرے پر بے ساختہ مسکراہٹ ابھر آئی۔

"تو گویا آپ مجھے پسند کرنے لگی ہیں۔" پوری تقریر میں اسے یہی نکتہ سمجھ میں آیا تھا۔ ملاہا پھر گڑبڑائی تھی۔

"آپ ایویں اندازے مت قائم کریں۔ ویسے بھی مجھے ڈاکٹرز قطعاً اچھے نہیں لگتے۔" خود کو سنبھالتے ہوئے اس نے ذرا بے نیازی بھرا جواب دیا۔

"اوہ تو گویا آپ کو اپنی ہنیہ آپی بھی قطعاً اچھی نہیں لگتیں۔" اس بندے سے تو بحث کرنا ہی فضول تھا لیکن کچھ بھی ملاہا تھی۔

"ہنیہ آپی میری کزن ہیں اور پھر لیڈی ڈاکٹر ہیں۔ میں نے یہ بات لیڈی ڈاکٹرز کے بارے میں نہیں کہی تھی۔" کیا برجستہ جواب تھا۔ اس نے دل میں خود کو داد بھی دی۔

"اب آپ کی خاطر میں لیڈی ڈاکٹر تو بننے سے رہا۔" عمر نے ٹھنڈی سانس بھر کر کہا اور اس بار نہ چاہتے ہوئے بھی ملاہا کو ہنسی آ گئی۔ یہ بندہ بھی اس کی طرح بے تکی باتیں کرنے میں ماہر ہے۔ اگر ڈیڈی اور بی بی جان اسے اوکے کر دیتے ہیں تو زندگی مزے میں گزرنا تھی اور ڈاکٹر عمر بھی مسکراتے لبوں کے ساتھ بالکل یہی بات سوچ رہا تھا۔ دونوں کی نگاہیں ملیں اور دونوں پھر ہنس پڑے تھے۔

☼

نبیہ نقوی

محبت فاتح عالم

رباح کی آنکھوں میں آنسوؤں کی برسات تھی۔

وہ اپنے باپ کی وجہ سے بے حد پریشان تھی۔ نشہ کی بری لت نے اسے کہیں کا نہیں چھوڑا تھا۔

نذر محمد شروع سے خراب نہ تھا مگر برے دوستوں کی صحبت نے تباہ کر دیا تھا۔ راتوں کو دیر سے آنا' دفتر سے آئے دن ناغے۔ جس کے سبب ملازمت سے برطرف کر دیا گیا۔ اور پھر جیسے روزگار بھول ہی گیا۔ جب شوہر کو بیوی کی کمائی کی عادت پڑ جائے تو پھر وہ اپنی ملازمت کے متعلق سوچنا چھوڑ دیتا ہے۔ نذر محمد کا بھی یہی حساب ہوا۔

سلطانہ پڑھی لکھی تھی۔ لہٰذا چند اچھی ٹیوشنز مل گئیں' جس سے گھر کا دال دلیہ چل رہا تھا۔ رباح نے بھی پرائیویٹ پڑھائی شروع کر دی۔ نذر محمد دن میں چارپائی توڑتا رہتا۔ رات کو باہر چل دیتا۔ منہ اندھیرے گھر آنا اس کا معمول بن گیا تھا۔ سلطانہ اسے دنیا کی اونچ نیچ سمجھاتی۔ اچھے دن یاد کراتی تو کہتا۔

"تو دیکھتی رہ بس۔ ایک ہی داؤ میں سارا ادھار چکا دوں گا۔"

"جوئے میں آج تک کسی کو بنتے نہیں دیکھا۔ یہ گھر پھونک تماشا ہے۔ چھوڑو اس کو۔ کوئی کام ڈھونڈ لو۔ بیٹی بیاہنی ہے۔" وہ بیزار ہو کر کہتی۔

"معلوم ہے۔" وہ ٹکا سا جواب دیتا۔

"شکر کرو ایک ہی بیٹی ہے' دو چار ہوتیں تو پتا چلتا۔"

ناولٹ



اور پھر تکرار شروع ہو جاتی۔ جس روز لڑائی ہوتی۔ اس رات تو وہ بالکل گھر نہیں آتے۔

"ابا کہاں جاتے ہیں آخر۔" رباح متفکر ہوتی۔

"اپنے جیسے بے ہودہ دوستوں میں اور کہاں جائے گا۔ تم سو جایا کرو۔"

"مجھے ڈر لگتا ہے' وہ پچھلے گھر میں' سنا ہے سایہ ہے۔ ابا آجاتے ہیں تو اطمینان ہو جاتا ہے۔"

"آیت الکرسی پڑھ کر سویا کرو۔" سلطانہ تلخی سے کہتی۔

آج بھی تکرار ہوئی تھی لہٰذا وہ غائب تھا۔

"انہیں معلوم ہے' مجھے ڈر لگتا ہے' پھر بھی دیر سے آتے ہیں۔" رباح باپ سے ناراض تھی۔

آدھی رات کو دروازہ بجایا جا رہا تھا۔

"ابا آگئے۔" وہ ایک ہی جست میں چارپائی سے کودی۔

"ٹھہری رہو میں کھولتی ہوں۔" سلطانہ کو شاید لو لگ گئی تھی۔ ورنہ رات بھر میاں کے سدھرنے کی دعا میں کرتی تھی۔

"کہاں مر گئی تھی؟ ٹھاٹ سے پڑی سوتی رہتی ہے۔" انتہائی غلیظ گالی دی گئی۔

"کتنے برے ہیں ابا!" رباح نے منہ تک چادر لے لی۔ "چلو! شکر ہے آتو گئے' اب میں آرام سے سو جاؤں گی۔" اس نے اطمینان سے کروٹ لی۔

"بیٹی جوان ہے اب تو سدھر جاؤ' وہ تمہارا انتظار کرتی رہتی ہے۔"

"اچھا۔ اچھا۔ دماغ نہ کھاؤ' ابھی ہوش نہیں ہے کچھ۔" ادھیڑ عمر' کھچڑی بال' ملگجے سے کپڑے' چال میں لڑکھڑاہٹ اس کی حالت عجیب ہو رہی تھی۔

"کہاں نصیب پھوٹے۔ اس موئے کو ذرا احساس نہیں۔" سلطانہ کڑھ کے رہ گئی۔

وہ چارپائی پر اوندھا جا پڑا۔

☼ ☼ ☼

سویرے نذر محمد کو ناشتے میں انڈا کچا ہے تھلپلا ہے اور چائے کا پیالہ دیوار پر دے مارا۔

"خدا کا خوف کرو۔" پیالے کی کرچیاں اٹھاتے ہوئے سلطانہ سسکی۔

رباح چائے کے پیالے میں پاپے ڈبو ڈبو کر کھا رہی تھی۔ بالوں کی چھوٹی بڑی لٹیں حسین چہرے پر نثار ہو رہی تھیں۔

"ایسے خوب صورت نقش۔" نذر محمد نے اسے غور سے دیکھا تھا۔ سلطانہ نے باپ کی نگاہ بیٹی پر گئی دیکھی تو خوف سے لرز گئی۔

"کتنا کھائے گی' چل دفعان ہو کمرے میں۔"

سلطانہ کی کرخت آواز وہ پر آدھا پاپا منہ میں دبا کر وہ اندر بھاگی۔

"کیوں اندر بھیج دیا اسے؟" اسے برا لگا۔

"باپ جوان بیٹیوں کو اتنے غور سے نہیں دیکھا کرتے۔" اس نے رسان سے سمجھایا' مگر اندر سے جان نکلی جا رہی تھی۔ نذر محمد کے کرتوت اسے پتا تھے۔

"ہونہہ! آئی بڑی افلاطون۔ ویسے۔ بگڑا تو تیرا بھی کچھ نہیں؟" فوراً بیوی پر نگاہ ڈالی۔ "معاکم نے لاکھوں کمالیے۔ اس کی بیوی بھی بڑی دھانسو۔"

"خبردار!" وہ حلق کے بل چلائی۔ "میرے میں ایسا سوچنا بھی مت۔"

وہ کمینگی سے ہنسنے لگا۔ وہ چکرا کر رہ گئی تھی۔

"وہ جہنم میں ڈالے جاؤ گے۔"

"پہلے اس جہنم کو تو بھرو۔" اس نے پیٹ پر ہاتھ مارا۔ وحشانی کی انتہا تھی۔

"دن رات اسی کے لیے تو آنکھیں پھوڑتی ہوں۔" اس نے احساس دلانے کی کوشش کی۔

"کیوں پھوڑتی ہو۔ اتنی آنکھیں ہیں۔ ان میں کاجل ڈالا کرو۔ کتنے تمہارے قدموں میں گریں گے۔"

وہ بے شرمی سے ہنسا۔

"خدا سے ڈرو نذر محمد!" سلطانہ لرز گئی تھی اس کے ارادے خطرناک لگ رہے تھے۔

دن بھر غائب رہا اور سلطانہ خوف سے دہلتی رہی۔

"امی ابو کیسی باتیں کرتے ہیں؟" ماں کو لرزتے کانپتے دیکھ کر وہ بھی ڈر گئی تھی۔

"انسان کی ذہنیت بدلتے دیر نہیں لگتی۔ بری صحبت نے اسے کہیں کا نہ رکھا۔"

"میں کہیں نوکری کرلوں؟" اس نے اجازت طلب نظروں سے ماں کو دیکھا۔ اسے معلوم تھا باپ اچھے کھانوں کا شوقین ہے۔ دونوں ماں بیٹی کمانا شروع کریں گی تو باپ کی نت نئی فرمائشیں باآسانی پوری ہو سکیں گی۔

"چپ کرو تم!" سلطانہ ویسے ہی پریشان تھی اس کی بات نے اسے مزید تپایا تو اسے ڈانٹ دیا۔

وہ سارا دن دہلتی رہی۔ "اس کی سوچ کو میں کیسے بدلوں؟"

رباح بھی اسے دیکھ کر پریشان ہوتی رہی۔

☼ ☼ ☼

"بات سنو بیوی!" شام کو وہ آیا تو ہاتھ پکڑ کر کمرے میں لے گیا۔ "سلطانہ! مجھے معاف کرو' بڑا مجبور ہو گیا ہوں' تمہیں صرف ایک روز کے لیے کرم کے پاس جانا ہوگا' میں جوئے میں ہار گیا ہوں۔"

"تم۔ تم۔ کمینے انسان! میری بولی لگا دی۔" غصے سے سلطانہ کی آواز پھٹ گئی۔ "تمہارے اندر کی غیرت مر گئی ہے۔" اس نے دونوں ہاتھ دعا کے انداز میں اٹھائے۔ "خداوند تعالیٰ تو مجھے اس جہاں سے اٹھالے۔"

"بیوہ ہونے کی دعا مانگ۔" وہ بھی رو رہا تھا۔

"ہونہہ ایسے رو رہے ہو جیسے بڑی غیرت ہے؟" اس نے نفرت سے زمین پر تھوک دیا۔

"تم۔ تم۔ تیار رہنا' میں رات کو لے جاؤں گا' ورنہ وہ ہماری بیٹی کو غنڈوں سے اٹھوالے گا۔"

وہ ٹھٹک گئی' نذر منہ چھپا کر چلا گیا۔

سلطانہ کے دماغ میں دھماکے ہو رہے تھے۔ وہ کوئی بھی انتہائی قدم اٹھانے کو تیار تھی۔ رباح الگ دہل کر رہ گئی تھی' باپ کی آواز اس کے کانوں نے بھی سنی تھی۔ وہ حواس باختہ تھی۔

"اٹھو جلدی اس جہنم سے نکل جاؤ۔" سلطانہ نے اسے پاگلوں کی طرح گھسیٹا۔

"اس سے پہلے تمہارا باپ آجائے۔"

"امی امیں کہاں۔ کہاں جاؤں۔" رباح خوف سے ڈھے گئی۔

"ہم گھر کے پچھلے حصے میں جہاں کچرا پڑا رہتا ہے وہاں جاکر چھپ جاؤ' صبح آجانا۔ اس کمینے انسان نے مجھے بیچ ڈالا ہے۔ چرسی' شرابی' جواری' ضمیر مرگیا اس کا۔"

"تم تو امی۔ ہم دونوں کہیں چلتے ہیں۔"

"تمہارا باپ آنے ہی والا ہوگا۔ خدا کے واسطے رباح! بحث نہ کرو' نکل جاؤ۔"

"مگر؟" وہ ہچکچائی۔

"چلی چل۔" سلطانہ نے اسے گھسیٹ کر دروازے سے باہر دھکیل دیا۔ وہ جیسے سوچ سمجھ سب بھول چکی تھی۔

"یا اللہ۔"

اس کے پیروں تلے سے زمین نکلی جارہی تھی۔

بڑے سے دوپٹے میں لرزتا کانپتا وجود لیے وہ گھر سے باہر آئی۔ گھر کے پچھلے حصے کی طرف بڑھی یہاں اندھیرا تھا اچانک کتے کی آواز پر وہ بری طرح بھاگی تھی۔ باپ کا سایہ ناقابل بھروسا اور ماں کا سایہ ہمیشہ کے لیے چھوٹ جائے گا۔

"یہ کیسا فیصلہ کرلیا امی نے ابلیہ۔" باپ کا خیال آتے ہی بدن میں نفرت کی لہری اٹھی تھی۔

رات بڑھتی جارہی تھی مگر ٹریفک ابھی رواں دواں تھا۔

شور مچاتی بس، دھواں اڑاتے رکشے۔ اس نے چاروں طرف دیکھا۔ گاڑیوں کا اژدھام تھا۔ وہ سوچ میں پڑ گئی۔ روڈ پار کرلوں یا کسی گاڑی کے نیچے آجاؤں یا اسی جہنم میں واپس پلٹ جاؤں۔

"امی نے زہر کھالیا ہوگا۔ اور اب ابا کیا کررہے ہوں گے۔"

رات بڑھتی جارہی تھی۔ اس کا خوف بھی بڑھ رہا تھا۔ وہ تو ویسے ہی ڈرپوک تھی۔

گھبراہٹ میں اس نے قریب گزرنے والی گاڑی کو ہاتھ دے دیا دوسرے لفظوں میں اپنی شامت کو خود آواز دی۔

"آ۔ آپ میری مدد کرسکتے ہیں؟" وہ پچھلی کھڑکی پہ تھوڑا جھکی۔

سیٹھ نے اس کے چمکتے حسین چہرے کو للچا کر دیکھا۔ ڈرائیور نے گاڑی آگے بڑھانا چاہی مگر سیٹھ نے روک دیا۔

ڈرائیور نے انتہائی غصے سے اس روتی دھوتی لڑکی کو دیکھا۔

"آجاؤ۔" سیٹھ نے گاڑی سے جھانک کر کہا وہ آبیٹھی۔

"آپ کا بہت شکریہ!" وہ بدقت بولی۔ سیٹھ کی ہوس ناک نظریں اس انتہائی خوف زدہ زاروقطار روتی لڑکی پر گڑ گئیں جبکہ ڈرائیور قہر آلود نظروں سے اسے گھور رہا تھا۔

مختلف راستوں سے ہوتی ہوئی گاڑی پوش ایریا میں ایک بنگلے کے پاس رکی۔

جدید آرائش سے سجا نہایت عالی شان گھر مگر وہاں خاموشی کا راج تھا۔

"بیٹھو!" وہ ڈری سہمی کرسی پہ ٹکی۔ سیٹھ اس کے برابر آبیٹھا۔

چہرے پر انتہائی بے صبری تھی۔

"میں تمہیں نہیں پوچھوں گا کہ کن حالات کے تحت گھر سے نکلی ہو۔ مجھے خوش کردو بس۔ ڈھیروں دولت تمہارے قدموں میں بچھادوں گا۔" سیٹھ نے اس کا نازک ہاتھ پکڑا۔

رباح کو اس شخص کی کمینگی کا احساس جاگا تو بجلی کی سی تیزی سے ہاتھ چھڑایا۔

"خدا کے واسطے مجھے بچالو۔" تڑپ کر ڈرائیور کے سامنے ہاتھ جوڑ دیے۔ جو نہ جانے کیسے وہاں آگیا تھا۔

"تم خود آئی ہو۔" ڈرائیور نے نفرت سے کہا جو کھڑا ہوا۔

اسے نظرانداز کرکے اپنے سیٹھ کے حکم کا منتظر ہوا۔

"اللہ کے واسطے" سیٹھ کے مزید کچھ بولنے سے پہلے وہ ڈرائیور کے قریب آئی۔ "پلیز مجھے یہاں سے نکالو، تمہیں اپنی ماں کا واسطہ اگر تمہاری کوئی بہن ہے تو پلیز۔" وہ کچھ اس انداز سے گڑگڑائی کہ وہ چونک اٹھا۔

سیٹھ نے اٹھ کر رباح کو اپنی جانب گھسیٹا۔

اسی پل بغیر سوچے سمجھے اختر نے سیٹھ کو ایک جھانپڑ رسید کیا۔

سیٹھ کی کراہ نکلی۔ وہ لڑکھڑا کر دو قدم دور ہوا۔ اگلے ہی لمحے وہ بجلی کی سی تیزی سے رباح کا ہاتھ پکڑ کر گیٹ سے باہر تھا۔ ابھی اس نے گاڑی گیٹ کے اندر نہ کی تھی۔ اسے جھٹ گاڑی میں بٹھایا اور ہوا کے دوش پر اڑادی۔

وہ ڈری سہمی مسلسل آنسو بہارہی تھی۔ اس روڈ پر زار اور اونچے اونچے سامان سے لدے ٹرک رواں تھے۔ گاڑی کسی چیونٹی کی مانند لگ رہی تھی۔

"کہاں جارہے ہو؟" خوف سے کانپتی آواز میں پوچھا۔

"جہنم میں۔" وہ گویا کاٹ کھانے کو دوڑا تھا۔

"میں نے یہ قدم کیوں اٹھایا۔ ہم دونوں ہی کہیں چلی جاتیں یا پھر دونوں ہی زہر کھالیتیں۔ اب یہ ڈرائیور پتا نہیں کہاں لے جارہا ہے۔"

غصے میں بھرا، ہاتھ اسٹیئرنگ پر جمائے اپنے انجام سے لاپروا وہ گاڑی بھگائے چلا جارہا تھا۔

"مجھے میری امی کے پاس لے چلو واپس۔" وہ منمنائی۔

"واپس ہی جانا تھا تو بھاگی کیوں گھر سے۔" اس نے قہر برسایا۔

"میں بھاگی نہیں ہوں۔" وہ چیخ پڑی۔

اس نے غصے سے اس کی طرف دیکھا۔ اسی لمحے گاڑی اس کے قابو سے باہر ہوئی۔ ٹرک سے ٹکراتے ٹکراتے بچی اور سنبھلتے سنبھلتے بھی گاڑی سڑک سے اتر گئی اور ایک درخت سے جا ٹکرائی۔

اس نے خوف سے آنکھیں میچ لیں۔ ٹائر بڑی زور سے چرچرائے تھے۔

"ابو نے امی کو بیچ دیا۔ جانے وہ کس حال میں ہوں گی۔ مجھے ان کے پاس لے چلو پلیز۔ انہیں میری ضرورت ہوگی۔" وہ رو رو کر التجا کرنے لگی۔

"یہ سب پہلے سوچنا تھا تمہیں۔ میری زندگی بھی اپنے ساتھ خوار کروادی۔ سیٹھ بھلا کہاں چھوڑے گا مجھے۔"

"میں معافی مانگتی ہوں تم سے۔ ابو نے میری امی کو جوئے میں ہار دیا۔ انہوں نے مجھے کہا کہ گھر سے نکل جاؤ ورنہ میرا باپ مجھے۔

میں سوچ بھی کہاں سکتی تھی کہ میرے سر کا سایہ، میری چھت، میرا باپ اتنا گھناؤنا اقدام کرے گا۔" دہشت بھرا لہجہ دکھ کی چبھن بھی لیے ہوئے تھا۔

"اسی لیے۔ اسی لیے مرد ذات سے نفرت ہونے لگی ہے۔"

"میں تمہاری جھوٹی کہانی پر یقین نہیں کرسکتا۔ کسی کی خاطر گھر سے بھاگی ہو۔ اس نے بے وفائی کردی۔"

ایک سنسناتا ہوا تازیانہ اس کے تن بدن میں آگ لگا گیا۔ وہ تڑپ اٹھی۔ پوری قوت سے اس کی گردن پر دونوں ہاتھ مارے۔

وہ بلبلا اٹھا۔

"تمہارا دماغ خراب ہے۔ دفع ہوجاؤ۔ ایک منٹ کے اندر اندر۔ نکلو گاڑی سے، ورنہ تمہارا گلا دبادوں گا۔" وہ خوف ناک آواز سے دھاڑ اٹھا۔

وہ بیٹھی رہی۔

"تم اترتی ہو یا دھکا دوں تمہیں؟" وہ غرایا۔

"گلا دبادو۔" وہ زاروقطار رونے لگی۔

"پتا نہیں کس مصیبت میں پھنس گیا۔" وہ گاڑی اسٹارٹ کرنے لگا مگر وہ اسٹارٹ نہ ہوئی۔

"کچھ فالٹ ہوگیا ہے۔ سیٹھ بھوکے کتے کی طرح ڈھونڈ رہا ہوگا۔ اس کے ہاتھ سے تر نوالہ چھین لایا ہوں۔ اس نے پولیس کو بھی اطلاع کردی ہوگی۔ یقیناً مجھ پر گاڑی چوری کا الزام لگادیا ہوگا۔ ابھی کوئی پولیس موبائل ڈھونڈتی ہوئی آجائے گی۔ اسے یہیں چھوڑنا چاہیے۔" وہ بڑبڑایا۔

وہ شہر سے کافی دور نکل آئے تھے۔

اس کا ذہن اپنے بچاؤ کی ترکیب لڑانے لگا۔ ڈیش بورڈ کھولا گاڑی کی لائٹ جلائی۔ یہاں اچھی خاصی رقم ہوا کرتی تھی، تاکہ اسے چھوٹے موٹے فالٹ یا کیس بھگتانے کے لیے سیٹھ سے بار بار تقاضا نہ کرنا پڑے۔ اسے اکثر اندر رقم مل جاتی تھی۔ وہ بڑی دیانت داری سے

خرچ کرتا تھا۔
اس کی رہائش بھی سیٹھ کے گھر میں تھی حقیقت میں اس کا تو کوئی خرچہ ہی نہ تھا۔ بس اپنی تعلیم پر خرچ کرتا۔ وہ اعلا کردار کا پڑھا لکھا نوجوان تھا اور غیرت مند بھی۔
اس وقت اس مصیبت زدہ لڑکی کی مدد کر کے گویا اپنے مالک سے خیانت کر رہا تھا۔ حالانکہ اسے اس لڑکی سے اور اس کی کہانی سے کوئی دلچسپی نہ تھی مگر اسے یہ بھی احساس ہو گیا تھا کہ اس کی خوب صورتی کی وجہ سے اسے مشکلات کا سامنا ہو سکتا ہے۔
یوں ہی پلٹ کر اسے دیکھا۔ ابھی وہ کشتی میں خوف زدہ ڈری سہمی ہچکیاں لیتی وہ لڑکی اسے بہت بدحال سی لگی۔ اس کا حسن اسے سب سے زیادہ خوف دلا رہا تھا۔ رقم جیب میں ڈال کر وہ درشتی سے بولا۔
"باہر نکلو۔"
"مجھے یہیں رہنے دو۔" اس نے روتے ہوئے التجا کی۔
"گھر سے نکلی ہو بغیر سوچے سمجھے۔"
"مجھے کیا پتا تھا۔ میں جن حالات کا شکار تھی، میری امی نے۔" وہ خاصی دہشت زدہ تھی۔
اسے شک کی نگاہ سے دیکھا تھا مگر اس کے چہرے پر خوف کے علاوہ کچھ نہ تھا۔
نہ ارادہ، نہ علم کوئی رقم۔ بس یوں ہی گھر سے دھکیل دی گئی تھی۔ گھر کے باہر ہوس پرستوں کی یلغار تھی۔
مدد کرنے والا ابھی شک کی نگاہ سے دیکھ رہا تھا۔
اس سے تو بہتر تھا گھر کے جہنم میں رہتی۔
"اترو! سیٹھ کی گاڑی ہے۔"
"اب کہاں جانا ہو گا؟" لرزتی کانپتی آواز میں پوچھا۔
"اللہ مالک ہے۔ میں نے تمہاری مدد کی حامی بھری ہے تو اب کروں گا بھی۔ میری ماں کا واسطہ دے دیا تم نے یہ الگ بات کہ خود کو آگ میں جھونک دیا ہے۔" وہ تمیز سے تو بولا مگر بے زاری کا احساس بھی دلا لیا۔
"سیٹھ کے بڑے احسان ہیں مجھ پر۔ سیٹھ نے پرورش کی، تعلیم دلائی، مزید تعلیم کے لیے باہر جا رہا تھا۔ میرا ٹکٹ بھی آ چکا تھا۔ اگلے ہفتے میری روانگی تھی۔ اب یہ سب کچھ ممکن نہیں۔"
"تو آ میری مدد کرنے والا خود کتنا مجبور ہے۔ اس وقت مجھے سیٹھ کے چنگل سے نہ نکالتا تو ہو سکتا ہے میں بے عزت ہو کر اپنی جان دے دیتی۔"
"آپ کا بہت شکریہ۔ آپ کا احسان تاحیات نہیں اتار سکتی۔ میرے بہت عزیز ہیں مگر باپ کی وجہ سے سب نے ناطہ توڑ لیا۔ وہ تو روز بروز پستی میں گرتے جا رہے ہیں۔ اسی تک کو داؤ پر لگا دیا۔ مجھے شدید نفرت ہو رہی ہے اپنے والد سے۔ کوئی یوں اپنی عزتوں کو نیلام کرتا ہے۔ میری امی نے اب تک زہر کھا لیا ہو گا۔ اس وقت میں نے کچھ تو سوچا ہوتا۔" رو رو کر وہ بے حال ہو رہی تھی۔
"بی بی! خود کو سنبھالو۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ پولیس آ جائے۔ اس گاڑی کو یہیں چھوڑ کر جانا ہے۔" وہ سمجھانے لگا۔ مگر اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔
وہ بے ہوش ہو کر ایک سمت کو جھک گئی۔
"سنو بی بی!" اس نے اس کا شانہ ہلایا۔
اسی لمحے دور سے موبائل کی آواز سنائی دی۔
اس نے فوراً دروازہ کھولا۔ بجلی کی سی تیزی سے اس بے ہوش وجود کو بازوؤں میں سنبھالا اور ایک طرف کو چل پڑا۔
"اچھی مصیبت ہے۔" وہ بڑبڑایا۔
ڈھلوان راستہ، بڑھتا ہوا اندھیرا، موبائل کا سائرن۔
جھاڑیوں کی اوٹ میں بے ہوش لڑکی کو لٹا دیا۔ ابھی سیدھا بھی نہ ہوا تھا کہ جھاڑیوں میں سرسراہٹ کی آواز نے خوف زدہ کر دیا۔
ایک سانپ انتہائی قریب سے گزرا۔
اس نے برق رفتاری سے اسے بازوؤں میں یوں سمیٹا جیسے متاع حیات ہو۔

گھاس پھوس پر لٹاتے ہوئے وہ جھجک رہا تھا۔ کیونکہ جھاڑیوں سے مسلسل سرسراہٹ سنائی دے رہی تھی۔ اسے اٹھا کر چلنا بھی دشوار تھا۔ اندھیرا بڑھتا جا رہا تھا۔
"کسی مشکل میں نہ پھنس جاؤں۔ اس لڑکی کی مدد زندگی بھر کا روگ نہ بن جائے۔"
وہ یوں ہی بیٹھا رہا۔ موبائل کے سائرن کی آواز ختم ہو چکی تھی۔
"گاڑی کو چلانے کی کوشش کروں۔" وہ اسی شش و پنج میں تھا۔
"چھوڑو۔ چھوڑو مجھے۔" اچانک وہ جاگی اور وحشت زدہ ہو کر بری طرح چیخی۔ صورت حال ایسی تھی کہ وہ غلط فہمی کا شکار ہو گئی۔ اس کے چیخنے پر گھبرا کر اس نے فوراً بازو کھول دیے۔
وہ پوری قوت سے پتھریلی زمین پر جا پڑی۔ اور درد سے بلبلا اٹھی۔
"جانیں یہ مددگار کیا کرنا چاہ رہا تھا۔" مضبوط بانہوں کے حصار کا تصور آتے ہی وہ لرزنے لگی۔
"تو اس لیے بچایا تھا مجھے۔ تم سارے مرد ایک ہوتے ہو۔"
"شٹ اپ۔" اس کی وجہ سے وہ پہلے ہی پریشان تھا۔ الزام نے جیسے آگ لگا دی۔
ایک زناٹے دار تھپڑ اس کے منہ پر رسید کر دیا۔
"مس! تمہاری وجہ سے میری زندگی عذاب میں آ گئی ہے اور تم۔" انگلی اس کے چہرے کے سامنے لہرائی۔ "پولیس کسی بھی پل مجھے تلاش کرتی یہاں آ پہنچے گی۔ اپنے اندر سچ والا انسان اپنے مجرم کو کیسے چھوڑے گا۔ میرا مستقبل صرف تمہاری وجہ سے خاک کا ڈھیر بن گیا ہے۔ بے ہوش تھیں تو تمہیں سانپ کے کاٹنے سے بچایا اور تم مجھ ہی پر شک کر رہی ہو۔" وہ کپڑے جھاڑ کر اٹھا۔ قدم آگے بڑھائے۔
"بس جتنی مدد کرنی تھی کر دی۔ اب اپنی حفاظت تم خود کرو۔" وہ سخت بھنا گیا تھا۔
جیسے ہی وہ ایک طرف کو چلا وہ بری طرح گھبرا گئی۔
"دیکھو پلیز۔" خوف سے کانپنے لگی۔
وہ رکا۔ اس کی طرف نگاہ گھمائی، اس کی شفاف رنگت ملگجے اندھیرے میں چمک رہی تھی۔ تھپڑ زناٹے دار تھا۔ پھر اس کا مردانہ ہاتھ، رخسار پر انگلیوں کے نشان واضح تھے۔ ہونٹ کا کنارا بھی سوج گیا تھا۔ خوف سے بری طرح کانپتی ہوئی ملتجی نظروں سے اسے ہی دیکھ رہی تھی۔ اس کا دل پسیج گیا۔
اسی پل اس کے پاؤں پر کسی کیڑے نے کاٹ لیا۔ اس نے سسکی بھری تو لپک کر اس کے بازو کو ہاتھوں سے جکڑ لیا۔
"چلو! جلدی کرو، یہاں سے نکلنا ہے۔" ذہن پر صرف اس کی مدد کرنے کی دھن سوار ہو گئی۔ آگے کیا کرنا ہے، سب بھول گیا۔
"یہ یقیناً شریف انسان ہے۔" اس نے دل میں سوچا۔
وہ تیز تیز قدموں سے چل رہا تھا اس کا ساتھ دینے کے لیے اسے تقریباً بھاگنا پڑ رہا تھا۔ خطرہ ابھی تک سر پر منڈلا رہا تھا۔ اندھیرے کے سبب اس نے دائیں بائیں کے بجائے ناک کی سیدھ اختیار کی۔ سڑک پر پہنچے تو دور سے ایک بس آتی نظر آئی۔
"اپنے چہرے کو چھپا لو میں بس روکتا ہوں۔"
وہ اس کی بات پر ممنون سی ہو گئی۔
بڑے سے دوپٹے کو سلیقے سے لپیٹ لیا۔ چہرہ بھی تقریباً چھپا لیا، صرف آنکھیں نظر آ رہی تھیں۔
اس نے اشارہ کیا۔ بس رک گئی۔ وہ دونوں سوار ہو گئے۔
"کہاں جانا ہے؟" کنڈیکٹر کی آواز پر دونوں چونک گئے۔
"ہم مسافر ہیں۔ ایسی جگہ جانا ہے، جہاں رات بسر کر سکیں۔" مضبوط لہجے میں کہا۔
"قریبی بستی میں ہمارا آخری اسٹاپ ہے۔"
"ہم بھی اسی جگہ ٹھہر جائیں گے۔" وہ اطمینان

سے بولا۔

کنڈیکٹر کو مطلوبہ رقم ادا کی۔ بس میں چند سواریاں اور تھیں۔ سب ان کی طرف متوجہ تھے۔ وہ دونوں ساتھ ساتھ بیٹھے تھے۔ رباح نے گورے گورے ہاتھ دوپٹے میں چھپا لیے تھے۔

دل دھڑک دھڑک کر بے حال تھا۔ ماں کا خیال ستا رہا تھا۔

یہ اجنبی۔ جانے کہاں لے جائے۔ فکر تو تھی مگر اتنا سکون ضرور تھا کہ کسی غلط ہاتھ نہیں لگی تھی۔

"بیٹا! اس علاقے میں پہلی مرتبہ آئے ہو؟" بس میں سوار ایک بوڑھی عورت نے پوچھا۔

"جی۔" اشعر نے جواب دیا۔

"یہ تمہاری بیوی ہے؟"

وہ زبردستی کھانسنے لگا۔ اسے بات ٹالنے کا یہی طریقہ سوجھا تھا۔

"تم اور تمہاری بیوی میری سرائے میں ٹھہر جانا۔" گلے پڑنے والی بوڑھی عورت گاہک پھانس رہی تھی۔

"ٹھیک ہے اماں۔" اس نے سر ہلایا اور مطمئن ہو گیا۔ "چلو! رات گزارنے کا انتظام تو ہو گیا۔"

بس نے سارے مسافر اتار دیے۔ وہ دونوں اس بوڑھی عورت کے ساتھ ہو لیے۔

☼ ☼ ☼

سرائے کیا تھی۔ ایک چھپر سا پڑا تھا۔ گندے مندے میلے بستروں پر خراٹے لیتے لوگ۔

وہ بہت ڈری سہمی تھی۔ یہ جگہ عورتوں کے رہنے کے قابل نہ تھی۔ سارے مرد تھے۔

"تمہاری بیوی کو اپنے گھر لے جاؤں گی۔ عورتیں اندر ہی ہوتی ہیں۔"

"جاؤ! اور خود کو نارمل رکھنا۔ کسی کو شک نہ ہو۔" اس نے سرگوشی کی۔

"کیسے عجیب حالات ہیں۔" اجنبی شناسا سا ہو گیا۔ اس سے دور رہنے سے خوف آیا۔ اندھیرے میں چھوڑ گیا تو۔"

"مم مجھے۔ چھوڑ کر نہیں جانا۔" روہانسی آواز میں اندیشے کا اظہار کیا۔

"رات کے اندھیرے میں اگر پولیس پکڑ کرے گی تو کچھ نہیں کر سکتا۔"

"مجھے۔ پھر بھی میں تمہارے ساتھ رہوں گی۔ بتا دینا پولیس کو اندر میں بھی ہوں۔" وہ خوف سے اس کے قریب ہو گئی۔

"سنیے مسٹر!" کاندھے پر کسی نے اچانک تھپکی دی۔

وہ پلٹا اور بری طرح چونکا۔ سامنے پولیس والا کھڑا تھا۔

رباح کا سانس اٹک گیا۔ اشعر بھی ڈر رہا تھا۔ مگر اگلے ہی لمحے وہ مسکرا رہا تھا۔

"تم۔ سہیل! یہاں کیسے؟" انداز میں شناسائی تھی۔

"یہی سوال میں بھی پوچھنا چاہ رہا ہوں۔ بس سے اترتے دیکھا تو سوچا یہاں کس سے ملنے آئے ہو؟"

"وہ کسی سے بھی نہیں۔"

"چلو! پھر گھر چلو۔" اچٹتی نگاہ اس ڈری سہمی لڑکی پر ڈالی، پھر اشاروں اشاروں میں اس کے متعلق پوچھا۔

اس نے ہاتھ کے اشارے سے تسلی دی۔

"وہ تمہیں دیکھ کر جان میں جان آئی۔"

"کیوں۔ کوئی واردات کر کے نکلے ہو؟" سہیل نے قہقہہ لگایا۔

"پولیس والے ہو، تفتیشی طریقہ ہی اپناؤ گے۔" اس نے بھی ہنس کر بات اڑا دی۔

تینوں اس کی جیپ میں سوار ہوئے۔ اسے اب تحفظ کا احساس ہو رہا تھا۔

پھر بھی بے حد پریشان تھی، دل گھر میں اٹکا تھا۔ ماں جانے کس حال میں ہو گی؟

"بھابھی کا کیا حال ہے؟"

"وہی پرانی عادت بہت مارتی ہے۔" وہ ہنس دیا۔ بھاری ہنسی جیپ میں گونج گئی۔

چھوٹے سے ایک کوارٹر کے قریب جیپ رکی۔

ہارن کی آواز پر دروازہ کھلا۔

"ارے انہیں کہاں سے پکڑ لائے؟" چھوٹے قد والی خاتون نے خوش گوار حیرت کا اظہار کیا۔ پھر اس کے پیچھے آنے والی لڑکی کو دیکھا۔

"آئیے!" سہیل نے بڑی عزت سے پلٹ کر رباح کو کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ پھر بیوی سے کہا۔

"ذرا کھانے کا بندوبست کر لو۔"

اس نے سر ہلا کر حامی بھری اور کچن کی طرف جاتے جاتے ایک مشکوک نگاہ رباح پر ڈالی۔

"بہت حسین ہے۔ اشعر ایسا ہے تو نہیں مگر۔ پھر یہ کون ہے۔"

سہیل اسے باہر لے گیا۔ تب مختصراً اشعر نے رباح کے بارے میں اور اپنے اقدام کے متعلق بتایا۔

وہ اندر آئے تو وہ دبی دبی ہچکیوں سے رو رہی تھی۔

"آپ بے فکر ہو جائیں، یہاں کوئی خطرہ نہیں۔ اپنا پتا بتائیں۔ مجھے حالات وغیرہ بتائیں۔"

"مجھے بے حد شرم آ رہی ہے اپنے بارے میں بتاتے ہوئے۔" وہ ہچکچائی مگر پھر اس کے زور دینے پر بڑی ہمت کر کے اپنی داستان غم سنا دی۔ اسی اثنا میں سہیل کی بیوی کھانا لے آئی۔

"بی بی! آپ بے فکر ہو جائیں۔ مجھے اپنے گھر کا ایڈریس بتائیں۔ میں سب کچھ معلوم کر لوں گا۔"

"یہ تو محفوظ ہو گئی۔ میرا کیا ہو گا۔" اشعر کو فوراً اپنی فکر نے آ گھیرا۔

"تمہارے سیٹھ کو تو میں دو جھانپڑ لگا دوں گا۔ فی الحال تم کھانا کھاؤ اور آرام سے سو جاؤ۔ صبح میں پتا کرتا ہوں۔"

"میری امی کا پتا نہیں کیا حال ہو گا۔" وہ تڑپ رہی تھی۔

"اللہ سے اچھی امید رکھیں۔ سب ٹھیک ہو گا۔" اسے تسلی جھوٹی لگی تھی۔

رات بھر بے چین رہی۔

☼ ☼ ☼

اسے شام تک بڑی بے چینی تھی۔ سہیل کا انتظار تھا۔

"کچھ۔ کچھ معلوم ہوا۔" اسے فکر مند سا دیکھ کر وہ گھبرا گئی۔

"فی الحال آپ کا گھر نہیں ڈھونڈ سکا۔" وہ اس سے نظریں چرا گیا۔

بہانے سے اشعر کو باہر لے گیا۔

"یار! وہاں تو کہانی عجیب ہو گئی۔ باپ نے زہر کھا کر خود کو ہلاک کر لیا۔ ماں کسی کو بتائے بغیر گھر چھوڑ گئی۔ اب اسے کیا بتائیں؟"

"اور۔ اور سیٹھ؟؟" اسے اپنی پڑی تھی۔

"اسے تو میں نے خود دیکھا ہے۔ بھلا چنگا گاڑی میں بیٹھا سگار پی رہا تھا۔"

"میں تو مارا گیا۔" وہ بے حد پریشان ہو گیا۔

"کیا خبر قدرت نے کیا سوچا ہے۔ کسی بے سہارا کی مدد کی۔ اس کا اجر ملے گا۔"

"خاک ملے گا۔ اجر کے چکر میں ملازمت بھی گئی۔ گھر سے نکلنے سے پہلے سوچ تو لیتی۔"

اسے رباح پر نئے سرے سے غصہ آیا۔ جس کی وجہ سے اسے ملازمت سے ہاتھ دھونے پڑے اور ملک سے باہر جانے کا موقع بھی ہاتھ سے گیا۔

وہ دونوں اخبارات کا جائزہ لے رہے تھے۔ سیٹھ نے کسی بھی اخبار میں کوئی خبر نہیں دی تھی۔ اس نے شکر کا کلمہ پڑھا۔

"جا کر معافی مانگ لو۔" سہیل نے مشورہ دیا۔

"اتنا بے غیرت نہیں۔ ملازمت گئی تو گئی۔ اب دیکھیں قسمت کیا کرتی ہے۔" ہاتھ کی ہتھیلی پر نگاہ جمائی۔

"شکر ہے وہ زندہ بچ گیا۔ ورنہ قاتل کہلاتا۔ میرا ضمیر مجھے تاحیات بے چین کیے رہتا۔"

"اسے کس طرح بتایا جائے۔" سہیل کو یہی فکر تھی۔

"اس کا ذکر مت کرو۔" اسے رباح سے بے حد چڑ ہو رہی تھی۔ اب وبال جان لگ رہی تھی۔

"کوئی جان پہچان ہے جہاں اسے چھوڑا جائے؟"

سہیل ابھی تک اسی کے بارے میں سوچ رہا تھا۔
"ایک آدھ دن کی بات ہوتی تو۔ یہ پوری زندگی کا معاملہ ہے۔"
"پوری زندگی۔ ویسے۔ خوب صورت بہت ہے۔"
"یہی تو مصیبت ہے۔" اس کا حسن اشعر کو مصیبت لگ رہا تھا۔
"اب اس کی عزت بچانی ہے تو کسی ایسی جگہ تو پہنچا دیں کہ باعزت رہے۔"
"کہاں پہنچاؤں؟" اس نے بے زاری اختیار کی۔
"میں کرتا ہوں کچھ۔" سہیل کو اس لڑکی پر ترس آرہا تھا۔ سہمی سہمی خاموش متورم آنکھیں۔
مگر کوئی حل نہ نکل سکا۔ اس کی امید دم توڑ رہی تھی۔ وہ دونوں بھی حوصلہ ـــــ کھو رہے تھے
سہیل کی بیوی بھی خاموش تھی۔ وہ اس لڑکی کی وجہ سے پریشان تھی۔ وہ چاہتی تھی کہ یہ جلد از جلد اس گھر سے چلی جائے مگر دو دن گزر گئے انہیں سے کوئی امید نہ بندھ سکی۔



سب ناشتا کر رہے تھے۔
اس نے صرف چائے پی۔ دوپٹا احتیاط سے اپنے گرد لپیٹا۔ سرو قد' نازک سی کانچ کی گڑیا جیسی وہ لڑکی وحشت زدہ اور پریشان نظر آرہی تھی۔
"آپ کا بہت شکریہ! مجھے پناہ دی۔ میری مدد کی۔"
ہلکی سی سسکی لی' جو اشعر کے دل پر برچھی کی طرح لگی۔
"کہاں جاؤ گی؟" بے چینی سے پوچھا۔
سہیل نے چونک کر اشعر کو دیکھا۔
"میں بندوبست کر رہا ہوں۔" "چند دن انتظار کرلو۔" سہیل نے کہا۔
"بہت شکریہ بھائی! آپ کا بہت احسان ہے۔"
"تھوڑا احسان اور لے لو' اندر چلی جاؤ کمرے میں۔" سہیل کے انداز پر اس کی ڈھارس قدرے بندھی مگر رونا آگیا۔ اس کی حالت دیکھ کر سہیل نے ایک دو جگہ فون کیے۔ پھر یک دم ہی اسے یاد آیا۔ مسز نیلوفر درشان خان زادہ کو اپنی ساس کی نگہداشت کے لیے کسی خاتون کی ضرورت ہے۔
"مجھے ابھی لے چلیے لالہ۔" وہ بے تابی سے بولی۔
"وہاں کسی کو اپنی کہانی سنانے کی ضرورت نہیں۔" اشعر نے سمجھایا۔ اس نے سرہلایا۔
"فیملی اچھی ہے۔ وہاں کوئی پریشانی نہیں ہوگی۔" سہیل نے ہمت بندھائی۔
سہیل اسی شام اسے وہاں لے گیا۔
مسز خان زادہ کا گھر کافی شان دار تھا۔
مسز خان زادہ نے اس کا تفصیلی جائزہ لیا۔
"آپ کی جان پہچان والی ہے تو بہتر ہی ہوگی مگر غضب کی حسین ہے۔" جواباً سہیل خاموش رہا۔ اس بات پر کیا کہا جاسکتا تھا۔
نیلوفر گوری رنگت کی دبلی پتلی تراشیدہ بالوں والی خاتون تھیں۔ وہ ملٹی نیشنل کمپنی میں اونچے عہدے پر فائز تھیں مگر غرور نام کو نہ تھا۔ میاں سرکاری عہدے دار تھے۔ وہ خود بھی کئی رفاہی ادارے چلا رہی تھیں۔
"میری ساس کو شکایت کا موقع مت دینا۔" وہ اسے اپنی ساس کے کمرے میں لے آئیں۔
نیلوفر کی ہدایت پر اس نے دیکھے سے سرہلایا۔
تنخواہ اچھی خاصی تھی۔ وہ حیرت زدہ رہ گئی۔ اس نے اتنے سارے پیسے کہاں ایک ساتھ دیکھے تھے۔
"اماں! دیکھیے کتنی پیاری لڑکی ہے۔ یہ آپ کے ساتھ رہے گی۔"
اماں نے اسے ناگواری سے دیکھا۔
"اچھی لڑکی ہے۔ آپ کی دیکھ بھال کرے گی۔" انہوں نے پھر اسے گھورا۔
"میں پوری کوشش کروں گی کہ آپ کو شکایت کا موقع نہ دوں۔" اس نے پہلی بار گفتگو میں حصہ لیا۔
"کیا نام ہے؟"
"رباب۔"
"اماں کی عادت کو سمجھ لوگی تو آسانی ہوجائے گی۔" وہ سرہلا کر ہدایات سن رہی تھی۔ دل اپنی ماں میں

اٹکا تھا۔ دنیا میں رہی کہ نہیں "تو کیسی مجبوری ہے کس سے معلوم کروں۔"
"اماں! یہ تنہا ہے' ماں باپ نہیں ہیں اس کے۔" اماں کو پتا نہیں رباب کیوں نہیں اچھی لگ رہی تھی۔ وہ اسے مسلسل ناگواری سے گھور رہی تھیں۔
"تم یوں کرو' سب سے پہلے نہا کر کپڑے بدل لو۔" انہوں نے اسے اپنی ساس کی گھورتی نگاہوں سے بچایا اور ساتھ ہی کاٹن کا ایک سوٹ اسے پکڑا دیا۔
"اپنے آپ کو ذرا ڈھانپ کر رکھنا۔" تھوڑی سی ہدایت کی۔
"اماں کو ایڈجسٹ کرنے میں کچھ وقت لگے گا۔ مگر تم پریشان نہ ہو۔" نیلوفر نے اسے تسلی دی۔
نہا کر اس نے لباس تبدیل کیا۔ ابھی بال سنوار رہی تھی کہ نیلوفر آگئیں۔
"اماں کے ساتھ والا کمرا تمہارا ہے۔ فریج میں پھل وغیرہ موجود ہوتے ہیں۔ تم بے تکلفی سے استعمال کرسکتی ہو۔" انہوں نے فراخدلی دکھائی۔
"آپ بہت اچھی ہیں باجی!" اتنی محبت پا کر وہ ہچکیوں سے رودی۔
"سہیل بھائی نے ضرورت مند کہہ کر بات ختم کردی تھی۔ آپ نے بھروسا کرلیا۔ مگر میں آپ سے کچھ نہیں چھپا سکتی۔ میری اصل کہانی یہ ہے باجی کہ مجھے تحفظ چاہیے۔" نیلوفر کرسی پر بیٹھی تھیں۔ وہ ان کے پاس بیٹھ گئی اور اپنی داستان غم سنا ڈالی۔ نیلوفر حیران تھیں۔ اشعر نے اصل کہانی بتانے سے منع کیا تھا مگر اس نے کہہ ڈالی۔
"آپ مجھ پر بھروسا کرسکتی ہیں' میرا اور کوئی ٹھکانہ نہیں ہے۔"
"تم بے فکر ہوجاؤ۔" انہوں نے اس کے سر پر ہاتھ رکھا۔
"مجھ سے جو ہوسکا کروں گی۔ پڑھی لکھی ہو' کوئی اچھی جاب ہوئی تو ضرور بتاؤں گی۔"
"مجھے یہاں سے کہیں نہیں جانا۔" اس نے منت کی۔
"تم جب تک چاہو' یہاں رہ سکتی ہو۔" نیلوفر نے فراخدلی دکھائی۔
"اچھا ہوا تم نے مجھے سب کچھ بتادیا۔ تمہارے ساتھ کوئی زیادتی ہوجاتی تو مجھے شرمندگی ہوتی۔"

☼ ☼ ☼

نیلوفر آج کل زیادہ مصروف ہوگئی تھیں۔ این جی او کے تحت بے سہارا خواتین کے لیے رہائش کا انتظام اور ان کو ہنر سکھا کر کام دلانے کی دھن سوار تھی۔ رباب بھی بے سہارا ہے مگر اسے اپنے گھر میں رکھ کر وہ اس کی طرف سے مطمئن ہوگئی تھیں کہ اسے سہارا مل چکا ہے۔ وہ بھی ان کی بہت ممنون تھی' خدا کا شکر بھی ادا کرتی۔ مگر ماں کے بارے میں جاننے کو بے چین تھی۔ ان کا خیال آتے ہی دل کٹ کر رہ جاتا' نیلوفر کا گھر بھی دور دراز علاقے میں تھا۔ وہ راستوں سے ناواقف تھی' ورنہ ایک دفعہ گھر جا کر ضرور معلوم کرتی۔ نیلوفر سے بھی بات کرنے کا موقع نہیں مل رہا تھا۔
وہ اپنے بال بنا رہی تھی۔ دراز ریشمی گھنے بال جو ہاتھوں میں نہیں آتے تھے۔
"ماں کتنے پیار سے ان بالوں کو سنوارتی تھیں' ماشاء اللہ کہہ کر سر چوم لیتیں۔" وہ سوچوں میں گم تھی۔
"رباب! پلیز ذرا ادھر آنا۔" نیلوفر نے اسے پکارا تھا۔ وہ بہت جلدی میں تھیں۔ وہ کیچر بالوں میں اٹکا کر تیزی سے باہر نکلی۔
"پلیز ذرا یہ اٹھالو۔ باہر گاڑی تک پہنچانا ہے۔" تھیلا کافی وزنی تھا' جسے اٹھانے میں اسے کافی دشواری ہورہی تھی۔ لینڈ کروزر کھڑی تھی۔ چند مرد اور خواتین بھی موجود تھیں۔ اس نے کسی کی جانب نہیں دیکھا۔
"ہائے کیسے غضب کے بال ہیں۔"
"کتنی پیاری فل ہے۔"
اسے دیکھتے ہی کچھ ملی جلی آوازیں آئیں۔ ایسے

بے تکلفانہ تبصرے سن کر وہ بری طرح گھبرا گئی اور گھبراہٹ میں سیڑھیوں پر توازن برقرار نہ رکھ پائی اور نچلے سمت نیچے فرش پر جا پڑی۔ سر گاڑی سے جا ٹکرایا۔ آنکھوں کے آگے ستارے ناچ گئے۔ شرمندگی کے احساس سے نظریں جھک گئیں۔ کسی نے اسے لپک کر اٹھایا تھا۔ اس نے نظریں اٹھا کر دیکھا تو حیران رہ گئی۔

اشعر ہمیشہ سے مددگار!

"شکریہ۔" اشعر کو دیکھ کر وہ بوکھلا گئی۔ پیشانی پر گومڑ سا ابھر آیا تھا۔

"چوٹ تو نہیں آئی؟" گردن میں کیمرہ ڈالے ایک شخص اس کے سراپے کو دلچسپی سے دیکھ رہا تھا۔

"مسز ذیشان! ایک تصویر لے سکتا ہوں ان کی؟"

اس نے نیلوفر کی طرف اجازت طلب نظروں سے دیکھا پھر اس کا جائزہ لیا۔

وہ فیروزی رنگ کا ہلکی کڑھائی والا سوٹ پہنے ہوئے تھی۔ جو نیلوفر کی اترن تھا' بالوں میں سرخ کنگھی پھنسی تھی۔

"ضرور لو بھئی!" نیلوفر نے فراخ دلی سے اجازت دی۔ اس سے پوچھا ہی نہیں۔ اس کی دو تین تصویریں لے لیں۔ اشعر نے انتہائی ناگواری سے تصویر کھینچنے والے اور تصویر کھنچوانے والی کو دیکھا۔ کیوں۔ وہ خود بھی نہ سمجھ سکا۔ وہ تیزی سے اندر چلی گئی۔

"یہ اتنی خوب صورت لڑکی کون ہے؟"

"اماں کی دیکھ بھال کے لیے رکھا ہے۔" "شرم کرو اتنی خوب صورت لڑکی سے ساس کے کام کرواؤ گی۔" مسز حامد حیران تھیں۔

"ضرورت مند ہے۔"

اشعر نے اسٹیرنگ کو مضبوطی سے تھام رکھا تھا۔ رباح۔ اس لڑکی کی وجہ سے اسے اپنے سنہری مستقبل سے ہاتھ دھونے پڑے۔ ورنہ اس وقت امریکہ میں ہوتا۔

ادھر وہ یہ سب سوچ رہا تھا اور ادھر وہ اندر اس کے لیے دعا گو تھی اللہ اسے کسی پریشانی میں مبتلا نہ کرے۔



"رباح! ذرا ڈرائنگ روم میں آنا۔" نیلوفر کی پکار سنائی دی۔ وہ اماں کی چوٹی باندھ کر فارغ ہوئی تھی۔ شاندار ڈرائنگ روم میں دو صاحب بیٹھے تھے۔ ان میں ایک وہ بھی تھا۔ جس نے اس دن رباح کی تصویر کھینچی تھی۔

وہ ٹھٹک گئی۔

"یہ جنید آفندی ہیں۔ مشہور ایڈورٹائزنگ کمپنی کے مالک۔ تمہیں ایڈ کے لیے منتخب کیا ہے۔" نیلوفر نے تعارف کے ساتھ ہی اطلاع دی۔

"فوٹو جینک فیس ہے تمہارا۔" تعریفی نظریں اس پر ڈالنے کے بعد نیلوفر کی طرف متوجہ ہوئے۔

"مسز ذیشان! آپ نے مجھے بہت حسین چہرہ دیا ہے۔ شکریہ تو کمال ہو گیا۔" جنید آفندی نے ستائش بھرے لہجے میں بولے اور پھر گہری نظروں سے اس کا جائزہ لیا۔

"مجھے یہ کام نہیں کرنا۔" وہ گھبرا گئی۔ آفندی کی نگاہیں یوں محسوس ہو رہی تھیں جیسے جسم کے آرپار دیکھ رہا ہو۔ وہ اس وقت گلابی جدید تراش کا لباس پہنے ہوئے تھی۔ جس کا گلا تھوڑا کھلا تھا۔ نیلوفر نے فراخدلی سے اپنے کئی جوڑے اسے بخش دیے تھے۔ جنید کے اس طرح دیکھنے پر اس نے دوپٹا اوڑھ لیا۔

"شہرت خود چل کر تمہارے پاس آئی ہے۔ بے وقوف! اماں سے کہاں جا پہنچو گی۔"

نیلوفر کا یہ بولنا اسے کچھ ناگوار گزرا۔

"مجھے گھر کی لڑکیاں میرے توسط سے جاتی ہیں۔ والدین کو مجھ پر بھروسا ہے۔ کوئی غلط کام نہ ہو گا بلکہ تمہاری حفاظت ہو گی۔"

وہ اسے پچکار رہی تھیں۔ "معاشرے میں عزت ہے۔"

"تم معاہدے پر دستخط کرو۔ کچھ باؤنڈ ہو جاؤ گی۔ مگر جب تک میری اجازت نہیں ہو گی' کسی اور کے

لیے کام نہیں کر سکو گی۔" جنید آفندی نے فوراً کاروباری انداز اختیار کیا۔

"اس کی فکر مت کرو جنید!" رباح کے بجائے نیلوفر نے جواب دیا۔ "کام نے کر جانے کی ذمہ داری تو میری ہو گی۔"

"ایک ایڈ ڈراپ تو میں بھی کر سکتا ہوں۔" جنید نے آفر کی۔ "قریب ہی تو رہتا ہوں۔"

"بہت کہی ہو۔" نیلوفر ہنس دی۔

وہ حیران پریشان تھی۔ کیا اسے جو رقم مل رہی تھی وہ تو خواب میں بھی نہ سوچی تھی۔

اس کا پہلا کمرشل ٹی وی پر چل پڑا۔

نیون سائن' بل بورڈز' رسالوں میں' اخباروں میں' سب جگہ دھوم مچ گئی۔ اشعر نے اخبار میں بڑا سا اشتہار دیکھا۔ اس کا جی چاہا' سر پھوڑ لے اپنا۔ جھنجلا کر اخبار پھاڑ ڈالا۔

"مجھے فقیر بنا کر خود مزے اڑائے گی۔" وہ تلملا رہا تھا۔



وہ ٹی وی کے قریب پونچھا لگا رہی تھی۔ ٹی وی پر نظر پڑی تو چکرا کر رہ گئی۔

سنہرے بالوں کے ساتھ وہ حسین چہرہ ٹی وی کے اسکرین پر نمودار ہوا شیمپو کا اشتہار تھا۔

"رباح۔"

بمشکل اپنے بے جان ہوتے وجود کو اٹھایا۔

وہ دل تھامے بے آواز رو رہی تھی۔

"یا اللہ... میری بیٹی کن ہاتھوں میں ہے۔ نذر محمد! اللہ تجھے بھی نہ بخشے۔ نہ جانے میری بچی جانے کس حال میں ہو گی۔"

وہ کلیجہ تھامے تڑپ تڑپ کر رو رہی تھیں۔ "میں نے اسے کھو دیا۔ شکر ہے زندہ ہے۔ خداوند اس کی عزت کو محفوظ رکھنا۔"

سلطانہ نے بڑی ہمت کر کے خود کو اٹھایا۔ [illegible] گیا تھا۔ بیگم صاحب کے بڑے بیٹے نے چینل بدل دیا۔ سلطانہ بے چین ہو گئی۔ "بیٹا! وہی اشتہار لگاؤ۔" آج پہلی مرتبہ فرمائش کی۔ رباح کو دیکھنے کا جی چاہ رہا تھا۔

ایک لمحے بعد ہی ڈرامے میں وقفہ آ گیا۔ نئے ایڈ بار بار دکھائے جانے لگے۔

"رباح ہی ہے۔" وہ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھ رہی تھی۔

اخبار میں بڑا سا اشتہار چھپا تھا۔

"بیگم صاحب! اخبار لے لوں۔"

ان کا اشارہ پاتے ہی بے تابی سے اخبار کو سینے سے لگا لیا۔ "رباح' میری رباح۔ میں تجھے یاد رہی کہ نہیں۔ اپنے ہاتھوں سے اپنی بچی گنوا دی۔"

وہ آہ و بکا کرتی اور رب تعالیٰ سے اس سے ملنے کی دعا کرتی رہی۔



اسے کافی رقم ملی تھی۔ سب سے پہلے موبائل لیا۔ بچوں نے استعمال کرنا بھی سکھا دیا۔ کچھ نئے کپڑے بھی بنائے تھے اور گھر میں بھی سب کے لیے کچھ نہ کچھ خریدا تھا۔

ماں کا خیال آیا تو دل بھر آیا۔ وہ ان کا حال جاننے کے لیے بے قرار تھی۔ نیلوفر سے دبی دبی زبان سے اپنے گھر جانے کی خواہش کا اظہار کیا تھا۔ مگر وہ ٹال گئیں۔

اس نے شاپنگ کے دوران اپنے لیے اسکارف اور عبایا خریدا تھا۔

اس اشتہار کے بعد اسے اور آفر ہوئی تھیں' مگر معاہدے کے مطابق ابھی وہ صرف جنید آفندی کے ساتھ کام کرنے کی پابند تھی۔ جنید کے دیکھنے کا انداز اس کے رگ و پے میں سنسنی پھیلا دیتا۔ اس کے حسن کو چار چاند لگ گئے تھے۔ جنید آفندی کا والہانہ پن بھی بڑھتا جا رہا تھا۔ اس کے انداز اسے بے حد پریشان کر رہے تھے۔ جی چاہتا تھا کہیں چھپ جائے۔ اس کے مطالبے روز بروز بڑھتے جا رہے تھے۔

"باجی! بہت سے لوگ آفر کر رہے ہیں۔" ریمپ پر ماڈلنگ کی آفر آئی تھی۔ ایک روز ہمت کر کے نیلو فر سے کہہ دیا۔

"تم زیادہ سے زیادہ دولت کمانا چاہتی ہو؟"

"نہیں... مجھے آفندی سے خوف آتا ہے۔" سچ بات کہہ ہی دی۔

"تمہاری کامیابی کی پہلی سیڑھی ہے۔ ظاہر ہے کچھ تو حق بنتا ہے اس کا بھی۔"

"میں ایسا نہیں کر سکتی۔"

نیلو فر اس کے پیچھے پڑ گئی۔

☼ ☼ ☼

اسکارف سے چہرہ اچھی طرح چھپایا۔ رکشا روک کر آنے جانے کا کرایہ طے کیا اور سوار ہو گئی۔ دل بے حد دھڑک رہا تھا۔ ہاتھ پاؤں سنسنا رہے تھے۔ اچھی بری دونوں خبریں مل سکتی تھیں۔ اس کی بے کلی حد سے بڑھ گئی تھی۔ جب تھوڑی سوجھ بوجھ آئی تو ایک دن اس نے موقع سے فائدہ اٹھا لیا۔

گھر جیسے جیسے قریب آ رہا تھا۔ دل کی بے تابی بڑھتی جا رہی تھی۔ تنگ گلیاں شروع ہو گئیں۔

"یہیں روک دو بھائی۔"

کانپتے ہاتھ، دھڑکتے دل کے ساتھ کنڈی بجائی۔ دو تین بار بجانے کے بعد کوئی بڑبڑاتا ہوا کنڈی کھول رہا تھا۔

اجنبی چہرہ۔

"یہاں نذر محمد اور ان کی بیوی سلطانہ رہتے تھے۔"

شدت جذبات سے اس کی آواز کانپ رہی تھی۔

"یہاں تو میں رہتا ہوں تم کون؟" فوراً ہی سوال داغا۔

"وہ کہاں گئے؟" اس کا سوال نظر انداز کر گئی۔

"نذر محمد نے سنا ہے خود کشی کر لی۔ بیوی کہیں منہ چھپا کر روپوش ہو گئی۔ دراصل ان کی بیٹی بھاگ گئی تھی اپنے عاشق کے ساتھ۔"

"اوہ!" وہ لڑکھڑائی۔

"تو یہ کہانی بن گئی۔" اس کی ہمت جواب دے گئی۔

لڑکھڑاتے قدموں سے وہ دوبارہ رکشے میں بیٹھ گئی۔ رو رو کر برا حال تھا۔

"پتا نہیں کہاں چلی گئی میری ماں۔ کہاں ڈھونڈوں؟" تڑپتے بلکتے رات گزر رہی تھی۔

☼ ☼ ☼

"میری بچی! تیرا ٹھکانہ کس سے پوچھوں؟" سلطانہ بہت بے قرار تھی۔

"اپنے حواس قابو میں رکھنے چاہیے تھے مجھے۔ اسے باہر نہیں بھیجنا چاہیے تھا۔" اسے بے حد پشیمانی تھی۔

نذر محمد کے زہر پیتے ہی یوں محسوس ہوا جیسے آسمان چھت بن کر مجھ پر گر جائے گی۔ تیری گمشدگی پر طرح طرح کے سوال اٹھنے لگے، کس کس کا جواب دیتی۔ منہ چھپا کے ڈھونڈنے نکلی... پر تو جانے کہاں چلی گئی۔

میری بچی! تیری ماں بے قصور ہے۔" وہ اخبار کو سینے سے بھینچے تڑپ رہی تھی۔

"میری معصوم بچی... اللہ اس کی حفاظت فرمانا۔" اس کی تصویر کو بے قراری سے چوم رہی تھی۔

☼ ☼ ☼

وہ بہت کم عرصے میں شہرت کی بلندیوں کو چھونے لگی۔

"جنید آفندی نے پرپوزل بھیجا ہے۔" نیلو فر نے دھماکا کیا۔

"نہیں باجی... مجھے اپنی ماں کو تلاش کرنا ہے، میں یہ فیلڈ چھوڑ دوں گی۔"

"ترقی کے راستے کھلتے جا رہے ہیں، کیسے چھوڑ دو گی؟"

"بہت دولت کما لی ہے۔ مجھے زیادہ کی تمنا نہیں ہے۔" وہ فیصلہ کر چکی تھی۔

"دولت تمہارے پاس خود چل کر آ رہی ہے۔ ناشکرا پن مت کرو۔" انہوں نے جھاڑا۔

"جنید آفندی سے شادی نہیں کر سکتی، کبھی نہیں۔" اسے جھرجھری آ گئی۔ اس کے متعلق سب کچھ جان چکی تھی۔

وہ صرف اشعر کو اپنے دل کے آس پاس منڈلاتے دیکھتی تھی۔ صرف اسی کے ساتھ۔ معمولی ڈرائیور تو جس کی کوئی حیثیت نہیں تھی۔

میری عزت بچانے والا۔ تحفظ دینے والا۔ اسی کی وجہ سے میں یہاں تک پہنچی۔ وہی میرے جذبوں کی ابتدا ہے، وہی انتہا ہے۔ مگر جانے کہاں ہے۔" گاڑی میں بیٹھے ہر ڈرائیور پر اس کی نگاہ ہوتی۔ شاید وہ ہو۔ اس روز وہ کس کا ڈرائیور تھا۔ چاہتے ہوئے بھی نیلو فر سے پوچھ نہ سکی۔

☼ ☼ ☼

وہ جب بھی شاپنگ پر جاتی، عبایا پہن کر جاتی۔ اس طرح لوگوں کی نظروں سے اوجھل ہو جاتی تھی۔ اس وقت بھی عبایا پہنے ہوئے تھی۔

چند ریڈی میڈ سوٹ خریدے اور سینڈلوں والے کارنر پر آ گئی۔

"مما! مجھے وہ شوز لینے ہیں۔" ایک ننھی سی بچی ٹھنک رہی تھی۔

"ہاں جان... تم تین لے لو۔" اسی طرح کی اس کی مما بھی صدقے واری ہوتیں۔ اسی سمے اس کا موبائل بج اٹھا۔

"او نو! اسے بڑی بے چینی ہو رہی ہے۔" نمبر دیکھ کر بڑبڑائی۔ بٹن دبا کر موبائل کان سے لگایا۔

"تم پریشان نہ ہو۔ صاحب سے میری بات ہو گئی ہے۔ کسی دوست کے ساتھ گھر چلے جائیں گے۔ تم ہمارے ساتھ رہو گے اور یہاں آکر شوز والے کارنر سے ہمارے پیکٹ اٹھا کر گاڑی میں رکھو۔" جس کو ہدایت دے رہی تھی۔ تھوڑی دیر بعد وہ چلا آیا۔

"اشعر..." وہ بے آواز چلائی۔

وہ چار پانچ پیکٹ اٹھا کر ادھر ادھر دیکھے بنا چلتا بنا۔ وہ بے قراری سے اس کے پیچھے لپکی۔

وہ کافی آگے تک چلا گیا تھا۔ لوگوں کا ہجوم تھا۔ وہ تیزی سے اس کے پیچھے بھاگتی کئی لوگوں سے ٹکرائی۔

"اشعر!" اس کے برابر پہنچ کر چلائی۔ "اشعر پلیز رکو۔ میں رباب... رک جاؤ۔" اس نے ان سنی کر دی۔

"رباب جان..." وہ بڑبڑایا۔ قدم اور تیز کر دیے۔ وہ سامنے آ گئی تو اسے رکنا پڑا۔ "اب کیا پرابلم ہے؟"

"تمہارا ایڈریس چاہیے" اس نے ایک نظر اسے دیکھا۔

سامان کے شاپرز جلدی جلدی ٹھونسے اور خود کو گاڑی میں مقید کر لیا۔

اس کی بے اعتنائی پر وہ سسک کر رو پڑی۔ شیشہ بجانے لگی۔ کیسی لاچار و مجبور لگ رہی تھی۔

"ملک کی مشہور و معروف ماڈل ہے۔ اب اسے مجھ سے کیا غرض؟" وہ حیران تھا۔ مگر اس پر بے تحاشا غصہ بھی آ رہا تھا۔

"کیا پرابلم ہے۔" دانت پیستے شیشہ نیچے کیا۔

"میں تمہیں کب سے تلاش کر رہی ہوں۔ میری بات تو سن لو پلیز۔" وہ منت کر رہی تھی۔ بڑی بڑی آنکھیں آنسوؤں سے تر تھیں۔ پوری کی پوری لرز رہی تھی۔ اشعر کے ملنے کی خوشی مگر اس کی بے مروتی انتہا کی تھی۔

"کیا مسئلہ ہے؟ اب یہ جاب بھی چھڑوانی ہے کیا؟"

"مجھے تمہارا ایڈریس چاہیے۔ تم نے اتنے احسان کیے۔"

"اب تم مجھ پر ایک احسان کرو۔ میرا پیچھا چھوڑ دو۔"

"تم... میرے لیے بہت اہم ہو۔"

"محترمہ! میں ایک معمولی ڈرائیور ہوں۔ سرونٹ کوارٹر میں رہتا ہوں۔ آپ ہزاروں میں کھیلنے والی۔" وہ طنزیہ بولا۔

"اب بھی تم میرے لیے بہت اہم ہو۔"

"ہونہہ۔" اس پر کوئی اثر نہیں ہوا۔
"ایک سے ایک امیر مل جائے گا۔ بلکہ مل بھی گیا ہوگا اور ایک کیا۔"
"اشعر خدا کے واسطے۔" وہ تڑپ اٹھی۔ اس کے دونوں ہاتھ ابھی تک جڑے تھے۔
"تماشا نہ بناؤ پلیز۔ لوگ دیکھ رہے ہیں بیگم صاحب بھی آتی ہوں گی۔ تم جاؤ۔" اس نے اسٹیئرنگ پر ہاتھ رکھے۔
"میری بات سن لو ورنہ میں مرجاؤں گی۔"
"تو مرجاؤ۔" وہ بے انتہا سفاک ہو رہا تھا۔
وہ سن ہو کر رہ گئی۔ اس نے سوچا بھی نہ تھا کہ یہ اتنا کٹھور ہو سکتا ہے۔ وہ آنسو پونچھتی پلٹ گئی۔
"اسے مجھ سے کیا کام ہو سکتا ہے۔" وہ مڑ کر اسے جاتے ہوئے دیکھا۔ وہ سسکتی رکشے میں بیٹھ رہی تھی۔
"اس نے گاڑی نہیں خریدی۔ ڈرائیور چاہیے ہوگا اسے۔ یعنی میں ڈرائیور کا ڈرائیور رہوں۔ اتنی تعلیم کے باوجود ڈھنگ کی ملازمت نہیں ملتی۔" وہ دلبرداشتہ تھا۔
"آخر کیوں مجھ سے ملنا چاہتی تھی؟" اس کی سوئی پھر وہیں اٹکی۔
"کیا کروں ملوں کہ نہ ملوں۔" وہ تذبذب کا شکار ہوا۔
بالآخر اس کی سسکیاں، آنسوؤں میں تر آنکھیں اس کے دل کے آس پاس نرم گوشہ بناتی رہیں۔ اس نے اس سے ملنے کا فیصلہ کرلیا۔

☆ ☆ ☆

وہ دونوں پارک کے نسبتاً ایک تنہا گوشے میں آبیٹھے تھے۔
مگر اس کے مزاج میں ایک تناؤ تھا۔
"کیا کام ہے؟"
"مجھے تمہاری مدد چاہیے۔"
"جلدی بتاؤ۔"
"تم میرے سارے کام سنبھالو۔" اس کی خوشی قابل دید تھی۔
"تمہارا ملازم بن جاؤں؟" تیکھے لہجے میں سوال داغا۔
"نن۔ نہیں۔ محافظ۔" وہ ہکلائی۔
"مطلب۔ سیکیورٹی گارڈ۔" وہ تلملایا۔ اس کی عزت بچاتے ہوئے اپنا مستقبل خاک کرچکا تھا اسے پھر یاد آیا۔
"اس سے بھی بڑھ کر۔" اس کا انداز حیا آمیز تھا۔ مگر وہ اس کے انداز سمجھ نہیں رہا تھا۔ یا جان کر کے نظر انداز کر رہا تھا۔
"صاف صاف بات کرو۔ میری سمجھ میں نہیں آرہا۔ تم کیا کہہ رہی ہو۔" وہ قطعی متاثر نہ ہوا۔
"مجھے دنیا کے کسی مرد پر بھروسا نہیں سوائے تمہارے۔"
"ہاں۔ وہ تو میں ہوں گدھا۔" لہجے میں کوئی فرق نہ آیا تھا۔ "تم کام بتاؤ میرے پاس وقت کم ہے۔"
تھوڑا سا نقاب سرکاتے وہ اس کے حواسوں پر چھا رہی تھی۔ موتی سے دانتوں کی قطار بار بار مسکراہٹ سے نمایاں ہو رہی تھی۔
شفق کی سرخی رخساروں پر لیے ہاتھوں کی نازک انگلیاں باہم ایک دوسرے میں پھنسائے وہ بڑی مشکل سے بول رہی تھی۔
"میں تمہاری وجہ سے اس مقام پر ہوں۔"
"اب بس کرو، یہ ہی کہنے کے لیے بلایا تھا۔" اس نے بات کاٹ دی۔ تیوری کے بل درست ہی نہیں ہو رہے تھے۔
وہ سب کچھ کہنا چاہتی تھی مگر حیا دامن گیر تھی۔ وہ کیوں نہیں سمجھ رہا؟
"کتنی تنخواہ دوگی؟" اس نے ایک دم پینترا بدلا۔
"ساری کی ساری۔" وہ چونکا۔
"اندازہ ہے کیا کہہ رہی ہو۔ دماغ درست رکھو۔ میں اس قماش کا نہیں ہوں۔ جانے کون کون لوگ اس فہرست میں ہیں۔" اس کا لہجہ مزید ترش ہوا۔

"میری توہین مت کرو۔ کوئی بھی فہرست میں نہیں۔ کیوں اتنا شک کر رہے ہو۔" اسے بھی غصہ آگیا۔ ساتھ آنسو ٹپ ٹپ گرنے لگے۔
"واپس چلو۔"
"میری بات کا جواب تو دیا نہیں۔"
"کیا مصیبت ہے۔ اس نوکری سے بھی نکلواؤ گی تم؟"
"میں تمہیں کس طرح سمجھاؤں۔" وہ روہانسی ہوئی۔
وہ پریشان ہو گئی۔ اسے کھل کر کیسے کچھ بتائے۔ پروانوں کی تعداد بڑھتی جارہی تھی۔ اور دل لگی کرنے والے بھی جمع ہو رہے تھے۔ وہ خود کو بچاتے بچاتے پریشان ہو گئی تھی۔ اور یہ وجہ اشعر کے علاوہ کسی کو بتانے کو تیار نہ تھی۔ اسے اس بات کی پروا نہ تھی کہ وہ ایک ڈرائیور ہے۔ اس کی شرافت نے کسی اور سے متاثر ہونے نہ دیا۔
"اشعر! میں تمہارے ساتھ زندگی گزارنا چاہتی ہوں۔" وہ شرم سے مری جارہی تھی پھر بھی کہہ ہی دیا۔
وہ حیران رہ گیا۔ "پاگل ہو گئی ہو کیا۔ لوگ کیا کہیں گے؟"
"مجھے کسی کی پروا نہیں۔" بے اختیار آنسو بہہ نکلے۔ "مجھے سب کی نظروں سے دور لے جاؤ۔"
"تم بہت بلندی پر ہو۔ میں ایک ڈرائیور۔" کسی طرح قائل نہ ہو رہا تھا۔
"میں نے کمایا ہے۔ مجھے کسی بات کی پروا نہیں۔ میں تمہارے ساتھ ہر طرح کے حالات میں رہ سکتی ہوں۔"
"تم مجھے کتنا جانتی ہو؟"
"ہزار سال سے بھی زیادہ۔ تم میرے مددگار ہو، میرے محافظ ہو۔" وہ حیران رہ گیا۔
"اس وقت میری جگہ کوئی بھی ہوتا ایسے ہی مدد کرتا۔"
"تم خود جانتے ہو کہ تم جھوٹ بول رہے ہو۔" وہ پورے وثوق سے بولی۔
"تم جذبات میں بہہ رہی ہو۔"
"پلیز بلاوجہ کی تاویلیں مت دو۔ کسی مناسب وقت باجی کے گھر آجاؤ۔" وہ بے چین تھی۔
"تم جو سوچ رہی ہو۔ ممکن نہیں۔ اتنی بڑی ماڈل ایک ڈرائیور کے ساتھ شادی۔ ناممکن۔" اس نے نفی میں سر ہلایا۔
"ہم کرائے کا فلیٹ یا کوئی چھوٹا سا گھر لے لیں گے۔" اس کے انکار کو نظر انداز کر کے اس نے مستقبل کا منصوبہ بنایا۔
"میں کرائے کا گھر یا فلیٹ افورڈ نہیں کرسکتا۔"
"تو ٹھیک ہے ہم سرونٹ کوارٹر میں۔"
"تم کس مٹی کی بنی ہو۔" اس نے غصے سے چلا کر کہا۔
"محبت کی مٹی سے۔" وہ اپنے دل کی کیفیت سے آگاہ کر رہی تھی۔
"اتنا پیسہ کمانے کے بعد مجھ میں کیا نظر آیا۔"
"روپے پیسے شہرت نے مجھے میری اوقات سے بڑھنے نہیں دیا۔ میں جذباتی فیصلہ نہیں کر رہی۔ تمہارے ساتھ زندگی گزارنا چاہتی ہوں۔ کتنی بار کہوں۔"
وہ اسے اپنی محبت کا یقین دلانا چاہ رہی تھی مگر وہ یقین کرنے کو تیار نہ تھا۔ عجیب مشکل کا شکار تھا۔ یہ لڑکی دل کے نہاں خانوں میں گھستی جارہی تھی۔ مگر وہ ایک ہوش مند انسان تھا۔
"ہمارے درمیان بہت فاصلے ہیں۔" اس نے سمجھایا۔
"نہیں ہیں فاصلے۔" وہ ماننے کو تیار نہ تھی۔
"میرا شمار عام ملازموں میں ہوتا ہے۔" اس نے پھر سمجھایا۔ حالانکہ دل اس کے ساتھ کے لیے مچل رہا تھا۔
"کتنی دفعہ کہوں اشعر! مجھے اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔" وہ زچ ہو کر رو پڑی۔
"سوچ لو۔ اب بھی وقت ہے۔ سرونٹ کوارٹر چائے پاپے کا ناشتا۔" وہ اس کے موبائل میں اپنا نمبر فیڈ کرتے ہوئے مسکرا کر بولا۔

رباح نے بے اختیار سکون کا سانس بھرا۔

☼ ☼ ☼

"تمہارا دماغ خراب ہے۔ ایک ڈرائیور سے شادی کرو گی۔ ملک کی مشہور و معروف ماڈل اور۔"

"اس شخص کے علاوہ میں کسی سے بھی شادی نہیں کروں گی۔" اس نے ان کی بات کاٹی تھی۔

"کون سی فلمی کہانی بنانا چاہتی ہو؟" وہ بری طرح تلملا گئیں۔ "تمہاری سوچ جھونپڑی والی ہی رہی۔ اتنی بلندی پر جانے کے بعد کوڑے میں گرنا چاہتی ہو۔"

"یہ میری ذاتی زندگی ہے۔" اس نے انہیں جتایا۔

"میری ساری محنت پر پانی پھیر دیا۔ کوئی کام نہیں دے گا۔ بھوکوں مرو گی۔" انہوں نے ڈرایا۔

"مجھے روکھی سوکھی کھانے کی عادت ہے۔" اس کے پاس ہر بات کا جواب تھا۔

"اس ڈرائیور کی محبت نے تمہیں بہت نڈر بنا دیا ہے۔" نیلوفر حیران تھیں۔ "ایک بار پھر سوچ لو۔ بہت جگ ہنسائی ہوگی۔"

"سوچ لیا۔" وہ دو ٹوک لہجے میں بولی۔

☼ ☼ ☼

اخبار میں شائع خبر رباح نے پڑھی۔ کنپٹیاں سلگ گئیں۔ جی چاہا سب کو شوٹ کر دے۔ مگر صرف پیچ و تاب کھا کر رہ گئی۔

"باجی! یہ خبر۔" اخبار نیلوفر کے سامنے پٹخا۔ چہرہ غصے کے مارے لال بھبھوکا ہو رہا تھا۔ نیلوفر نے اس کے تیور دیکھے اور لاپروائی سے شانے اچکائے۔

"ایسی باتیں چھپی نہیں رہتیں۔"

"میں نے تو صرف آپ کو بتایا تھا۔"

"بھئی! کیا کرتی۔ تمہارے کچھ رشتے آئے تھے۔ مجھے ان لوگوں کو انکار کرنے کی معقول وجہ بتانی تھی۔ کہہ دیا کسی اور کو پسند کرتی ہے۔"

"معمولی ڈرائیور کہنا ضروری تھا؟" وہ رو دینے کو تھی۔

"ہاں بہت ضروری تھا۔ عشق اندھا ہوتا ہے۔ بار بار شرمندہ ہونے کی ضرورت نہیں۔ اب بھی وقت ہے اس ڈرائیور کو بھگا دو۔" ان کا انداز تمسخرانہ تھا۔

"وہ میرا محسن ہے۔ اس نے مجھے تحفظ دیا تھا۔"

"ٹھیک ہے تو انعام میں کچھ رقم دے دو۔ شوہر بنانے کی کیا تک ہے؟" انہوں نے مشورے سے نوازا۔

"انعام ہی تو دے رہی ہوں۔" نیلوفر نے ناسمجھی سے اسے دیکھا۔ وہ خاموشی سے اٹھ کر چل دی۔

☼ ☼ ☼

"مشہور معروف ماڈل رباح کا ایک معمولی ڈرائیور سے معاشقہ۔" چٹپٹی خبر اخبار میں شائع ہوئی۔ ساتھ ہی رباح کی تصویر تھی۔ سلطانہ نے دل پکڑ لیا۔

"یہ کیا ہو گیا رباح تجھے۔" رونے کے علاوہ کچھ نہیں کر سکتی تھی۔ چکرائی چکرائی کام کر رہی تھی۔

"کس سے اس کا پتا پوچھوں۔ خدایا میری مدد کر کہ اسے روک سکوں۔ پتا نہیں کیسا انسان ہو۔ یقیناً لالچی ہوگا۔ اسے کوئی قابل انسان نہیں ملا۔ میں اس تک کیسے پہنچوں۔"

دونوں ماں بیٹی بے خبر تھیں۔ ان کے درمیان صرف ایک دیوار کا فاصلہ تھا۔ نیلوفر کا مکان اور سکندر خان کا مکان آگے پیچھے گلیوں میں تھا۔

☼ ☼ ☼

شوٹنگ سے تھک کر آئی تھی۔ لوگوں کے طرح طرح کے سوالوں کا سامنا کرنا پڑ رہا تھا۔ یہاں بھی پریشانی تھی۔ یہاں مزید کیسے رہ سکتی ہے۔ ان کے تیور بھی بگڑ گئے تھے۔ اسی لیے وہ کسی کو اشتر سے ملانا نہیں چاہتی تھی۔ شادی بھی خاموشی سے کرنا چاہتی تھی۔

"کاش مل جائے خداوند کوئی تو ہو۔" ابھی غنودگی ہی میں تھی موبائل بج اٹھا۔ اشتر تھا۔

"ہیلو!"

"تم نے اخبار میں خبر شائع کرا دی۔" وہ ناراض تھا۔

"میں نے نہیں۔" پھر ساری تفصیل اسے بتائی۔ "اشتر! باجی کے گھر رہنا مشکل ہو رہا ہے۔ مجھے بہت جلد گھر تبدیل کرنا ہے۔ کوئی فلیٹ یا گھر کرائے پہ۔"

"اوکے! میں کرتا ہوں بندوبست تم پریشان نہ ہو۔"

وہ مطمئن ہو کر سو گئی۔

☼ ☼ ☼

"زندگی کی آسائشوں کی عادت ہو گئی ہے تمہیں۔ اب وہ ڈرائیور کیا دے گا تم کو؟" وہ جنید آفندی کے ساتھ لنچ پہ مدعو تھی۔

"اس موضوع کو ختم کیجیے۔" وہ اس پر بات نہیں کرنا چاہتی تھی۔

"کیسے ختم کروں۔ تم میری خواہش ہو، جنون ہو۔" ان کے لہجے میں رعب کے ساتھ پیار بھی تھا۔

"ساری خواہشات پوری نہیں ہوا کرتیں۔" اسے مقابلہ کرنا خوب آ گیا تھا۔

"زبردستی پوری کر لی جاتی ہیں۔" وہ بھی ضد پر اتر آیا تھا۔

"آفندی صاحب پلیز۔"

"میں نے اتنی بلندیوں تک پہنچایا تو گرا بھی سکتا ہوں۔"

"آپ دھمکی دے رہے ہیں؟"

"خبردار کر رہا ہوں۔ اس قابل نہیں چھوڑوں گا کہ وہ عزت دار ڈرائیور تمہیں اپنا لے۔ غریبوں کو عزت بڑی پیاری ہوتی ہے۔"

"کیسی بات کر رہے ہیں۔ امیروں کو عزت پیاری نہیں ہوتی؟"

"امیر تو ہوتا ہی عزت دار ہے۔ ایک غریب لڑکی کو عروج پر پہنچایا۔" اس نے پھر جتایا۔

"مہربانی ہے آپ کی۔"

"میں تمہیں کام نہیں دوں گا مزید کہیں اور کرنے کے قابل بھی نہیں چھوڑوں گا۔" وہ خباثت پر اتر آیا تھا۔

وہ لرز کر رہ گئی۔

"یہ آخری آفر ہوگا۔" جنید آفندی نے اپنی بات جاری رکھی۔

"مجھے یہ بھی نہیں کرنا۔" وہ فوراً کھڑی ہو گئی۔

"رقم؟"

"کون سی؟"

"جو تم پر خرچ ہوتی رہی ہے۔"

"لعنت بھیجتی ہوں اس رقم پر۔ ایک ایک پائی لوٹا دوں گی۔" وہ شدید غصہ ہوئی۔

"ڈرائیور پر لعنت بھیجو اور چلو میرے گھر۔ بہت شان دار طریقے سے تم سے شادی کروں گا۔" اسے غصے میں دیکھا تو فوراً چاپلوسی اختیار کی مگر اس پر اثر نہ ہوا۔ سنی ان سنی کر کے جانے کے ارادے سے قدم بڑھائے۔

"تمہارے عاشق کو تو میں چٹکی سے مسل دوں گا۔ جان عزیز ہے اس کی؟" اسے جاتے دیکھ کر وہ سلگ اٹھا۔ رقابت کی آگ نے اسے پاگل کر دیا۔ یہ دھمکی سن کر اسے رکنا پڑا۔ وہ کرسی سے اٹھ کر اس کے نزدیک آ گیا۔ وہ ذرا پیچھے کو ہو گئی۔

"میرے بہت سے جاننے والے ہیں جو میری ناپسندیدہ شخصیت کو دنیا میں زیادہ دیر تک نہیں رہنے دیتے۔" وہ غرایا۔ وہ بے حد خوف زدہ ہو گئی۔

☼ ☼ ☼

"اشتر! خدا کے واسطے ابھی مجھ سے نہ ملنا۔ وہ مار ڈالے گا تمہیں۔" وہ بری طرح سسک اٹھی۔ گھر آتے ہی اس نے اشتر کو فون کیا۔

"کیا کہہ رہی ہو۔" اس کی سمجھ میں کچھ نہ آیا۔

"اشتر! آفندی مجھ سے شادی کرنا چاہتا ہے۔"

"تو تم اس سے شادی کر لو گی۔" وہ ناراض ہوا۔

"زہر کھا لوں گی۔" وہ رو رہی تھی۔

"فلمی جملے مت بولو۔" وہ ابھی تک ناراض تھا۔

"میں سچ کہہ رہی ہوں۔ بس تم وہ کرو جو میں نے کہا ہے۔" اپنا فیصلہ سنا کر اس نے موبائل آف کر دیا۔ وہ کافی دیر تک تڑپتی سسکتی رہی۔ کچھ سمجھ میں نہ آرہا تھا کیا کرے۔

"اشتر کے بغیر تو میں مر جاؤں گی۔ اللہ! میری مدد کر۔"

دوسری طرف موبائل تھامے اشتر حیران پریشان کھڑا رہ گیا۔

☆ ☆ ☆

اس پر حیرت کے پہاڑ ٹوٹ پڑے۔ آفندی نے آؤٹ ڈور شوٹنگ کے لیے جو نیا ڈرائیور رکھا تھا وہ اشتر تھا۔ رباح نہیں جانتی تھی کہ اشتر نے جان بوجھ کر آفندی کے پاس نوکری کی یا آفندی نے اسے اوقات یاد دلانے کے لیے اشتر کو ڈرائیور رکھا۔ مگر اتنا ضرور تھا کہ وہ اشتر کے سامنے ہی رباح سے اپنے التفات کا مظاہرہ کرواتا۔ اسے میں اشتر کی کن پٹیاں سلگ جاتیں۔ اور رباح زمین میں گڑ جاتی۔

رباح اشتر سے بات نہ کرتی۔ وہ بھی بظاہر اپنے کام سے کام رکھتا۔

"یار! بڑے خوب صورت ہو۔ ایٹی ٹیوڈ بھی ہے۔ ایڈ کرو گے؟"

"نہیں سر۔" اس نے کورا جواب دیا۔

"ارے کیوں بھئی! ہینڈسم ہو۔ بہت جلد ترقی کرو گے۔" وہ آج فیاضی کے موڈ میں تھا۔ رباح اس کے پہلو میں بیٹھی پیچ و تاب کھا رہی تھی۔

"صاحب یہ گانے بھی گاتا ہے۔ بڑا سریلا ہے۔" الیکٹریشن حمید بولا۔

"کر لیجئے۔ اچھا رہے گا آپ کے لیے۔" اس کی مسلسل خاموشی پر رباح نے آہستگی سے کہا۔ اشتر نے تب بھی سر اٹھا کر نہیں دیکھا۔ مگر آفندی زور سے ہنس پڑا۔

"بھئی اب تو ڈن۔ ہماری جان نے کہہ دیا۔ سمجھ لو پتھر پر لکیر ہو گیا۔"

رباح یوں خوش ہو گئی گویا رہائی کی شاید پہلی سیڑھی پر قدم رکھ دیا ہو۔

"جب ٹیلنٹ ہے اور موقع بھی مل رہا ہے تو فائدہ اٹھاؤ۔ ہم بیٹھے ہیں نا آگے تک پہنچا دیں گے۔" آفندی بڑی موج میں آیا ہوا تھا۔ اشتر نے اب بھی کچھ نہ کہا۔ گاڑی اسٹارٹ کر دی۔

☆ ☆ ☆

قسمت اس پر مہربان ہو رہی تھی۔ انسان کے اختیار میں کچھ نہیں ہوتا۔ اس کا پہلا ہی اشتہار مقبول ہو گیا۔ آفرز کی لائن لگ گئی۔

ٹی وی پروڈیوسرز نے ڈرامے کی آفر کر دی۔ وہ اچانک ہی بہت مصروف ہو گیا۔ جب موقع ملتا آفندی کے پاس آجاتا۔

"آپ ہم دوست ہیں۔ تم میرے ڈرائیور نہیں رہے۔"

"لیکن آپ مجھے بلوایا کریں گے۔" وہ اوپری دل سے کہتا۔

اس دن وہ آفندی سے ملنے آفس آیا تو آفندی نہیں تھا۔ رباح اسی وقت کوئی کمرشل کر کے آئی تھی۔ اسے دیکھ کر رو پڑی۔

"اشتر! مجھے کہیں لے چلو۔ آفندی کے ساتھ محبت کا ڈراما کرتے میں تھک گئی ہوں۔" وہ روہانسی ہو رہی تھی۔

اس نے تسلی دی۔ وہ بھی جلد از جلد اس سے چھٹکارہ چاہتا تھا ورنہ نظروں کے سامنے رباح کسی اور کی ہو جائے گی۔ وہ کچھ نہ کر سکے گا۔ دونوں کی زندگیاں برباد ہو جائیں گی۔

☆ ☆ ☆

رباح کو رہائش کی تلاش تھی اس نے اشتر سے مکان ڈھونڈنے کا کہہ دیا تھا۔ اب اس میں تمہارنے کی ہمت آ گئی تھی۔ اسے اشتر کے مضبوط سہارے کا آسرا تھا۔

رات کو جب موقع ملتا اشتر اسے فون کرتا۔ وہ ڈھیروں باتیں کرتے، مستقبل کے منصوبے بناتے۔ کسی کو کانوں کان خبر نہ ہوتی۔

اشتر ہی نے اسے بتایا کوئی بوڑھے میاں بیوی اپنا ایک پورشن کرائے پر ـــــ دینا چاہتے ہیں۔ اسے ایڈریس سمجھا دیا۔ اب اسے راستوں کی پہچان ہو گئی تھی۔ عبایا پہن کر نقاب کر کے مطلوبہ مکان پر پہنچ گئی۔

"جی فرمایئے۔" بوڑھے ایاز علی نے عینک کے موٹے موٹے شیشوں کے پیچھے سے اس کی شخصیت کا جائزہ لیا۔ ادھیڑ عمر صالحہ بیگم بھی قریب آگئیں۔ سادگی زیب تن کیے کھچڑی بالوں کو جوڑے کی شکل میں لپیٹے وہ ایک باوقار نفیس سی خاتون لگ رہی تھیں۔

"مجھے کرائے پر پورشن چاہیے۔" اس نے مدعا بیان کیا۔

"تمہیں کس نے بتایا؟" انہوں نے اسے بہت غور سے دیکھا۔

اس نے مختصراً اپنے بارے میں بتایا۔ انہیں اس کے کام پر تھوڑا اعتراض ہوا مگر اس نے یقین دلایا کہ انہیں اس کی وجہ سے کوئی پریشانی نہیں اٹھانی پڑے گی۔ وہ دونوں میاں بیوی تھوڑی سی پس و پیش کے بعد مان گئے۔

"چلو یہ مسئلہ تو حل ہوا۔" وہ خوش ہوئی۔ بہت

اسے ایک ہفتہ ہو گیا تھا یہاں آئے ہوئے۔ اس دوران ان دونوں میاں بیوی کے وہ خدشات جو رباح کی فیلڈ کے حوالے سے تھے' دور ہو گئے۔ خود رباح بھی انتشار و بے اعتباری کی فضا میں معلق رہنے کے بعد مطمئن ہو گئی تھی کہ وہ دونوں میاں بیوی بے ضرر مخلص لوگ تھے۔ وہ انہیں اپنی ساری کہانی سنا چکی تھی۔ وہ دونوں اس کی آپ بیتی سن کر آبدیدہ ہو گئے تھے۔

"تم اشتر سے نکاح کر لو۔" خاموشی سے ایاز علی نے مشورہ دیا۔

"آفندی بہت خطرناک انسان ہے انکل! اسے مروا دے گا۔" وہ خوف زدہ ہو گئی۔ "اور میں اس کے علاوہ کسی اور کے متعلق سوچ بھی نہیں سکتی۔"

"ملواؤ ہم سے' دیکھتے ہیں تمہارے قابل ہے بھی کہ نہیں۔" وہ ذمہ داری سے بولے تو وہ سر سے لے کر پیر تک سرشار ہو گئی۔ اس کا تو خوف ہی دور ہو گیا۔

"وہ آج کل کچھ ڈراموں کی شوٹنگ میں مصروف ہے۔" اس نے بتایا۔

"مگر میں اس سے کہتی ہوں۔ وہ فوراً آپ سے ملنے آئے گا۔"

"پھر اس کے بعد تمہاری امی کو ڈھونڈنے کی کوشش کریں گے۔" صالحہ بیگم نے اسے تسلی دی۔

☆ ☆ ☆

کسی کے گھر شوٹ تھا۔ ابھی کچھ کام باقی تھا۔ رباح کا تھکن سے برا حال تھا۔ وہ آرام کی غرض سے دوسری منزل پر ایک الگ تھلگ کمرے میں آگئی۔ وہ اس وقت کمرے میں تنہا تھی۔ سب ہی کہیں نہ کہیں مصروف تھے۔

زرد رنگ کی میکسی اس کے وجود پر بے حد جچ رہی تھی۔ اس نے پیر سینڈلوں سے آزاد کیے اور بیڈ کراؤن سے ٹیک لگا کر نیم دراز ہو گئی۔ میکسی پنڈلیوں سے کھسک گئی۔ صاف و شفاف پنڈلیاں نمایاں ہو گئیں۔ ہوش ربا حسن نیم خوابیدہ تھا۔

آفندی نے اندر جھانکا۔ اس کے اندر کا شیطان باہر نکل آیا۔ غلط نیت لیے اس تک پہنچا۔ ہلکا سا کھٹکا ہوا۔ آہٹ سن کر رباح نے بند پلکیں کھولیں۔ آفندی کو بے حد نزدیک پا کر بجلی کی سی تیزی سے اٹھ کھڑی ہوئی۔

"تم بہت خوب صورت ہو رباح۔ آج ظلم نہ کرنا پلیز۔"

"آفندی۔" وہ لرز اٹھی۔

"ہماری شادی ہونے والی ہے' پھر تمہیں کیوں

اعتراض ہے۔" وہ ایک قدم بڑھا۔
"میں جان دے دوں گی مزید آگے بڑھے تو۔"
"مجھ سے انتظار نہیں ہوتا اب۔" وہ کرنل تو تانا مو۔ رباح کو اندازہ ہوا وہ اسے نہیں روک پائے گی۔ اس نے دوسری راہ اختیار کی۔
"ابھی شوٹنگ مکمل نہیں ہوئی۔ اس کے بعد دیکھتے ہیں۔"
"میں نے سب کی چھٹی کر دی۔ سب چلے گئے۔ اب یہاں کوئی نہیں ہے۔" وہ مسکرایا۔
وہ دہشت زدہ ہو گئی۔ وہ آہستہ آہستہ کھڑکی کی طرف کھسکنے لگی۔
"دیکھو۔ میں کہہ رہی ہوں رک جاؤ ورنہ۔" اس نے انگلی اٹھا کر اسے تنبیہ کی۔
"مرنا آسان نہیں ہوتا میری جان۔" خباثت بھری مسکراہٹ اس کے لبوں پر ابھی تک تھی۔
"اپنی عزت بچانے کے لیے میں کچھ بھی کر سکتی ہوں۔ سمجھے!" وہ غرائی۔
"جان دینی ہی ہے تو مجھے دے دو نا میری جان! دیکھو۔"
وہ اب کھڑکی تک پہنچ چکی تھی۔ کھڑکی کا شیشہ کھسکانا محال تھا۔ مگر شکر تھا اس میں گرل نہیں لگی تھی۔
"بے وقوفی مت کرو رباح!" وہ مسلسل آگے بڑھ رہا تھا۔ وہ خوف کی آخری حد تک ڈر چکی تھی۔ اس کا وجود لرزے کی زد میں تھا۔
"یا اللہ مدد کر!" اس نے پوری قوت سے اسے دھکا دیا۔ وہ لمبا چوڑا مرد بس یکدم ہی لڑکھڑایا تھا۔ اس نے بجلی کی سی تیزی سے شیشہ کھسکایا۔
"رکیں۔" کوئی پیچھے سے پکارا۔ وہ کیمرہ مین تھا جو اپنا موبائل لینے کمرے میں آیا تھا اور ساری صورت حال بھانپ چکا تھا۔
مگر رباح اس کی آواز نہیں سن سکی اور اسی لمحے ایک زوردار چیخ کے ساتھ اس نے خود کو دوسری منزل کی کھڑکی سے گرا دیا۔ کیمرہ مین چیختا ہوا کھڑکی تک پہنچا۔
اتنی دیر میں وہ چھجے پر گری اور پھر فرش وہاں سے بھی لڑھک کر زمین پر جا گری۔ کیمرہ مین نے نیچے جھانکا۔ وہ خون میں لت پت بے سدھ پڑی نظر آئی۔
"لعنت ہے صاحب آپ پر!" کیمرہ مین صوفے پر گرے آفندی کو کہہ کر تیزی سے سیڑھیاں اترتا وہاں پہنچا۔ اتنی دیر میں کچھ لوگ جمع ہو چکے تھے کسی نے ایمبولینس بھی منگوالی تھی۔
خبر میڈیا تک جا پہنچی اور پھر بجلی کی سی تیزی سے پھیل گئی۔
"مشہور ماڈل رباح نے عزت بچانے کی خاطر دوسری منزل سے چھلانگ لگا دی۔ وہ موت و زیست کی کشمکش میں جناح اسپتال میں داخل ہیں۔"

☆ ☆ ☆

"ہائے۔" سلطانہ نے کلیجہ پکڑ لیا۔ "بیگم صاحبہ میری بچی۔" وہ بری طرح رو پڑی۔
وہ حیرت زدہ تھیں۔
"تم نے کبھی بتایا نہیں۔" بیگم صاحبہ نے فوراً اپنے ڈرائیور کو بلایا۔
ڈرائیور سلطانہ کو مقامی اسپتال چھوڑنے چلا گیا۔
اشتر اسپتال کے کوریڈور میں بے قراری سے ٹہل رہا تھا۔ ایاز علی، صالحہ بیگم اور کیمرہ مین بھی موجود تھے۔
آفندی راتوں رات روپوش ہو گیا۔
"ارے میں بچا لیتا بی بی کو پر میری سنی ہی نہیں۔" وہ باقاعدہ رو رہا تھا۔
"آفندی کو کہاں ڈھونڈوں۔" اشتر بے چین تھا۔
"رباح! اللہ تمہیں زندگی دے۔" سلطانہ بلکتی ہوئی کاریڈور میں داخل ہوئی۔
"خاتون آپ کون ہیں؟" صالحہ بیگم نے تڑپ تڑپ کر روتی سلطانہ سے پوچھا۔
"میں سلطانہ۔ رباح کی ماں۔" اس کے الفاظ ہچکیوں میں کہیں گم ہو گئے۔
اشتر چند قدم کے فاصلے پر تھا۔ سنتے ہی لپک کر ان کے پاس آیا اور انہیں تسلی دی۔
اندر آئی سی یو میں ڈاکٹرز اس کی جان بچانے کی کوشش میں مصروف تھے۔
کئی خون کی بوتلیں اسے لگیں۔ ٹانگ کی ہڈی میں فریکچر تھا۔ بازو کی ہڈی بھی مڑ گئی تھی۔
آخر کار اس نے آنکھیں کھول دیں۔
"میری ماں۔؟" ہوش میں آتے ہی اس نے پہلا سوال کیا۔
"رباح۔ یہ دیکھو۔ تمہاری امی۔" اشتر نے سلطانہ کا ہاتھ پکڑ کر رباح کے قریب کیا۔
"امی۔ ی۔" سلطانہ کو دیکھ کر وہ پھر ہوش و حواس کھونے سی لگی۔ یہی کیفیت سلطانہ کی بھی تھی۔ مگر اس مرتبہ یہ خوشی کا عالم تھا۔

☆ ☆ ☆

رباح تیزی سے صحت یاب ہو رہی تھی۔ بس گھٹنے کے پاس سے فل پٹی تکلیف دے رہی تھی۔ ابھی بازو پر بھی بینڈیج تھی۔ نقاہت بھی بے حد تھی۔ مگر ماں کے ملنے پر مسرور تھی۔
اسے کمرے میں شفٹ کر دیا گیا تھا۔ سلطانہ کو اشتر بے حد پسند آیا تھا۔ ایاز علی اور صالحہ بیگم کی بھی ممنون تھی کہ اس کی بیٹی کا اتنا خیال رکھا۔
"اسی عزت کو بچانے کی خاطر تو امی نے رات کے اندھیرے میں گھر کی چار دیواری سے باہر دھکیل دیا تھا۔ اسے بے مول بچایا۔" رباح کا لہجہ ٹھوس تھا۔
کچھ دن بعد رباح کو گھر شفٹ کر دیا۔
ایاز علی صالحہ بیگم نے ایک دم اشتر کو بھی زبردستی یہیں روک لیا تھا۔ تنہائی کے مارے ایاز علی اور صالحہ بیگم کو یکدم اتنے رشتے مل گئے۔ ان کی خوشی کا ٹھکانہ نہیں تھا۔ اتنے بے لوث تھے دونوں۔
صالحہ بیگم رباح کے کمرے میں آئیں۔ ان کے ہاتھ میں ایک پاؤچ تھا۔ بازوؤں پر گلابی جھلملاتا دوپٹا سنبھالا ہوا تھا۔
نیم دراز رباح کے قریب آئیں۔ اس کی پیشانی کو بوسہ دیا۔
اس وقت سب لوگ موجود تھے۔ خاموش مسکراہٹ کے ساتھ اس کارروائی کو دیکھ رہے تھے۔
اس کا ذرا سا سر اونچا کر کے دوپٹا اس کے سر پر ڈالا۔ پاؤچ سے بھاری کنگن نکال کر اس کی کلائیوں میں ڈالے۔
"میں نے رسم کر دی ہے۔" سلطانہ سے مخاطب ہوئیں۔ "اشتر سے اس کی بات پکی ہو گئی ہے۔ اب آپ کی باری ہے۔"
سلطانہ نہال ہو گئی۔
اشتر نے مسکرا کر اسے دیکھا تھا۔ وہ شرم سے سرخ ہو گئی۔ گلابی جھلملاتے دوپٹے میں اس کا نقاہت زدہ چہرہ شرمیلی مسکراہٹ لیے بے حد حسین لگ رہا تھا۔
سلطانہ نے بٹوے سے کچھ نوٹ نکال کر اشتر کے ہاتھ پر رکھے اور اس کی پیشانی چوم لی۔ ایاز علی مٹھائی کا ڈبا نکالا' جو انہوں نے کرسی کے پیچھے چھپا رکھا تھا۔ ان کو شوگر تھی۔ صالحہ بیگم کھانے نہیں دیتی تھیں۔ وہ مٹھائی کے دلدادہ۔ گھور کر میاں کو دیکھا۔
"بھئی آج کوئی روک ٹوک نہیں۔ آج میری بیٹی کی منگنی ہوئی ہے۔ آج تو میں مٹھائی کھاؤں گا بھی، کھلاؤں گا بھی۔"
کہتے کے ساتھ انہوں نے رباح کو آدھا گلاب جامن کھلایا اور باقی آدھا اشتر کے منہ میں ڈال دیا۔ وہ تلملائی کھڑی رہیں تو سنجیدہ ہو گئے۔ زبان کے سامنے کر دیا۔ صالحہ بیگم نے فوراً" جھپٹ لیا مگر پھر ایک گلاب جامن اٹھا کر ایاز علی کے منہ میں ٹھونس دیا۔ سب یکدم ہنس پڑے۔
رباح اور اشتر کی تو کیفیت ہی الگ تھی۔ دونوں کی بے لوث محبت نے فتح پائی تھی۔

سمیرا حمید

امرحہ کی پیدائش کے وقت اتفاقی طور پر رونما ہونے والے چند ناگوار اور نقصان دہ واقعات کے سبب وہ اپنے خاندان میں "منحوس" مشہور ہو جاتی ہے۔ اس کے بابا، اماں، دادی اور تینوں بہن بھائی دانیہ، عماد اور علی اسے اکثر جلی کٹی "منحوس" کالی نظر اور کالی زبان کہتے رہتے ہیں۔ یہاں تک کہ اس کی منگنی بھی ان ہی افواہوں کی وجہ سے ٹوٹ جاتی ہے۔ اپنی نحوست کے صبح شام قصے سن کر امرحہ خود ترسی کا شکار ہو کر روتی رہتی ہے۔

پورے گھر میں صرف دادا ہی اس کی دل جوئی کرتے ہیں اور گھر والوں کی باتوں کو لغو قرار دیتے ہوئے امرحہ کو بھی ان پر کان دھرنے سے منع کرتے ہیں۔ امرحہ کی اپنے دادا سے خوب بنتی ہے۔ وہ سارا دن ان کے ساتھ پنجاب لائبریری میں گزارتی ہے۔ جہاں وہ لائبریرین تھے۔ دادا اسے سمجھاتے ہیں کہ وہ پڑھائی پر دھیان دے اور اسکالر شپ لے کر باہر ملک چلی جائے۔ امرحہ اپنے باقی بہن بھائیوں کی طرح پڑھائی میں کمزور ہے مگر دادا کی بات پر وہ ثابت کرنے کے لیے جدوجہد شروع کر دیتی ہے مگر پھر بھی بہت اچھے نمبر حاصل نہیں کر پاتی۔ اسی دوران اس کی شادی کا سلسلہ چلتا ہے مگر چند روز قبل دولہا کی جوان بہن کے بیوہ ہو جانے پر اس کی شادی رہ جاتی ہے اور اس کی نحوست پر مہر لگ جاتی ہے۔ امرحہ دل برداشتہ ہو کر نیند کی گولیاں کھا کر خودکشی کی کوشش کرتی ہے تاہم بچ جاتی ہے۔ اس واقعہ کے بعد امرحہ کی زندگی مزید تلخ ہو جاتی ہے۔ وہ مختلف بیرون ملک کالج و یونیورسٹیوں کے ہزاروں آن لائن اسکالر شپ فارم بھرتی ہے مگر ہر جگہ سے انکار ہوتا رہتا ہے۔ بالآخر مانچسٹر یونیورسٹی سے اسے اسکالر شپ مل جاتا ہے جو اس یونیورسٹی کی طلبا سوسائٹی اپنے ذاتی فنڈ سے دیتی ہے۔ جس کی رو سے امرحہ کو تیس فیصد ادا کرنا ہوتا ہے۔ باقی ستر فیصد کی ادائی ان کی طرف سے ہوگی۔ اس کے علاوہ وہ ان کی میزبانی کے

مکمل ناول



بعد امرحہ کو اپنی رہائش اور اخراجات کا خود بندوبست کرنا ہوگا۔ یہ سب باتیں اسے برطانیہ پہنچنے کے بعد دائم بتاتا ہے۔ والدہ جی امرحہ کے لیے پیسے اکٹھے کرکے اسے برطانیہ بھجوا دیتے ہیں۔ باقی اسے خود اپنے بل بوتے پر کرنا ہوگا۔ عذرا، شرلی، مینی لو اور للی کول سے اس کی ابتدائی ملاقات ہوتی ہے۔

امرحہ پڑھنے کے ساتھ ساتھ ایک کافی شاپ میں جاب کرنے لگتی ہے اور لیڈی مہر کے گھر اس کی رہائش کا بندوبست بھی ہو جاتا ہے۔ لیڈی مہر بے اولاد خاتون ہیں۔ انہوں نے۔۔۔ شنل کاک نامی اپنے ہاسٹل نما گھر میں مختلف بچوں کو اولاد کی طرح رکھا ہے۔ ان ہی میں ایک عالیان مارگریٹ ہوتا ہے۔ وہیں سادھنا، ویرا اور این اون سے اس کی دوستی ہو جاتی ہے۔ جاب کے دوران ووڈ لک کے ساتھ مل کر ڈاکو منٹری فلم بنانے لگتی ہے۔

اسی دوران امرحہ کے بابا جان کی اعظم مارکیٹ میں قالین کی دکان ہوتی ہے، آگ لگ جاتی ہے جس سے ان کا بیس پچیس لاکھ کا نقصان ہو جاتا ہے۔ انہیں اٹیک ہو جاتا ہے۔ امرحہ انہیں تسلی دیتی ہے اور ڈاکو منٹری فلم سے ملنے والے پیسے ان کے اکاؤنٹ میں ٹرانسفر کروا دیتی ہے۔ اس کے علاوہ لیڈی مہر بھی اسے ایک چیک دیتی ہیں۔ امرحہ وہ رقم بھی پاکستان بھجوا دیتی ہے۔ امرحہ کے والد بہت خوش ہوتے ہیں۔ امرحہ کمرے کی کھڑکی میں کھڑی ہوتی ہے جب عالیان مارگریٹ کسی اسپائیڈر مین کی طرح اس کی کھڑکی میں جھانکتا ہے۔ امرحہ کی چیخ نکل جاتی ہے۔

عالیان بتاتا ہے "یہ اس کا گھر ہے" وہ اس کے کمرے کی کھڑکی سے کود کر باہر نکل گیا۔ تھوڑی دیر بعد گھر میں آوازیں گونجنے لگیں تو سادھنا نے بتایا کہ لیڈی مہر کا بیٹا آیا ہے۔ وہ لیڈی مہر کے کمرے میں گئی تو دیکھا کہ وہ لیڈی مہر کے بیڈ پر بیٹھا انہیں کیک کھلا رہا تھا۔ اسے یاد آیا کہ لیڈی مہر نے ایک بار بتایا تھا کہ ان کا بیٹا بھی اسی کی یونیورسٹی میں پڑھتا ہے اور بہت قابل ہے۔

امرحہ کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ اس کا نام عالیان تھا اور اس کی ماں کا نام مارگریٹ۔ اسے عجیب سا لگا "ناجائز؟"

دوسرے دن لیڈی مہر کی سالگرہ تھی، نوجوان کے بچوں نے بڑے اہتمام سے منائی۔ انہوں نے امرحہ کو عالیان کے بارے میں بتایا کہ انہوں نے اسے ایک ادارے سے لیا تھا اور بڑی تن دہی سے اس کی تربیت کی ہے۔ امرحہ کو افسوس ہوا کہ اس کی اماں نے کبھی بیٹوں کی تربیت پر توجہ نہیں دی تھی۔

ویرا کا ساتھ امرحہ کو احساس دلا رہا تھا کہ عورت بھی بہادر ہو سکتی ہے۔ عالیان کی توجہ نے امرحہ کو ایک عجیب احساس سے دوچار کر دیا۔ وہ لاشعوری طور پر عالیان سے متاثر ہو رہی تھی۔

ہارٹ راک میں امرحہ اور ویرا کی باتیں ریکارڈ کرکے چلانے پر امرحہ ویرا سے ناراض ہو جاتی ہے۔ امرحہ کو شدت سے احساس ہوتا ہے کہ عالیان کے بارے میں یہ سب کہہ کر اس نے اچھا نہیں کیا۔ ہارٹ راک کے باہر امرحہ عالیان کا انتظار کرتی ہے مگر وہ اس سے ٹھیک سے بات نہیں کرتا۔ رات کو عالیان ویرا کو شنل کاک چھوڑ کر جاتا ہے۔ امرحہ کو یہ بات بری لگتی ہے کہ عالیان اپنی سائیکل پہ ویرا کو چھوڑنے آیا۔ ویرا امرحہ کو بتاتی ہے کہ وہ گر گئی تھی۔ اس کے پیر پر چوٹ آئی تھی اس لیے عالیان اسے گھر تک چھوڑنے آیا تھا۔

امرحہ ہمت کرکے عالیان سے ملنے دوبارہ جاتی ہے۔ وہ اسے ٹریٹ میں چاکلیٹ دیتی ہے۔ عالیان حیران ہوتا ہے مگر پھر اس کی ٹریٹ لینے سے انکار کرتا ہے۔ اس پر امرحہ کہتی ہے کہ اگر تم ٹریٹ دو تو میں ابھی بھی تیار ہوں۔ عالیان لاجواب ہو جاتا ہے۔

۵
پانچویں قسط

اسے اس کے پیچھے جانے کی کوئی حاجت نہیں رہی تھی نہ وہ یہ چاہتا تھا کہ وہ اس کے پاس آیا کرے۔ اسے خود کو اس سے دور ہی رکھنا تھا وہ خود کو دور ہی لے گیا تھا لیکن۔۔۔

رات بھر جاگنے کے بعد وہ منہ اندھیرے ہال سے نکل گیا تھا۔ گھٹن کا یہ عالم تھا کہ اسے لگتا تھا زمین و آسمان آپس میں مل رہے ہیں اور وہ ان دونوں کے درمیان دب کر مر جائے گا۔ پہلے وہ ہال کے باغ میں آیا، اس نے اپنا سانس بحال کرنا چاہا، لیکن ایسا نہ کر سکا اور اسے تیز تیز سڑک پر بھاگنا پڑا۔ ہر چیز اسے خوف زدہ کر رہی تھی اس کا دم گھٹ رہی تھی۔ وہ بھاگتا رہا، بھاگتا رہا اور شہر کے اندر ہو کر بھی شہر سے دور نکل گیا۔

اگر وہ کسی سے بھاگ رہا تھا تو وہ کسی اس کے اندر تھا اور اس کسی کو وہ اپنے ساتھ لیے بھاگ رہا تھا۔ وہ کسی ایک مارگریٹ تھی ایک ولید البشر۔ ایک سسکیاں بھرتا ہوا ایک دھتکارتا ہوا۔ دو لوگوں سے بچا میدان حشر تھا اور ہر طرف خون ہی خون تھا۔ مارگریٹ کی معصومیت کا، شدت کا، عقیدت کا، محبت کا۔

آخری چیز کوڑیوں کے مقابل دوسرے پلڑے میں رکھی گئی تھی اور بے وزن رہی تھی۔ اس وقت اسے اپنی ذات سمیت دنیا کے کسی عجوبے سے کوئی دلچسپی نہ رہی۔ اسے کسی عروج، کسی کامیابی، کسی زندگی کی چاہ نہ رہی۔ اپنی ذات کی گہرائی میں اس نے ایک غلام کی حیثیت اختیار کر لی۔ نئے جہانوں کی دریافت کے خواب پست ہوئے۔ یہ خیال ہی اسے دیوانگی لگا کہ اب وہ پہلے کی طرح ٹھیک ٹھیک زندہ رہ سکے گا۔ اس پر ہر خیال گراں گزرا سوائے موت کے خیال کے۔ اس پر وارد ہونے والی چیزوں میں آگے بھی موت رہی اور پیچھے بھی۔ اول بھی آخر بھی۔ ضروری بھی اور اشد بھی۔

وہی سب اس کے ساتھ ہونے لگا جو مارگریٹ کے ساتھ ہوا تھا۔ اپنے بیٹے سے بے تحاشا محبت کے باوجود وہ اس کے لیے زندہ نہ رہ سکی اور ولید البشر سے نفرت کے باوجود وہ اس کے لیے مر گئی۔

اس میں قصور مارگریٹ کا نہیں تھا۔ اس میں قصور اس درد کا تھا جو محبت کی مٹھی میں بند ملتا ہے۔

ایک ہی رات میں یہ درد اس کے وجود کی بیچی میں

تن بدن میں اٹھان ہوا اور وہ اس کیفیت میں آگیا جس میں پل سے چھلانگ لگا دی جاتی ہے، کنپٹی پر پستول رکھ لی جاتی ہے اور ٹریگر دبانے میں تامل نہیں کیا جاتا۔ یا سر کے بالوں کو مٹھیوں میں جکڑ کر در و دیوار سے ٹکریں ماری جاتی ہیں۔ اور دل کے مقام پر مکے مارے جاتے ہیں۔

یہ نقطہ فنا ہوتا ہے۔ بس مٹ جانے کی خواہش اس کا آغاز ہوتا ہے۔

اس نے پل سے چھلانگ لگائی نہ ٹریگر دبا سکا بس آپ فنا یے دیوانوں کی طرح شہر دوڑتے "معلق گھومتے چلتے" عالیان مارگریٹ کو فنا کرتا رہا۔

وہ قبرستان مارگریٹ کے پاس بھی گیا تھا۔ وہ وہاں مارگریٹ کے مرنے کے بعد پہلی بار خود چل کر گیا تھا۔ کڈز سینٹر میں قبرستان جانے کا انتظام کیا جاتا تھا لیکن وہ سختی سے انکار کر دیا کرتا تھا۔ اسے اس مارگریٹ کے پاس نہیں جانا تھا جو اب تابوت میں تھی۔ کیا تھا اگر وہ اس ایک کمرے کے گھر کے تابوت میں خود کو زندہ مردہ رکھنے پر قدرت رکھ لیتی۔ اب وہ اس کے پاس آیا تھا تو اس کے ہاتھ میں پھول نہیں تھے لیکن آنکھوں میں آنسو بہت تھے۔

مارگریٹ کی قبر کو ہتھیلی سے مسلتے اس کے اپنے اندر سے کچے گوشت کے دھیمی آنچ پر جلنے کی بساند آنے لگی۔ اس نے خود کو سونگھا۔ پاگلوں کی طرح سونگھا۔ وہ تو مارگریٹ بن رہا تھا۔ اسے خوف آیا۔

خوف سے وہ وہاں سے بھاگا۔

اسے مارگریٹ تو نہیں بننا تھا جبکہ وہ مارگریٹ ہی بن رہا تھا یعنی وہ مارگریٹ سے ملنے نہیں اس کے تابوت میں جگہ لینے گیا تھا۔

وہ مانچسٹر سے دور ہو گیا۔ اس نے زمین کی حدود سے نکل جانا چاہا۔ وہ بے سمت سفر کرتا رہا۔ وہ ایک ہی ٹرین میں ایک ہی نشست پر دن بھر، رات بھر بیٹھا رہتا۔ وہ کسی بھی ایک شہر کی ایک ہی سڑک پر گر دونوں بار چکراتا رہتا۔

پہاڑی کے گنڈے کی طرح۔ چلتا تو چلتا ہی رہتا رکتا

فراموش کر دیتا، بیٹھتا تو صدیاں گزار دیتا۔۔۔ وہ فیصلے کی کیفیت میں تھا نا نتیجے کی۔۔۔ وہ آر تھا نا پار۔۔۔ بس وہ گم ہو چکا اور خود کو ڈھونڈنے کی رتی برابر کوشش نہ کرتا ہوا عالیان تھا۔ جیسے اس پر سب آشکار ہو چکا تھا اور وہ سب سے انجان بھی تھا۔

"دیکھو میں کود جاؤں گی ولید۔۔۔ ہاں میں کود ہی جاؤں گی۔۔۔ آکر مجھے روک لو۔۔۔ لو میں کود رہی ہوں۔۔۔ تو ولید آجاؤ۔"

آخری سفر سے پہلے آخری جملوں میں سے ایک یہ جملہ بھی تھا۔ وہ سہم کر مارگریٹ سے لپٹ جاتا کہ وہ اٹھ کر بھاگ نہ جائے اور کود نہ جائے۔

اور وہ زندگی کے اس طرف کود ہی گئی۔

اور زندگی کے اس طرف اس کا بیٹا بیٹھا تھا۔ لندن برج پہ۔

مارگریٹ کو لندن برج پسند تھا ان دونوں کی آخری تصویر وہیں لی گئی تھی۔ کود جانے کا خیال اس کے ذہن میں بھاگ دوڑ رہا تھا۔۔۔ وہ ایک بینچ پر بیٹھا تھا۔

"تم یہاں بیٹھو میں تمہارے لیے کچھ کھانے کو لاتی ہوں۔"

ایک افریقی عورت کی مشقت زدہ اور تھکی ہوئی آواز آئی وہ ایک آٹھ سالہ بچے کو اس کے پاس بٹھا کر خود چلی گئی بچہ لاغر اور بیمار سا تھا 'ماں کو دور جاتے دیکھتے رہنے کے بعد اس نے اپنے قریب رکھے تھیلے کو کھولا اور اس میں سے کسی قدر عقیدت سے تین گھوڑوں کا گول گول گھومنے والا کھلونا نکالا۔

کھلونا کافی خستہ حال اور ٹوٹا پھوٹا سا تھا۔ بچے نے انگلی کو ایک گھوڑے کی اگلی ٹانگوں میں پھنسا کر اسے گول گھما دیا۔ تینوں گھوڑے آگے پیچھے بھاگنے لگے اور گھوڑوں کے ٹاپوں اور ہنہنانے کی آوازیں کھلونے میں سے نکلنے لگیں۔

بچہ ایسے مسکرانے لگا جیسے کسی ایک گھوڑے پر وہ خود سوار ہو۔۔۔ سب سے آگے والے پر۔۔۔ گھوڑوں کے ساتھ اس کی مسکراہٹ دوڑنے لگی۔ بچے کے ننھے سے قہقہے نے عالیان کو متوجہ کیا پھر اس کی جاندار مسکراہٹ نے۔ بچہ ساری دنیا سے بے نیاز گھوڑوں کو دوڑا رہا تھا۔

"تم انہیں دوڑانا چاہتے ہو؟" بچے نے اجنبی کی نظریں خود پر محسوس کر کے اسے اپنا خزانہ استعمال کر لینے کی اجازت دینی چاہی۔

"یہ دیکھو' یہ ایسے چلتا ہے۔" اس نے گھوڑے کی اگلی ٹانگوں کو پکڑ کر گھمایا۔

"اور سنو ان کی آوازیں کتنی پیاری ہیں۔۔۔ میں نے کبھی اتنی پیاری آوازیں نہیں سنیں تم نے بھی نہیں سنی ہوں گی۔" کھلونا اس نے عالیان کے بینچ کے قریب کیا اور یہ سب کرتے وہ ایسے پرجوش سا تھا کہ ایک اجنبی اس کے کھلونے سے متاثر ہو چکا ہے۔

عالیان نے بچے کو ایسے دیکھا کہ وہ ان دنوں ہر چہرے کو دیکھ رہا تھا کہ یہ سب کیوں زندہ ہیں۔۔۔ کیا انہیں نہیں مرنا۔

اسی پل اس کے اندر کسی قوت نے اسے اکسایا کہ وہ بچے سے مکالمہ کرے اور پھر اس مکالمے پر وہ خود کو آر یا پار کرے۔۔۔ یہ قوت اتنی شدت سے اس کے اندر جاگی کہ اتنے دنوں سے ایک لفظ بھی منہ سے نکلنے کی زحمت نہ کرتے عالیان نے خود کو بولتے پایا۔ اس نے بچے کے ہاتھ سے کھلونا لے لیا۔

"یہ تو ٹوٹا ہوا ہے۔" اس نے قدرے سفاکی سے کہا۔

بچے کا بیمار چہرہ پھیکا سا پڑا اور اسے اپنی پیاری چیز کے لیے ایسے کلمات پر صدمہ پہنچا۔

"نہیں' یہ بالکل ٹھیک ہے۔" اس نے اس انداز میں کہا کہ دنیا کا کوئی انسان اسے جھٹلا نہیں سکتا تھا۔

"دیکھو' اس گھوڑے کی دم نہیں ہے۔۔۔ اس والے کا سر نہیں ہے۔ اور اس گھڑ سوار کا بازو ٹوٹا ہوا ہے۔"

اس بات سے اسے اور صدمہ ملا لیکن اس نے ایسا انداز اپنا لیا کہ وہ اس بات کے خلاف بھی ڈٹ کر دکھا

سکتا ہے۔

"اس سے فرق نہیں پڑتا۔۔۔ یہ گھوڑے پھر بھی دوڑتے ہیں۔" اس نے اس انداز میں ہنس کر کہا جیسے عالیان پاگل ہو۔

عالیان پاگل ہی تھا۔ وہ بچے کی بات پر سن ہو گیا۔

"اس سے فرق نہیں پڑتا۔ یہ گھوڑے پھر بھی دوڑتے ہیں۔" یہ گونج اس کے کانوں کے پردوں سے کہیں اندر آگئی۔ بہت دور تک۔۔۔

بچے نے جو فلسفہ اپنا رکھا تھا وہ فلسفیوں کے بس کی بات نہ تھی۔

"اگر ان سب گھوڑوں کی ٹانگیں ٹوٹ جائیں۔۔۔ سر بھی۔۔۔ اور سب گھڑ سوار مر جائیں تو؟" اس کی آواز کانپ رہی تھی۔

"یہ پھر بھی دوڑیں گے میں انہیں دوڑاؤں گا اور گھڑ سواروں کو میں مرنے نہیں دوں گا۔" بچے نے انقلاب برپا کر دینے والے انقلابی کے سے انداز میں ہاتھ کی مٹھی کو ہوا میں لہرا کر کہا۔

"یہ دیکھو۔" اس نے ایک گھڑ سوار پر انگلی رکھی۔ "یہ ٹوٹ کر گر چکا تھا۔ تمہاری زبان میں یہ مر چکا تھا۔ میں نے اسے گھوڑے کی پیٹھ پر رکھ کر باندھ دیا۔۔۔ تم غور کرو گے تو بھی تمہیں وہ باریک مضبوط دھاگہ دکھائی نہیں دے گا جس سے میں نے اس گھڑ سوار کو باندھا ہے۔ کرو غور ڈھونڈو دھاگہ۔"

عالیان نے غور کیا وہ دھاگے کو ڈھونڈ نہ سکا۔ بچہ اس معاملے میں اپنے فن کی بلندیوں پر رہا تھا۔

"میں نے کہانا میں گھڑ سواروں کو مرنے نہیں دوں گا۔۔۔ میں انہیں زندہ رکھنا جانتا ہوں۔۔۔ یہ گھوڑے کی پیٹھ پر ہمیشہ موجود رہیں گے۔" بچے نے آخری معرکہ بھی سر کر لینے والے سپہ سالار کی آواز کی کھنک کی طرح کھنک کر کہا۔

"میں نے کہانا میں گھڑ سواروں کو مرنے نہیں دوں گا' میں انہیں زندہ رکھنا جانتا ہوں۔" یہ فقرہ عالیان کے اندر آسمان پر نکلنے والی دھنک کی طرح پھیل گیا۔

"اور اس کی چابی۔۔۔ یہ بھی ٹوٹی ہوئی ہے۔" اس کے اندر چھپ کر بیٹھے پرانے عالیان نے دعا کی کہ کاش بچہ اسے لاجواب کر دے۔

بچے نے فاتح کی سی جو ہوتی مسکراہٹ کو اپنے ہونٹوں پر سجا لیا۔

"اس کی چابی ہے میرے پاس۔۔۔ جو کبھی نہیں ٹوٹے گی۔۔۔ یہ دیکھو۔" اس نے وہ انگلی جو وہ گھوڑے کی ٹانگوں میں اڑس کر انہیں دوڑاتا رہا تھا اٹھائی۔

"یہ ہے اس کی چابی۔۔۔ میں ہوں اس کھلونے کی چابی۔" یہ کہہ کر اس نے گھوڑوں کو اس عظیم چابی کے ذریعے پھر سے دوڑایا اور مایوسی کے میدان میں امید کے گھڑ سوار دوڑنے لگے۔۔۔ اس نے اسے لاجواب کر دیا تھا۔

بچے نے منہ کھولا اور دریا کو اگل دیا۔۔۔ کیونکہ انسان پر یہ جائز نہیں کہ اپنے اندر وہ اسے جگہ دے۔ اس آب فنا کا چشمہ اس پر حرام کیا گیا ہے۔۔۔ حرام تر۔۔۔ ایک بچہ بھی جانتا ہے ٹوٹے ہوئے کھلونے کو کیسے چلایا جائے گا۔

"میں ہوں اس کی چابی۔" گھڑ سوار مقابلے کے جوش سے للکار اٹھے۔ گھوڑوں کی ٹاپوں نے دلدلی جنگلوں کو بھی پچھاڑ ڈالا۔۔۔ ان پر انسان سوار تھے۔۔۔ وہ انسان جو بزدلی اور کم ہمتی کے سمندروں کو بھی پاٹ جاتے ہیں۔

"گھوڑے کو گرنے نہ دو۔۔۔ گھوڑ سوار کو مرنے نہ دو۔" اقوال یاد کر کے زندگی گزارنے کی کوشش کرتی مارگریٹ کو کاش کوئی یہ فلسفہ سکھا دیتا۔۔۔ اور اب وہ زندہ ہوتی اور اس کا بیٹا پل کے دہانے پر نہ بیٹھا ہوتا۔

"جو انسان روتا ہے وہ آسمانی فرشتوں کو رنجیدہ کرتا ہے۔"

"فرشتے کیوں رنجیدہ ہوتے ہیں ماما؟"

"انسان کو رونے کے لیے نہیں بنایا گیا۔۔۔ اس پر اشرف ہونے کا تاج سجایا گیا ہے اس تاج کو سجا کر انسان روئے گا تو رنجیدہ ہی کرے گا نا۔ انہوں نے انسان کی تخلیق دیکھی ہے اور وہ یہ کیسے فراموش کر سکتے ہیں کہ انسان کو وہ علم و حکمت عطا کی گئی جو انہیں

نہیں دی گئی۔ اگر انسان وہ منظر دیکھ لے جب کائنات کا رب اس کی تخلیق کا فیصلہ کرتا ہے اور نطفے میں جان ڈالتا ہے اور اسے پروان چڑھاتا ہے اور لوح پر اس کا نام لکھا جاتا ہے اور فرشتوں کو اس بندے کے لیے ذمہ داریاں سونپی جاتی ہیں تو انسان صرف اور صرف اپنے مقصد حیات کے لیے جدوجہد کرے۔ وہ دکھ پر صبر کرے نعمت پر شکر کرے۔ وہ زندگی کو با مقصد بنانے کو بندگی جانے۔ رتبوں میں سب سے پہلا رتبہ تخلیق میں لائے جانے کا ہوتا ہے اور ہر تخلیق پا جانے والے کو اس رتبے پر فخر و شکر کرنا چاہیے۔"

ماما مہر نے اسے اپنی گود میں بٹھا کر کہا تھا۔ اسے یاد تھا۔ اسے وہ بھول گیا تھا تو ہی اس حالت میں بیٹھا تھا۔

"زندگی میں جو جذبہ آپ کو برباد کرنے لگے اس جذبے سے دور ہو جائیں۔ کیونکہ انسان کو یہ نہیں بھولنا چاہیے کہ اس کی تخلیق کا فیصلہ خدا نے کیا ہے۔ وہ اپنا خدا خود نہیں بن سکتا وہ خود کو برباد نہیں کر سکتا۔"

بچے کی پیشانی چوم کر عالیان وہاں سے اٹھ آیا۔ اسے مارگریٹ نہیں بننا تھا۔ اس کے پیچھے بچے گھوڑے دوڑا رہا تھا۔ ساز بجا رہا تھا۔ کیونکہ اس کھلونے کی چابی وہ خود تھا۔ اور وہ گھڑ سوار اس وقت تک نہیں گر کر مریں گے جب تک وہ چابی سلامت تھی۔

زندگی کھیل نہیں ہے۔ زندگی میدان ہے۔ ابد کا میدان۔ اور ابد کی زندگی کے لیے۔ گھوڑے گرنے نہ دیں۔ گھڑ سوار کو مرنے نہ دیں۔ یہ فرض ہے ورنہ انسان اشرف ہونے کا شرف کھو دے گا یہ حقیقت ہے۔

وہ مانچسٹر واپس آیا تو رات ہو چکی تھی وہ اپنی جاب پر ہارٹ راک آ گیا۔

"مجھ سے کچھ نہ پوچھنا۔" کارل نے اس کی آ کر گردن دبوچ لی تھی۔

"دوبارہ ایسے غائب نہ ہونا۔" اسے ایک گھونسا جڑ کر اس نے چلا کر کہا تھا اور آج رات کو کارل اسے زبردستی سڑک پر گھسیٹ لایا تھا۔ دونوں مٹر گشت کرنے لگے۔ آتے ہوئے کارل ایک ہاف میٹ کا پیزا اٹھا لایا تھا جو وہ اپنے کمرے میں "اکیلا" چھوڑ کر خود ذرا سی دیر کے لیے اِدھر اُدھر ہو گیا تھا۔

تمہارا اب تک ٹھیک ہونے کا ارادہ ہے۔" پیزا کو سونگھ سونگھ کر کھاتے اس نے بھرے ہوئے منہ سے پوچھا۔

"نہیں ٹھیک ہوں۔"

"تم اپنے ٹھیک ہونے کے بارے میں مجھ سے زیادہ نہیں جان سکتے۔ جب تم چھوٹے تھے تب تم ایسے ہوا کرتے تھے۔"

"ٹھیک ہے۔ ابھی میں پورا ٹھیک نہیں ہوں۔"

"چلو پھر یہ بتاؤ پورے ٹھیک کب تک ہو جاؤ گے۔"

"زندگی ایک عجیب مضمون ہے کارل۔"

"بالکل نہیں! زندگی ایک خالی مضمون ہے یہ مضمون پڑھا جانے والا نہیں لکھا جانے والا ہے اسے ہم لکھتے ہیں 'یہ زندہ دل ہو گا' 'رنگین یا کامیاب' یہ ہم طے کرتے ہیں 'یہ مشکل ہو گا' 'بے کار یا فضول' یہ بھی۔ اس کا عنوان ہم ہیں "میں کارل" "تم عالیان" مجھے دیکھو کیا تم نے مجھے کبھی روتے ہوئے دیکھا ہے۔ میں نے خود کو خود کبھی روتے ہوئے نہیں دیکھا اسپنسر میں جس دن تم سے شرارت کی تھی تمہاری روتی شکل دیکھ کر کی تھی ورنہ تم جیسے تھے ویسے بچے مجھے پسند نہیں تھے تم میرے مزاج کے نہیں تھے۔"

"جانتا ہوں۔"

"میری سمجھ میں نہیں آ رہا میں تمہارے ساتھ اتنا اچھا کیوں بن رہا ہوں پر سنو۔ ایک دن چرچ میں سروس کے بعد فادر نے مجھے روک لیا میں خاموش اور اداس رہا کرتا تھا کلاس میں چھوٹا تھا میں اس وقت۔ وہ کئی بار مجھے سمجھا چکے تھے کہ زندگی کو ایسے اداس ہو کر نہ گزاروں۔ اس دن انہوں نے میرے سامنے ایک

گلاس توڑا گلاس گر کر ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا۔ انہوں نے مجھ سے پوچھا کہ کیا میں ان ٹکڑوں پر ننگے پاؤں چلنا چاہوں گا۔ میں نے انکار کر دیا۔ انہوں نے کہا کہ دکھ ٹوٹا ہوا گلاس ہے کرچیاں اور ٹکڑے۔ ان پر چل کر ہم خود کو زخمی ہی کر سکتے ہیں بس جو ہو چکا ہے اسے بدلا نہیں جا سکتا۔ گلاس ٹوٹ چکا ہے اب کچھ نہیں ہو سکتا 'ٹوٹے ہوئے گلاس کو اٹھاؤ اور باہر پھینک دو' اس کی کرچیوں پر خود کو گھسیٹتے رہنے کی کوئی ضرورت نہیں 'یہ کم عقلی اور بے وقوفی ہے جبکہ انسان سے ارفع توقعات وابستہ کی جاتی ہیں۔' کارل سارا پزا کھا چکا تھا اور خالی ڈبہ ڈسٹ بن ڈھونڈ کر اس میں ڈال چکا تھا۔

"یہ سب باتیں کر کے میں نے یہ بھی ثابت کر دیا ہے کہ میں تم سے زیادہ سمجھ دار اور بہادر ہوں۔"

عالیان خاموش ہی رہا۔

"اگر تم اس کی وجہ سے اپ سیٹ ہو تو میں اسے بوتل سے نکلوا سکتا ہوں۔" کارل نے سنجیدگی سے کہا۔

"اور تمہیں اس کی ٹویٹ لے لینی چاہیے تھی۔ لے کر مجھے دے دیتے۔"

"کسے نکلوانے کا کہہ رہے ہو؟"

"امرحہ کو۔" کارل کو حیرت ہوئی اس کے انداز پر

"کون امرحہ؟"

کارل خاموش اسے دیکھتا رہا پھر کندھے اچکا دیے۔ "کون امرحہ۔ دلچسپ۔"

"تم کس بارے میں بات کرنا چاہ رہے ہو کارل؟"

"ٹھیک۔ بات نہیں ختم۔ بلکہ سب ختم۔ پھر تم پہلے جیسے کیوں نہیں ہو رہے ایسا لگتا ہے تمہاری کھال میں کوئی اور چل پھر رہا ہے۔" کارل نے اس کی ناک کی چٹکی لی۔

"عالیان کی کھال میں عالیان ہی ہے۔" عالیان نے اس کے دونوں کانوں کو ایک ساتھ مروڑا۔

"خود کو دو ہو کیوں رہے ہو؟"

"ایک دوڑ ہو جائے۔؟" عالیان نے پیش کش کی۔

کارل نے جاندار قہقہہ لگایا "بات بدل رہے ہو؟"

"چار۔ تین۔ دو۔" عالیان نے انگلیاں اٹھائیں۔

"ایک۔" کارل چلایا اور بھاگ کھڑا ہوا۔ عالیان بھی۔

اب بس یہی حل تھا۔ بھاگتے پھرنا۔ آنکھیں بھیچ لینا۔ کانوں میں انگلیاں ٹھونس لینا۔ راستہ بدل لینا۔ غیر حاضر ہو جانا۔ غیر ہی بنے رہنا۔ مشکل تھا مشکل سے ہی ہو رہا تھا۔

ابھی ان کی دوڑ ہاف سے ذرا دور ختم ہی ہوئی تھی اور کارل جیت گیا تھا کہ ایک پاؤں میں اپنا اور ایک میں کسی دوسرے کا جوتا پہنے شاہ ویز کارل کے سامنے آیا۔ اتفاق سے اس کے دائیں ہاتھ میں باکسنگ گلوز تھا۔

"میرا پزا تم نے کھایا ہے؟" وہ باکسنگ رنگ میں آیا۔

"نہیں تم سے کس نے کہا۔؟" کارل پر سارے جہان کی معصومیت بھی تھی۔

"تمہارے چیکیلے ریکارڈ نے۔ اب شرافت سے میرا پزا واپس کرو۔"

کارل نے پورا جبڑا کھول دیا "دیکھو کیا اس میں سے تمہارا پزا ہو کر گزرا ہے۔"

شاہ ویز نے منہ پھیر لیا اور ناک پکڑ لی۔ "یہ باکسنگ گلوز تم دیکھ رہے ہو نا اور تم جانتے ہو عامر خان میرا پسندیدہ باکسر ہے۔ تم مجھے اکسا رہے ہو کہ میں اسے اسی سڑک پر خراج تحسین پیش کروں۔" اس نے باکسر کی طرح اچھل اچھل کر کہا۔

"ڈڈی تم عالیان سے پوچھ لو۔ میں نے تو دو ہفتوں سے پزا کی شکل نہیں دیکھی۔"

"جبکہ ان دو ہفتوں میں پورے دس پزا ہال سے غائب ہوئے ہیں۔" شاہ ویز نے دائیں ہاتھ کو لہرا کر کہا۔ کارل نے اس سے اپنی ناک بچائی۔

"اس نے ہی پزا کھایا ہے۔" عالیان نے کہا۔

کارل کو ذرا حیرت نہیں ہوئی اسے عالیان سے یہی

توقع تھی۔ شاہ ویز نے ہاتھ پھر لہرایا' مکا مارنے کے لیے نہیں بلکہ کسی متوقع آمد کی خبر دینے کے لیے۔

"جو Testoni کے جوتے تم نے مارک کو رینٹ پر دیے تھے میں احتیاطاً" انہیں اس کی وارڈ روب سے نکال کر اپنی وارڈ روب میں لاک کر آیا ہوں۔"

عالیان پاگلوں کی طرح ہنسنے لگا کہ اب کارل تم کیا کرو گے۔ کارل خاموش سا شاہ ویز کو دیکھنے لگا' اس کے جوتے پرانے ملتے تھے۔

"اب تم پرانے آنا اور جوتے لے جانا جب تک پرا نہیں آئے گا' گھنٹہ جوتوں پر ہرجانہ بڑھتا جائے گا۔ ایک گھنٹے بعد آنے کی صورت میں' میں دونوں جوتے استعمال کر کے تمہیں دوں گا۔ اور میں یہ بتادوں کہ انہیں پہن کر میں فٹ بال کھیلنے کا ارادہ رکھتا ہوں۔" شاہ ویز نے خلائی مسکرا کر کہا۔

"Hmm..." کارل نے شاہ ویز کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔

"پچھلے ہفتے تم نے جیری کو اپنا ونڈی کیم استعمال کے لیے دیا تھا۔ جیری اتنا لاپروا ہے کہ اسے اسٹڈی ٹیبل پر ہی رکھتا ہے۔"

کارل نے تیزی سے کہا اور ہال کی طرف دوڑ لگادی جب تک شاہ ویز کو بات سمجھ میں آئی تھوڑی سی دیر ہو چکی تھی پھر بھی وہ کارل کے پیچھے تیزی سے بھاگا لیکن کارل ہال کا داخلی دروازہ پار کر چکا تھا۔

"اور میں یہ بتادوں کہ میں ونڈی کیم کو نہلانے کا ارادہ رکھتا ہوں۔" کارل نے بھاگتے ہوئے چلا کر کہا۔

عالیان نے بھی دونوں کے پیچھے بھاگنا مناسب سمجھا کیونکہ اس کا ارادہ شاہ ویز کی مدد کرنے کا تھا۔

☼ ☼ ☼

اسلامی اسٹوڈنٹ سوسائٹی اسلام کو لے کر ایک ڈاکومنٹری بنوا رہی تھی جس کا ذمہ ڈیرک کو دیا گیا تھا۔ ڈیرک نے ظاہر ہے امرحہ کو بھی ساتھ کام کرنے کی پیش کش کی جو امرحہ نے قبول کرلی۔ ڈاکومنٹری کا موضوع مختلف مذاہب کے اسٹوڈنٹس کے خیالات جاننا تھا جو وہ اسلام کے لیے رکھتے تھے۔

ڈیرک اور اس نے مل کر سوالات لکھے۔ انہیں کم سے کم چالیس اسٹوڈنٹس سے سوالنامے کے جوابات لینے تھے۔ ڈاکومنٹری کا دورانیہ بیس منٹ تھا۔ ریکارڈنگ کے لیے انہوں نے مختلف اسٹوڈنٹس سے رابطے کرلیے تھے۔

کچھ ریکارڈنگ یونیورسٹی کیمپس میں کی جانی تھی کچھ یونی کے باغ میں' اسٹوڈنٹس ہالز اور کچھ قریبی کیفے اور سڑک پر۔

ریکارڈنگ شروع ہوئی تو تقریباً سب نے ہی ان کے ساتھ تعاون کیا اپنے خیالات کے اظہار کے لیے آزاد تھے اور وہ آزادانہ ہی اظہار کرتے تھے۔ کچھ اسٹوڈنٹس کے تاثرات کافی منفی اثرات لیے ہوئے تھے کہ امرحہ سختی سے اپنے لب بھینچ لیتی اسلام کو لے کر اتنی غلط فہمیاں پروان چڑھ چکی ہیں اس کا اسے اندازہ نہیں تھا۔ مغربی لوگ حالات سے باخبر رہتے ہیں یہ ایک سچ ہے لیکن اس سے بھی بڑا سچ وہ میڈیا ہے جو انہیں اپنی مرضی کے جھوٹ سچ دکھاتا ہے۔ ایک اسلامی ملک پاکستان میں میڈیا کی لگامیں کسی کے ہاتھ میں نہیں ہیں تو کسی دوسرے ملک کے بارے میں کیا کہا جاسکتا ہے۔

سب سے بڑی حقیقت تو یہ ہے کہ اسلام کے خلاف جتنی بھی غلط فہمیاں یا پروپیگنڈہ ہوچکا ہے اس کو لے کر مسلم امہ نے کوئی لائحہ عمل نہیں بنایا۔ جو بنایا ہے' وہ بہت کمزور ہے۔ ہونا تو یہ چاہیے کہ مسلم امہ مل بیٹھ کر اس بارے میں سوچے اور کچھ کرے۔ کچھ تو... کہ اسلام پر لگے دہشت گردی کے الزام سے چھٹکارا حاصل کیا جائے۔

لیکن ہو یہ رہا ہے کہ سب بیٹھے تو ہیں لیکن مل کر نہیں' شخصی سطح پر بہت کیا جارہا ہے لیکن ایک قوم کی حیثیت سے کچھ بھی نہیں یہی وجہ ہے کہ وہ سیاہ دھبہ دن بدن پھیلتا ہی جارہا ہے گھروں میں بیٹھے' ہاتھوں میں فون لیے ہم صرف اسلام کے خلاف ہونے والے پروپیگنڈے کے خلاف لمبے لمبے کمنٹس ہی کرسکتے ہیں یا مختلف گروپس اور صفحوں پر لڑسکتے ہیں' یہ ہے ہمارا سارے کا سارا جہاد اور یہ ہے ہماری اسلام کے حق میں جنگ۔ کافی کے مگ سے کافی پیتے۔ اسلام' اسلام کرتے۔ اسلام کے حق میں پوسٹ شیئرز کرتے' تصویریں اپ لوڈ کرتے اور زیادہ ہو تو پروفائل پکچر تبدیل کرتے۔

"اسلام کے لیے خدمت تمام ہوئی۔" لاگ آف ہوئے اور سوگئے' یا ٹی وی آن کرلیا۔ جاپانی اور جرمن دوسری جنگ عظیم میں مفتوح رہے تھے یہ ماضی ہے' جاپانی اور جرمن ترقی کے ہر میدان کے فاتح ہیں۔ یہ حال ہے۔"

"ہر قوم خود پر ٹوٹنے والے افتاد سے سبق سیکھتی ہے اس افتاد سے چھٹکارا حاصل کرلیتی ہے۔ مسلم قوم کیوں نہیں؟"

جنگ عظیم دوم کے دوران جاپانیوں کو وحشی اور درندے کہا گیا۔ اور اب... اور آج دنیا میں انہیں "دنیا کی امن پسند قوم" کی صف میں سب سے آگے کھڑا کیا جاتا ہے۔ دنیا کا کوئی انسان ایک جاپانی سے زیادہ امن پسند نہیں ہوسکتا۔

"تقدیریں بدل جاتی ہیں اگر قومیں بدل جائیں اور قومیں صرف اسی وقت بدلتی ہیں جب ان کی سوچ بدلے... اور سوچ اس وقت روشن ہوتی ہے جب جہالت کا اندھیرا چھٹ جائے... اور جہالت کا اندھیرا تو چودہ سو سال پہلے قرآن کی تکمیل سے مٹ چکا ہے۔ اس مٹائے گئے اندھیرے کے بعد بھی ہم جاہل ہی رہیں تو تف ہے ہم پر... پھر بھی ایک قابل فخر قوم نہ بن سکیں تو "خسارے میں ہیں ہم... قوموں میں قوم نہ کہلائیں جائیں تو "بدنصیب" ہیں ہم۔"

"اندھے گونگے اور بہروں کے لیے کوئی وعدہ نہیں ہے' کامرانی کا نہ شجاعت کا۔"

پال کا تعلق یونان سے تھا' وہ تقریباً" اولڈ سب ہی مشہور تھا' یونیورسٹی میں وہ اپنے تیز مزاج کی وجہ سے جانا جاتا تھا' اسے تخریبی ذہن کا مالک بھی کہا جاتا تھا۔ ڈاکومنٹری کے لیے جب اسٹوڈنٹس سے رابطے کیے گئے تو اس نے ڈیرک سے ریکارڈنگ کی خواہش کا اظہار کیا۔ کیمرہ آن ہوتے ہی اس نے اسلام کو لے کر انتہائی شدت پسندانہ خیالات کا اظہار شروع کردیا۔ ڈاکومنٹری کے لیے آزادی رائے کی اجازت دی گئی تھی' لیکن اس کا مطلب یہ بھی نہیں تھا کہ ایسا گرا ہوا انداز اپنایا جاتا۔

ریکارڈنگ Oak ہاؤس کے باغ میں کی جارہی تھی۔ ڈیرک نے کیمرہ بند کردیا تو وہ ضد کرنے لگا کہ اسے آزادی رائے کا حق پوری طرح سے استعمال کرنے دیا جائے۔

"تمہارا انداز مناسب نہیں ہے۔" ڈیرک نے تحمل سے کہا۔

"کیوں! میرے انداز کو کیا ہوا ہے؟" وہ چڑ گیا۔

"تم الزامات لگا رہے ہو۔"

"کیا الزام لگایا ہے؟"

"مجھے تم سے بحث نہیں کرنی۔" ڈیرک نے بات ختم کی۔

"تم میری بے عزتی کررہے ہو؟" وہ بلاوجہ غصے میں آگیا۔

"اور تم جو اتنی گھٹیا زبان کا استعمال کررہے ہو... شکر کرو۔ میں نے تمہارا منہ نہیں توڑ ڈالا۔" امرحہ بولے بغیر رہ نہ سکی جبکہ ڈیرک نے اسے خاموش رہنے کے لیے کہا تھا۔

پال اور بھڑک اٹھا کہ گالیاں دینے لگا اور امرحہ کو مخاطب کرکے اسلام کی ہتک کرنے لگا۔

ڈیرک نے امرحہ کو چلنے کا اشارہ کیا لیکن امرحہ ہلی نہیں۔

"مجھے سن لینے دو اس کی بکواس۔" امرحہ غصے میں چلائی۔

"اس کی ضرورت نہیں ہے امرحہ! چلو... عقل سے کام لو۔"

لیکن امرحہ نے عقل سے کام نہیں لیا اور وہ پال کی بکواس سنتی رہی۔

"امرحہ! خدا کے لیے چلو۔" ڈیرک منت کرنے لگا

وہ امرحہ کا سرخ ہوتا چہرہ دیکھ رہا تھا۔
"جاہلوں سے بحث نہیں کرتے امرحہ!" ڈیرک نے اسے سمجھانا چاہا۔
"یہ یونیورسٹی اسٹوڈنٹ ہے جاہل نہیں۔" امرحہ غصے سے بولی۔
"تم یہاں سے چلو بس۔"
پال مسلسل الٹی سیدھی باتیں کر رہا تھا اس سے ایسے سوال پوچھ رہا تھا، جن کے جواب میں خاموش رہا جا سکتا تھا یا اس کے منہ پر تھپڑ مارے جا سکتے تھے اور جب اس نے مقدس ہستیوں کو لے کر زہر اگلا تو امرحہ نے یکدم اس کے منہ پر کس کر ایک چانٹا دے مارا۔
"بکواس بند کرو اپنی ذلیل انسان۔" امرحہ کی برداشت کی حد ختم ہو گئی تھی۔
ڈیرک ایک دم سے پال اور امرحہ کے درمیان آیا۔
"امرحہ! بھاگو یہاں سے۔" ڈیرک چلایا۔ پال کسی بھینسے کی طرح بے قابو ہو رہا تھا۔ کچھ دوسرے اسٹوڈنٹس ڈیرک اور پال کی طرف بھاگے جو گتھم گتھا ہو رہے تھے۔ پال امرحہ کی گردن دبوچ لینا چاہتا تھا۔
امرحہ زرد سی ہو گئی اور تیزی سے وہاں سے چلی گئی۔
ذرا سی دیر میں صورت حال بدل گئی تھی۔ اور انتہائی خوفناک صورت حال اختیار کر گئی تھی۔ اس نے یونیورسٹی کے ایک اسٹوڈنٹ کو تھپڑ مار دیا تھا صرف اس ایک تھپڑ کو لے کر پال اسے یونی سے نکلوا سکتا تھا۔
امرحہ گھر آ گئی۔ ویرا سے رابطہ نہیں ہو رہا تھا۔ دو گھنٹے بعد ڈیرک کا اسے فون آیا وہ اسے اسٹوڈنٹ یونین کے دفتر آنے کے لیے کہہ رہا تھا۔ وہ یونین کے آفس آ گئی۔ ڈیرک نے "فوراً" سے پہلے معاملہ یونین کے سپرد کر دیا تھا۔
ساری صورت حال صرف ایک اسٹوڈنٹ کے خلاف جانے والی تھی "امرحہ کے" ڈیرک اسے منع بھی کر رہا تھا کہ پال کو بولنے دے اور وہ وہاں سے چلی جائے لیکن امرحہ سے اپنا غصہ دبایا نہیں جا سکا اس نے پہلی بار براہ راست ایسا کچھ سنا تھا وہ بھی اپنی ہی یونی کے اسٹوڈنٹ کے منہ سے۔
یونین کے صدر، اسلامی سوسائٹی کے صدر اور پاکستانی سوسائٹی کے صدر نے ان تینوں سے پہلے الگ الگ بات کی۔ پھر اسٹوڈنٹ یونین کے چند دوسرے نمائندوں لیکن بہت ہی سمجھ دار اسٹوڈنٹس کی موجودگی میں میٹنگ کی گئی۔



یونین کے صدر جے پیٹرسن نے امرحہ کے عمل کو سخت ناپسند کیا۔
"وہ بکواس کر رہا تھا۔ میں برداشت نہیں کر سکی۔" امرحہ کو جے پیٹرسن کے رد عمل پر اور غصہ آیا۔
"بہر حال اس نے اپنی زبان کا استعمال کیا۔ آپ نے ہاتھ کا۔ آپ کا رد عمل سنگین ہے۔ آپ جانتی ہیں اب پال چاہے تو وہ آپ کو یونیورسٹی سے نکلوا سکتا ہے۔"
"معافی۔ اگر اس نے دوبارہ بھی ایسی بکواس کی تو میں اس کا منہ توڑ دوں گی۔" میٹنگ میں موجود ایک شخص نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔
"آپ اپنے مذہب کے کس اصول کے تحت اس کا منہ توڑ دیں گی۔" عالیان اس سے پوچھ رہا تھا۔
"تشدد کی تو اسلام میں گنجائش ہی نہیں ہے۔"
"اور ایسی فضولیات کی انتہائی حد پر جا کر بھی گنجائش ہے؟" امرحہ کو عالیان کی بات بری لگی اسے یہ بھی برا لگا کہ اتنے سارے لوگوں میں وہ اسے غلط ثابت کرنا چاہ رہا ہے۔ "نہیں ہم پال کے رد عمل کے حامی ہیں نا ہی آپ کے۔" جے پیٹرسن نے کہا۔
"لیکن آپ سب صرف مجھے ہی غلط کہہ رہے ہیں۔"
"آپ غلط ہیں۔" عالیان نے سنجیدگی سے کہا۔
امرحہ اس کی شکل دیکھتی رہ گئی۔ تو وہ اسے اس قدر ناپسند کرنے لگا تھا۔ غصے اور دکھ کے لاوے نے اس پر ہلا بول دیا۔ وہ جیسے عقل سے بیگانہ سی ہو گئی۔
"ہونہہ۔ یونین کی اس میٹنگ کے ارکان عیسائی ہیں یا یہودی۔ یا اللہ سب وہ کیسے میری حمایت کر سکتے ہیں۔ ایک مسلمان کو وہ کیسے ٹھیک کہہ سکتے ہیں۔؟" امرحہ کا دماغ واقعی کام کرنے لگا تھا۔
عالیان نے سختی سے اپنے لب بھینچ لیے۔ اس نے اتنی ناپسندیدگی سے امرحہ کو دیکھا کہ اس نے آج تک شاید ہی کسی کو دیکھا ہو گا۔
"یونین کے ارکان سمجھ دار پڑھے لکھے انسان ہیں۔ آپ غلط سمجھ رہی ہیں، یہاں ہم سب مذہب سے بالاتر ہو کر بات کر رہے ہیں۔ ہم مسئلے کے حل کے لیے آپ کے پاس بیٹھے ہیں۔ آپ کو سمجھانے کے لیے۔ آپ کی غلطی ہے آپ مان جائیں۔ پال سے مفاہمت کر لیں۔"
"ہرگز نہیں۔"
"آپ کو اس سے پہلے معذرت کرنی ہو گی آپ کر لیں۔ وہ بھی کرے گا۔ ورنہ اس معاملے کو ہم یونیورسٹی انتظامیہ تک جانے سے نہیں روک سکیں گے۔"
"جو ہو گا وہ میں دیکھ لوں گی۔ میں اس سے معذرت ہرگز نہیں کروں گی۔"
"ٹھیک ہے۔ یہ معاملہ یونیورسٹی انتظامیہ کے پاس ہی جانا چاہیے پھر۔ مس امرحہ کا یونیورسٹی سے چلے جانا ہی بہتر ہو گا۔" یہ عالیان کی کرخت آواز تھی جسے سن کر امرحہ بلبلا سی اٹھی تھی۔
ہاں وہ اس سے شدید نفرت ہی تو کرنے لگا ہے اب۔
میٹنگ بغیر کسی نتیجے کے برخاست ہو گئی۔ امرحہ نے اسٹوڈنٹ یونین کے آفس سے باہر نکلتے عالیان کو جالیا۔
"تو تم مجھ سے اتنی نفرت کرنے لگے ہو کہ مجھے ایسے یونیورسٹی سے نکلوانا چاہتے ہو۔"
"میں تمہیں نکلوا رہا ہوں؟"
"تم نے جے پیٹرسن سے کہا کہ۔"
"ہاں۔ میں نے کہا۔ اور ٹھیک کہا۔"
"میرا یونیورسٹی سے نکل جانا بہتر ہے۔؟" وہ سن چکی تھی پھر بھی تصدیق چاہی تھی۔
"بالکل۔" اس نے تصدیق کر دی۔
امرحہ جہاں کی تہاں کھڑی رہ گئی۔ "اتنی نفرت اب اس سے۔"
"تم مسلمان ہوتے تو تمہارے دل پر چوٹ لگتی۔ صرف نام رکھ لینے سے اور چند کتابیں پڑھ لینے سے کوئی مسلمان نہیں بن جاتا۔ جس طرح کی بکواس اس نے کی تھی وہ قتل کیے جانے کے لائق تھا۔"
عالیان کے رویے سے بھڑک کر امرحہ نے اس پر گہری چوٹ کی۔
عالیان نے بہت صبر سے امرحہ کو دیکھا جیسے کسی جاہل کو علم کی نظر سے جانچا۔
"ایسے کتنے قتل ہوئے تھے اس دور میں جس میں محمد ﷺ پر پتھر برسائے گئے تھے؟" وہ سوال کر رہا تھا امرحہ اس کی شکل دیکھ رہی تھی۔
"بتاؤ۔ جواب دو۔ جب ان کے جوتے خون سے بھر گئے تھے۔ انہیں برا بھلا کہا جاتا رہا۔ جب وہ اپنی قوم کے پاس واپس آئے تو انہوں نے اپنی قوم کو کیا حکم دیا تھا۔ ملیامیٹ کر دو ان لوگوں کو جنہوں نے مجھے برا بھلا کہا۔ ان کی اینٹ سے اینٹ بجا دو۔ کیا ایسا کوئی حکم دیا تھا انہوں نے؟"
غصے میں بھڑک جانے والوں میں سے ایک کے پاس اس کا جواب نہیں تھا۔
"کیا اس عورت کے ہاتھ کاٹ دینے کا حکم دیا تھا جو ان پر گند پھینکا کرتی تھی۔ ایک اللہ کا پیغام پھیلانے والے کے سامنے جب مشرک جاہل اللہ کو برا بھلا کہتے اور مذاق اڑاتے تو کیا وہ غصے میں بھڑک کر ایک ایک کا منہ توڑ دیا کرتے تھے۔ جو اللہ کے نبی تھے جو تم سے زیادہ اللہ کے قریب تھے کیا وہ یہ کیا کرتے تھے؟ ساری دنیا میں اسلام کا تماشا تم جیسے بھڑک جانے والے مسلمانوں نے بنایا ہے۔ تم مسلمان ہو نا۔ اسلام کو مانتی ہو۔ پھر غصے میں بھڑکنے کی وجہ۔ غصہ تو حرام ہے نا۔ ہر حال میں حرام۔ حرام کا مطلب حرام۔ کبھی حرام کو حلال ہوتے دیکھا ہے۔ کسی بھی صورت کسی بھی ماحول میں۔

غصے میں برا بھلا کہتا، گریبان پکڑ لیتا، تشدد کرتا۔ یہ کون سا مذہب ہے۔ جس کی تصویر اٹھا کر تم دنیا کو دکھا رہی ہو؟ تم نبی کے نام پر جان دینے کو تیار ہو گی، لینے کو بھی تیار ہو گی، لیکن اسی نبی جیسی بننے پر تیار نہیں ہو گی۔

اسلام اینٹ کا جواب پتھر نہیں ہے مس امرحہ۔ بالکل نہیں۔ اسلام اینٹ کا جواب برداشت ہے، تحمل ہے، صبر ہے، حکمت ہے اور سب سے بڑھ کر خاموشی ہے۔

اسلام گالی کا جواب گالی نہیں ہے۔ اسلام گالی کا جواب درگزر ہے۔

کیا تم نے درگزر کو اپنایا۔ کس نبی نے کب درگزر سے کام نہیں لیا، کب خاموشی اختیار نہیں کی۔ نبیوں کے لیے سب سے زیادہ صبر، خاموشی، حکمت کے پیغامات اترے ہیں، نبیوں نے یہی درس اپنی امتوں کو دیے ہیں۔ تم کس نبی کو مانتی ہو۔ تم کس دین کی پیروکار ہو۔ تم میں برداشت نہیں۔ تم میں صبر نہیں۔ تم کون ہو؟

کل پوری انسانیت وحشی پن پر اتر آئے تو بھی اسلام اس کی مخالفت کرتا ہے۔ اپنے برائے نام اسلام کو صرف خود تک رکھو۔ بھڑک کر اسے مار کر تم نے ثواب نہیں کمایا۔ تم اسے بولنے دیتیں۔ کیا اس کے کہہ دینے سے وہ سچ ہو جائے گا جو جھوٹ ہے۔ غلط ہے۔ تم جانتی ہو کہ یہاں کیا ہو سکتا تھا۔ بارود کے ڈھیر پر تم نے چنگاری پھینک دی تھی۔ پال کا حلقہ بہت بڑا ہے، وہ ایک اسپورٹس پرسن ہے۔ یونی اسے سپورٹ کرتی ہے، اس کے کئی چاہنے والے ہیں، یہاں ان سب سپورٹرز کو ملا کر اس نے تمہارے خلاف۔ یعنی مسلمانوں اور اسلام کے خلاف ایک محاذ کھڑا کر لینا تھا۔ عرب اور افریقہ کے مسلمان اسٹوڈنٹس ان معاملات میں بہت حساس ہیں وہ بھی ایک محاذ بنا لیتے۔ ایک ایسی جگہ جہاں مسلمان بھی ہیں، عیسائی بھی اور دیگر مذاہب کے اسٹوڈنٹس بھی وہاں مذہبی آگ بھڑک اٹھتی۔ مانچسٹر یونیورسٹی دنیا کی امن پسند یونیورسٹیوں میں سے ایک ہے، لیکن پھر یہ امن پسند نہ رہتی۔ تمہاری ذرا سی غلطی کا نقصان کتنا بڑا ہوتا، تم اندازہ بھی نہیں لگا سکتیں۔ ایسی صورت میں تمہارا یہاں سے چلے جانا ہی ٹھیک ہے۔"

"تو کیا اس نے ٹھیک کیا؟" امرحہ کی آواز رندھ گئی۔

"اس نے غلط کیا لیکن بہرحال زبان سے۔ مسلمان تم ہو، مجھے کی توقع تم سے ہے کیا اس سے۔ تمہیں یونیورسٹی انتظامیہ اس معاملے کو یکسر کر دے تو شاید وہ تم دونوں کو یونی سے نکال دے کیونکہ تمہیں یونیورسٹی میں رکھنے کی صورت میں مذہبی گروپس بننے کا خطرہ موجود رہے گا۔ جبکہ یونیورسٹی کو ہر حال میں اپنے ماحول کو تعصب سے پاک رکھنا ہے۔ یہ ایک درس گاہ ہے یہاں دنیا بھر سے لوگ آتے ہیں پڑھنے کے لیے۔ ایک اکیلی درس گاہ میں آ کر بھی اگر تم تحمل اور بردباری کا مظاہرہ نہیں کر سکتیں تو بہتر ہے کہ تم چلی جاؤ۔"

"تو تمہاری یہ خواہش ہے کہ میں گھر چلی جاؤں۔"

"نہیں امرحہ۔ ہم یہاں ذاتی معاملات پر بات نہیں کر رہے۔ اگر تمہیں کوئی بات نہیں سمجھنی تو بہتر ہے کہ میرا وقت ضائع نہ کرو۔ جب جے پیٹرسن نے مجھے فون کیا تھا تو مجھے نہیں معلوم تھا کہ تم بھی اس معاملے میں شامل ہو۔ ورنہ میں خود کو اس معاملے سے دور رکھتا۔ لیکن اگر اب مجھے یہ محسوس ہوا کہ یہ معاملہ بگڑ سکتا ہے تو میں یونیورسٹی سے تمہیں نکالے جانے کی پرزور سفارش کروں گا۔ میں یونیورسٹی اسٹوڈنٹس کے درمیان مذہبی چپقلش نہیں جاری رکھ سکتا۔"

کہہ کر وہ چلا گیا۔

اس کی ساری باتیں ٹھیک تھیں اور ایک بات سب سے زیادہ ٹھیک تھی کہ اب وہ واقعی "امرحہ" کو نہیں جانتا تھا۔ اسے اس کے ہونے نہ ہونے سے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔

امرحہ جاب پر نہ گئی اور سڑکوں پر سرگشت کرتی رہی۔ رات ہو گئی اور رات سے اور رات۔

جے پیٹرسن کو اس نے فون کر دیا تھا، وہ پال سے مفاہمت کے لیے تیار تھی۔ مانچسٹر کی ایک ایک چیز جو اسے اچھی لگا کرتی تھی اسے زہر لگ رہی تھی اس کا دل کہیں دور بھاگ جانے کو چاہ رہا تھا۔ کہیں چھپ جانے کو کہیں بھی موجود نہ ہونے کو۔

وہ یہ سمجھنے سے قاصر تھی کہ اسے خود کے ساتھ کیا کر لینا چاہیے۔

کشتی کے پیندے میں ہوئے سوراخ کی مانند وہ سمندر کے کھارے پانی سے خود کو بچا لینے پر قادر نہ رہی تھی۔ اور وہ تو اس پر بھی قادر نہیں رہی تھی کہ کسی طرح سے اس سوراخ کو ہی بند کر ڈالے تو اسے ڈوب ہی جانا تھا۔ اگر یہی طے تھا تو اسے زیادہ مچلنا نہیں چاہیے پرسکون رہنا چاہیے۔ لیکن اس سے یہ بھی تو نہیں ہو پا رہا تھا۔ وہ اخلاقی طور پر ایک مشکل دور سے گزر رہی تھی اور اس کا الزام وہ صرف اپنے سر نہیں لے سکتی تھی کہ سب اس کی وجہ سے ہوا اور اس میں سراسر اسی کا قصور ہے۔

☆ ☆ ☆

وہ جے پیٹرسن کے پاس موجود تھی۔

"میں سارے معاملے کو ختم کرنا چاہتی ہوں۔"

"ڈاکو منٹری پر فی الحال کام نہیں ہو گا۔ یا آپ لوگ اسے ریلیز نہیں کریں گے۔ اس سارے معاملے سے آپ کسی کو آگاہ نہیں کریں گی اپنے قریبی دوستوں کو بھی نہیں، ورنہ نتائج کی ذمہ دار آپ ہوں گی۔ آپ کسی کو کسی بھی صورت یہ نہیں بتائیں گی کہ پال نے کیا کہا۔ Tab Manchester یا The کسی بھی دوسرے اخبار تک یہ بات کسی بھی صورت نہیں جانی چاہیے۔ آپ بالکل خاموش رہیں گی۔ کوئی کچھ بھی پوچھے گا تو آپ لاعلمی کا اظہار کریں گی۔ پال چاہتا ہے آپ اس سے معذرت کریں۔"

"پہلے معذرت وہ کرے گا۔ پہل اس نے کی تھی۔"

"ٹھیک ہے کل اپنی پہلی کلاس لینے کے بعد یہاں آ جایئے گا۔"

جے پیٹرسن سے ملنے کے بعد امرحہ عالیان سے ملنے اس کے ڈیپارٹمنٹ آئی لیکن وہ اسے نہیں ڈھونڈ سکی۔ ناچار وہ سائیکل اسٹینڈ کے قریب کھڑی ہو گئی۔ اپنی کلاسز لے کر جب وہ اپنی سائیکل کے پاس آیا تو وہ فوراً اس کے پاس آ گئی۔

"میں اپنے تلخ رویے کی معذرت چاہتی ہوں عالیان!"

"جے پیٹرسن نے مجھے بتایا ہے کہ معاملہ ختم ہو چکا ہے۔" عالیان نے اس سے ٹھیک ویسے ہی بات کی جیسے جے پیٹرسن نے امرحہ سے کی تھی۔

"میں اس معاملے کی نہیں۔ تمہاری اور اپنی بات کر رہی ہوں۔"

"تمہاری اور میری کوئی بات نہیں ہے جسے کیا جائے۔" سائیکل نکال کر وہ آگے بڑھ گیا اور اس پر بیٹھ کر اتنی شدت سے پیڈل گھمایا جیسے کسی پرانے صدمے کو نئے انداز سے دافع کرتا ہو۔

امرحہ نے غصے میں اس پر طنز کیے تھے کہ وہ مذہب ہے یا صرف نام کا مسلمان ہے، لیکن نام کا مسلمان وہ نکلا تھا یا خود امرحہ۔ امرحہ کو خدشہ رہا تھا کہ وہ حرام فوڈ کھاتا رہا ہو گا۔ اور امرحہ حرام کی قسم غصے میں کئی ہزار بار جتا ہو چکی تھی۔ وہ ہاتھ سے کھانے والے کھانے کو ہی حرام کہتی تھی اور اس حرام کا کیا جو غصہ، غیبت اور چغلی کی صورت وہ کئی سو بار کھا چکی تھی۔ اسے اپنے مسلمان ہونے پر فخر تھا لیکن یہ کیسا فخر تھا جو صرف نام کا تھا۔

لیڈی مہر کا کہنا تھا کہ وہ چاہتا تو اپنی ماں کا مذہب اپنا سکتا تھا لیکن اس نے میرا مذہب اپنایا۔ اس پر کوئی زبردستی نہیں کی گئی تھی، بالغ ہونے کے بعد اختیار اس کے ہاتھ میں تھا اور اس نے اسلام کا انتخاب کیا۔ وہ ایک عام مسلمان نہیں ہے۔

لیکن امرحہ نے اسے عام بھی نہیں سمجھا تھا۔ وہ ایک عیسائی عورت کا بیٹا ہے، یورپ میں پلا بڑھا ہے، اس کے باپ کا اتا پتا نہیں تھا اس کے ساتھ دوستی کی جا

سکتی ہے۔ رشتہ داری نہیں وہ خوب صورت ہے'
لائق فائق ہے' سمجھ دار' بردبار ہے' لیکن پھر بھی پاکستانی معاشرے میں صفر ہے' کیونکہ اس کی ماں عیسائی تھی اور اس کا باپ سوالیہ۔ اس کے آگے پیچھے کوئی نہیں ہے اسے ایک مسلمان عورت نے پالا ہے اور اس کی پرورش ایک بے سہارا بچوں کے سینٹر میں ہوئی ہے۔ صرف ان چند باتوں سے ہی مانچسٹر یونیورسٹی کا ٹاپر۔ صفر ہو جاتا ہے۔

"اس نے ٹھیک کہا امرحہ! اسلام گالی کا جواب گالی نہیں ہے۔ بلکہ کتنی پیاری بات کی ہے اس نے۔" دادا امرحہ کو سمجھا رہے تھے۔

عالیان کو صرف ایک یونیورسٹی فیلو ثابت کرکے اس نے دادا کو ساری بات بتادی تھی۔

"میں بھی غلط نہیں تھی دادا۔ جو میں نے سیکھا' دیکھا وہی میں نے کیا' میں نے اپنے گھر میں بھی ایسی باتیں نہیں سنیں۔ کیسا تحمل اور کیسی بردباری۔ یاد ہے اماں اور بابا کے لڑا کرتے تھے۔"

"تم اماں بابا اور ماحول کو چھوڑو۔ بتاؤ کیا میں نے تمہیں یہ سب نہیں سکھایا' میں نے تم میں بردباری اور تحمل پیدا کرنے کی کوشش نہیں کی۔ جب تم مانچسٹر جا رہی تھیں تو میں نے تم سے نہیں کہا تھا کہ امرحہ دوسروں کے لیے مثال بننا کہ تم اب اکیلی نہیں اپنے ساتھ اپنے ملک و مذہب کا نام لے جا رہی ہو۔ تمہارا ایک غلط قدم تمہاری قوم پر انگلی اٹھائے گا۔ تم نے کتنی بار مجھے کہا کہ دادا روسی بہت سخت جان ہوتے ہیں۔ جبکہ روسیوں کے نام پر تم صرف ایک ویرا کو جانتی ہو۔ تم نے کہا کہ جرمن بہت صلح جو اور امن پسند ہوتے ہیں جبکہ تمہارا صرف ایک ہم جماعت جرمن ہے۔ تم نے کہا کہ جدت فرانسیسیوں پر ختم ہے۔ تم بمشکل ایک یا دو فرانسیسیوں کو جان پائی ہوگی۔ پال بھی تم ہی سے سارے مسلمانوں کو تشبیہ دے گا۔ تم خاموشی سے چلی آتیں تو وہ کہتا' بے شک خود سے ہی کہ مسلمان خاموشی سے نظر انداز کرنا جانتے ہیں۔ تم نے الثانیومین کے صدر پر طنز کیے' امرحہ ایک بات یاد رکھنا اور ایسا تاقیامت ہوگا جہاں ایک سچ ہو گا وہاں اس کے سو مخالف ضرور ہوں گے۔ ہم لڑ کر بھڑک کر دوسروں پر یہ ثابت نہیں کرسکتے کہ ہم سچے ہیں۔ صرف ہمارا مذہب سچا ہے۔"

"ٹھیک ہے دادا۔"

"تمہاری آواز اتنی بوجھل کیوں ہے؟"

"ٹھیک ہے آپ کو ایسے ہی لگ رہا ہے۔"

"میرے خواب میں تم روئی ہوئی آئی تھیں۔ اگر تم روتی رہی ہو تو مجھے وجہ بتاؤ۔ کیا اس مسئلے کو لے کر پریشان تھیں؟"

"میں کیوں روؤں گی بھلا؟"

"امرحہ بچے! تم یہ بھول جاتی ہو کہ میرا دل تمہارے دل سے جڑا ہے۔ میرا دل اداس ہے۔ جڑا جارہا ہے اور ایسا اس لیے ہے کہ تمہارا دل اداس ہے۔ میں اپنے دل سے تمہارے دل کا حال جان جاتا ہوں۔"

"آپ کا وہم ہے۔"

"میں دعا کروں گا کہ یہ میرا وہم ہی ہو۔"

"ہاں ضرور دعا کیجئے گا کہ سب وہم ہی ہو۔" اس نے فون بند کیا اور کھڑکی کھول دی۔

اگر ایک دل دوسرے دل سے جڑ جائے تو سب معلوم ہوتا رہتا ہے؟ سب۔ لیکن اگر وہ جڑ جائے تو ہی نا۔

☆ ☆ ☆

شارلٹ اپنے نمونے کو لے آئی تھی اور کیا نمونہ لائی تھی کہ نشست گاہ میں بیٹھی این اون تک نظریں چرا کر جوردن کو دیکھ رہی تھی جو خود لڑکا سی بنی گھبرا رہی تھی اور جسے "لڑکا نامی مخلوق" سے اتنی ہی دلچسپی تھی کہ "بس یہ بھی ایک مخلوق ہے۔"

سادھنا خاص امرحہ کو اس کے کمرے سے نکال کر لائی تھی۔

"میں نے اب تک کی زندگی میں اتنا خوب صورت انسان نہیں دیکھا۔" سادھنا نے جوردن کی طرف انگلی سے اشارہ کرتے ہوئے تو صورت کہا۔

امرحہ نشست گاہ سے ذرا دور کھڑی جلد ہی ہوگئی "میں نے اتنی بڑی یونیورسٹی میں اس کے قریب قریب کا بھی نہیں دیکھا۔"

سادھنا نے امرحہ کے بازو پر چٹکی بھری "ہم اسے نظر لگا دیں گے۔"

"نظر بھی اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکے گی۔"

جانے کس دل سے خواہش کی تھی ماما مہر نے کہ شارلٹ ہالی ووڈ کا ہیرو ہی اٹھا لائی تھی۔ چند ایک فلموں میں چھوٹے بڑے کردار ادا کرچکا تھا۔ بڑے بھی کر ہی لے گا اور سپر اسٹار بن ہی جائے گا۔

ماما مہر کو سمجھ نہیں آرہی تھی کہ اس گڈے کو کس شوکیس میں سجا کر اس شوکیس کا دنیا بھر کے سامنے افتتاح کریں۔ یا ایک بڑی سی نمائش رکھ لیں کہ "دیکھو میرا داماد۔ ہے کسی کے پاس ایسا؟"

"تمہیں کہاں ملا شارلٹ؟" ماما مہر نے سرگوشی کی ہو۔

این اون نے کان خاص ان کے قریب کرلیے۔ اف یہ سچ ہے لیے بھی معلوم کرنا تھا کہ ایسے چینی مٹی سے ہاتھ لگائے کہیں ٹوٹ ہی نہ جائے جیسے گڈے کہاں پائے جاتے ہیں۔

"ہالی ووڈ سے ماما' جوردن ایک شارٹ کورس کے لیے آیا تھا کورس کیا اور چلا گیا پھر کچھ مہینے بعد آیا اور مجھے انگوٹھی پہنا دی۔" اس نے انگوٹھی والا ہاتھ آگے کیا تو نشست گاہ کی سب لائٹس بجھا دی جاتیں تو انگوٹھی میں جڑا ہیرا بتاتا کہ اس کی قیمت کیا ہے وہ اتنی روشنیوں میں بھی اپنی روشنی بکھیر رہا تھا۔

"مجھے تو یقین نہیں آرہا کہ اس نے تمہیں پسند کر لیا ہے۔"

شارلٹ کا منہ اتر گیا۔ وہ بلاشبہ خوب صورت تھی لیکن جوردن جتنی' بہرحال نہیں۔ لیکن ماؤں کو تو صرف اپنے ہی بچے پیارے لگتے ہیں نا۔

"کتنی خوش قسمت ہوں میں شارلٹ!" ماما مہر نے بچوں کی طرح دونوں ہاتھ تھوڑی تلے ٹکائے۔

امرحہ نے ہنسی کی زیادتی کی وجہ سے منہ پھیر لیا البتہ سادھنا کو نشست گاہ سے جانا پڑا۔ کیا انداز تھا ماما مہر کا۔

"فلمی ستارے آئیں گے۔ بولو مجھے شادی کے انتظامات کرنے ہیں۔ انجلینا جولی' بریڈ پٹ کے آنے کے کتنے فیصد امکانات ہیں؟ صرف خاندان کے لوگ ہوں گے یا قریبی دوست۔ اور میڈیا۔ میڈیا آئے گا۔"

شارلٹ کی گلابی رنگت پیلی سی پڑ گئی۔ اس نے آنکھیں گھما کر جوردن کی طرف دیکھا کہ وہ ان کی طرف متوجہ تو نہیں۔ "بالکل نہیں ماما' جوردن کو یہ سب پسند نہیں۔"

"لیکن مجھے پسند ہے یہ شارلٹ۔ تم جانتی ہو میری کتنی بڑی خواہش تھی کہ میرا کوئی بچہ ہالی ووڈ اسٹار بنے لیکن کتنے برے ہو تم سب۔ سوائے عالیان کے کوئی آڈیشن دینے نہیں گیا اور میری قسمت دیکھو وہ آڈیشن میں ناکام ہو گیا' ویسے وہ ہر جگہ ٹاپ کرتا ہے۔ شارلٹ میری مانو تو لو اب تو مجھے ایک بنا بنایا ہیرو مل گیا ہے۔ مجھے مت روکو۔"

"ٹھیک ہے ماما! چپکے سے بلوا لیجئے گا۔" شارلٹ نے کان کے قریب ہو کر کہا۔

"تم جوردن سے یہ بھی کہنا کہ وہ فلمی ستاروں کو شادی میں ضرور بلائے خاص کر بریڈ پٹ کو۔"

سادھنا واپس آکر بیٹھ چکی تھی اور اس آخری بات پر پھر باہر جانے کو تھی۔

آریان دن بہ دن صحت یاب ہو رہا تھا سادھنا تو چڑیا کی چوں چوں پر بھی پیٹ پر ہاتھ رکھ کر ہنستی تھی۔

این اون البتہ جوردن کو دیکھنے میں مصروف تھی۔

"کیا آپ چاہتی ہیں میں یہاں سے اٹھ جاؤں۔" جوردن نے بانسری سی میٹھی لے میں بہت مہذب انداز سے این اون سے پوچھا۔ این اون نے گھبرا کر نفی میں سر ہلایا۔

"پرائے مہمان اپنی نظریں مجھ پر سے اٹھا لیں یا خود کو [illegible]۔"

این لون خاموشی سے اس کی شکل دیکھنے لگی۔ یعنی اس نے جوردن کے لب تو ہلتے دیکھے تھے پر آواز اس کے کانوں کے پردوں سے اندر نہیں اتر سکی تھی۔ سادھنا کو منہ پر ہاتھ رکھ کر جھٹ سے باہر جانا پڑا۔

اور یوں بہار کی دلہن شارلٹ اور بہار کا گڈا جوردن ماما سے شادی کی اجازت لے گئے۔

رات بھر شارلٹ کی چمکتی ہوئی آنکھیں امرحہ کی آنکھوں میں اندھیرا کرتی رہیں۔ شارلٹ کا بھی کوئی خاندان نہیں تھا اس کی ذات پر ایک نہیں کئی سوالیہ نشان تھے، لیکن جوردن اسے بیاہ کرلے جارہا تھا۔ شارلٹ نے بتایا تھا کہ جوردن کا خاندان کافی بڑا ہے اور وہ شارلٹ کو لے کر بالکل خوش نہیں ہیں اور انہوں نے صاف صاف اپنی ناپسندیدگی کا اظہار کردیا ہے لیکن جوردن نے ان کی ناپسندیدگی کی پروا نہیں کی اور انہیں اپنے فیصلے سے آگاہ کردیا۔

تو یہ ہوتی ہے محبت۔ بنا کسی سوال و جواب کے۔ ٹھیک ہے "محبت" کا اندھا ہونا ضروری نہیں لیکن "محبت" کا اتنا بینا ہونا بھی ٹھیک نہیں۔ کہ پہلے سوال نامے کو بھرو پھر آگے بڑھو جمع تفریق کرو حاصل جمع نکالو پھر اقرار "انکار" کرو۔ اور یہ بھول جاؤ کہ محبت ہی تو سب سے پہلے ذات و نسل کا فرق مٹاتی ہے۔ عرش و فرش کا۔ تخت و خاک کا۔ کم و زیادہ کا محبت ہی تو سب برابر کرتی ہے۔ جڑے کل ہوتی ہے اور کل ہی رہ جاتی ہے اگر ایسا نہ کرے تو وہ محبت نہیں رہتی۔

سوال و جواب نکالتے وہ رات گزر گئی۔

اگلی رات ویرا اسے سائیکل پر بٹھا کرلے گئی وہ اسے آکسفورڈ روڈ کی طرف لے جارہی تھی۔

"ہم کہاں جارہے ہیں۔"

"یولی۔" ویرا اکڑی ہوکر سائیکل چلارہی تھی۔

"اس وقت۔ آدھی رات کو۔" امرحہ مضبوطی سے سائیکل کو تھامے رہی۔

وہ بس گر جانے کو ہی تھی اتنی بار ویرا کی رولر کوسٹر پر بیٹھ جانے کے باوجود ہر بار اسے یہی لگتا کہ یہ اس کا آخری سفر ہے اور اگلا سفر آخرت کی طرف ہوگا۔

"ہاں۔ ضروری ہے۔" ویرا نے اور تیزی سے سائیکل چلائی۔

آکسفورڈ روڈ پر اس کی سائیکل رکی تو وہ حیران رہ گئی وہاں کم سے کم چندرہ اسٹوڈنٹس اور موجود تھے ویرا نے ہینڈی کیم امرحہ کے ہاتھ میں پکڑا دیا۔

"مجھے ٹھیک سے شوٹ کرنا۔"

"کیا کرنے جارہی ہو تم۔" امرحہ کا خیال تھا روڈ پر وہ سب دوڑ لگائیں گے۔

"دیکھ لینا۔" ویرا نے ہاتھوں [illegible]

خود کو گرم کرنے کے لیے پہلے ان سب نے دوڑ لگائی پھر اولڈ کیمپس کی محراب کے اندر ہو گئے تاکہ روڈ پر لگے کیمرے انہیں شوٹ نہ کرسکیں۔

"ہمارے پاس زیادہ سے زیادہ دس منٹ ہیں پولیس آنے کی صورت میں کوئی کسی کا ذمے دار نہیں ہوگا۔" ایک لڑکے نے جس نے اونچی اٹھان والی ٹوپی پہن رکھی تھی ہاتھ میں پکڑی دھاتی پلیٹ کو چمچ سے بجا کر کہا۔

امرحہ نے پولیس کے نام پر خوف سے ویرا کو دیکھا۔

"ویرا یہاں کیا ہونے جارہا ہے۔"

"تمہارا خون۔ پھر ہم تمہیں یہاں دفن کردیں گے۔" ویرا نے سفاکی سے کہا۔

"ٹن ٹن ٹن" دھاتی پلیٹ پر چمچ بجا ان بے چاروں کے پاس صرف دس منٹ تھے نا۔۔۔

زبان کے نیچے دو انگلیاں دے کر سیٹی بجائی اور محراب کے سامنے پوزیشن لیے کھڑے کمانڈوز یونیورسٹی آرک پر ٹوٹ پڑے۔ اسے سر کرنے کے لیے۔

امرحہ کو نہیں معلوم تھا کہ یولی کو سر کرنے کا ایک طریقہ یہ بھی ہے۔ اسے گمان سا ہوا کہ ذرا دور ایک کیمرہ چھپا ہوا ہے جس کے پیچھے جیمز کیمرون کھڑا اپنی نئی آنے والی فلم کے لیے ریکارڈنگ کررہا ہے۔

امرحہ نے سر کو جھٹکا سا دیا "کیا وہ پاگل خانے سے بھاگے پاگلوں کے درمیان تھی۔؟"

نہیں، وہ مانچسٹر یونیورسٹی کے ان اسٹوڈنٹس کے کرتب دیکھ رہی تھی جنہوں نے خفیہ سوسائٹی بنا رکھی تھی جن میں شامل اسٹوڈنٹس "ایکس مین"، "اسپائڈرمین" اور "جمپر" بننے کے مواقع تلاش کرتے رہتے تھے یعنی وہ افواہ درست تھی کہ چند اسٹوڈنٹس نے کئی سو فٹ اونچی آمنے سامنے کی دو عمارتوں کی چھتوں پر رسہ تان کر ان پر چہل قدمی کی۔ وہ چہل قدمی کرنے والے کون ہوں گے ان ہی میں سے کوئی نا۔ ان چار لڑکیوں اور دس لڑکوں میں سے کوئی۔

ویرا چھپکلی آرک پر یہ جا وہ جا۔ جیسے یہ اس کا خاندانی پیشہ ہو "دیواروں پر رینگنا" "چڑھائیاں چڑھنا" بس سب سر کرلینا اور جیسا کہ امرحہ سوچ رہی تھی کہ وہ اب گرے کہ تب تو ان میں سے کوئی ایک بھی نہیں گرا تھا البتہ ان کے وہ غبارے جو انہوں نے منہ میں لے رکھے تھے اور جن میں پانی بھرا تھا وہ پھٹنے لگے اور جس جس کا غبارہ پھٹا گیا وہ کھیل سے باہر ہوتا گیا اور آرک سے نیچے کود آیا۔ جیسے پہاڑ پر درخت پر چڑھائی کی جاتی ہے ایسے ہی وہ اوپر سے اوپر جارہے تھے اصل کوہ پیما اور [illegible] بھی ان کے ساتھ آکر مقابلہ کرتے تو ہار جاتے۔ یہ حقیقت ہے آنکھوں دیکھی، چودہ میں سے چھ اپنے غباروں سمیت یولی آرک تک پہنچنے میں کامیاب ہوگئے۔ ان چھ نے اپنے پانی بھرے غبارے فضا میں چھوڑ کر اپنی فتح کا اعلان کیا ان چھ میں کارل اور ویرا بھی شامل تھے۔ وہ حضرات مسکراتے ہوئے نیچے کود آئے۔

یہ کھیل کا پہلا راؤنڈ تھا، ابھی دوسرا باقی تھا اب انہوں نے پہلے سے زیادہ وزنی اور بڑے غبارے منہ میں لے لیے "ایک دو تین" کا اشارہ کیا گیا سیٹی بجائی گئی اور لنگور حضرات "مستقبل کے ایکشن ہیروز ہیروئنز" پھر سے آرک پر ٹوٹ پڑے۔

ویرا کمانڈو بچے نے جنگلی گوریلے کی سی پھرتی سے کونے میں فٹ پاتھ کو چھوا اور امرحہ نے پلکیں بھی نہیں جھپکی تھیں کہ وہ یہ جا وہ جا۔ ادھر ادھر ہاتھ پیر پھنساتی ویرا تیزی سے اوپر چڑھ رہی تھی۔ ایک تو چڑھائی اوپر سے پانی بھرے غبارے۔ آسان کام نہیں کر رہے تھے وہ۔

ایک ایک کر کے چار کے غبارے پھٹے وہ نیچے کود گئے۔ رہ گئے کارل اور ویرا "اب کارل کو ہارنا موت لگ رہا تھا اور ویرا کو ہار مان لینا۔"

ویرا ایک رخ سے کارل مخالف رخ سے محراب کی چوٹی کی طرف بڑھ رہے تھے موت و زندگی کی جنگ تھی دونوں کم و بیش ایک ہی وقت میں اس سفید جھنڈے پر جھپٹے جو انہوں نے پہلے سے ہی وہاں لگا دیا تھا۔ جھنڈا ویرا اور کارل دونوں کے ہاتھ میں بیک وقت آیا تھا۔ کارل نے زور سے جھٹکا دیا ویرا گرتے گرتے بچی ویرا نے اس سے زیادہ زوردار جھٹکا دیا لیکن کارل ہلا تک نہیں اور دانت نکالنے لگا ویرا نے غبارہ وہیں پھوڑ دیا جبکہ کارل نے اپنا غبارہ امرحہ کے سر پر پھوڑنا چاہا لیکن امرحہ پیچھے ہٹ گئی۔

خیالی جیمز کیمرون نے تالی بجائی اور انگوٹھے کا اشارہ دے کر کیمرہ کلوز کردیا۔

دونوں میں سے اصل ونر کون ہے اور کس کے ہاتھ میں پہلے جھنڈا آیا اس کے لیے جو دوسرے کھلاڑی کھڑے دیکھ رہے تھے ان سے ووٹنگ کروائی گئی جس کے رزلٹ میں دس ووٹ لے کر کارل جیت گیا۔

"یہ سب تمہارے چمچے ہیں اس لیے فیصلہ کارل کے حق میں کیا ہے۔" ویرا بھڑک اٹھی وہ کارل کو سمجھتی ہی کیا تھی "نت نئی شرارتوں کا [illegible]"۔۔۔

"چلو میرے دوست اس قابل تو ہیں کہ ایسے کارآمد چمچے بن سکیں "تمہاری زنگ آلود چمچی تو اس قابل بھی نہیں ہے۔ سیڑھی لگا کر بھی دی جاتی تو یہ دو فٹ اوپر چڑھنے سے پہلے ہی چیخ چیخ کر سارے مانچسٹر کو اٹھا دے گی۔ مس رشیا! اپنی چمچی بدلو۔" کارل نے انگلی سے امرحہ کی طرف اشارہ کر کے منہ اٹھا کر ہنسنا شروع کردیا سب ہی ہنسنے لگے۔

امرحہ کا خون کھول اٹھا اور سچ تو یہ ہے کہ اس کا جی چاہا کہ کارل کا منہ یوں توڑ ڈالے کہ اسے بیس میں

سیکنڈز کے اندر آرک کی چوٹی کو ہاتھ لگا کر دکھاوے اور غبارے کو پتھروں سے بھر کر اس کے سر پر پھوڑے۔

تو۔۔۔ پرایسے چیلنج ہی دیکھے جا سکتے تھے۔ تصویر تانکنے کے لیے اگر وہ اسٹول پر کھڑی ہو جاتی تو دلوا دے اسٹول پکڑواتی کہ بلی کر اسٹول اسے گرا ہی نہ دے۔ اب جو تین فٹ کے اسٹول پر ایسے کھڑا ہو گا اس پر ایسے جنگلی چیلنج کرنے کے بعد دیکھنا بنتا تو نہیں ایک زور دار سیٹی کو بجی اور خفیہ سوسائٹی کے ارکان میں کھلبلی مچی' جلدی سے وہ ایک سائیکل پر وہ وہ تین تین بیٹھے اور یہ جاوہ جا۔

سیٹی رات کو گشت کرنے والی یونیورسٹی پولیس کی آمد کا اعلان دینے کے لیے خفیہ سوسائٹی کے ہی ایک رکن نے بجائی تھی جو اسی کام پر مامور تھا۔ امرحہ بھی پولیس آگئی۔

"ہائے میری یونی گئی" امرحہ گھبرا کر چلائی' ویرا نے اسے کھینچ کر سائیکل پر بٹھایا۔

"اب ہمیں یونی سے نکال دیا جائے گا نا۔" امرحہ نے دانت پر دانت جمائے۔

ویرا نے قہقہہ لگایا "میں پورا برطانیہ ہلا ڈالوں گی اگر کسی نے ایسا کرنا چاہا۔"

"تم تو ہلا ڈالو گی میں کیا ہلاؤں گی۔۔۔ میری تو دادی نے اس بار میری پیشانی پر لکھوا دینا ہے "منحوس ماری جہاں جاتی ہے بیڑا غرق کر آتی ہے۔""

ویرا کا قہقہہ بڑا عظیم تھا۔ امرحہ کے ذہن میں آنے والا خیال اس سے بھی زیادہ عظیم تھا۔ اور اس خیال کو اس نے عملی جامہ بھی پہنا دیا۔

چنڈی کیم سے بنی ویڈیو اس نے محترم ڈین اور انتظامیہ کو میل کر دی۔ ڈیرک سے سیکھی ایڈیٹنگ سے اس نے ویرا کو کاٹ کر نکال دیا اور صرف کارل کو رہنے دیا۔ اس کا دل چاہا کہ The Tab میں بھی بھیج دے' لیکن وجہ یہ اس ویڈیو کے پوسٹ ہوتے ہی کارل یونیورسٹی میں اور زیادہ مشہور ہو جاتا کیونکہ سارے اسٹوڈنٹس ایسی حرکتوں کو بہرحال بہت پسند کرتے ہیں اور اس طرح کارل کے نام کا ڈنکا یونی میں بجنے لگتا۔

ویڈیو بھیج دی گئی۔۔۔ کتابوں اور جوتوں والا حساب برابر ہو گیا۔ امرحہ رات کو سکون سے سوئی۔۔۔ اتنے سکون سے۔۔۔ اتنے سکون سے کہ ایک گھنٹے کے اندر اندر ہی وہ خوفناک چیخ مار کر اٹھ بیٹھی۔ کارل اس کے بستر پر سانپوں سے بھرا باکس انڈیل رہا تھا۔

"اف۔۔۔ یہ میں نے کیا کر دیا۔" امرحہ نے اپنا پسینہ صاف کیا۔

کاش ڈین کا آئی ڈی ہیک ہو جائے یا ڈین ہی۔۔۔ ڈین ہی۔۔۔

امرحہ نے سونے کی کوشش کی اور اگلی بار کا گھونٹ جانے سے اٹھ کر بیٹھ گئی اور گہرے گہرے سانس لینے لگی۔

اب وہ کیسے مرنا پسند کرے گی۔۔۔ اس کا فیصلہ کسی اور کو کرنا تھا۔ آپ جانتے ہیں کون۔۔۔ سی وہی۔

☆ ☆ ☆

کارل کو انتظامیہ نے حاضر کر لیا۔ دو گھنٹے تک میٹنگ ہوتی رہی "اگلی میٹنگ میں ویرا کو بھی شامل کیا گیا۔ کارل ڈوب رہا تھا تو ویرا کو بھی لے ڈوبتا' باقی کے کھلاڑیوں کو البتہ اس نے بچا لیا تھا۔ کارل نے اپنے دوست کی بنائی ویڈیو انتظامیہ کے آگے حاضر کر دی۔

فیصلہ تین دن کے لیے یونیورسٹی سے باہر۔۔۔ نو لیکچر' نو کلاس۔۔۔ ساتھ وارننگ' وارننگ مطلب عام وارننگ نہیں' مطلب اگلی بار کسی بھی قسم کی شکایت پر سیدھا یونیورسٹی سے باہر۔

یونیورسٹی انتظامیہ ان معاملات میں کافی سخت ہوتی ہے لیکن ہر بار وہ اس بات کا خیال ضرور رکھتے ہیں کہ ان کے فیصلے سے یونیورسٹی کی ساکھ متاثر نہ ہو۔ اگر ایسے ہی اسٹوڈنٹس باہر نکالے جاتے رہے تو انگلیاں یونیورسٹی پر ہی اٹھیں گی۔

ویرا نے امرحہ سے بات چیت ہی بند کر دی' امرحہ نے اسے منانا چاہا لیکن ناکام رہی' ویرا کے گھر ڈین کا فون گیا تھا اور آفیشل وارننگ لیٹر بھی تفصیلات اور ویڈیو کے ساتھ۔۔۔ کوئی کم بات تھی۔۔۔ وہ تمام کروز نئی اپنے ہنر دکھاتی رہی اور انتظامیہ نے اس کی بے عزتی کر دی۔۔۔ اصل بے عزتی اس کے فادر نے اس کی کی' انہوں نے کہا وہ سو بار ایسی عمارتیں پھلانگے لیکن قانون کو ہاتھ میں نہ لے۔

"تم نے روس کی ناک کٹوا دی۔۔۔ تم نے کیا کیا؟؟" وہ بار بار یہی کہتے جاتے "پورے مانچسٹر میں تمہیں یونیورسٹی کی آرک ہی ملی تھی سر کرنے کے لیے۔۔۔ اپنے پاس دیکھنا تھا کوئی ایک آدھ پہاڑ ہل ہی جاتا۔"

وہ اتنی زور زور سے چلا رہے تھے کہ آواز ویرا کے بند کمرے سے باہر تک آ رہی تھی۔ امرحہ اور سادھنا دم سادھے سنتی رہیں' ویرا اسول سوں کرتی رہی۔

"تو ویرا بھی روتی ہے۔" امرحہ کو نجانے کیوں حیرت سی ہوئی۔

"مجھے معاف کر دو ویرا!" بند دروازے کے پاس اس کی سوں سوں تھمنے کے بعد امرحہ نے ہمت کی اندر جانے کی۔

"تم مجھ سے نفرت کرتی ہو؟" ویرا نے سنجیدگی سے پوچھا۔

"اگر ہم کسی کو اپنی محبت کا یقین نہ دلا سکیں تو اس کا مطلب یہ تو نہیں کہ ہم اس سے نفرت کرتے ہیں۔"

"میں نے اپنی اور تمہاری گفتگو کارل کو سنائی' تم نے اس کا بدلہ لیا؟"

"خدا گواہ ہے کہ نہیں۔۔۔ مجھے صرف کارل کو سبق سکھانا تھا" امرحہ نے پہلی بار شدت سے سچ بولا' ویرا کی لمحے اسے دیکھتی رہی۔

"تم بہت معصوم ہو امرحہ' بہت زیادہ۔" ویرا نے مسکرا کر کہا۔

امرحہ کے دانت نکل آئے "کیا واقعی؟"

"ہاں اور تم بے وقوفوں کی ملکہ معظمہ بھی ہو' تم کسی کو بھی لے ڈوب سکتی ہو' کسی کا بھی سر قلم کروا سکتی ہو۔" ویرا نے چلا کر دونوں لمبے بازوؤں کو ہوا میں لہرا کر کہا۔

امرحہ بت سی بن گئی۔۔۔ لب نہ پوچھ سکی "کیا واقعی؟"

ویرا نے اس کی بارہ بجے والی شکل دیکھی امرحہ نے اس کی "میں تمہیں کھا جاؤں گی۔۔۔" والی شکل پر غور کیا اور دونوں کے جبڑوں سے یکدم پھر پھر قہقہوں کے کبوتر نکلے۔

"یہ تم دونوں میں کیا کھچڑی پک رہی ہے آج کل؟" صبح ناشتے کی میز پر لیڈی مہر پوچھ رہی تھیں۔

امرحہ نے ہاں میں صرف سر ہلایا جبکہ ویرا نے منہ پھلا لیا' لیڈی مہر نے این اون کی طرف دیکھا' این اون آج کل لیڈی مہر کی کارندہ خاص بنی ہوئی تھی اور اس کارندہ خاص نے چابی کی گڑیا کی طرح سب سنا دیا۔

لیڈی مہر کتنی ہی دیر ویرا کو دیکھتی رہیں۔

"یہ تو مجھے معلوم تھا کہ تم میں بہت کچھ خاص ہے۔ لیکن اتنا زیادہ خاص ہے مجھے اندازہ نہیں تھا اور امرحہ تم۔۔۔ تمہیں یہاں آ کر پر لگے ہیں یا تم پر اپنے سامان میں چھپا کر لائی تھیں' جو تم نے یہاں آ کر لگا لیے؟"

دونوں کھی کھی کرنے لگیں۔

"زمین پر گھومو پھرو جو جی میں آئے کرو' مگر قانون نہ توڑو۔۔۔ دنیا میں ایسا کوئی شوق نہیں جسے اصولوں کو توڑ کر ہی پورا کیا جا سکتا ہو۔ حدوں سے باہر بہرحال نہیں نکلنا چاہیے' خاص کر ایک طالب علم کو۔"

ویرا نے گھور کر امرحہ اور این اون کو دیکھا' ہر طرف سے اس کی بہادری پر لعن طعن کی جا رہی تھی۔

"مجھ سے بچ جانا اب تم" ویرا نے جلبلاتی میں این اون کو دھمکی دی۔

"یہ مجھے جان سے مار دینے کی دھمکی دے رہی ہے آنٹی!" این اون نے فوراً ہی ایک کی تین لگا کر تادی۔۔۔ امرحہ کا منہ کھل گیا یعنی این اون بھی پر سامان میں رکھ کر ساتھ لائی تھی یا مانچسٹر یونی کے باغ سے توڑے تھے۔ آخری خیال پر اتفاق کیا جاتا ہے۔

یونی میں کارل آیا اسے دیکھ کر چلا گیا پھر اگلے دن وہ بس سے اتری ہی تھی کہ وہ اس کے پاس آیا اور ہاتھ

سینے پر باندھ لیے۔ امرحہ نے بس کی کھڑکی سے دیکھ لیا تھا۔ وہ سنجیدگی سے یونی کی دیوار کے ساتھ کمر ٹکائے آتی جاتی بسوں کی طرف دیکھ رہا تھا یعنی مس امرحہ بنک لیڈی آف پاکستان کا انتظار کیا جا رہا تھا۔ امرحہ نے ساتھ بیٹھے اسٹوڈنٹ سے پانی کی بوتل لے کر دو گھونٹ پانی پیا۔۔۔ بس ایسے ہی گلا خشک سا ہو رہا تھا اس کا جی تو چاہا اگلے اسٹاپ اتر جائے پر وہ ڈرتی ورتی تھوڑی تھی کارل سے۔۔۔ کیا سمجھتا ہے کارل اسے۔۔۔ ہیں؟

سینے پر ہاتھ باندھے ہڈ کیپ سے سر کو ڈھانپے وہ اسے تم کے انداز سے گھورنے لگا۔ اب وہ نہ بول رہا تھا نہ اس کا راستہ چھوڑ رہا تھا وہ کتنی بھی تیزی سے دائیں بائیں سے ہو کر نکل جانا چاہتی اتنی ہی پھرتی سے وہ اس کے آگے آجاتا۔

"میرا راستہ چھوڑو۔" امرحہ نے چلا کر کہنا چاہا لیکن آواز نکلی ہی نہیں۔۔۔ پانی۔۔۔ پانی کہاں ہے؟

"کیا مسئلہ ہے تمہارا کارل؟"

"تم۔۔۔"

"اب تک تم مجھے پنچ (Punch) مارتے رہے ایک میں نے مار دیا۔"

"مجھے تمہارا پنچ اچھا لگا۔ ہمیں اب دوستی کر لینی چاہیے۔"

"میں لنگوروں سے دوستی نہیں کرتی۔"

"پر مجھے مینڈکیاں پسند ہیں۔۔۔ امرحہ۔۔۔

"The Disaster Queen"

"کارل دی فتور۔۔۔" آکسفورڈ روڈ پر دونوں آمنے سامنے کھڑے لڑ رہے تھے۔

"فتور؟" ہڈ کیپ کو اس نے سر کو دائیں بائیں جھٹک کر اتارا۔ اسے غصہ آ رہا تھا۔

"ہاں فتور۔۔۔ کرتے رہو اب اسے گوگل۔"

"ضرورت نہیں۔۔۔ مجھے یہ نام پسند آیا ہے۔"

"تم پر بیچ بھی بہت رہا ہے بلکہ اسے اپنے نام رجسٹرڈ کروالو۔"

"Hmm۔۔۔ پھر ملتے ہیں امرحہ۔"

اس کے کراس بیگ کی اوپری جیب سے جھانکتی ایک عدد چاکلیٹ کو نکال کر وہ چلا گیا ساتھ ہنستا ہوا گیا۔ بھاڑ میں جائیں اس کے ہنٹ۔ امرحہ یونی آگئی اور سارا دن اس حد تک محتاط رہی کہ کلاس میں عبدالرحمٰن نے پین مانگا تو وہ شک سے اسے دیکھنے لگی۔

"کیوں چاہیے تمہیں مجھ سے پین؟"

"میرا پین کام نہیں کر رہا۔" وہ بے چارہ مصری گھبرا گیا۔

"تم کسی اور سے لو۔ مجھ سے ہی کیوں مانگ رہے ہو؟"

"تم میری ساتھ کی سیٹ پر بیٹھی ہوتا اور اتفاق سے مجھے یہ غلط فہمی رہی کہ تم کافی خوش اخلاق ہو۔ پین نامی چیز عاریتاً" مانگ لینے پر ایسے خونخوار نہیں ہو جاتی ہو گی۔"

"میرے پاس کوئی پین نہیں ہے۔" تین پین اس کے بیگ میں پڑے تھے۔

پامیلا نے اس سے کہا۔ "تھوڑی دیر کے لیے میری بکس اور لیپ ٹاپ کو سنبھال سکتی ہو مجھے کمپیوٹر ڈیپارٹمنٹ تک جانا ہے صرف چند منٹ کے لیے"

"میں خود بھی وہیں جا رہی ہوں۔" کہہ کر وہ تیزی سے آگے بڑھ گئی، نہیں وہ سائی کے پاس جا رہی تھی۔ پورا دن وہ نفسیاتی مریضنی رہی۔

چند دن گزرے تو وہ اس واقعے کو بھولنے لگی اسے اور بھی بہت کام تھے جیسے کہ پاکستانی اسٹوڈنٹ سوسائٹی کے ساتھ مل کر امرحہ سوشل ورک کر رہی تھی۔ مقامی ہسپتال کے لیے انہیں فنڈز اکٹھے کرنے تھے بچوں کے بہرے اور اندھے پن کے علاج کے لیے۔ امرحہ شزا سے اچھے خاصے پونڈز نکلوانے میں کامیاب ہو چکی تھی، ساتھ ہی شزا نے اسے اپنے "پرانے" اور "بے کار" بیگ جوتے اور کوٹ دیے جو امرحہ نے اپنے اور آرٹ ڈیپارٹمنٹ کی لڑکیوں کو اچھے داموں میں بیچ دیے۔ وہ عالیان کے پاس بھی گئی تھی۔ حقیقت یہ تھی کہ وہ پھر سے چھپ کر اسے دیکھ رہی تھی اور وہ ایک دم سے اس کے سامنے آگیا تھا۔

"میں فنڈز جمع کر رہی ہوں۔" وہ گھبرا گئی باکس آگے کیا۔ ثبوت!

اس نے چند پونڈز فنڈ باکس میں ڈال دیے اور جانے لگا۔

"بچوں کے اندھے اور بہرے پن کا علاج ہوتا ہے۔ علاج مہنگا ہوتا ہے، ہمیں زیادہ پونڈز چاہئیں۔" اس کی پشت سے گھوم کر وہ جلدی سے آگے آئی اس کا راستہ روک لیا۔ اسے زیادہ پونڈز نہیں اس کا زیادہ وقت چاہیے تھا۔

اس نے اپنے کراس بیگ میں سے ساری کتابیں نکال کر ہاتھ میں پکڑ لیں اور بیگ کے پیندے میں پڑے ہوئے سکوں کو اکٹھا کیا اور فنڈز باکس میں ڈال دیے۔۔۔ اور پھر سے جانے لگا۔

"کتنے شرم کی بات ہے عالیان۔۔۔! تم نے کتنا کم فنڈ دیا ہے۔"

"میرے پاس جتنے تھے میں نے سب اس باکس میں ڈال دیے ہیں۔" وہ بے زاری سے بولا۔

"یہ تو بہت بری بات ہے، بلکہ قریب قریب بے غرتی کی۔" اس نے کہتے اپنے بیگ میں سے جلدی سے دس پونڈز نکالے اور باکس میں ڈال دیے۔

"یہ دس پونڈ کی نوٹ میں نے تمہاری طرف سے باکس میں ڈال دی ہے۔ اب تم مجھے دس پونڈ واپس کر دینا۔۔۔ ٹھیک ہے کر دینا یاد سے۔" امرحہ کو اپنی بہادری پر حیرت ہوئی۔

عالیان خاموشی سے اسے دیکھ رہا تھا۔

"جب چاہے کر دینا میں جلدی نہیں مچاؤں گی۔"

امرحہ کو کرنٹ آئی جیسے وہ اسے دیکھ رہا تھا اس پر تو امرحہ نے یونی کے بیچ بیٹھ کر دھاڑیں مار کر رونا شروع کر دینا تھا۔ لیکن اس بار کوئی اس کے سامنے گھٹنوں کے بل آ کر نہیں بیٹھے گا، وہ یہ بھی جانتی تھی۔ اس بار مغرب بہ مشرق کا تال میل نہ ہوگا اس بار اسے چپ نہ کروایا جائے گا۔۔۔ نہ جان۔۔۔ نہ پہچان یونیورسٹی میں کوئی امرحہ نہیں۔۔۔ اسی یونیورسٹی میں کوئی عالیان بھی نہیں۔

کارل فوراً اس کے پاس آیا اور صرف دو پونڈ باکس میں ڈالے۔ "یہ لو آج سے ہم دوست ہیں۔" چمکدار دانتوں کی نمائش کی۔۔۔ خوامخواہ۔

امرحہ نے فنڈ باکس کو کھول کر دو پونڈ نکالے اس میں اپنے بیگ سے دو پونڈ نکال کر شامل کیے اور اسے واپس کیے۔

"یہ لو دوبارہ ایسی بات نہ کرنا۔" اس کی آخری دھمکی کی وجہ سے وہ نفسیاتی مریضن بن گئی تھی۔ اب یہ دوستی کی فرمائش بھی اسی کی کڑی ہو گی۔

کارل نے اپنی آنکھیں چندھیالیں اس کے پاس اس شہہ کی مات فی الحال نہیں تھی، وہ زیر لب مسکرایا۔ جب وہ ایسے مسکراتا تھا تو مطلب اس کا یہ ہوتا کہ مجھے اچھا لگا۔۔۔ بہت اچھا لگا۔۔۔ میں نے انجوائے کیا، ویسے وہ یونی کا ایک ایک لمحہ ہی انجوائے کر رہا تھا۔

وہ ہر کھیل کا بادشاہ تھا۔ اس کے سر پر فتح کا تاج سجتا تھا۔ یونیورسٹی میں وہ اسٹوڈنٹ یونین کے صدر سے زیادہ مقبول تھا اور ظاہر ہے اپنی حرکتوں کی وجہ سے تھا۔ اب یونی میں موجود کمپیوٹر کو ایک اسٹوڈنٹ استعمال کر کے اٹھتا ہے تو فوراً اس پر کارل بیٹھ جاتا ہے اپنے موبائل کو اس کمپیوٹر سے جوڑ کر ننھا منا سا لیکن خطرناک ہیکنگ سوفٹ ویئر عارضی طور پر انسٹال کرتا ہے اس کمپیوٹر پر استعمال ہوئے تازہ تازہ آئی ڈی کے پاس ورڈز کو توڑتا ہے اور بس۔

نہیں وہ بلیک میل نہیں کرتا۔۔۔ ہرگز نہیں وہ آئی ڈی اور پاس ورڈ کا غلط استعمال بھی نہیں کرتا، بس وہ تھوڑا سا ڈیٹا، کچھ تصویریں، کچھ پیغامات، کچھ چیٹ موبائل میں محفوظ کر لیتا ہے اور پھر اسے دی پرنٹ ورک کے کسی مہنگے ریسٹورنٹ میں لنچ ڈنر کروا دیا جاتا ہے، سینما کی ٹکٹ لے دی جاتی ہے، کھانے پینے کی دوسری اشیا اس کی وارڈ روب میں بھر دی جاتی ہیں اور اس کی وارڈ روب میں چند اور نئی شرٹس آجاتی ہیں، نئے شوز بھی اور اسے اپنی نئی کار استعمال کے لیے دی

جاتیں جنہیں وہ دنوں واپس نہ کرتا جب تک مانچسٹر کی ایک ایک سڑک کی سیر نہ کر لیتا۔ بس یہی سب چھوٹا بڑا۔۔۔ وہ بھی سب اپنی خوشی سے کرتے ہیں وہ مجبور نہیں کرتا۔

اسٹوڈنٹس کے گھروں میں Prank کالز کرنا بھی اس کا مشغلہ ہے، لیکن اس مشغلے کا استعمال وہ اس وقت کرتا جب وہ انسانوں سے بور ہو چکا ہوتا۔ وہ اسٹوڈنٹس کے بارے میں انتہائی سنجیدگی سے مختلف کہانیاں گھڑ کر ان کے گھر والوں کو سناتا اور اگلے دن وہ بے چارے ہال میں بھاگے آتے۔ آخر سلویا کیوں خود کشی کرنے جا رہی تھی۔۔۔ صرف سامنے کے دو دانت ٹوٹ جانے پر خود کشی۔۔۔؟

اور شیلے راتوں کو اٹھ اٹھ کر الو کی آوازیں کیوں نکالتا ہے وہ بھی کھڑکی سے آدھا دھڑ باہر نکال کر۔ کیا وہ الو کی طرح اڑنے کی کوشش بھی کرتا ہے؟ او گوش۔۔۔ اور یہ کرسٹی کو بلیوں سے اتنی الرجک کیوں ہونے لگی ہے کہ اس نے تین بلیوں کا قتل کر دیا اور انہیں اپنے بیڈ کے نیچے دفنا دیا اور جس دن اسے قتل کرنے کے لیے کوئی بلی نہیں ملتی وہ بلی کی صورت والی اپنی ہال میٹ لڑکیوں پر حملہ کر دیتی ہے۔۔۔ Dhuzz۔۔۔ Dhuzz کرسٹی قاتلہ بنے جا رہی ہے۔

اور روفی وہ کیا کرنا چاہتا ہے آخر، وہ اپنے کیمسٹری کے پروفیسر کو دیکھتے ہی پاگلوں کی طرح کیوں چلانے لگتا ہے اور ہال کی آخری منزل کی چھت پر آدھی رات کو چڑھ کر وہ کے آوازیں دیتا ہے۔ کیا گیا اس کا کہنا ہے کہ مارلن منرو اس سے ملنے آتی ہے۔ آہ میرا روفی۔۔۔ وہ تو بہت لائق تھا۔ ہال میں والدین اپنے پاگل دیوانے بیمار ذہن بچوں سے مل جاتے اور بچے سوچ سوچ کر پاگل ہو جاتے کہ آخر یہ کون ہے جو ان کے گھر راتوں کو فون کرتا ہے اور والدین یہ سوچتے کہ بچے ان سے کچھ نہ کچھ تو چھپا رہے ہیں۔۔۔ لیکن کیوں، اس کی کیا وجہ ہے۔۔۔؟

وجہ کارل تھی اور کافی بڑی وجہ تھی۔

امرحہ کافی آگے جا چکی تھی کارل سے مکالمہ میں اسے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ کارل بھاگ کر اس کے سامنے آیا۔

"ٹھیک ہے نہیں کرتا دوستی کی بات۔۔۔ ویسے میں بہت اچھا انسان ہوں۔"

"مجھے تم جیسے انسانوں سے دور رہنا چاہیے۔"

"میں پاکستان کو بہت پسند کرتا ہوں، کاش وہ میرا ملک ہوتا، خاص کر لاہور پر تو میں فدا ہوں۔" اس نے دل پر ہاتھ رکھ کر کہا۔

"مجھے تشویش ہو رہی ہے، پاکستان کی قسمت کو لے کر خاص کر لاہور کو لے کر۔"

"میں بزنس ٹائیکون بن جاؤں گا تو پاکستان کو کافی بزنس دوں گا۔"

"اف، اتنے برے حالات کبھی نہیں آئیں گے میرے ملک پر۔"

"دیکھو کر جتنے برے آنے تھے وہ تو تمہاری پیدائش سے آ چکے ہوں گے نا۔" پوری جان سے قہقہہ لگا کر چلا گیا۔

امرحہ تو سناٹے میں ہی آ گئی، اسے بہت بری لگی اس کی آخری بات، حقیقت میں اب تک کی جانے والی ساری باتوں اور حرکتوں میں سب سے زیادہ بری بات، وہ کون تھا اس کے ماضی کے بارے میں ایسی خطرناک بات کرنے والا۔

جس طرح کا کارل تھا اور جو بات وہ کر گیا تھا امرحہ کو یقین سا ہو گیا کہ وہ اس کی پیدائش کی تاریخ جان چکا ہے، ہاں ایسا ہو گیا ہے، وہ کسی نہ کسی طرح سے اس کا ماضی بھی جان چکا ہے، اب وہ یونی میں ان باتوں کا اشتہار لگاتا پھرے گا۔



وہ جان گیا کہ ڈین کو ویڈیو بھیجنے کا معرکہ مارنے والی پاکستان میں کس حیثیت کی مالک رہی ہے۔ امرحہ نے اپنا فون، اپنا بیگ چیک کیا کہ ضرور اس نے ان میں کوئی چپ (chip) لگا دی ہوگی یا ویرا سے لگوا دی ہوگی جس میں ویرا جینفر لارنس طرز کی صورت پر بجلی

صورت طاری کر کے کہہ دے گی۔

"مجھے کیا پتا تھا وہ تمہاری نحوست کے بارے میں جان جائے گا۔"

وہ اور دادا اکثر ماضی کے بارے میں بات کرتے رہتے تھے۔ وہ اپنے فون کو ایم ایس سی کرنے والے مارک کے پاس لے گئی اس سے اس کی اچھی ہائے ہیلو تھی۔

"مارک! اسے چیک کرو اس میں کوئی ایسا سسٹم تو فکس نہیں جس سے کوئی اور میری باتیں سن سکے۔"

"تم مذاق کر رہی ہو؟" فون اس نے ہاتھ میں لے لیا اور سیدھا ان باکس میں پہنچا کیونکہ یہ ایک یونیورسل عادت بن چکی ہے۔ فون کسی کا بھی ہو جانا سیدھا ان باکس میں ہوتا ہے۔

"میرے پیغامات پڑھنے بند کرو۔۔۔ میں سنجیدہ ہوں۔ اس میں کوئی ایسی چپ لگی ہے تاکہ کوئی میری ساری گفتگو سنتا ہے۔"

مارک سنجیدگی سے فون چیک کرنے لگا پھر سر اٹھا کر اسے دیکھا۔

"ہاں! تمہارا شک ٹھیک ہے۔ اس میں ایک سسٹم فکس ہے۔"

"اوہ، اف" امرحہ کا گلابی سفید رنگ سیاہ پڑ گیا۔

"تم اس بٹن کو دباؤ گی تو ساری یونیورسٹی دھماکے سے اڑ جائے گی اور اس بٹن کو دباؤ گی تو پورا مانچسٹر غائب ہو جائے گا۔۔۔ اور اس تیسرے بٹن کو دبانے سے تم خود غائب ہو جاؤ گی، تم لوگوں کو نظر آنا بند ہو جاؤ گی۔۔۔ میرا خیال ہے تم اس تیسرے بٹن کا استعمال کرو۔"

فون اس کے آگے کر کے وہ اسے ایک ایک بٹن کے بارے میں سنجیدگی سے بتانے لگا۔۔۔ بے حد سنجیدگی سے۔۔۔ پھر فلک شگاف قہقہہ لگایا۔

"کیا تمہارے پیچھے اسکاٹ لینڈ یارڈ کی پولیس لگی ہے امرحہ؟" ہنسنے سے فارغ ہو کر اس نے پوچھا۔

سب ایک سے بڑھ کر ایک تھے اسکاٹ لینڈ یارڈ کی پولیس بہتر تھی کارل سے۔۔۔ اسے کارل ناپسند تھا جبکہ وہ تو اتنا پیارا تھا۔۔۔ ہر فن مولا سا۔۔۔ سوچتا کرتا اور ہو جاتا۔۔۔ آخر کتنے ہیں دنیا میں ایسے لوگ۔۔۔؟

جب بھی وہ دیوار کے ساتھ کمر ٹکائے، ایک ٹانگ کو کھڑا دوسری کو ترچھا دیوار پر جمائے دونوں ہاتھوں کو جیب میں رکھے کھڑا ہوتا تو اس کی آرتی اتارنے کو دل چاہتا ایک تو اس لیے کہ وہ آس پاس والوں کو "مجھے رک کر، پلٹ کر دیکھو" پر مجبور کرتا دوسرا اس لیے کہ "یہ بھونچال یہاں کھڑا ہے، کاش تاقیامت یہاں ہی کھڑا رہے، یہیں کھڑے کھڑے اس کا مجسمہ بن جائے، زلزلہ یہ حرکت نہ کرے۔"

مائیکل اینجلو اس کا مجسمہ بناتا تو اسے ایک اور زندگی خدا سے مستعار لینی پڑتی صرف اتنی سی بات سوچنے کے لیے کہ وہ ایک خوب صورت انسان کا مجسمہ بنائے یا خوب صورت شیطان کا۔۔۔ یا۔۔۔ یا۔۔۔ بس زندگی تمام ہو جاتی اس کی۔

وہ بے حد گورا تھا گلابی گورا، نیلی آنکھیں، پتلی ناک، گھنی بھنویں، لمبی گردن اور ذرا سا ابھرا چہرہ۔۔۔ قد ویرا سے ذرا کم عالیان سے ذرا زیادہ۔۔۔ کبھی کبھی مونچھیں رکھ لیتا تو ایسے لگتا کسی قدیم سلطنت کا جنگجو سلطان ہے جو شیروں کو دائیں بائیں بٹھا کر طعام کیا کرتا تھا۔۔۔ اور ان ہی کی طرح دھاڑا کرتا تھا۔

ہاں وہ اتنا خوب صورت ضرور تھا کہ اگر گاؤں کی مٹیار سر پہ پانی کے گھڑے اپنی چکیلی کمر پر ٹکائے پگڈنڈی پر چلتے کارل کے پاس سے گزرتیں تو ضرور کہتیں۔

"وے تو کینا سوہنا اے۔۔۔ کج خدا دا خوف کر۔۔۔ وے تو اینا سوہنا کیوں اے۔۔۔؟"

کارل مسکراتا ہے اور شانے اچکاتا ہے۔۔۔ اور مٹیاروں کے بھی گھڑے۔۔۔ ہاہاہا۔۔۔ Dhuzz۔۔۔ Dhuzz۔۔۔ Dhuzz۔

رات کو امرحہ سادھنا کے کمرے میں آئی وہ آریان کے لیے چند تحائف پیک کر رہی تھی۔

"عالیان گھر کیوں نہیں آتا؟" امرحہ نے پوچھ ہی لیا۔

"وہ پہلے ویک اینڈ پر آ جاتا تھا پھر اس کی ماما نے منع کر دیا۔"

"منع کیوں کر دیا؟" امرحہ سادھنا کی مدد کرنے لگی۔
"میں نہیں جانتی ' کبھی کبھار رات گئے آجاتا ہے۔"
"کب۔ میں نے اسے کبھی آتے نہیں دیکھا۔؟"

"ایک دو بار سے زیادہ نہیں آیا ' رات گئے آتا ہے۔ کچھ دیر ٹھہر کر چلا جاتا ہے۔ زیادہ وہ کھڑکی کے راستے آنا پسند کرتا ہے۔ اسی لیے لیڈی مہر کے کمرے کی کھڑکی اندر سے بند نہیں ہوتی۔ اسی مہینے اس کی سالگرہ آنے والی ہے تو وہ آئے گا ایک کیک لے کر۔"
"اسی مہینے۔ اچھا تمہیں پکا معلوم ہے اسی مہینے نا۔؟"
"ہاں!" سادھنا مسکرانے لگی۔
"اچھا۔ یعنی وہ پھر چنا منا سا کیک لے کر کھڑکی کے راستے آئے گا۔" امرحہ یکدم خوش سی ہو گئی۔
لیکن اس بار اسے بچا ہوا کیک نہیں ملے گا' چلو کوئی بات نہیں۔ حالات برے ہو چکے تھے تو اچھے بھی ہو ہی جائیں گے۔ آخر کو ایک دن سب ٹھیک ہو ہی جائے گا۔ امید کے پودے کو پانی دیتے رہنا چاہیے اور اسے اتنا تناور کر دینا چاہیے کہ مایوسی کا جنگل دور دور تک اگنے ہی نہ پائے۔ ویسے بھی سادھی کہتا ہے۔
"اختتام پر سب نہ سہی لیکن بہت کچھ ٹھیک ہو جاتا ہے۔"
امرحہ کہتی ہے "اختتام پر سب برا ہو گا تو کچھ اچھا بھی تو ہو گا نا۔ بلکہ ضرور اچھا ہی ہو گا سب۔"
اور میرا یہ کہنا ہے کہ اختتام کو بھول جائیے۔ زندگی ہر پل صرف شروعات کا نام ہے۔ اسے تن دہی سے جاری و ساری رکھیں۔
اگلے دن یونی میں وہ کلاس لے کر نکلی ہی تھی کہ دادی نے بہت خاص وقت نکال کر اسے شرف بات چیت بخشا۔ وہ بھی ان کی پسند کے جوابات دیتی رہی۔

"نہیں ناچنے گانے والی جگہ پر نہیں جاتی۔ ہاں کلب نہیں جاتی دادی ' حلال گوشت ہی کھاتی ہوں ' سہولت سے مل جاتا ہے۔ جی وہ لوگ جاتے ہیں مجھے یونیورسٹی چھوڑنے ' پھر جاب پر۔ گھر لے کر بھی آتے ہیں اکیلی نہیں جاتی میں ' دادی بالکل اکیلی نہیں نکلتی گھر سے۔"
"تم پاکستان آ رہی ہو۔؟"
"پاکستان!" اس کا سانس اٹکنے لگا تو اصل بات یہ کرنی تھی۔
"کب ختم ہو رہی ہے تمہاری پڑھائی۔؟"
"کیوں کیا کرنا ہے آپ کو؟"
"تمہاری شادی اور کیا۔؟"
"کیا کہہ رہی ہیں دادی؟" اس نے چلا کر پوچھا۔
"شادی۔ شادی!" دادی اس سے زیادہ چلائیں۔
"آپ بول کیوں نہیں رہیں دادی! مجھے آپ کی آواز نہیں آ رہی۔"
"بول تو رہی ہوں۔ حماد کھوائے کیا ہوا اس کی تصویر تو نظر آ رہی ہے اسے میری آواز کیوں نہیں جا رہی۔"
"تمہاری آواز آ رہی ہے تمہیں۔ میں تمہیں نظر آ رہا ہوں کیا؟"
"دادی بولیں نا۔ کہاں چلی گئیں۔ اچھا میرا لیکچر ہے میں جا رہی ہوں۔"
وہ اسکائپ سے لاگ آف ہو گئی اور لفظ شادی شادی اس کے کانوں میں سائیں سائیں کرنے لگا۔
"تمہارا رنگ پیلا پڑ رہا ہے امرحہ۔" قریب سے گزرتی جیکلین رائے زنی کی۔



"-In the memory of
katy the cat
یہ وہ بورڈ تھا جو امرحہ کی کلاس فیلو لورین کی پشت پر زنجیر میں پرویا جھول رہا تھا۔ رات اس کی بلی کا انتقال ہو چکا تھا اور آج وہ سوگ منا رہی تھی۔ اس نے کالی شرٹ اور اسکرٹ پہن رکھی تھی اور بال برش نہیں کیے تھے منہ بھی نہیں دھویا تھا۔ رو رو کر اس کی

آنکھیں سرخ ہو چکی تھیں اور اس نے رات سے کچھ نہیں کھایا تھا یہ بھی نظر آ رہا تھا۔ امرحہ اس کے پاس گئی اس کی بلی کا افسوس کرنے۔ زندگی میں پہلی بار وہ کسی جانور کے مرنے کا افسوس کر رہی تھی اور کافی مشکل سے ہنسی روک کر رہی تھی۔
"کیسے مری بے چاری بلی۔؟"
"ایسے نہ کہو امرحہ! وہ بے چاری ہر گز نہیں تھی بہت بہادر تھی ' پرنسز تھی۔"
"او پرنسز کیٹی کیسے مر گئیں لورین۔؟"
غم کی شدت سے لورین پھر بے قابو سی ہو گئی آنکھیں ٹشو میں چھپالیں اور ایک ہاتھ سے اشارہ کر کے بتایا کہ اس کی موت کے بارے میں نہ پوچھا جائے اسے بہت تکلیف ہوتی ہے۔ امرحہ آنکھیں پٹ پٹا کر اسے دیکھتی رہی ' بلی کی یاد میں دونوں ہاتھ گود میں رکھے۔ اب سچ یہ تھا کہ امرحہ کو دور کے عزیزوں کی وفات پر رونا نہیں آیا کرتا تھا اب لورین کا ساتھ دینے کے لیے کیسے روتی اور لورین کی جان پر آخر کیا مصیبت ٹوٹ پڑی تھی کہ ایک بلی کے لیے ایسے جان ہلکان کر رہی تھی ' بلی ' سنجیدگی سے اس سے کیٹی پرنسز کا افسوس کر کے جاتے رہے ایک امرحہ ہی اس بے چاری لورین کا غم نہیں سمجھ پا رہی تھی۔
کچھ لوگ لورین جیسے حساس تھے کہ جانور کے لیے آنسو بہا رہے تھے اور کچھ کارل جیسے کہ انسانوں کو ہی خون کے آنسو رلا رہے تھے۔
امرحہ جاب سے واپس آ رہی تھی۔ رات کا وقت تھا وہ بس میں بیٹھی تھی جو تقریباً خالی ہی تھی۔
"ہائے ڈی کوئین!" کارل کی آواز اس کی نشست کی دوسری طرف کی رو کی نشست سے آئی اس نے ہڈ پہن رکھا تھا اور ہڈ کیپ سے سر کو پیشانی تک چھپا رکھا تھا۔

امرحہ اپنے چہرے پر وہ بے زاری لے آئی جو دادی اسے دیکھ کر لے آیا کرتی تھیں ' اب وہ بھی دادی کا قصور نہیں تھا جس لوگوں کو دیکھ کر ایسے ہی منہ بن جایا کرتے ہیں۔ آج کی رات خوفناک خواب دیکھتے گزرنے والی تھی کہ رات کے اس وقت اسے جو دیکھ لیا تھا وہ اور عالیان سائیکل کا استعمال بہت کرتے تھے خدا جانے آج وہ بس میں کیوں سوار تھا۔
"تم مجھے بری طرح سے نظر انداز کر رہی ہو ' آخر کو ہم یونی فیلو ہیں۔ پھر میرے تم پر کتنے احسانات بھی تو ہیں خاص کر وہ ' اگر میں ہارٹ راک میں وہ ڈرنک نہ چکھواتا تو سوچو عالیان جیسا بور انسان تمہارا سر کھا رہا ہوتا اور تم مجھ جیسے پرفاسٹ ' پر ہیرو سے محروم ہو جاتیں۔"
"کتنی بد قسمت لڑکی ہو گی وہ جس کا وہ ہیرو ہو گا یعنی بیوی بے چاری نے ایسے ہی مذاق میں کوئی بات کہہ دی اور کارل نے اس مذاق کا جواب دینے کے لیے اسے چھت سے الٹا لٹکا دیا یا فریج میں بند کر دیا ورنہ لانڈری مشین میں ٹھونس کر گھما دیا اور نہیں تو غریب کا ایک آدھ کان ہی کاٹ لیا۔" امرحہ سوچتی رہی اور کھڑکی سے باہر دیکھتی رہی۔
"آج صرف تمہارے لیے میں بس میں سوار ہوا ہوں۔"
امرحہ نے ذرا سی گردن موڑ کر اس کی طرف دیکھا ' مسکراہٹ اس کی آنکھوں میں چمک رہی تھی۔ امرحہ کو خوف سا آیا "یہ یہاں کیا کر رہا ہے۔"
"بس کے کرائے میں ' میں اپنے پونڈ ضائع نہیں کرتا۔" وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا اور اس کی نشست کے پاس آ گیا۔
"جو وہ پونڈ تم نے مجھے دیے تھے ان میں چند پونڈ اور ملا کر میں یہ لے آیا ہوں۔" اس نے وہ ہاتھ جو ہڈ پاکٹ میں تھا نکالا اور چھن سے ایک ہتھکڑی نکل کر سامنے آئی۔ پلک جھپکنے کی دیر تھی کارل نے اس کے ہاتھ جو اگلی نشست کی پشت کے گول راڈ پر رکھا تھا میں ہتھکڑی ڈال کر راڈ کے ساتھ لاک کر دیا۔
"یہ۔" امرحہ دنگ رہ گئی اس نے ہتھکڑی کو جھٹکا دیا۔
"کارل کیا بدتمیزی ہے یہ؟"

"بدتمیزی نہیں جواب' میں ادھار نہیں رکھتا' لڑکیوں کا تو بالکل نہیں۔" وہ بڑی شان سے مسکرایا "کیونکہ میں Count Destroyer ہوں نا۔"

"کارل مذاق بند کرو۔"

"مذاق کل یونی میں کریں گے۔" کہتا وہ اسٹاپ پر رکتی بس سے اتر گیا۔

"کارل!" وہ اٹھ کھڑی ہوئی ہتھکڑی جھٹکنے لگی۔

"کارل رک جاؤ۔ اسے کھول کر جاؤ۔" وہ چلائی لیکن کانوں میں ایئر فون لگائے تیز انگلش میوزک پر آڑا ترچھا ہوتے وہ دور ہوتا چلا گیا۔

بس میں سوار چھ افراد اسے دیکھنے لگے۔

"میری مدد کریں۔" وہ تیز آواز میں چلائی سب بیٹھے دیکھ رہے تھے آگے نہیں آرہے تھے اس کی آواز پر جیسے چونک گئے اور اس کی طرف آئے۔

"اوہ۔ یونیورسٹی کے جوڑے جو نہ کریں وہی کم ہے۔ آخری اسٹاپ تک انتظار کریں وہیں کچھ ہوگا میں آفس فون کر دیتا ہوں' وہ اسے کھولنے کا انتظام رکھے۔" ٹکٹ چیکر نے کہا۔

آخری اسٹاپ آتی دور اور پھر رات۔ امرحہ نے گہرے گہرے سانس لے کر خود کو نارمل رکھنا چاہا ورنہ غصے سے وہ راڈ کے ساتھ سر پھوڑ لینے کو تھی' یہ اس نے کیا کیا اس نے کارل جیسے فتور سے ٹکر کیوں لی کیا ضرورت تھی' کتنی پاگل تھی امرحہ۔ ایک ایسی لڑکی جو سردیوں کی راتوں میں کچن تک اکیلے پانی پینے نہیں جایا کرتی تھی اس نے ڈین کو کارل کی ویڈیو بھیج دی۔ ایک ایسی لڑکی بھی جو چوہے کو چھت سے دیکھ کر آسمان ہلا دینے والی چیخیں مارنے والی نسل سے تعلق رکھتی تھی' اس نے "دی کرائے کنڈ" کی نسل سے تعلق رکھنے والوں سے ٹکر کیوں لی۔ اس نے یہ فاش غلطی کیوں کی۔ ایک ایسا ماحول جہاں لڑکیاں ہلکی رفتار سے چلتی بس کے پائیدان کے راڈ کو پکڑ کر اس میں بیٹھ جانے کو بڑا معرکہ سمجھتی ہیں وہ یونیورسٹی آر کے سر کرنے والوں کو کیسے اور کیوں للکار بیٹھی۔

وہ ایک ایسے ماحول سے تھی جہاں لڑکی کار تو چلاتی ہے اسے دھکا نہیں لگاتی وہ سر اٹھا کر اونچی دیواروں' عماروں' مکانوں کو ضرور دیکھتی ہے انہیں پھلانگنے کا نہیں سوچتی۔ حفاظت کے پیش نظر اگر کوئی گن' پستول گھر میں رکھی ہے تو وہ تا عمر اسے ہاتھ میں پکڑ کر نہیں دیکھتی کہ اسے کھول کر اس میں میگزین کیسے بھرتے ہیں اور اسے چلانے کے لیے سیکھنے کی جرات بھی نہیں کرتی کہ یہ اس کا کام نہیں ہے۔ بھلے سے چور' ڈاکو' قاتل اس کے پیٹ میں دو گولیاں اتار دے وہ ایک گولی بھی چلانے کی جرات نہیں کرے گی کہ یہ تو اس کا کام ہی نہیں ہے۔ یہ کام تو اس کا باپ کرے گا' بھائی' شوہر یا بیٹا وہ نہیں۔

بجلی کے فیوز ٹھیک کرتے یہ اپنے باپ بھائی کے پاس اوزار لے کر کھڑی ہو جاتی ہے اس فیوز کو خود سے ٹھیک کرنے کی غلطی نہیں کرتی۔ سیکھنے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ بھلا وہ کیوں سیکھے اور کرے یہ کام تو مردوں کے ہیں نا۔ جانے کس کی کتاب میں لکھا ہے کہ یہ سارے کام صرف مرد ہی کریں گے۔

بس کی نشست سے بندھی بیٹھی وہ رو دینے کو ہوگئی لیکن روئی نہیں' بائیں ہاتھ سے فون نکالا ویرا کو کیا وہ تو بھڑک اٹھی۔

"تم پہلے ہی میری ناک کٹوا چکی ہو۔"

یعنی ویرا کی ناک کا دارومدار بھی اسی پر تھا۔

"لوکٹ گئی ناک۔ آتی ہوں میں اس وقت تک تم جی بھر کر رولو۔ مینڈکی۔" وہ دھاڑی۔

آخری اسٹاپ پر بس رکی تو ٹرانسپورٹ کے عملے کا ایک رکن اس کی ہتھکڑی کھولنے کی کوشش کرنے لگا۔ رات کے اس وقت وہ کٹر حاصل کرنے میں ناکام ہو چکے تھے۔ ہانپتی کانپتی ویرا بس میں آئی اس کا سانس بری طرح سے پھول رہا تھا۔

"ہٹیں میں کرتی ہوں۔" آتے ہی اس نے سب کو ایک طرف کیا اور ہاتھ میں پکڑی باریک سلاخ سے چند منٹ کی کوشش سے اس کی ہتھکڑی کھول دی۔

جب وہ ہتھکڑی کو کھولنے کی کوشش کر رہی تھی تو عملے کے چھ ارکان اسے مشکوک انداز سے دیکھ رہے تھے۔

"تم پولیس میں ہو کیا؟" ایک نے پوچھ ہی لیا۔

"میں پولیس میں کیوں ہوں گی میں سابقہ سی آئی اے ایجنٹ ہوں۔" ویرا نے بھنویں تان کر سنجیدگی سے کہا۔

"سابقہ کیوں؟" شک اور بڑھ گیا۔

"میں نے بارک اوباما کو قتل کرنے کی کوشش کی تھی' گن میں اس کی کنپٹی پر رکھ چکی تھی۔" ویرا نے پہلے سے زیادہ سنجیدگی سے کہا اور اسے لے کر بس سے اتر آئی۔ ان چھ کی شکلیں دیکھنے لائق تھیں۔

"تم واقعی میں سی آئی اے کی ایجنٹ رہ چکی ہو۔ تم نے اوباما کو مارا کیوں نہیں؟" ویرا کو سب آتا تھا' نہیں وہ مانچسٹر یونی سے ماسٹرز ان بزنس ایڈمنسٹریشن کیوں کر رہی تھی۔

ویرا نے جواب میں اس کی گردن دبوچ لی۔

"تم میرے پیلا کے پاس جاؤ گی یا انہیں یہاں بلواؤں۔"

"انہیں بلوالو۔ لیکن کارل کے لیے۔ التجا کرتی ہوں میں ویرا!" امرحہ نے دونوں ہاتھ جوڑ کر کہا۔

"وہ چھوٹے موٹے کیس ہینڈل نہیں کرتے۔" ویرا نے غصے سے اپنی بولر کو سٹارٹ کیا۔ "تمہارے لیے آسکتے ہیں تم ہو مشن امپاسبل۔"

سارے راستے ویرا غصے سے بڑبڑاتی رہی اسے سناتی رہی وہ چپ کر کے بی بی سی۔ ویرا اسروس کی رہی۔

ویرا نے جا کر بائیک روکی وہ ہوسٹل کا گیٹ تو نہیں تھا۔ وہ تو وہ جگہ تھی جہاں عالیان رہتا تھا اور ساتھ ہی کارل ہمارا کارل۔

"ویرا! تم یہاں کیوں آئی ہو؟"

"چلو تم اندر ایک مکار و کارل کے ..." ویرا نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں مضبوطی سے لیا۔

"نہیں میں نہیں جاؤں گی اندر مجھے کچھ نہیں کہنا کارل سے۔ بس ختم۔"

"پھر مجھ سے دوستی ختم کرو۔" Anselm ہال کے باہر وہ دونوں آمنے سامنے کھڑی تھیں' ایک ہاتھ چھڑا کر بھاگ جانے کو تھی "امرحہ" ایک ہاتھ سے گھسیٹ کر اندر لے جانے پر مصر تھی "ویرا"

"مجھے تمہاری جیسی بزدل دوست نہیں چاہیے۔" ویرا دھاڑی۔

"میں اندر چلی جاتی ہوں لیکن میں کارل کو کچھ نہیں کہہ سکتی۔ میری بات سمجھنے کی کوشش کرو۔ میں یہ نہیں کر سکتی۔"

جواب میں ویرا اسے اپنے ساتھ اندر لے آئی اور اندر داخل ہوتے ہی گرج دار آواز میں نظر آنے والے پہلے لڑکے سے کارل کے بارے میں پوچھا۔ کوریڈور میں اور بھی لڑکے تھے ویرا کی آمد اور ایسی آواز سے متوجہ ہو گئے۔

"وہ وہاں میوزک بار میں۔" شاہ ویز نے پورے دانت نکال کر ہاتھ کا اشارہ کر کے بتایا بھی اور ساتھ آگے کو بھی ہو گیا کہ آئیے محترمہ کارل پر جو عذاب نازل کرنا ہے اس کے لیے میں آپ کو چشم ہوں اس کار خیر میں میرا حصہ بھی ڈالتے جائیے۔

آس پاس کے جو دوسرے تھے وہ بھی میوزک بار کی طرف بڑھنے لگے ایسے بنا ٹکٹ کا فرسٹ شو کون مس کرنا چاہے گا بھلا۔

کچھ لڑکے اوپر کی طرف لپکے کہ باقی ہال میٹس کو بھی بلا لائیں کہ ویرا کارل کو پوچھتی اس وقت آئی ہے اور اس انداز میں آئی جیسے ہال سے باہر روس کی فوج کو پوزیشن لیے کھڑا کر آئی ہو "ایک' دو' تین۔ فائر۔"

اندر نظر دوڑائی ویرا نے امرحہ کا ہاتھ مضبوطی سے تھام رکھا تھا۔ میوزک بار کے دروازے میں کھڑے ہو کر اس نے میوزک بار میں سامنے کاؤنٹر تھا جس کے پار تین بار ٹینڈر کھڑے تھے۔ کاؤنٹر کے عین سامنے والے حصے میں کرسیوں اور میزوں کو پار کر کے اسنوکر ٹیبل رکھا تھا جس پر کارل اسنوکر کھیل رہا تھا۔ باقی اسٹوڈنٹس ادھر ادھر کھڑے اور بیٹھے تھے۔

کارل اسنوکر اسٹک (Stick) کو پکڑے ٹیبل پر جھکے ایک [illegible] گیند کو ہٹ کرنے ہی لگا تھا کہ

ویرا دانت پیس کر کہا۔

"کارل!" کارل نے آنکھ کھولی، مسکرایا اور اس طرف سر گھما کر دیکھا جس طرف ویرا کھڑی ہی نہیں تھی۔ ڈرامے باز۔ پھر اس نے سر اٹھایا ویرا کی طرف گھمایا۔ ویرا اس کے ساتھ امرحہ۔ اور امرحہ کے آگے پیچھے Anselm ہال کا مجمع۔ "اٹس شو ٹائم یونی چک۔"

Its show time uni chick

"امرحہ! تم آ گئیں کافی دیر لگ گئی تمہیں تو آنے میں۔" اس نے دیوار گیر گھڑی کی طرف دیکھ کر کہا۔

"بہت سست ہوتی ہے ٹرانسپورٹ کی انتظامیہ۔ اگر میں مانچسٹر کا میئر بن گیا جو کہ مجھے بننا ہی ہے تو میں ضرور اس طرف توجہ دوں گا لیکن میرے میئر بننے کے وقت کے آنے سے پہلے تک کے لیے سوری۔"

اسنوکر اسٹک اس نے ایسے ہاتھ میں پکڑ رکھی تھی جیسے اے ایس فائیو زیرو کی Sniper Rifle یہ ویرا کو نشانے پر رکھا تھا۔ ٹھاہ ___Dhuzz

ویرا ڈیڈ مین کی سنجیدگی لیے اس کے قریب جا کر کھڑی ہو گئی۔ "ویرا یہ کر سکتی تھی۔"

"ویرا! تم مجھے اتنے پیار سے کیوں دیکھ رہی ہو... مجھے تشویش ہو رہی ہے میں دل کے عارضے سے ہلاک ہونا نہیں چاہتا۔"

ویرا نے اپنا وہ ہاتھ جو اس کے کراس بیگ کی جیب کے اندر تھا نکالا اور ہاتھ میں پکڑی بوتل کا اسپرے اس کی آنکھوں پر کر دیا۔ ایک دم سے۔

"آؤ!" کارل چلا اٹھا اور آنکھوں پر ہاتھ رکھ لیے اور تیزی سے پانی کی تلاش میں باہر کی طرف لپکنا چاہا کہ ویرا نے دوسری بوتل نکالی اور آنکھوں کو رگڑتے "آؤ آؤ" کرتے ادھر ادھر میز کرسی سے ٹھوکر کھاتے کارل پر تیزی سے اسپرے کرنے لگی۔

"او گوش۔ اتنی گندی بدبو۔" ایک ایک نے اپنی ناک پکڑ لی امرحہ کو بھی اپنی ناک پکڑنی پڑی۔

جتنے لڑکے کارل کے پاس کھڑے تھے وہ تیزی سے کارل سے دور ہوئے۔ بدبو کی انتہا تھی بس۔ ویرا نے پوری بوتل خالی کر دی۔ پھر ہاتھ باندھ کر ہنٹر مار اسٹائل میں کھڑی ہو گئی۔

"اب کچھ بھی کر لو کارل! ایک ہفتے سے پہلے اس شینل فائیو سے چھٹکارا حاصل نہیں کر سکتے۔ میں سائنس دان بن گئی تو ضرور اس خوشبو سے جلد چھٹکارا پانے کے لیے کچھ کروں گی، لیکن میرے سائنس دان بننے کے وقت کے آنے سے پہلے تک کے لیے سوری کارل۔"

امرحہ کا جی چاہا کہ وہ تالیاں بجائے لیکن اس نے ایسا نہیں کیا وہ چپ تو میوزک بار کے دروازے کے ساتھ شانہ ٹکائے کھڑے عالیان پر اس کی نظر پڑی وہ بہت سنجیدہ نظر آ رہا تھا اور بیزار بھی۔ امرحہ نے سوچا کہ وہ ایسے ہی کھڑا رہے اور باقی سب غائب ہو جائیں تو کتنا اچھا رہے۔

امرحہ کا ہاتھ پکڑ کر ویرا باہر نکلی اور اپنے پیچھے انہوں نے قہقہوں کا طوفان اٹھتے سنا۔ ہال کے اسٹوڈنٹس کارل کو گدھوں کی طرح ہنس رہے تھے ان میں عالیان بھی شامل تھا۔ ان سب نے مل کر میوزک بار کے دروازے کو بند کر لیا تاکہ وہ باہر نہ جا سکے۔ کاؤنٹر پر رکھی کسی کی سوفٹ ڈرنک سے کارل نے اپنی آنکھیں دھونی چاہیے لیکن شاہ ویز نے ایک کر ڈرنک اس کے ہاتھ سے چھین لی۔ سب نے سامنے سے ڈرنکس اٹھا کر کارل سے دور کر دیں۔ "امرحہ دی لاسٹ ڈک۔ کارل دی آخ... خ... خ۔" عالیان نے اس کے قریب جا کر اپنی ناک پکڑ کر کہا۔ کارل نے اسے دھکا دے کر پیچھے کیا اور میوزک بار سے باہر جانا چاہا اس کی آنکھیں جل رہی تھیں اسے ایک پل قرار نہیں آ رہا تھا۔ لیکن سب لڑکے بار کے دروازے پر براجمان تھے وہ اسے باہر جانے نہیں دے رہے تھے دھکا مار کر پیچھے کر دیتے۔

"ایک ایک کو دیکھ لوں گا میں۔" کارل چلایا۔

"دیکھ لینا۔ ابھی تو ہمیں سونگھ لینے دو۔ اف آخ خ۔"

کارل نے عالیان کو دبوچ لیا۔ "تو سونگھو مجھے۔ آؤ میرے پاس۔"

عالیان کا بدبو سے دم گھٹنے لگا۔ کارل ایک ایک کے قریب جا کر انہیں دبوچ رہا تھا۔ "تو گلے ملو مجھ سے۔ آؤ۔" ساتھ وہ ہنستا جا رہا تھا عالیان تو ہنس ہنس کر دیوانہ ہو رہا تھا۔

کارل نے رک کر چندھی آنکھوں سے عالیان کو دیکھا۔ "یہ منظر اچھا لگا۔"

"اسے تنگ کرنے میں بہت مزا آتا ہے اس کی شکل دیکھنے والی ہوتی ہے۔" کارل عالیان کی گردن دبوچتے ہوئے کہا۔

"شینل فائیو کی خوشبو بھی سونگھنے والی ہے۔ اف اتنی بدبو۔ آخ۔"

"میں تمہاری ناک پھوڑ دوں گا۔"

"جتنی بدبو ہے یہ کام ہمیں خود ہی کرنا پڑے گا۔ ہال ایک ہفتے کے لیے خالی کر دو سب۔"

"کارل کو ہی نکال باہر کرتے ہیں نا سب۔" شاہ ویز چلایا۔

اور پھر سب نے مل کر اسے اٹھایا اور ہال سے باہر پھینک آئے۔

ساری رات S.T.Anselm ہال میں یہی سب چلتا رہا۔ ہنس ہنس کر ان کے سر درد کرنے لگے تھے وہ اسے بار بار اٹھا کر باہر پھینک رہے تھے۔

کارل کو عطر معطر کرنے کے بعد مانچسٹر کی سڑکوں پر سے گزرتے ویرا ہنس ہنس کر پاگل ہوئی جا رہی تھی۔

"تمہیں یہ سب کس نے سکھایا ہے۔ تم نے میری کھوپڑی بھی کھول دی۔"

"پاپا نے۔ روس رہتے ہیں وہ۔ تم ڈگری لے لو تو روس آنا۔"

"اچھا! پاپا بالکل تمہارے جیسی ہو جاؤں گی؟"

"یا میرے جیسی ہو جاؤ گی یا پاپا سے بھی بڑھ جاؤ گی۔"

ویرا سائیکل سے اتر گئی۔

"چلو تم سائیکل چلاؤ۔"

"مجھے نہیں آتی۔"

"چلاؤ گی تو آ جائے گی۔"

"مجھے سیکھ کر کیا کرنا ہے؟"

"سیکھنے سے پہلے کیا کیوں نہیں کرتے۔" ویرا نے اسے زبردستی سائیکل پر بٹھایا اور ہینڈل کو پکڑے رکھا لیکن اس نے بیٹھتے ہی سائیکل گرا دی۔ ویرا نے اسے اٹھایا بٹھایا اس نے چند پیڈل مارنے کے بعد پھر خود کو اور سائیکل کو گرا دیا۔ ویرا نے اسے پھر چلانے کے لیے کہا۔

اگر سکھانے والا نہیں تھک رہا تھا تو سیکھنے والے کو بھی کچھ شرم کرنی چاہیے تھی۔ سائیکل گر گر کر چلتی رہی۔ امرحہ "قریباً" "قریباً" سنسان ہوتی سڑکوں پر سائیکل گرا اور چلا رہی تھی۔ اسے اچھا لگ رہا تھا۔ گر گر کر اٹھنا اٹھ کر گر جانا۔ ابتدا ایسے ہی ہوتی ہے 'گرنے سے ڈرنا نہیں چاہیے۔ جلد ہو جانے سے' حرکت نہ کرنے سے خوف کھانا چاہیے۔ جب ساری کائنات کتاب بنی کھلی پڑی ہو تو انسان کو شاگرد ضرور بن جانا چاہیے۔ دیر نہیں کرنی چاہیے۔ دیر ہو جائے تو مزید دیر نہیں کرنی چاہیے۔

آسمانوں کے سب ہی دروازے کھلے پڑے ہیں۔ آئیں ان دروازوں کے اس پار کو جائیں۔ اس سے اگلے پار۔ کیونکہ یہ سب انسان کو ہی کرنا ہے۔ اور یہ سب انسان ہی کر سکتا ہے۔

زمین بچھی ہوئی ہے اور فلک تنا ہوا ہے اور کائنات لامحدود پھیلتی جا رہی ہے اور ہر لمحے یہ پکار کرتی ہے "آؤ اور مجھے پالو۔ میرے فاتح بن جاؤ۔"

☆ ☆ ☆

"وقت تمہیں زندہ رکھے عالیان۔
بہاریں تم پر فدا ہو جائیں۔ وہ تم سے جدا ہونے پر نالاں رہیں۔

قسمت کا قلم اگر تمہارے لیے کوئی دکھ لکھنے کا ارادہ رکھتا ہے تو میں سر کو سجدے میں جھکاتی ہوں اور دعا کرتی ہوں کہ ایسا کرنے سے پہلے قسمت کی یادداشت کھو جائے اور وہ تمہارے نام دکھ لکھنا بھول جائے۔

جو دروازہ کھلتا ہے وہ بند بھی ہوتا ہے تم پر بھی بند

دروازوں پر دستک دینے کی نوبت نہ آئے۔
رحمتوں کے دروازے تم پر کھلیں اور انہیں کبھی بند ہونے کا حکم نہ ملے۔ اور تمہاری جان میں آب حیات حلول کر جائے۔"

پورے چاند کے آسمان اور چھن من ستاروں سے سجی رات میں وہ کھڑکی کے پاس کھڑی اپنے ہاتھ سے بنائے کارڈ پر لکھی دعاؤں کو زیر لب دہرا رہی تھی' بار بار۔ وہ ان میں مزید دعاؤں کا اضافہ کر رہی تھی۔

"بے سکونی کے سائے اندھے اور بہرے ہو جائیں تم تک آنے کے لیے انہیں کوئی راہ دکھائی اور سجھائی نہ دے۔"

وہ کھڑکی میں کافی دیر سے کھڑی تھی ہر آہٹ پر اسے لگتا تھا بس وہ آگیا ہے جبکہ بارہ بجنے میں کافی وقت تھا۔

اور وہ وقت سے دس منٹ پہلے آگیا تھا۔ بیگ کو پشت پر لٹکائے اس میں چھوٹا سا کیک چھپائے بادام کا منا سا کیک کاٹ لیا گیا تو وہ واپس جانے لگا۔ امرحہ اپنی کھڑکی میں ہی کھڑی تھی نجانے کیوں اسے امید تھی کہ وہ ایک بار تو ضرور اس کے کمرے کی کھڑکی کی طرف دیکھے گا۔ لیکن جیسے خاموشی سے وہ آیا تھا ویسے ہی خاموشی سے جا رہا تھا۔ وہ جا رہا تھا۔

اس کی چال میں شکست خوردگی اتنی نمایاں ہو گئی کہ امرحہ کا دل پھوٹ پھوٹ کر رونے کو چاہا' جو جگنو اس کے گرد گول گول گھومتے نظر آئے تھے' وہ اس کے قدموں تلے مردہ ہونے لگے۔ وہ ٹمٹما کر بجھ رہے تھے۔

امرحہ کا جی چاہا کہ بھاگ کر جائے اور ان مردہ جگنوؤں کو پھونکیں مار مار کر اس کے گرد گول گول گھومنے پر مجبور کر دے ورنہ التجا ہی کر لے۔ ورنہ آواز دے کر اسے روک لے اور کہے کہ بادام کیک مجھے چاہیے۔ ضرور ہی چاہیے۔ مجھے دے دو عالیان۔ پلیز۔ لیکن اس نے آواز نہیں دی اور اسے کیک بھی نہیں ملا۔

ابھی وہ نظروں سے اوجھل نہیں ہوا تھا کہ اس نے مڑ کر اس کھڑکی کی طرف دیکھا جس سے وہ ایک بار کودا تھا۔

امرحہ نے دیکھا کہ اس نے گردن کو موڑ کر دیکھا۔ ہاں اس نے دیکھا۔ اور پھر فوراً" ہی گردن گھمالی جیسے کسی نے اس کے پیروں تلے کی زمین کھینچ لی ہو۔

اپنے پیچھے اندھیرے کو چھوڑتے وہ چلا گیا۔ امرحہ کھڑکی میں ہی کھڑی رہ گئی۔

"یہ مجھے کبھی معاف نہیں کرے گا۔" امرحہ نے خود سے چھپ کر سرگوشی کی۔

"میں اس سے کبھی معافی حاصل نہیں کر سکوں گی۔" اپنے گالوں کو اس نے کھڑکی کی چوکھٹ کے ساتھ ٹکا دیا۔

"اب مجھے اس سے خوف آتا ہے اور یہ ایک خوفناک جذبہ ہے۔"

قسمت کے اندھیرے جنگل میں سرسراہٹ ہوئی' دعائیں ان میں سے ہو ہو کر گزریں۔ امرحہ نے اللہ کو اسی شدت سے یاد کیا جس شدت سے اس کے گم ہو جانے کے بعد کیا تھا۔ اس نے دعا کی تھی کہ وہ گم ہو چکے عالیان کو واپس لے آئے۔ اور اب بھی اس نے یہی دعا کی۔ "گم ہو چکا عالیان واپس آجائے۔ اے خدا۔"

☆ ☆ ☆

یہ اگلی رات کا قصہ ہے۔

وہ اپنی جاب سے واپس آرہی تھی بس اسٹاپ کی طرف پیدل۔ آج پھر سے اس نے ایک گاہک کا دس ہزار پونڈ سے زیادہ کا بل بنا دیا تھا جبکہ اس کے جوتے کی قیمت صرف سو پاؤنڈ تھی۔

صبح اس نے اٹھ کر سفید کارڈ پر ننھے' پیلے' سرخ سرخ ستارے چپکا دیے تھے' پھر شال کاک کے لان میں سے ایک پیلا پھول توڑ کر احتیاط سے بیگ میں رکھ لیا تھا۔ زیادہ پھول وہ لے کر نہیں جا سکتی تھی۔

جلدی جلدی کرتے بھی جب وہ صبح اس کے ڈیپارٹمنٹ تک گئی تو وہ کلاس میں جا چکا تھا۔ حالات پہلے جیسے نہیں تھے کہ وہ اس کی کلاس میں جا کر کہتی کہ میری بات سن لو' اسے اپنی کلاسز بھی لینی تھیں۔

عالیان کوئی لیکچر مس نہیں کرتا تھا اس کی آخری کلاس کے وقت سے ذرا پہلے وہ اس کے ڈیپارٹمنٹ آگئی۔

وہ' ویرا اور چند دوسرے دوست ایک ساتھ باہر نکلے' عالیان کے ہاتھ میں چند کارڈز تھے اور اس کے کراس بیگ میں سے پھول جھانک رہے تھے۔ امرحہ نے عالیان کے اکیلا ہونے کا انتظار کیا۔ اسے کارل کا بھی ڈر تھا کہ وہ کہیں قرب جوار میں ہی نہ ہو۔ عالیان کو اپنی سائیکل کی طرف جاتا تھا اس کی سالگرہ کا دن تھا لیکن وہ مسکرا نہیں رہا تھا اس سے زیادہ تو وہ امرحہ کی سالگرہ کے دن مسکرا رہا تھا۔

ویرا عالیان کے ساتھ ہی تھی' ویرا کو بھی اپنی سائیکل لینی تھی' لیکن ویرا نے اپنی سائیکل نہیں لی۔ وہ عالیان کی سائیکل کے پیچھے بیٹھی۔

امرحہ ذرا دور خود کو چھپا کر کھڑی تھی۔ کھڑی کی کھڑی ہی رہ گئی۔

ویرا نے آج اپنی خوب صورت گلابی پھول والی فراک کیوں پہن رکھی تھی گلابی جوتے اور لمبے بالوں کو اس نے آج کس محنت سے سنوارا تھا۔ امرحہ آج اس کے ساتھ سائیکل پر نہیں بیٹھی تھی جیسا کہ اب اکثر وہ یونی میں آجایا کرتی تھی۔ وہ سچ ویرا کو دیکھ نہیں سکی تھی۔ ویرا جو یونی میں اپنی خوب صورتی کے لیے مشہور تھی آج اس خوب صورتی کو چیلنج کرتی نظر آرہی تھی؟

عالیان نے سائیکل چلائی اور ویرا نے بیٹھے بیٹھے شرارت سے اس کی سائیکل کو گرانے کے لیے ہلایا اور سائیکل ڈگمگا گئی۔

کتنا برا منظر تھا یہ مانچسٹر میں دیکھا جانے والا سب سے برا منظر۔ مانچسٹر میں وقوع پذیر ہونے والا بدترین منظر۔

یونیورسٹی کے در و دیوار سے آکاس بیلیں لپٹ گئیں۔ آکسفورڈ روڈ پر دلدلی جھاڑیاں جا بجا پھوٹنے لگیں اور آکسفورڈ روڈ دلدل میں بدل گیا۔

چرچ کے گھنٹے کی ٹن ٹن ٹن نے مانچسٹر کے آسمان کو سر پر اٹھا لیا۔ پیلا پھول بیگ میں رکھے رکھے اپنی موت آپ مر گیا۔ سفید کارڈ پر چپکے ستارے جھڑنے لگے۔ "غائب ہوا وقت انسان کا فرماں بردار نہیں ہے۔"

اس کے بازو پر سخت گرفت پڑی۔ امرحہ چونکی وہ بس اسٹاپ سے آگے نکل آئی تھی۔ وہ اتنی ست روی اور معلق سی حالت میں چلتی رہی تھی کہ رات کافی ہو چکی تھی۔

اس کے بازو پر پڑنے والی گرفت نے اسے پتلی سڑک کے اندر گھسیٹا وہ چیخ مارتی اس سے پہلے ہی ماسک سے منہ کو چھپائے اس انسان نے غرا کر کہا۔

"تمہاری آواز نکلی تو میں تمہاری کھال ادھیڑ دوں گا۔" چیخ کی آواز کے ساتھ ایک تیز دھار چاقو نکلا اور اس کی پسلی کے ساتھ مس ہوا۔

سارے جہان کا خوف امرحہ کی آنکھوں میں سمٹ آیا' بند سڑک کے نیم اندھیرے ماحول میں اس نے کالے ماسک میں پوشیدہ آنکھوں کو دیکھا جن کی پتلیاں' بمشکل دکھائی دے رہی تھیں۔

"کیا چاہتے ہو۔ میرے پاس تمیں پونڈ سے زیادہ نہیں ہیں۔" امرحہ کی آواز کانپ رہی تھی ایک خدشہ اسے یہ بھی تھا کہ یہ کارل ہو گا اسے ڈرا رہا ہو گا۔

ماسک مین نے پوری قوت سے اپنا دایاں پیر اٹھا کر امرحہ کے پیر پر دے مارا' تکلیف سے امرحہ بلبلا اٹھی اگر اس نے جوگرز نہ پہن رکھے ہوتے تو اس کے پیر کی کھال ادھڑ جاتی۔ پیٹ کے بل امرحہ سڑک پر بیٹھتی چلی گئی اور جیسے ہی وہ جھکی اس نے پورا زور لگا کر امرحہ کو ٹانگ ماری۔ اس بار امرحہ سڑک پر گر گئی۔

"کون ہو تم کیا چاہتے ہو۔" خوف سے امرحہ چلائی۔

وہ نیچے اس کے قریب جھکا اور ہاتھ میں پکڑے چاقو کو اس کے بازو پر رکھ کر اس کی نوک کو اندر کرنے لگا۔

چاقو امرحہ کی کھال سے چھوا۔ اندر گھسا۔ خوف سے امرحہ کی آنکھیں سرخ ہو گئیں وہ اس کی آنکھوں میں دیکھ رہا تھا جیسے اسے بہت مزا آرہا تھا یہ کرتے

"بتایا تو ہے تمہاری کھال۔" چاقو کو اس نے گھمایا۔ امرحہ نے سارا خوف بالائے طاق رکھ کر چیخ مار دی اور پیچھے کی طرف بھاگی۔

"ہیلپ!"

وہ بڑے آرام سے اٹھا اور اس کی طرف آیا۔ امرحہ کی قسمت خراب کہ وہ تنگ گلی تھی، آگے سے بند تھی اور امرحہ اس کے آگے سے ہو کر نہیں جا سکتی تھی۔

"ہیلپ ہیلپ!" ساتھ اس نے بیگ میں سے فون نکالنا چاہا لیکن اس کے ہاتھوں میں اس بری طرح کپکپاہٹ تھی کہ وہ بیگ کی زپ بھی نہیں کھول سکی۔ وہ بند گلی کے آخری کنارے کی دیوار کے ساتھ چپک کر کھڑی تھی اور وہ بڑے مزے سے اس کی طرف قدم بڑھا رہا تھا۔

"اگر اب تمہاری آواز نکلی تو میں تمہارا گلا کاٹ دوں گا۔"

"خدایا۔ اے اللہ۔" امرحہ نے بلند آواز سے کہا وہ بس بے ہوش ہونے کو تھی۔

"اللہ۔" وہ استہزائیہ ہنسا۔

دیوار کا سہارا لینا امرحہ کے لیے محال ہو رہا تھا وہ بس گر جانے کو تھی۔

"کیا ہو رہا ہے یہاں؟" ایک تیز ٹارچ کی روشنی گلی میں چمکی۔ سالک مین تیزی سے بھاگ گیا۔ ٹارچ والا گلی کے اس حصے کی طرف آیا جس طرف امرحہ تھی۔

خوف اور تکلیف سے امرحہ کو ٹھیک سے دیکھنے اور سمجھنے میں وقت لگا۔

"او خدایا۔ کیا ہو رہا ہے یہاں؟" وہ امرحہ کو دیکھ کر بری طرح چونکا۔ امرحہ نیچے بیٹھ گئی اس کے لیے کھڑا رہنا مشکل ہو رہا تھا۔

"تم ٹھیک ہو؟" وہ گھٹنوں کے بل اس کے قریب بیٹھ گیا۔ امرحہ نے خوف سے ہی اسے بھی دیکھا اور اٹھنے کی کوشش کی۔

"ٹھہرو۔ میں تمہارے لیے پانی لاتا ہوں۔" آدمی جلدی سے گیا اور پانی کی بوتل لے آیا۔

"لو یہ پیو اور اپنی سانسیں درست کرو۔ پرسکون ہو جاؤ میں ابھی پولیس کو بلاتا ہوں۔"

امرحہ ہاتھ سے پسینہ صاف کرنے لگی۔ اس کی سانسیں قابو میں ہی نہیں آ رہی تھیں۔

"اس طرف ساتھ ہی میرا اسٹور ہے، میں کوڑا دان میں کوڑا ڈالنے آیا تو مجھے ہیلپ کی آواز آئی۔ تم میرے اسٹور میں چل کر بیٹھ سکتی ہو' تو میرے ساتھ میں پولیس کو فون بھی کرتا ہوں۔"

"نہیں پولیس رہنے دیں۔ کیا آپ مجھے ٹیکسی میں بٹھا سکتے ہیں؟"

"رکو لڑکی! تم ایسے نہیں جا سکتیں تم غیر ملکی ہو تمہارے ساتھ مانچسٹر میں یہ سلوک برداشت نہیں کیا جائے گا' جو ہم خود اپنے ساتھ برداشت نہیں کر سکتے آؤ میرے ساتھ۔" وہ ادھیڑ عمر بوڑھا آدمی آگے چلنے لگا۔

امرحہ کو ناچار اس کے ساتھ جانا پڑا۔ تھوڑے ہی فاصلے پر اس کا اسٹور تھا۔ کہنی سے اوپر اس کے دائیں بازو میں کافی تکلیف تھی وہ جگہ خون سے گیلی ہو رہی تھی۔ "تمہیں کوئی چوٹ تو نہیں آئی؟"

"نہیں۔ میں ٹھیک ہوں اسے میرا بیگ چاہیے تھا بس۔"

تھوڑی دیر میں پولیس آ گئی امرحہ نے سارا واقعہ سنا دیا۔

"آپ پہچانتی ہیں اسے؟" پولیس مین پوچھ رہا تھا۔

"وہ سالک مین تھا۔"

"آواز؟"

"نہیں جانتی اسے۔ آواز بھی نہیں۔"

"آپ یونیورسٹی اسٹوڈنٹ ہیں اکثر اسٹوڈنٹ ایسے مذاق کرتے ہیں۔" "نہیں۔ وہ یونیورسٹی اسٹوڈنٹ تو نہیں لگتا تھا اسے میرا بیگ چاہیے تھا۔"

"کیا اس نے مانگا تھا یا چھینا تھا؟"

"مانگا تھا۔ میں نے نہیں دیا تو مجھے گرا دیا اس نے۔"

"اس کے ہاتھ میں چاقو دیکھ کر بھی آپ نے اسے دینے سے انکار کر دیا جس میں صرف بیس پونڈز تھے' آپ کو ڈر نہیں لگا؟"

"گھبراہٹ میں میں نے انکار کر دیا۔ سب ایک دم سے ہوا۔"

پولیس کی گاڑی ہی اسے گھر چھوڑ گئی۔ گھر آ کر اس نے بازو کا حال دیکھا۔ گہرے زخموں کی وجہ سے خون نظر نہیں آیا تھا۔ فرسٹ ایڈ باکس کچن سے لا کر اس نے بہت مشکل سے بائیں ہاتھ سے دائیں ہاتھ کی پٹی کی۔ فرسٹ ایڈ باکس میں کوئی اینٹی بائیوٹک نہیں تھی اور اسے بازو پر کافی تکلیف ہو رہی تھی گرم دودھ میں ہلدی ڈال کر اس نے پی لی اور کمرے میں گم صم بیٹھ گئی۔

خاموش۔ بالکل چپ۔

"میں ایک بہادر لڑکی ہوں۔" بہت دیر خاموش رہنے کے بعد اس نے خود سے کہا۔

"میرے بازو میں تکلیف ہے' لیکن میں اسے برداشت کر سکتی ہوں۔ مجھے رونا آ رہا ہے' لیکن میں روؤں گی نہیں۔ میں خوف زدہ ہوں' لیکن میں اپنے خوف پر قابو پا لوں گی۔ یہ عمل کا رد عمل ہے۔ میں اسے اپنی ہمت کی طاقت سے بدل دوں گی۔ میں اسے ٹھیک کر لوں گی۔ مجھے ڈرنا نہیں ہے۔ مجھے ڈرنا نہیں چاہیے۔ میں اکیلی ہوں' لیکن اکیلا ہونے کا مطلب یہ نہیں کہ بزدل یا کمزور بن جایا جائے۔"

✿ ✿ ✿

ویرا صبح کے قریب گھر واپس آئی تھی۔ عالیان کے کلاس فیلوز اور ہال میٹس نے اس کے لیے برتھ ڈے پارٹی کا انتظام کیا تھا ویرا وہیں تھی رات بھر۔

روزی دعا کی بیٹی بھاگی مجبوراً اپنے کمرے میں چلی گئی تو امرحہ نے اٹھ کر اپنے بیگ میں سے کارڈ نکال کر الماری میں رکھے باکس میں رکھا۔ پھول تو اس نے مسل کر آکسفورڈ روڈ پر ہی پھینک دیا تھا اگر وہ پھول عالیان کو دے بھی دیتی تو کیا وہ لے لیتا؟ لے لیتا تو چلتے چلتے کہیں بھی پھینک دیتا' وہ تو رات بھر مزے سے پارٹی کرتا رہا تھا۔ امرحہ بھی مانچسٹر میں موجود ہے وہ یہ بھول چکا تھا۔

کبھی تو وہ اس کی دوست رہی تھی اس کبھی کے لیے ہی وہ اسے پارٹی میں بلا لیتا۔ امرحہ شو اسٹور پر سارا وقت اس پارٹی کے بارے میں سوچتی رہی تھی۔

گھسی ہوئی جینز کی پینٹوں میں سے کوئی ایک اس نے پہنی ہوگی شاید ہلکے مٹے نیلے رنگ کی اور یونیفارم کی طرح جانی جانے والی کئی کئی بار استعمال کی جانے والی چند گنی چنی مخصوص ٹی شرٹس میں سے کوئی ایک شاید کالی جس کی پشت پر موٹے تناور درخت کی صرف جڑیں سرمئی رنگ میں پھیلی پڑی تھیں اور جو عالیان کو بہت پسند تھی یا شاید نیلی پر سفید وہی سفید جس کی فرنٹ پر سرچ می (ڈھونڈو مجھے) لکھا تھا۔

"آخر تمہارا کیا مطلب ہے کہ کیا ڈھونڈ لیا جائے تم میں سے؟"

"جنہیں کچھ ڈھونڈنا ہوگا وہ کیا کہیں تو نہیں پوچھیں گے نا۔ وہ تو بس کر گزریں گے۔"

"کیا کر گزریں گے؟"

وہ خاموشی سے اسے دیکھتا رہا۔ "تم نہیں سمجھو گی۔"

اور وہ نہیں سمجھی تھی۔ ٹھیک کہا تھا اس نے۔

اس کے پاس گھسے ہوئے اور پرانے کپڑے ہی تھے "یہ میں نے چار سال پہلے لی تھی۔ یہ تین سال پہلے۔ یہ جوتے جرمنی' فرانس' یونان تک جا چکے ہیں' ابھی بھی دیکھو کتنے اجلے اجلے ہیں اور مضبوط بھی' ان کے ساتھ مزید تین چار ٹورز کیے جا سکتے ہیں۔"

"تم کافی کنجوس ہو۔ پرانی شرٹس کو تم خود تراش خراش کیے ہو یا جو کو دے دیتے ہو اور وہ فرانس کے قدیم و جدید تجریدی آرٹ تمہاری شرٹس پر بنا دیتی ہے مجھے تو اس کی بنائی علامتوں سے بغاوت کی بو آتی ہے۔"

"ہاہاہا۔ باغی ہی ہے۔ اس کے تجریدی آرٹ سے بنی شرٹس کو جب میں پہنتا ہوں تو اسے بہت آرڈرز ملتے ہیں اسی لیے تو وہ اتنی امیر ہے۔ میں تو اس کا چلتا پھرتا ماڈل ہوں اور میں کنجوس بالکل نہیں ہوں امرحہ۔ صرف فضول خرچ نہیں ہوں۔ میرے اس

کر اس بیگ کو دیکھو' بتاؤ یہ کتنا پرانا ہے؟"
"کم سے کم دس سال پرانا۔" امرحہ نے جانچ کر کہا۔
"ہاہا... نہیں یہ یونی کے پہلے دن سے میرے ساتھ ہے' چند ایک بار پھٹ چکا ہے' لیکن میں اسے سلائی کروا لیتا ہوں' دھلوا لیتا ہوں۔ میں ایک یونیورسٹی اسٹوڈنٹ ہوں' فیشن ماڈل نہیں' جو نت نئے کپڑوں کو پہن کر ہی یونیورسٹی آسکتا ہے' بس۔ یہ بیگ' یہ جوتے اور کپڑے صرف استعمال کی چیزیں ہیں' انہیں چیزیں ہی رہنے دینا چاہیے۔ جنون نہیں بنا لینا چاہیے۔ انسانی ترقی کا راز ان میں ہے ہی نہیں' یہ اس ترقی کے رضاکار ہیں ان کے لیے پاگل ہونا پاگل پن ہے۔"
"ایک سال میں تم کتنی خریداری کرتے ہو؟"
"بہت کم ضرورت پڑتی ہے' ماما' مور' گن' شارلٹ کرسمس پر گفٹ دے دیتی ہیں۔ کچھ دوست جو موٹے ہو جاتے ہیں یا جن کی وارڈ روب میں مزید گنجائش نہیں رہتی کپڑے جوتے رکھنے کی وہ کم قیمت پر نیلامی کر دیتے ہیں میں اور کارل وہ لے لیتے ہیں وہ بھی اگر بہت زیادہ ضرورت ہو تو۔"
"تو تم اپنے پیسوں کا کرتے کیا ہو؟" امرحہ کو حیرت تھی ماما مہر کے بیٹے کی یہ حالت تھی اور وہ جاب بھی تو کرتا تھا۔
"ویل یہ ایک راز ہے۔ ویسے تمہارے پاپا کیا بہت امیر ہیں' تم کتنے نت نئے انداز کے کپڑے بدلتی ہو' یونی کے پہلے دن جو تم نے لباس پہنا تھا' وہ میں نے دوبارہ نہیں دیکھا۔"
"وہ گرمیوں کے لیے تھا۔ گرمی آئے گی تو استعمال کروں گی۔"
امرحہ جھوٹ بول رہی تھی' اپنا وہ سوٹ وہ این لوت کو دے چکی تھی۔ کیوں کہ امرحہ کو اچانک سے وہ برا لگنے لگا تھا۔ اپنی طرف سے اتنی کفایت کرنے کے بعد بھی وہ ہر مہینے اپنے اسٹور سے کم قیمت کے دو جوڑے جوتے ضرور لے لیتی تھی۔ کافی ساری جینز لے چکی تھی' ٹاپ بھی' گرم کوٹ' جیکٹس' بیگز اور دستانے تو اس کے پاس اتفاق سے اتنے ہو چکے تھے کہ انہیں کلٹ کر کے ایک سوئیٹر بن سکتا تھا' دراصل اسے دستانوں کی لباس کے ساتھ میچنگ کا خبط ہو گیا تھا اور پاکستان سے جو وہ گرم کپڑے لائی تھی ان کے ساتھ دستانوں کی میچنگ کرتے کرتے وہ اتنے ہو گئے کہ بس بہت ہی ہو گئے۔
امرحہ عالیان کی شرٹس کو انگلیوں پر گن سکتی تھی اور وہ گن رہی تھی۔
تو اس نے وہ پہلے براؤن رنگ کی جو کہ تجریدی آرٹ سے بنی شرٹ پہنی ہو گی' بلیک جینز پر پھر اس نے پھونک ماری ہو گی اور کیک کاٹا ہو گا اور کارل کے منہ میں ڈالا ہو گا' شاید کیک کارل نے ہی کٹ لیا ہو اور موم بتیوں کی جگہ کوئی راکٹ فٹ کر دیا ہو کیک پر اور کیک کو عالیان کے منہ میں ڈالنے کے بجائے منہ پر تھوپ دیا ہو۔ ساتھ ساتھ ان غباروں کو پھوڑا گیا ہو گا جن میں کارل نے پٹاخے بھرے ہوں گے جو زمین پر گرتے ہی خود بخود پھٹنے لگتے ہیں' کان پھاڑ دینے والی آوازوں کے ساتھ' پٹاخوں کے پھٹتے ہی سب چیخیں مارتے خاص کر لڑکیاں ادھر ادھر اچھل اچھل کر بھاگی پھرتی ہوں گی۔
اور پھر تیز میوزک لگایا گیا ہو گا اور سب ساتھ ایک آواز میں گاتے ہوں گے۔

its my friend's birthday
So dance buddy Dance
_ Dance _ Dance_

عالیان کے گرد انہوں نے گول دائرہ بنایا ہو گا' ایک دوسرے کی کمر میں ہاتھ ڈالے وہ شانے دائیں بائیں ڈگمگاتے گھومتے جاتے ہوں گے۔

it's my friend's Birthday
So I am dancing_

امرحہ گم صم حالت سے چونکی۔

" it's my Friend's Birthday
So i am praying "

امرحہ نے آنکھیں بند کر کے اس کے لیے دعا کی۔
اگلی صبح وہ یونی نہیں جا سکی۔ دیر سے سو کر اٹھی۔

اسے بخار ہو رہا تھا۔ پہلے ڈاکٹر کے پاس گئی۔ ڈاکٹر کو بتایا کہ حادثاتی طور پر وہ اپنا بازو ایک لوہے کی سلاخ سے زخمی کر بیٹھی۔ اس کے زخم میں سوجن تھی بہت اور اس کے لیے بازو کو حرکت دینا مشکل تھا۔ اسے ہر حال میں یونی جانا تھا' لیکن اس کا بخار بڑھ رہا تھا اس سے چلا بھی نہیں جا رہا تھا۔ وہ آدھے راستے سے ہی گھر واپس آ گئی' تیز دھار چاقو اس کی کھال میں گھسا تھا' زخم تازہ تھا تو اتنی تکلیف نہیں تھی' لیکن اب تو اس سے برداشت ہی نہیں ہو رہا تھا۔ وہ گھر آ کر سو گئی۔
اسے اتنا تیز بخار ہو گیا کہ وہ مدہوشی میں بڑبڑانے لگی۔ سادھنا رات اس کے کمرے میں ہی سوئی اور جب اگلی صبح وہ اسے سوپ پلا رہی تھی تو وہ متذبذب سے امرحہ کو دیکھنے لگی۔
"اگر یہ سوپ تم نے پینا ہے تو پی لو پلیز مجھے ایسے نہ دیکھو۔" امرحہ نے مذاق کیا۔
"تمہارے اور عالیان کے درمیان کچھ ہوا ہے؟"
"کچھ کیا۔ کچھ بھی نہیں۔" دائیں بازو کی تکلیف پورے [illegible]
"ویرا عالیان کی برتھ ڈے پارٹی میں گئی تم کیوں نہیں گئیں؟"
"تمہیں تو معلوم ہے کہ یہ لوگ کیسی کیسی شرارتیں کرتے ہیں پارٹی میں' دادا نے منع کر دیا تھا۔"
"تمہارے اور اس کے درمیان کوئی ناراضی ہے؟ پہلے تم اس کی کافی باتیں کر لیا کرتی تھیں میرے ساتھ۔"
"نہیں... وہ مصروف ہوتا ہے' بہت۔ اس کے اور دوست بھی تو ہیں' میں اس کے لیے اتنی اہم نہیں ہوں۔"
"کیا تمہیں یہی دکھ ہے کہ تم اس کے لیے اتنی اہم نہیں؟"
"دکھ... نہیں' دکھ کیوں ہو گا مجھے؟"
"تو پھر امرحہ تم رات بھر اس کا نام لے کر روتی کیوں رہی ہو؟"
امرحہ خاموش سادھنا کو دیکھتی رہی۔ لفظوں کو اس کے حلق سے نکلنے میں دقت درپیش تھی۔
"میں روتی رہی ہوں؟"
"اتنی اونچی آواز میں کہ مجھے کمرے سے باہر جا کر دیکھنا پڑا کہ آواز گھر میں کہاں تک جا رہی ہے۔"
"بخار میرے سر کو چڑھ گیا ہو گا۔"
"بخار... تم اس طرح رو رہی تھیں کہ میں بھی رونے لگی۔ میرا دل پھٹنے لگا اور میں نے پرارتھنا کی کہ بھگوان تمہیں سکون دے۔"
"نہیں... میں دادا کو یاد کر رہی ہوں گی۔ پتا نہیں ڈاکٹر نے کل کیسی دوا دی تھی۔"
سادھنا نے کھڑکی کے پردے اٹھا دیے' باہر روشن دن نکلا تھا' دھوپ چمک رہی تھی' مانچسٹر کی دھوپ لاہور کی دھوپ کی چھوٹی بہن سی۔ اوپری من سے روٹھ جانے والی سہیلی سی۔ دوپٹے کا کونا دانتوں میں دبا کر دلہن بنی ننھی سی بچی کی اداؤں' تھوڑی سی شرماہٹ سی اور کسی جان سے پیارے کی "پی ٹی" سی بھی۔

✿ ✿ ✿

"اور کتنے دن بیمار رہنا ہے؟"
ویرا اچھل کر اس کے بیڈ پر کودی' امرحہ کا زخمی بازو بال بال بچا جسے وہ کشن پر رکھے نیم دراز سی تھی اس نے ویرا کو کچھ بھی نہیں بتایا تھا' بازو کے زخم کا تو بالکل بھی نہیں۔
"میرا تو دل چاہتا ہے اب بیمار ہی رہوں۔" اس کے اکتائے ہوئے سے انداز پر ویرا چونک سی گئی۔
"امرحہ! پارٹی سب دوستوں نے مل کر عالیان کو دی تھی' سرپرائز پارٹی تھی اگر عالیان کی طرف سے ہوتی تو تم بھی وہاں ہوتیں' وہ تمہیں بھی بلاتا۔"
امرحہ کو تھوڑا سا سکون ملا' ہاں اگر وہ پارٹی کا انتظام کرتا تو اسے بلاتا' لیکن وہ پارٹی شارٹی کرنے والوں میں سے نہیں تھا جو کپڑوں پر پیسے ضائع نہیں کرتا تھا وہ پارٹی پر کیوں کرے گا۔
"تم اپنے گھر پارٹی کرتی تھیں؟" وہ اس کی سالگرہ کے اگلے دن پوچھ رہا تھا۔

"پارٹی؟" امرحہ بدمزہ ہو کر رہ گئی' جس طرح سے اس کا یوم پیدائش مشہور ہو چکا تھا وہ تو صرف "یوم سیاہ" یا "یوم مرد فعان بلا" کے طور پر ہی منایا جا سکتا تھا۔

"نہیں۔ کوئی پارٹی نہیں۔"

"گھر میں کیک کاٹ لیتی ہو گی۔" وہ سٹول کے ساتھ ہے نا۔"

"نہیں (آہ بھر کر) اس کی بھی نوبت نہیں آئی تھی۔ دادا کے ساتھ بادشاہی مسجد جاتی تھی نفل پڑھنے' شکرانے کے۔ دادا کہتے ہیں کہ اپنی پیدائش کے دن زیادہ عبادت کرنی چاہیے خدا کو بتانا چاہیے کہ ہم اس کے شکر گزار ہیں کہ اس نے ہمیں بنایا اور کس محبت سے بنایا۔ ہمارے لیے نبی بھیجے' ہمارے لیے پیغامات آسمان سے اتارے۔ ہمیں خدا کو بتانا چاہیے کہ ہم خوش ہیں کہ ہمارے لاوجود کو وجود میں لانے پر وہ راضی ہوا۔"

"گڈ بچہ؟" عالیان متاثر نظر آنے لگا۔

"پھر وہ مجھے میری پسند کا گفٹ لے دیتے اور میری پسند کے پارک لے جاتے اور رات میں میری ہی پسند کے ہوٹل میں کھانا کھلا دیتے۔" امرحہ کو یہ سب بتاتے ڈر بھی تھا کہ وہ یہ نہ پوچھ لے کہ ہر جگہ صرف دادا ہی کیوں؟

"میں متاثر ہوا ہوں امرحہ!"

"اور تم۔ تم کیا کرتے ہو؟"

"کرتا تو نہیں ہوں' لیکن کرنا چاہتا ہوں۔" اس نے دونوں آنکھیں بھینچ کر پھر انہیں کھول کر کہا اور مستی سے مسکرانے لگا۔

"میں چاہتا ہوں کہ جب میری سالگرہ ہو تو میں پیٹر پین بن جایا کروں' بے شک صرف ایک گھنٹے کے لیے اور ماما کو اڑا کر اپنے ساتھ لے جایا کروں' دور بہت دور بادل کے ایک ٹکڑے پر' تیز ہوا موم بتی کو بجھا دے اور میں اور ماما مل کر کیک کاٹیں یا پھر میں انہیں وکٹوریہ فال لے اڑوں۔ گرتے ہوئے پانیوں کی بوچھاڑ کے درمیان کسی اونچی نوکیلی چٹان کے کنارے' پانی کے پردے کے بس اتنے قریب کہ ہاتھ بڑھا کر ہاتھ گیلے کر لوں۔ ننھی منی پانی کی چھینٹیں میرا ایک گیلا کر رہی ہوں اور کبھی میں پیٹر کے مجسمے کو احترام سے اٹھا کر اس کی کشتی سے نیچے رکھوں اور اس کی کشتی کو سمندر میں لے اڑوں اور۔۔۔"

"میں خوف زدہ ہو رہی ہوں عالیان۔"

اگر وہ پیٹر پین نہیں بھی بنا تو امرحہ کو ڈر تھا کہ وہ کسی نہ کسی طرح سے یہ سب کر ہی لے گا۔ اور اس کے خواب کیسے بڑے بڑے تھے۔ بہت بڑے بڑے؟ بادل کے ٹکڑے پر جا کر کیک کاٹنا شکر ہے اس نے آتش فشاں کے اندر جانے کی خواہش کا اظہار نہیں کیا۔

ویرا اپنے کمرے سے گٹار لے آئی تھی اور اسے کوئی روسی نظم بنانے لگی تھی۔ گاتے ہوئے وہ اتنی پیاری لگ رہی تھی کہ کوئی بھی اس پر نثار ہو سکتا تھا۔ لیکن امرحہ کا کوئی ارادہ نہیں تھا اس پر نثار ہونے کا بھلا اسے کیا ضرورت تھی' اتنی پیاری گلابی فراک پہن کر عالیان کی سالگرہ پر آنے کی۔

"مجھے یہ شک سا ہو رہا ہے کہ تم مجھے کھا جانے والی نظروں سے گھور رہی ہو؟" ویرا گانے کے درمیان میں ہی رک کر پوچھا۔

"تم اتنی پیاری لگ رہی ہو کہ دل چاہ رہا ہے تمہیں کھا جاؤں۔" اب امرحہ اسے یہ تو نہیں کہہ سکتی تھی کہ وہ اسے کھا ہی جانا چاہتی ہے۔

"یہ پیار سے کھا جانے والا انداز تو نہیں ہے۔" ویرا دوسرا روسی گانا گانے لگی۔

این لون' سادھنا بھی اس کے کمرے میں آ گئیں بعد ازاں لیڈی مہر بھی۔

اس کی اتنی سی بیماری پر وہ کیسے کیسے اس کا دل بہلا رہے تھے۔ وہ کوئی دنیا جہان کی دولت نہیں لٹا رہے تھے اس پر۔ صرف ذرا سی توجہ دے رہے تھے اور یقین جانیے ہر بیمار کو ہر تکلیف میں مبتلا کو بس ذرا سی توجہ کی ہی ضرورت ہوتی ہے۔

شام کو سائی اس کی خیریت معلوم کرنے آیا' امرحہ نے اسے فون کر کے سب بتا دیا تھا۔ وہ اس کے لیے پھول لایا تھا۔

"تم اس واقعے کے بارے میں کسی سے بات نہ کرنا سائی!"

"ظاہر ہے ایسا ہی کروں گا۔ لیکن تم اس کے پاس ضرور جانا۔"

"کیا مجھے جانا چاہیے؟"

"ہاں بالکل۔ تمہیں خوف زدہ ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔"

"میں خوف زدہ نہیں ہوں مجھے جانا تو تھا اس کے پاس اس لیے میں نے پولیس سے جھوٹ بولا۔"

"بس ٹھیک ہے تم نے ٹھیک کیا۔ مجھے خوشی ہے کہ تم بہتر انداز سے سوچ رہی ہو۔"

"مجھے یہی سب کرنا تھا سائی! ورنہ بات بہت بگڑ جاتی۔"

صحت یابی کی دعائیں دیتا سائی چلا گیا' لیکن صرف کمرے سے۔ نشست گاہ میں لیڈی مہر کی اس سے مڈبھیڑ ہو گئی تھی اور وہ انہیں نجانے کون کون سی کہانیاں سنا رہا تھا کہ وہ ہنس ہنس کر بے حال ہو رہی تھیں۔

"تمہاری یونیورسٹی میں کتنے مزے مزے کے لوگ پڑھتے ہیں نا۔" سادھنا اس کے لیے رات کا کھانا لائی تو ہنسی کو قابو میں کر کے کہنے لگی۔

"تمہیں سائی اچھا لگا؟"

"ہاں۔ بہت۔ وہ یونیورسٹی کے ابتدائی دنوں کی باتیں کر رہا ہے۔"

"سادھنا کیا تم آسمان کے ساتھ الٹا لٹکنا چاہتی ہو؟ اگر ہاں تو تم عالیان کو فون کرو کہ وہ تمہاری ملاقات کارل سے کروا دے۔ میں شرط لگاتی ہوں پھر تم ایسے کھل کر ہنس نہیں پاؤ گی۔"

"نہیں۔ مجھے کارل نہیں چاہیے وہ تمہیں ہی مبارک ہو۔ شکر کرو' تمہاری باتیں سن سن کر اس سے خوف زدہ ہو کر میں نے اب تک سائیکل چلانا چھوڑ رکھا۔"

"دادا بھی شکر کریں کہ اس کی حرکتوں سے سہم کر میں نے دنیا ہی نہیں چھوڑ دی کاش آج کل میں ہی وہ مرنے شرنے والا ہو۔ آمین۔"



اپنی کلاس لینے کے بعد وہ پال کے ڈیپارٹمنٹ آ گئی اور اس کا انتظار کرنے لگی۔

"مجھے تم سے بات کرنی ہے پال۔" وہ اپنی کلاس سے باہر نکلا تو امرحہ تیزی سے اس کی طرف گئی اس کے دوست بھی اس کے ساتھ تھے۔

"میرے پاس ضائع کرنے کے لیے وقت نہیں ہے۔" اسے جیسے کوئی فرق ہی نہیں پڑا تھا۔

"میں سب کے سامنے بات کرنا نہیں چاہتی۔" امرحہ نے بے حد مضبوط انداز میں کہا۔

"مجھے اس سے دلچسپی نہیں ہے کہ تم کیا چاہتی ہو؟"

"تمہیں اس رات والے واقعے میں بھی دلچسپی نہیں ہے؟"

"تمہیں اپنی بکواس سنانے کے لیے میں ہی ملا ہوں؟" وہ مڑنے کی ناکام اداکاری کرنے لگا۔

"میرے بازو پر زخم ابھی تازہ ہی ہے۔ اگر تم اپنے دوستوں کے سامنے بات کرنا چاہتے ہو تو ٹھیک ہے۔ میرا خیال تھا یہ تمہارے حق میں بہتر نہیں ہو گا۔"

پال اپنے دوستوں سے الگ ہو کر آگے چلنے لگا' امرحہ اس کے پیچھے ہی تھی' دونوں ڈیپارٹمنٹ سے باہر نکل آئے تو امرحہ اس کے سامنے آ کر کھڑی ہو گئی۔

"تم مجھے تھپڑ مار سکتے ہو۔"

"تمہیں پھر سے یاد دلاؤں کہ تم میرا وقت۔۔۔"

"تم اسی وقت مجھے سب کے سامنے تھپڑ مار سکتے ہو' ایک نہیں جتنے جی چاہے مار سکتے ہو میں تمہیں اجازت دیتی ہوں۔" امرحہ نے اتنی سنجیدگی اور متانت سے کہا کہ وہ کچھ بول ہی نہیں سکا۔

"اور اگر تم نے اکیلے میں مارنے ہیں تو بھی تم مجھے برا بھلا کہہ سکتے ہو' گالیاں دے سکتے ہو' سب کر سکتے ہو' لیکن اس کے لیے تمہیں قانون کو ہاتھ میں لینے کی ضرورت نہیں ہے۔ تمہیں اپنی تعلیم' اپنا کیریئر داؤ پر

لگانے کی ضرورت نہیں ہے' تم اسپورٹس پرسن ہو' یونی کے لیے میڈل جیت کرلائے ہو' ہیرو ہو' یونی کے میگزین' اخبارات' میڈیا تمہیں لمحوں میں ہیرو سے زیرو بنا دے گا۔"

"تم جانتی ہو تم کیا کہہ رہی ہو۔" وہ ہنسا۔

"ہاں' سنو۔ میری بات مکمل ہونے دو' اس رات اس آدمی نے میرے منع کرنے کے باوجود پولیس کو بلالیا تھا۔ میں نے ان سے جھوٹ بول دیا تھا۔ صبح پولیس کا فون آیا ہے انہوں نے مین روڈ پر لگے کیمروں سے تمہاری فوٹیج حاصل کرلی ہے' جس میں تم میرا بازو گھسیٹ کر گلی کے اندر لے جارہے تھے۔ انہوں نے تمہارا قد کاٹھ سب نوٹ کرلیا ہے' میں انہیں بتاسکتی تھی پال کہ یہ تم ہو۔ تم نے ہاتھوں میں دستانے پہن رکھے تھے' وہ بھی تمہارے بائیں ہاتھ کی چھ انگلیوں کو چھپانے میں ناکام تھے۔ اگر میں پولیس سے کہوں گی تو وہ ضرور باریک بینی سے اس معاملے کو دیکھیں گے۔ مزید اگر تمہارے چاقو سے بنا زخم میں نے پولیس کو دکھا دیا تو تم جانتے ہو کہ یہ صرف ہراساں کرنے کا کیس ہی نہیں رہے گا۔ تمہیں یونی سے نکال دیا جائے گا' کوئی رعایت نہیں برتی جائے گی کہ تم نے مجھ پر قاتلانہ حملہ کیا ہے۔ تمہارا کیریر ختم۔"

وہ اسے گھور رہا تھا۔ "مجھے نفرت ہے تمہاری شکل سے۔"

"کیا تمہارے پاس اس نفرت کی وجہ ہے۔ ایک تھپڑ تک۔ اور میرا مسلمان ہونا۔ تم سو تھپڑ مجھے مارلو۔ لیکن اپنے خود کو کرمنل مت بناؤ۔ تم ہر طرح سے اپنا غصہ مجھ پر نکال سکتے ہو۔"

"تم غلط جگہ اپنا لیکچر دینے کا شوق پورا کررہی ہو۔"

"اگلی بار مجھے نقصان پہنچانا چاہو تو اتنا خیال رکھنا کہ تمہیں نقصان نہ پہنچے۔"

"تمہیں میرے نقصان کی اتنی فکر کیوں ہے؟" وہ استہزائیہ ہنسا۔

"کیونکہ اب تم مجھے انسان ہونے کی حیثیت سے نہیں ایک مسلمان ہونے کی حیثیت سے دیکھتے ہو' تو ٹھیک ہے ایک مسلمان تمہارے اس قاتلانہ حملے کو درگزر کرتا ہے۔ میں چاہوں تو اسی وقت تمہیں پولیس کو پکڑواسکتی ہوں' تم پر جرم ثابت ہوجائے گا۔ تم یونی سے باہر ہوگے تو ایک مسلمان' ایک اسلام کو ماننے والا تمہارا کیریر' تمہاری نیک نامی بچا رہا ہے۔ تمہارے حملے کو درگزر کررہا ہے۔ تم نے اسلام کو لے کر وہ سب کیوں کہا۔ میں نہیں جانتی لیکن اب تم یہ جان لو کہ تمہارے ساتھ ایسا کرنے کے لیے میرا مذہب کہہ رہا ہے۔ تم اسلام سے نفرت کرتے ہو شاید' لیکن اسلام کا پیروکار نہ تم سے نفرت کرتا ہے' نہ تمہارے مذہب سے' نہ ہی کرے گا۔ مجھے نفرت کا درس نہیں دیتا میرا مذہب۔ تم کسی بھی وقت میرے منہ پر تھپڑ مار سکتے ہو۔ اس کے لیے تمہیں خود کو خطرے میں ڈالنے کی ضرورت نہیں' مجھے خوف زدہ دیکھنے کے لیے تمہیں قانون کو اپنے ہاتھ میں لینے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں بھی پہلے سے پڑھتے آئی ہوں اور تم بھی۔ اگر ہم ایک دوسرے کو پسند نہیں کرسکتے تو ہمیں ایک دوسرے کا احترام ضرور کرنا چاہیے۔ اور اگر یہ بھی نہیں کرسکتے تو غیر جانب دار ہوجانا چاہیے۔ خاموش ہو کر الگ ہوجانا بہت سے مسائل حل کردیتا ہے۔"

"میں تمہاری شکل بھی دیکھنا نہیں چاہتا۔" وہ سختی سے بولا۔

"ٹھیک ہے۔ تمہیں میری شکل نظر نہیں آئے گی۔" امرحہ کہہ کر آگئی۔

"اسلام گالی کا جواب گالی نہیں ہے۔ اسلام اینٹ کا جواب برداشت ہے۔"

اینٹ کا جواب' برداشت اور حکمت وہ پال کو دے آئی تھی اور اسے امید تھی کہ سب اچھا ہی ہوگا۔ کیونکہ حکمت کبھی مضر نہیں ہوتی۔ رات کو لیڈی مہر نے ان سب کو نشست گاہ میں ایک ساتھ بلایا۔

"میں تم سب سے ایک وعدہ لینا چاہتی ہوں انسانیت کے ناتے اور اس سے بھی کہیں بڑھ کر ایک ماں کی محبت کے ناتے سے۔ تم سب مجھ سے وعدہ

کرو کہ اگر کوئی میرے بارے میں' اس گھر اور میرے بچوں کے بارے میں تم سے کچھ پوچھے گا تو تم ایک لفظ بھی نہیں بتاؤ گی۔"

"کچھ ہوا ہے؟" ویرا نے پوچھا۔

"میں تفصیلات تمہیں بتاسکتی' تم چاروں پوری ایمانداری سے مجھ سے وعدہ کرو کہ کوئی کسی بھی طرح کی معلومات تم سے لینا چاہے گا تو مجھے بتاؤ گی' تمہارے سامنے کسی کا نام لیا جائے یا کسی کی شکل و صورت کے بارے میں پوچھا جائے تم نے ایک لفظ منہ سے نہیں نکالنا۔ یہ سب میں اپنے بچوں کے فائدے کے لیے کررہی ہوں۔ میں بہت مشکل سے انہیں زندگی کی طرف لائی ہوں' میں ان کے دلوں کے حال جانتی ہوں' ان پر کیا گزرتی رہی ہے۔ مجھ سے زیادہ کون جانے گا اس لیے ایک ماں تم سب سے درخواست کرتی ہے حد سے زیادہ احتیاط کی جائے اور اگر کوئی کچھ پوچھے تو فوراً" پولیس کو فون کیا جائے۔ سادھنا کے ساتھ چند دن پہلے یہی سب ہوا ہے لیکن سادھنا نے عقل مندی کا مظاہرہ کیا اور آکر مجھے بتادیا۔"

ان سب نے بڑی محبت کے ساتھ لیڈی مہر کو وعدہ دے دیا۔

امرحہ کئی دنوں سے دیکھ رہی تھی کہ وہ کچھ پریشان سی رہتی ہیں' اس نے پوچھا تو انہوں نے اتنا ہی کہا کہ یہ بہت ذاتی سا مسئلہ ہے' وہ بتا نہیں سکتیں۔

☼ ☼ ☼

عالیان ابھی کلاس سے نکلا ہی تھا کہ یونین کا صدر جے پیٹرسن مسکراتی ہنستا اس کے پاس آیا۔

"کسی کا خون کرنے جارہے ہو یا کرکے آئے ہو؟"

عالیان نے تھنوں کی حد تک بنائے گئے اس کے ہیر اسٹائل کو دونوں ہاتھوں سے خراب کردیا۔ پیٹرسن اپنے نت نئے ہیئر اسٹائل کے لیے یونی میں بدنام ترین تھا۔ اس وقت ایک کنگرو اس کے سر پر آ بیٹھا لگتا تھا۔

"تم اپنے علاوہ کسی کو خوب صورت نہیں دیکھ سکتے نا؟" وہ بھنا گیا۔

"اب ٹھیک ہے ورنہ اس طرح بننے سے تم کلال' کلال سے لگ رہے تھے۔"

"خدا مجھے بچائے بلکہ مجھے مار ہی ڈالے اگر میں کلال' کلال لگوں۔"

"بس پھر تم ایک دو دن میں مرنے ہی والے ہو۔"

"امرحہ کیسی ہے؟" جے پیٹرسن نے ایک دم سے پوچھا بلکہ کچھ ڈرتے ڈرتے پوچھا۔

"کون؟" عالیان نے بھرپور سنجیدگی سے پوچھا۔

"تمہاری دوست۔"

"میری کوئی دوست امرحہ نہیں۔"

"کم آن Frish (فرینڈ کی جدید شکل) وہی جس کے پیچھے تم ہروقت رہا کرتے تھے۔"

"تم مجھ سے ایسی غیر ضروری باتیں کرنے آئے ہو؟"

"تم اس سے کسی وجہ سے ناراض ہو گیا؟"

"چھوڑو بھی فضول باتیں۔"

"اچھا اچھا سنو! اسٹوڈنٹ یونین کی بلڈنگ میں موجود سیف روم جسے سیکرٹ روم بھی ہم کہہ لیتے ہیں کو جانتے ہو نا۔ جہاں اسٹوڈنٹس اپنا نام ظاہر کیے بغیر کچھ بھی لکھ کر جاسکتے ہیں۔ کوئی شکایت یا کوئی بھی مسئلہ۔ تو فریش سب سے زیادہ تمہارے خلاف شکایتیں موصول ہوئی ہیں اور درخواستیں بھی۔ اس روم کی دیواروں پر ایک انچ جگہ نہیں بچی' ہر خط میں لکھا ہے عالیان کی ناراضی ختم کروائی جائے' جابجا دیواروں پر یہ پیغامات چپکے ہیں۔"

"کس نے کیا ہے یہ؟" اب عالیان بھنا گیا۔

"ویل فریش نام نہیں لکھا' لکھا بھی نہیں جاتا' اتنا سب بھی اس لیے بتایا کہ تم یونین کے فعال رکن ہو' مطلب صدر ہو۔" پیٹرسن نے ایک آنکھ بند کی۔

"اور سنو' وہ رالما کہہ رہا تھا کہ اگر اسٹوڈنٹ پارٹی جیسا ایک اور مذاق ہم اس لڑکی کے ساتھ کرلیں تو اس بار اس کی آنکھوں سے وہ ساگر نکلے گا کہ سارا مانچسٹر اس

میں ڈوب کر بہہ جائے گا اور پھر جب آئندہ آنے والی نسلیں تحقیق کریں گی کہ آخر مانچسٹر کے ساتھ کیا بنی اور اسے بہا کر لے جانے والا سیلاب آخر آیا کہاں سے تھا وہ بھی ایسا غضب ناک تو بیش بہا کھدائی اور تحقیق کرنے کے بعد انہیں خاتون پاکستان امرحہ کی دو آنکھیں ملیں گی۔"

"تم کہنا کیا چاہتے ہو؟"

"صرف اتنا کہ مانچسٹر کو اس ساگر میں ڈوب کر بہہ جانے سے بچاؤ۔ جو پیغامات دیواروں پر چپکے ہیں ان سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ بس بہت جلد یہ آفت آنے ہی والی ہے، تم اسے مذاق ... میری درخواست بھی ہے۔ میں مانچسٹر کو ڈوبتے نہیں دیکھ سکتا۔ ویسے مجھے ناراض لوگوں کو منانے کا یہ انداز اچھا لگا، تم مان جاؤ گے اور پھر سے اس کے دوست بن جاؤ گے تو میں اس طریقے کو یونین اور یونیورسٹی میں رائج کرواؤں گا۔ اپنا یہ سائی بھی تو ایسے ہی مشہور ہوا ہے میں بھی ہو جاؤں گا۔" وہ کھی کھی ہنسنے لگا۔

عالیان پر اپنی کوفت پر قابو پانا مشکل سا ہو گیا اور وہ تیزی سے انگلش ڈیپارٹمنٹ کی طرف لپکا۔

"اسٹوڈنٹ یونین کے سیکرٹ روم میں لیٹرز تم لکھ لکھ کر آتی رہی ہو؟" وہ ایک دم سے اس کے سامنے آ کر کہنے لگا۔

امرحہ خوف زدہ سی اس کی شکل دیکھنے لگی اور صرف نفی میں گردن ہلا سکی۔

"وہ تمہاری ہی لکھائی میں ہیں سب۔"

"میں نے نہیں لکھے۔" وہ اور زیادہ ڈر گئی۔

"تم نے بائیں ہاتھ سے لکھے ہیں۔"

"بائیں ہاتھ سے تو مجھ سے پین بھی نہیں پکڑا جاتا۔ یہ سب یونی فیلوز کا کام ہو گا۔"

"یونیورسٹی کے اسٹوڈنٹس اتنے فارغ نہیں ہیں۔"

"اس میں فارغ ہونے کی کیا بات ہے یہ تو نیکی کا کام ہے۔" اس کی زبان سے پھسلا۔

"تو یہ نیکی کا کام تم نے سب سے کہا کرنے کے لیے؟" وہ استہزائیہ ہنسا۔

"نہیں۔" امرحہ کو اس کا انداز برا لگا۔

"تو پوائنٹ دیے ہوں گے سب کو تم نے۔" طنز یہ کہہ کر وہ جانے لگا۔

یہ بات اس کے انداز سے زیادہ بری لگی۔ "وہ سب میں نے لکھے ہیں۔ داد دو مجھے عالیان میں نے سیکرٹ روم کو ہزاروں خطوط سے بھر دیا ہے۔"

"ایسے بے کار کام کے لیے داد دیتا ہوں تمہیں۔" اس نے پلٹ کر کہا۔

"تم مجھ سے ناراض ہونا پسند کرتے ہو مجھ سے۔" وہ گھوم کر اس کے سامنے آ کھڑی ہوئی۔

"نا تم سے ناراض ہوں نا ہی ناپسند کرتا ہوں کیونکہ یہ کرنے کے لیے کسی تعلق کا ہونا ضروری ہے اور ہمارے درمیان ..."

"تم ہو نا ... تم میرے دوست ہو۔"

"اب میں کہہ رہا ہوں۔ میں تمہارا دوست نہیں ہوں۔"

"تم مجھے معاف کیوں نہیں کر دیتے۔"

"میں معاف کر چکا ہوں۔"

"تو تم مجھ سے بات کیوں نہیں کرتے۔"

"کیونکہ میں سب باتیں ختم کر چکا ہوں۔" کہہ کر وہ رکا نہیں چلا گیا۔

اب یہ وہی مقام تھا کہ وہ گلستان بھر کے گل اس کے قدموں میں بچھا دے گی تو بھی وہ انہیں پھلانگ کر گزر جائے گا۔ کیونکہ ایک بار وہ کانٹے بچھا چکی تھی۔ اب آسمان کے ستاروں کے جھرمٹ بھی اس کی راہوں میں ڈھیر کر دینے پر اس کی اندھیری راہوں میں روشنی نہ کر سکے گی۔

ماحول انگشت بدنداں تھا اور ہوا نے اپنے پر اپنی آنکھوں پر لپیٹ کر آنکھیں میچ لی تھیں۔ قسمت سے پوچھ پرتال نہیں کی جا سکتی کیونکہ کبھی یہ چنگیز خان کی خون آلود تلوار ہوتی ہے اور کبھی حاتم طائی کا کمال سخاوت۔ "قسمت۔"

☆ ☆ ☆

"اگر ساری دنیا تباہ ہو رہی ہو اور کسی ایک چیز کو آئندہ انسانی زندگی کی ترقی کے لیے قائم رہنے کی اجازت ہو تو میں یہ اجازت سائیکل کے لیے لینا پسند کروں گی۔ سائیکل۔ تکبر سے پاک 'چلانے والے کی شاہی سواری'"

نتل کاک کے سامنے کی سڑک پر اس نے این اون کے ساتھ مل کر کافی مشق کر لی تھی سائیکل چلانے کی۔ سیدھی خالی سڑک پر وہ بنا ڈرے چلا لیتی 'سادھنا اور این اون کو پیچھے بٹھا کر بھی مشق کی۔ کسی کو پیچھے بٹھا کر سائیکل چلانا اناڑی سائیکل چلانے والے کے لیے مشکل ہوتا ہے لیکن اس نے تھوڑا بہت اس سلسلے میں ڈر خوف نکال ہی لیا۔ دو بار وہ یونی کے راستے تک بھی گئی این اون پیچھے بیٹھی ہوئی۔

"سب ہمیں ہی دیکھ رہے ہیں نا؟" اس کا سانس گم ہو ہو جاتا۔

"کیا واقعی؟" این اون اپنا ہیئر بینڈ ٹھیک کرنے لگی۔

"ہاں مجھے دیکھ رہے ہیں۔" سائیکل ڈگمگائی۔

"کیوں۔ تم کیا ہو جو تمہیں دیکھا جائے۔"

"پاکستانی۔ پاکستانی لڑکی سائیکل چلا رہی ہے نا۔"

"پاکستانی لڑکی سائیکل چلائے تو اسے سب دیکھیں۔ کیوں ایسا تضاد کیوں۔" "شکوہ۔" "چپ کر جاؤ این اون میں نے تمہیں گرا دینا ہے۔" "دھمکی۔"

"تم مجھے گرا دو۔ لیکن سائیکل تو تھوڑی تیز چلاؤ۔ کم از کم آخری سانس تو لے لوں۔"

"ٹھہرو اس بس کو گزر جانے دو اس کے ڈرائیور کو بہت جلدی ہے۔" اس نے سائیکل روک دی کوئی بجا سویں بار روئی کہ یہ کار گزر جائے 'یہ شرارتی بدتمیز لڑکا گزر جائے' ذرا ٹریفک کم ہو لے سڑک خالی ہو لے۔ وغیرہ وغیرہ مزید وغیرہ وغیرہ بھی۔

"جو بس ہمارے پیچھے ہے اسے بھی گزر جانے دو اور جو اس کے پیچھے ہے اسے بھی آگے آنے دو آگے آ کر اسے بھی گزر جانے دو۔ ٹھہرو مجھے بس میں ہی بیٹھ جانے دو۔"

"خبردار جو تم اتریں این۔"

"اس رفتار سے تمہارے سائیکل چلانے کے دوران میں دس بار اتر کر بیٹھ چکی ہوں 'بیٹھ بیٹھ کر تھک جاتی ہوں تو کھڑی ہو کر ساتھ چلنے لگتی ہوں 'اور اس ایشین فلیگ کو تھوڑے اور بل دو گردن میں' میں تابوت میں بند ہو کر جاپان واپس جانا نہیں چاہتی۔"

سائیکل روک کر اس نے ایشین فلیگ کو دو اور بل دیے گردن میں اس نے جینز پر ٹاپ پہن رکھا تھا کہ زیادہ یورپین لگے۔ سر پر اس نے کیپ پہن رکھی تھی جس کی جھری سے اس کے لمبے بالوں کی تیل باہر نکلی ہوئی تھی۔

یونی کی طرف جاتے دائم اور راما نے اسے دیکھا اور دونوں نے سارے دانت نکال دیے اور چلتے چلتے کھڑے ہو کر اسے دیکھنے لگے۔ دائم نے ہاتھ سے پرفیکٹ کا اشارہ بھی کیا اور اتنی سی بات پر وہ سائیکل گرا بیٹھی۔ این اون بھاگ کر یونی چلی گئی وہ اکیلی پیدل سائیکل کو لے کے یونی تک آئی۔

"یہ پاکستانی 'ہندوستانی برداشت ہی نہیں کر سکتے کہ ان کے خطے کی لڑکیاں ایسے سائیکل چلائیں الٹا جو اس بانتہ کر دیتے ہیں۔" غصے سے وہ ان پر بڑبڑانے لگی۔

آنے والے دنوں میں آدھا راستہ وہ چلاتی اور آدھا راستہ این اون 'تب ہی کہیں جا کر وقت پر یونی پہنچ پاتے بھی دیر ان کے آگے آگے ہوتی گارڈ کی صورت۔ وہ تیز گھنٹی بجاتی اور دوسرے سائیکل سواروں کو پیچھے کرتی جاتی کہ بیگم لیڈی آف پاکستان اپنی سواری چلا رہی ہیں 'تھوڑا ڈرتی ہیں ذرا پیچھے پیچھے ہو جائیں۔

ایک دن ایسے ہی راستے میں وغیرہ وغیرہ سے ڈر کر سائیکل کو روکے وہ بمشکل یونی روڈ تک آئی کہ پیچھے سے ایک دم سے عالیان کی سائیکل عین اس کے پہلو میں دائیں طرف برابر میں آئی۔ وہ بھی اپنے دھیان میں تھا امرحہ بھی اور جب امرحہ کی اس پر نظر پڑی تو وہ اتنی بری طرح سے گھبرا گئی کہ دائیں رخ ٹھیک اس کی

سائیکل کے اوپر سائیکل گرا بیٹھی۔

این اون جاپانی میں چلائی جس کا اردو میں ترجمہ ہے "ہائے اماں جی مجھے مار ڈالا۔"

امرحہ کی سائیکل پوری کی پوری عالیان کی سائیکل کے اوپر تھی، خود وہ بھی پورے اور یہ سب ایسے ہوا کہ۔

"وہ آیا۔۔۔ اسے دیکھا اور اسے گرا دیا۔"

دو سائیکلوں کے اس ٹکراؤ سے مانچسٹر کا روڈ ہل سا گیا۔۔۔ اور اس کے نتیجے میں جو کچھ سب سے برا ہوا وہ یہ تھا کہ اس کی سائیکل کے آگے لگے اسٹینڈ باسکٹ میں کچھ سینڈوچز ٹشو میں لپیٹے رکھے تھے شاید وہ ناشتا کر کے نہیں نکلا تھا اور وہ ناشتا آکسفورڈ روڈ پر نکل کر گرا تھا اور دو عدد سینڈوچز روڈ پر چپکے بکھرے پڑے تھے اب وہ کچھ بھی ہوں گے لیکن سینڈوچز نہیں ہوں گے۔

عالیان نے ایک غصیلی نظر امرحہ پر ڈالی اور پھر سینڈوچز کو دیکھا اور جیسے رونے کو ہو گیا۔۔۔ اس بے چارے کا کتنا بڑا نقصان ہو گیا تھا۔

"میری غلطی نہیں ہے۔" امرحہ بھی رونے کو ہو گئی۔

اس نے اپنی سائیکل اٹھائی۔۔۔ بے چارے ہو چکے سینڈوچز سمیٹے اور جانے لگا۔

"عالیان!" این اون نے آواز دے کر روکا اور اس کے پیچھے سائیکل پر بیٹھ گئی۔

اب سارا مانچسٹر اس کی سائیکل کے پیچھے بیٹھے گا سوائے اس کے۔

یونی کے اندر جا کر این اون کو ڈھونڈا اسے برگر لے کر دیا۔

"کہنا تمہاری طرف سے ہے۔"

"تمہاری طرف سے مجھے اور میری طرف سے عالیان کو؟"

"پاگل کہنا ٹریٹ ہے، لے لو۔"

"پر میں تم سے ٹریٹ لینا نہیں چاہتی نہ اسے دینا چاہتی ہوں۔"

امرحہ نے اس کی پونی کھینچی اور آدھا گھنٹہ لگا کر اسے ساری بات سمجھائی۔

این اون برگر ہاتھ میں لے کر بزنس اسکول کی طرف جانے لگی کچھ فاصلہ رکھ کر امرحہ بھی اس کے پیچھے پیچھے تھی اسے ڈر تھا کہ وہ ضرور کوئی گڑبڑ کرے گی اور گڑبڑ ٹھیک اس کے سامنے آ گئی۔

کارل نے برگر ہاتھ میں لے ایک ننھی بچی کو خاموشی سے جاتے دیکھا تو رک گیا اور اس کا حال احوال پوچھنے لگا اور پھر برگر اس کے ہاتھ سے لے لیا۔

این ننھی ہی تھی کہ اس نے فوراً برگر کی ایک بڑی بائٹ لی۔

"تم نے کارل کو برگر کیوں دیا؟" امرحہ رونے کو ہو گئی۔

"اس نے کہا وہ عالیان کے پاس ہی جا رہا ہے اور اسے وہ برگر دے دے گا۔ میں نے اس کا شکریہ ادا کیا اور آ گئی۔"

"ایک بار پھر جاؤ اس کا سر پھوڑو اور آ جاؤ۔"

"یہ کام اب تم کر لو۔۔۔ میں تھک گئی ہوں۔" کہہ کر وہ ننھی بچی چلی گئی۔

بڑی بچی دل مسوس کر کھڑی رہی۔ "کاش کوئی عالیان کو ٹریٹ دے دے۔"

ابھی وہ سوچ ہی رہی تھی کچھ کرنے کا کہ ویرا ہاتھ میں برگر اور کافی لیے ڈیپارٹمنٹ کی طرف جاتی ہوئی نظر آئی۔

امرحہ کا دھاڑیں مار مار کر رونے کو جی چاہا۔ کیا اتنے بڑے روس میں کوئی یونیورسٹی نہیں تھی کہ ویرا وہاں پڑھ سکتی اسے مانچسٹر آنے کی کیا ضرورت تھی بھلا؟

اندھیرے غار میں بند پڑے رہنے کی کیفیت تھی۔ کسی ایک طرف سے روشنی لکیر بناتی آ رہی تھی۔ روشنی کی لکیر بڑھتی ہی جا رہی تھی۔۔۔ غار کا دہن کھل رہا تھا۔۔۔ پرسکون اور آزاد ہو جانے کی کیفیت تھی۔

کہ دور سے آتی چاپ قریب آتی محسوس ہوئی سنائی دینے والی چاپ کہ گھٹنوں میں سر دے لیا جائے۔۔۔ کان لپیٹ لیے جائیں۔۔۔ ایک ہیولا بنا قریب سا آیا۔۔۔ لمبے سائے کے اس پار روشنی کے دہن کے عین سامنے کھڑا ہوا اور ساری روشنی کو پیچھے دھکیل دیا۔۔۔ اور اندھیرا۔

عالیان ہڑبڑا کر اٹھا۔۔۔ نیم اندھیرے کمرے میں وحشت زدہ خود کو بستر پر پایا۔ اس کی سانسیں تیز تیز چل رہی تھیں جیسے رات بھر بھاگتا رہا ہے کوئی اس کے پیچھے تھا۔۔۔ اس کے کانوں میں وہ انتہائی چاپ ابھی بھی زندہ تھی۔۔۔ وہ اسے محسوس کر رہا تھا۔۔۔ وہ خواب میں سے ہو کر آیا تھا۔۔۔ جیسے خود کو کھینچ کر خواب سے باہر نکالا تھا وہ خوف زدہ بھی تھا۔۔۔ یا کچھ اور تھا۔۔۔ جو بھی تھا اس کی دائیں آنکھ میں آنسو تھا۔

امرحہ رات کو جاب سے واپس آ رہی تھی کہ سڑک کے کنارے چلتے اسے ایک آدمی نے بہت مہذب انداز سے روکا۔

"خاتون آپ کا تھوڑا سا وقت چاہیے۔"

امرحہ رک گئی۔ "فرمائیے۔"

"آپ خاتون مہر کی بیٹی ہیں؟"

"نہیں۔" امرحہ سمجھی وہ لیڈی مہر کے مرحوم شوہر کے رشتے داروں میں سے کوئی ہے۔

"ان کی لے پالک بیٹی نہیں ہو؟"

"نہیں میں تو پاکستان سے آئی ہوں یونیورسٹی میں پڑھنے ان کے گھر میں رہتی ہوں پے انگ گیسٹ ہوں۔"

"اچھا۔۔۔ اس کا مطلب تم ان کے سب بچوں کو جانتی ہو۔۔۔ جنہیں اس خاتون نے لے کر پالے ہیں۔"

امرحہ کو ایک دم سے لیڈی مہر کی بات یاد آ گئی اور وہ آگے چلنے لگی۔

"میں اس بارے میں کوئی بات نہیں کر سکتی۔ آپ جائیں یہاں سے۔"

"انہوں نے دس بچے پالے ہیں کیا تم سب کے نام جانتی ہو۔۔۔ ان کی شکلیں۔۔۔" امرحہ اور تیزی سے چلنے لگی وہ بھی ساتھ ساتھ چلنے لگا۔

"مجھے صرف لڑکوں کے بارے میں معلومات چاہئیں۔۔۔ کہ وہ کہاں ہیں، کس ملک میں ہیں کون کون ہیں ان کی تصویریں مل سکیں تو بہتر ہو گا۔ تم ایک چھوٹی سی جاب کرتی ہو کتنا کما لیتی ہو۔۔۔ میں تمہیں پورے ایک لاکھ پونڈ دوں گا۔"

امرحہ حیرت سے رک کر اسے دیکھنے لگی یہ کون تھا جو اتنی بڑی رقم دینے کو تیار تھا۔

"اگر چاہو تو زیادہ بھی دے سکتا ہوں۔"

"میں پولیس کو بلاؤں گی جناب!"

"دو لاکھ پونڈ۔۔۔ تین لاکھ پونڈ۔۔۔ جواب دو۔۔۔ جانتی ہو کتنے پیسے ہوئے ہیں یہ۔۔۔ تحمل سے میری بات سنو، تم جذباتی ہو کر بھاگ رہی ہو، تمہیں کچھ زیادہ کام نہیں کرنا صرف اتنا کہ وہ سب لڑکے اس وقت کہاں ہیں۔۔۔ کس کس ملک میں ہیں ان کے نام کیا ہیں۔۔۔ بس اتنا ہی اور اتنے سے کام کے اتنے پیسے۔۔۔ اتنے کہ تم ساری زندگی میں شاید ہی کما سکو گی۔"

"پہلے بچوں کو چھوڑ جاتے ہو پھر انہیں ڈھونڈتے اور خریدتے پھرتے ہو؟" امرحہ نے طنز سے کہا۔

اس نے بہت سکون سے امرحہ کے طنز کو سہا۔۔۔ "ہاں کچھ ایسا ہی ہے۔۔۔ لیکن اگر تم تھوڑا سا تعاون کر دو تو بہتر ہو گا۔"

"میں کسی بھی قسم کا تعاون نہیں کروں گی۔۔۔ جائیے۔"

"چار لاکھ پونڈ۔۔۔"

"میں پولیس کو فون کرنے لگی ہوں۔۔۔" امرحہ نے فون نکال کر ہاتھ میں لیا۔

"پانچ لاکھ پونڈ۔۔۔"

امرحہ نے عاجز آ کر اس کی شکل کی طرف دیکھا اور نمبر ڈائل کرنے لگی۔ "تمہارا کام بہت آسان ہے تمہیں صرف یہ معلوم کرنا ہے کس لڑکے کی ماں کا نام مارگریٹ جوزف تھا۔"

امرحہ فون کان سے لگانا بھول گئی وہ اس انسان کی شکل دیکھ رہی تھی۔

(باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ)



شاہین ملک

دل کی چوری

کچھ رشتے نبھانے کے لیے نہیں بنتے اور کچھ کو جوڑا ہی اس نیت سے جاتا ہے کہ اذیت میں مبتلا رکھا جائے۔ اگر ایسا نہیں ہوتا تو پھر عبیر اور پروفیسر خالد کا رشتہ کیا معنی رکھتا تھا۔

میں ان دونوں کو بہت سالوں سے جانتی ہوں۔ عبیر میرے ساتھ جامعہ کراچی میں داخل ہوئی۔ وہ سائنس کی طالبہ تھی۔ میں سماجی بہبود کے شعبے کی طرف نکل گئی۔ مگر ہمارا تعلق ان علیحدہ شعبوں کے باوجود کمزور نہیں پڑا۔ وہ پڑوسن بھی تھی۔ روز مرہ کے کئی چھوٹے موٹے کام ہم مل جل کر کیا کرتی تھیں۔ بازار آنا جانا ہو' موسمی پکوان بنانے ہوں یا عید تہواروں پر شاپنگ میں ہاتھ بٹانا ہو' وہ ساتھ دیتی تھی۔ جن دنوں پروفیسر خالد عبیر میں دلچسپی لینے لگے تھے' تب بھی وہ اتنی ہی ملنسار اور ہمدرد تھی۔ کئی مرتبہ بازار جاکے بجٹ آؤٹ ہوتا تو ہم ایک دوسرے کے لیے قرض حسنہ جاری کردیتے۔ کبھی ماتھے پر بل نہیں پڑتا تھا۔ آئس کریم یا چاٹ کے پیسے بچیں نہ بچیں' فکر نہیں ہوتی تھی۔ بس شاپنگ مکمل کرنا ہمارا ہدف ہوتا تھا۔ اسی طرح گھر کے دکھ سکھ میں بھی۔ کسی کی بات بری لگ جائے یا کسی کو اپنے دل کی بات کہنی ہو' ہم ایک دوسرے کے ساتھ گھڑی ملتی تھیں۔

جس روز وہ مجھے پروفیسر خالد سے متعارف کرانے ڈپارٹمنٹ لے کر گئی تھی' میں بہت خوش تھی اور وہ بہت پرجوش۔ ہم نے ملک شیک کے بعد ان کے دفتر میں چائے پی۔ کسی پروفیسر کے کمرے میں' چائے پینا چاند پر قدم رکھنے جیسی خوشی اور ولولہ انگیز تجربے سے کم نہیں تھا۔ میرے اپنے ڈپارٹمنٹ کے ٹیچر تو خاصے سخت گیر قسم کے تھے کہ ان کے کمرے میں قدم رکھنا اور اسائنمنٹ دے کر واپس آنا ہی کے ٹو سر کرنے کے برابر محسوس ہوتا اور یہاں ایک پروفیسر ہم سے ہماری دلچسپی کی چھوٹی چھوٹی باتیں کررہا تھا۔

واپسی پر اس نے پوچھا۔ "سارہ! کیسے لگے نہیں۔"

"بہت اچھے۔ مگر عمر۔" میں رک گئی' وہ سمجھ گئی کہ مجھے ان کی عمر زیادہ لگی ہے۔

"اسٹیبلش تو ہیں نا۔ دیکھو سارہ! امجد' محمود اور کمال احمد۔ یہ تینوں کزنز رشتہ لیے حاضر ہیں اور ان میں سب یا تو جدوجہد میں ہیں یا مستقل جانے کے خواہش مند۔ ذہنی ان کی پہنچ سے دور ہے۔ کوئی بھی پروفیشنل نہیں۔ ٹیکنیشن' پلمبر اور کارپینٹر کیا یہی رہ گئے اپنے نصیبوں میں۔" وہ آگے بھی کچھ کہنا چاہتی تھی' مگر پہلی بار میں نے اسے ٹوک دیا' بلکہ جھڑک دیا۔

"خاندان کی چند ایک لڑکیاں ایم اے' ایم ایس سی کرلیں تو انہیں یہ حق تفویض نہیں ہوجاتا کہ وہ محنت کشوں کی تضحیک کریں۔ آپ دل کا سودا نہیں چاہتیں تو پیچھے ہٹ جائیں' مگر غربت دھونے کے لیے محنت کرنے والوں کا تمسخر نہ اڑائیں۔" وہ چپ ہوگئی' مگر بعد میں صفائی پیش کرتے ہوئے بولی۔

"دراصل اب دماغ کچھ خراب ہوگیا ہے۔ نظر میں وہ لوگ نہیں سمارہے' جو ساتھ ایک آنگن میں

کھیلے۔ ساتھ پلے بڑھے۔ تم ٹھیک کہتی ہو' وہ اعلا تعلیم نہ حاصل کر سکے۔ مجھے حسرت سے دیکھتے رہے' مگر خلیج کی کمائیاں لا کر ماؤں کی ہتھیلیوں پر رکھنے والے اسی آس میں رہے کہ میں ان کے وجودوں پر طاری پردیس کی تھکن اتاروں۔ کوئی میٹھی بات کروں' کوئی پیغام قبول کروں اور۔ یہ سب میں نے نہیں کیا۔ مجھ سے مایوس ہو کر امجد نے میٹرک پاس دوشیزہ سے منگنی کر لی ہے۔ باقیوں کی مائیں گھر کے چکر لگا رہی ہیں' مگر فضول ہی ہے۔ اب تم جاؤ اور امی سے خالد صاحب کی بات کر دینا کہ تم مل چکی ہو' [illegible] ہیں۔"

وہ ایک سانس میں کہتی جا رہی تھی۔ مجھے پیار آ رہا تھا اس پر' مگر حیرت بھی ہو رہی تھی کہ اس کی سوچ کیا ہے۔ خالد صاحب کی پہلی شادی' ایک بچی اور بیوی کی علیحدگی کے مسائل' سب کچھ ہی تو جانتی تھی۔ خالد صاحب نے کچھ بھی چھپایا نہیں تھا اس سے۔ یونیورسٹی میں ہر کسی کو پتا تھا۔ ان کی بچی کلاس الفتھ میں پڑھتی ہے' جو اپنی نانی کے گھر رہتی ہے' چھٹی کے روز گھر آتی ہے۔

"سوچ لو۔ پیار' محبت' توجہ اور وقت ہی نہیں سرمایہ بھی شیئر کرنا پڑے گا' کر سکو گی؟" میں نے اپنی دانست میں اسے سمجھانا چاہا۔

"غیر شادی شدہ مرد کے ساتھ تعلق جوڑتے ہوئے کیا کچھ بھی شیئر نہیں کرنا پڑتا۔ کم از کم ہم جیسے مڈل کلاس اور مشترکہ خاندانی نظام میں۔ امجد کی چار بہنیں بن بیاہی بیٹھی ہیں۔ بوڑھی ماں اور باپ بیماریوں کے علاج کے خرچے ہی خرچے اور محمود یا کمال کی طرف دیکھو تو دو سو گز کے مکان پر چھ بھائیوں کی رہائش۔ ساتھ ساتھ بوڑھے والدین الگ۔ چھ بھائیوں کی اولادیں الگ۔ سانس لینے کو گھر میں جگہ نہیں۔ ان سے تو پروفیسر خالد ہی بھلے جو مجھے چاہتے بھی ہیں اور ذمہ داریوں کی تقسیم بھی جانتے ہیں۔ مجھے تو فخر ہوتا ہے۔ انہوں نے مجھے پہلے دن سے سمجھ لیا۔ میری قدم قدم پر رہنمائی کی' ورنہ میں اور یہ سمسٹر A گریڈ میں پاس کر سکتی تھی؟"

میں جان چکی تھی کہ وہ فیصلہ کر چکی ہے تو اب والدین کو شریک کرنا ضروری ہے۔

ایک سال ہی میں یہ شادی ہو گئی۔ وہ دونوں بہت خوش تھے۔

☼ ☼ ☼

میں بھی دوسرے محلے بیاہ کر آ گئی۔ میری ممانی کے میکے والوں سے اس خاندان کے پرانے تعلقات تھے۔ حسن اچھے انسان لگے۔ سافٹ ویئر انجینئر تھے۔ ان دنوں یہ ٹیکنالوجی نئی نئی متعارف ہوئی تھی۔ اپنے شعبے کے ماہرین کے ساتھ جڑے ایک ٹیم کی مانند محنت سے کام کرتے۔ اتفاق سے مجھے بھرا پُرا سسرال ملا' لیکن تعلیم یافتہ لوگ تھے اور سمجھ داری سے رشتے نبھاتے تھے۔ اب عبیو سے ملنا جلنا تو کم ہو گیا تھا۔ ٹیکسٹ میسجز پر رابطہ رہتا اور فون پر بھی بات چیت ہو جاتی۔ وہ گھر آتی تو میں بھی کسی بہانے سے امی کے گھر کا چکر لگا آتی۔

شادی کے بعد اس نے کہا تھا۔

"خالد واقعی باوقار شخصیت رکھتے ہیں۔ ان کے نام سے جڑنا ہی بڑے اعزاز کی بات ہے۔ ہماری بیٹی زارا اب جب چاہتی ہے ہمیں فون کرتی ہے۔ گھر آتی ہے۔ ہم کو تنگ کر جاتی ہے۔ کبھی وہ ایک ہفتہ ہمارے ساتھ قیام کرتی ہے۔ میں اسے ہاسٹل سے لانا چاہتی ہوں' مگر خالد ابھی کچھ وقت چاہتے ہیں۔"

میں خاموشی سے سنتی رہی۔

بہتر یہی تھا کہ وہ اپنی زندگی کو اپنے ڈھب سے گزارے۔ میں اسے کوئی مشورہ کیوں دیتی۔ اسے مشورے کی ضرورت نہیں تھی۔

"اپنی اولاد کے بارے میں کیا سوچا ہے؟" میں نے دھیرے سے پوچھا۔

"ابھی تک تو نہیں۔ مگر تنہائی محسوس ہونے لگی ہے۔" میں نے دیکھا اس کی آنکھوں میں دیپک بجھ سے گئے تھے۔

"تو پھر سوچ لو' کیونکہ زیادہ وقت گزر گیا تو کوئی پیچیدگی بڑھ سکتی ہے۔ اللہ نہ کرے کہ ایسا کچھ بھی ہو' مگر پھر بھی۔" میں رک گئی اس کا ردعمل دیکھنے کے لیے۔

اس نے پہلو بدلا اور بولی۔ "خالد نئی ذمہ داری سے گھبراتے ہیں۔ کہا تھا ایک بار میں نے' تمہاری سنی ان سنی کر گئے۔"

میرا کوئی جواب یا ردعمل جانے بغیر وہ میرے بچوں ارحم اور عنایہ سے کھیلنے لگی۔ میں نے موقع مناسب جانا اور چائے کے لوازمات لگانے میں بوا کی مدد کرنے لگی۔ میں نے دل ہی دل میں سوچا کہ آخر وہ عورت ہی ہے نا جو چار دیواری چاہتی ہے۔ گھر کو ایک سائبان بنا کے ننھے منے بچوں کی قلقاریاں اور شرارتیں دیکھنا اور زندگی کو اس کے مکمل رنگوں سمیت محسوس کرنا چاہتی ہے۔ لیکن کیا کرے۔ پروفیسر خالد جب نہیں چاہتے تو اسے ان کی رائے بدلنے تک انتظار کرنا ہی ہوگا۔ عورت کے لیے مرد سے نام جڑوانا اب تک کافی ہوتا ہے' سب کتابی باتیں ہیں' ہوتا وہی ہے۔ اللہ رحم کرے اس جوڑے پر۔ وہ کچھ ہی دیر بعد چلی گئی۔

رات کے کھانے پر حسن' میں اور بچے عبیو کی باتیں کرنے لگے۔ بچوں کو عبیو کے لائے ہوئے کھلونے بہت پسند آئے تھے۔ اتفاق سے حسن نے بھی ان کی اولاد ہی کے بارے میں پوچھا۔ خود ہی انہوں نے کہا۔

"پروفیسر صاحب کے ہاں اپنی بیٹی ہے نا تو انہیں اب نئے بچے کی ضرورت کیا ہے؟ میرا تو نہیں خیال کہ وہ عبیو کو یہ خوشی بھی دے سکیں گے۔"

"اچھا۔ تو کیا جوان لڑکی سے' عمر کے اتنے بڑے فرق سے شادی رچانا خود غرضی ہو سکتی ہے۔"

"ہو بھی سکتی ہے اور نہیں بھی۔ میں انہیں اتنا قریب سے تو جانتا نہیں۔ لیکن تم چھوڑو' تم بھی کیا قصہ لے کر بیٹھ گئیں۔ تمہاری سہیلی کا دماغ کیوں خراب ہو گیا تھا۔ انہیں صاحب ثروت دیکھ کر اپنی جوان امنگوں کو داؤ پر کیوں لگا بیٹھی۔" وہ ہاتھ دھونے واش روم چلے گئے۔

اب میں انہیں کیا بتاتی کہ اس غلطی کا احساس تو اس کے والدین نے بھی دلایا تھا۔

☼ ☼ ☼

چند برس گزر گئے۔ حسن کو ملائیشیا میں جاب مل گئی۔ ہمارا کنبہ پاکستان اب دو برس بعد آتا۔ عبیو سے ایک وزٹ میں تو ملاقات ہی نہ ہو پائی۔ یونیورسٹی سے پتا چلا کہ وہ اپنی فیملی کے ساتھ شمالی علاقہ جات گئی ہوئی ہے۔ میرا بیٹا ارحم پاکستانی نیوز چینلز دیکھنے لگا تھا۔ وہ جھٹ سے بولا۔

"مگر مما وہاں تو ڈرون اٹیک ہوتے ہیں اور ضرب عضب بھی۔"

"اس لڑکی کو ایڈونچر ہی پسند ہیں۔ آؤ دیکھتی ہے نہ تاؤ۔ خطرات سے کھیلتے چل رہی ہے۔" ڈپارٹمنٹ والوں نے میرا نمبر لیا کہ جوں ہی وہ آئیں انہیں دے دیں گے۔

ہفتہ بھر گزر گیا۔ زندگی کے ڈھب بدلتے ہیں تو مصروفیات اور دلچسپیاں بھی آپ ہی آپ تبدیل ہو جاتی ہیں۔ اب میں اس کے ساتھ براہ راست رابطے میں نہیں رہی۔ میں بازاروں میں میچنگ چوڑیاں' دوپٹے' جوتوں اور نئے فیشن کے ملبوسات کی خریداری میں مصروف ہو گئی۔ دو نندوں کی اکٹھی شادیاں ہو رہی تھیں۔ تقریبات کے ساتھ ساتھ رسموں رتوں کے لیے ہزاروں کام تھے۔ جن میں اپنے سسرالی عزیزوں کا ہاتھ بٹا رہی تھی۔ دو نندوں کے بعد ایک دیور صاحب شادی کی قطار میں لگے تھے۔

مجھے یہ بھیڑ' یہ بھرا پُرا کنبہ اور ذمہ داریوں بھری زندگی حسن اور بچوں کے سہارے بہت اچھی لگتی تھی۔ اور حیرت انگیز بات یہ تھی کہ میں اپنے والدین کی اکلوتی اولاد تھی۔

میرا رشتہ طے کرتے وقت بھی میرے والدین بہت پریشان تھے۔ بظاہر شہزادیوں کی طرح رہتے بستے جس گھرانے میں بیاہی گئی وہاں شروع دن ہی سے ذمہ داریوں کی گٹھڑی میرے سر پر لاد دی گئی تھی۔ میرے سامنے میری رول ماڈل میری خالائیں اور امی تھیں جو دس دس بچوں کے گھرانوں میں بیاہی گئیں اور ذمہ داریاں نبھاتے ہوئے جن کے ماتھوں پر کبھی بل نہ پڑے۔

عبیر کی امی بھی اپنے سسرال میں تیسری بہو تھیں اور ان کے بعد دو اور بہوئیں گھر میں آئیں۔ اس لحاظ سے انہوں نے بھی اسی طرح مشترکہ خاندان میں ہی زندگی شروع کی تھی‘ لیکن وہ اپنی اولاد میں اس طرح کے انتظامی ڈھانچے سے محبت پیدا نہ کرسکیں۔ شاید ان کے دل میں کہیں سسرال سے نفرت کی چھوٹی سی چنگاری دبی ہوئی تھی۔ شاید کسی عزیز کا رویہ بہت کھلا ہے یا کوئی توقع پوری نہ ہوئی‘ جس کی وجہ سے وہ خاندان کے کسی لڑکے میں دلچسپی نہ لے سکی‘ بلکہ غرور کا یہ عالم ہوا کہ التفات کا جواب ہمیشہ سرد مہری اور روکھے پن سے دیتی رہی۔ جس کے بعد کسی کا حوصلہ ہی نہ پڑا کہ اسے آنکھ بھر کے دیکھتا۔

ماسٹرز کرنے یونیورسٹی گئی تو خیال کو اور بھی آزادی اور تقویت مل گئی۔ پروفیسر خالد کی بیوی کسی بات پر ناراض ہو کر چلی گئی تھیں اور خلع لے کر ان کی زندگی سے دور ہو گئیں تو عبیر کا بھولا پن‘ ذہانت اور حسن دیکھ کر ان میں ایک بار پھر گھر بسانے کی آرزو جاگی۔

میں نے اس کے گھر شادی کا کارڈ بے دھیانی میں دیا۔ مگر اس نے بڑے دھیان سے اسے پڑھا اور اگلے روز ہم لاؤنج میں بیٹھی چائے پی رہی تھیں۔

"ملائیشیا کیسا ہے؟ کیا تم نے لنکاوی بیچ دیکھا‘ کیا بنانا بوٹ کو رسی کی مدد سے موٹر بوٹ سے باندھ کر کشتی رانی کی اور کبھی پینانگ کی اسٹیٹ مسجد دیکھی؟ میں جب وہاں گئی تھی تب "بے وو بیچ ریزورٹ" نیا نیا بنا تھا۔ بہت خوب صورت جگہ ہے۔" مگر وہ یہ قصے آج سے بیس برس پہلے کے سنا رہی تھی اور میں اسے آج کے ملائیشیا کے بارے میں بتاتی رہی تھی۔

"کیا کر رہی ہو آج کل؟" میں نے بات بدلی۔ اس نے بتایا کہ وی سی کی سیکریٹری ہے اور فزکس کے ڈپارٹمنٹ کی اعزازی لیکچرار بھی ہے۔"

"یہ تو بہت بڑی کامیابی ہے۔"

"خاک کامیابی ہے۔ تھک جاتی ہوں سارا دن کوڑھ مغز طلبا کے ساتھ دماغ کی دہی بن جاتی ہے۔" میں ہنستی رہی۔

"تمہاری زندگی بہت اچھی ہے۔ بچے ہیں‘ شوہر ہے۔ ملائیشیا ہے اور فکروں سے آزاد زندگی۔" وہ اسی طرح کے تقابلی جائزے لیا کرتی تھی۔

"تم ایک نسل کو علم نافع عطا کر رہی ہو‘ تاکہ وہ معاشرے کے مفید شہری اور انسان دوست بن جائیں۔"

میں چاہتی تھی کہ وہ صحت مندانہ طرز فکر اختیار کرے۔ کم از کم بڑھاپے کی دہلیز پر پہنچ کر ہی سہی‘ دنیا کو دلفریب رنگوں کو عینک لگا کے دیکھنے کے بجائے صرف بینائی کا چشمہ لگائے‘ تاکہ دور اور نزدیک سے حقائق کو باریک بینی سے دیکھے۔

"اور تم ماں بن گئی ہو۔ ایک رحمت اور ایک نعمت کو انگلی پکڑ کر انہیں کٹھن راستوں سے منزلوں کا پتا دے رہی ہو۔ تمہارے قدموں تلے جنت آگئی ہے۔ اور میں۔۔۔ میرے پاس دماغ کھپانے کو ایسی ہی چند مصروفیات رہ گئی ہیں۔"

میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ بات کو درمیان میں چھوڑ دوں تو کہیں وہ اسی خیال کو صحیح نہ تصور کرلے کہ اس کی زندگی بے مقصد ہے اور یہ بھی نہیں کہہ پا رہی تھی کہ تم نے اپنی زندگی خود اپنے ہاتھوں چنی ہے۔ تم نے بغاوت کی ہے‘ جس کے عذاب جھیلنے پڑ رہے ہیں۔

"مجھے تو اب رات کو نیند کی گولی کھائے بنا نیند بھی نہیں آتی۔"

"ایسا نہ کرو۔ ڈپریشن کا علاج کرواؤ۔ کیوں اپنی جان کو عذاب میں ڈالا ہوا ہے۔"

"عذاب بھی ایسا ویسا۔ بیٹی مجھے سوتیلی ماں کہہ کر نفرت کرنے لگی ہے۔ پروفیسر صاحب نے مجھے یونیورسٹی میں مصروف کر رکھا ہے‘ تاکہ میں گھر پر آؤں تو بری طرح سے تھکی ہوئی ہوں۔ نہ لڑ سکوں‘ نہ کوئی مطالبہ کرسکوں۔" کہتے کہتے وہ رو پڑی تھی۔

"ذرا سوچو یہ ناشکرا پن نہیں۔ تم ایسی تو نہیں تھیں عبیر!" اسی اثنا میں موبائل بجنے لگا۔ اس نے آنکھیں پونچھ کر دیکھا‘ شاید پروفیسر خالد کا فون تھا‘ وہ بولی۔

"آج نکلی ہوں‘ تو بھی چین نصیب نہیں مجھے۔ پوچھا جا رہا ہے کہاں ہوں میں۔ کہاں جانا ہے میں نے؟"

میں خاموش رہی کہ یہ میاں‘ بیوی کے آپس کا معاملہ تھا۔ وہ جس کیفیت سے گزر رہی تھی۔ اس میں وہ کہاں مانتی کہ چاہنے والوں ہی کی تو خبر گیری کی جاتی ہے۔ غیروں یا واسطہ نہ رکھنے والوں کو کوئی مڑ کر نہیں دیکھتا۔

"بتا دو کہ میں آئی ہوئی ہوں۔ بلکہ یہاں بلالو۔ عرصہ ہی ہو گیا ان سے ملاقات کیے ہوئے۔" میں نے بڑے مان سے کہا تھا‘ مگر اسے اچھا نہ لگا‘ بولی۔

"تم نہیں جانتیں۔ وہ اب مجھ پر شک کرنے لگے ہیں۔ کہتے ہیں کن کن لوگوں سے چھپ چھپ کر ملنے جاتی ہو اور کب چھوڑ کے جا رہی ہو مجھے۔ جب ہاتھ اٹھاتے ہیں تو کہتے ہیں جاؤ کسی این جی او کا دروازہ کھٹکھٹاؤ کہ میں پڑھا لکھا ہو کر جاہلوں کی مانند اپنی بیوی پر تشدد کرتا ہوں اور تم میرے ساتھ نہیں رہنا چاہتیں۔"

مجھے لگا کہ وہ ایک ایسا مکان ہے جسے تعمیر ہوئے کئی سو برس گزر چکے ہوں اور مکینوں نے اس کی جو اب برتی ہوئی تعمیر پر وسائل صرف کرنے سے ہاتھ روک لیا ہو۔ دیواروں سے رنگ اور پلستر اکھڑ کر گرنے لگا ہو۔ اینٹوں کا یہ ستر کھلتا جا رہا تھا۔ پھر وہ اٹھی اور روتی ہوئی چلی گئی۔

مجھے وہ رات کاٹے نہیں کٹ رہی تھی۔ اس کی ماں زندہ نہ تھیں۔ بوڑھے والد تو تھے‘ مگر شب کوری کے مرض میں مبتلا تھے۔ شوگر اور بلڈ پریشر اس کے علاوہ تھے۔ انہیں یہ بتایا جانا۔ نہیں بتایا جاسکتا تھا کہ آپ کی لاڈلی بیٹی باتوں کے غبارے اڑا کر خالی ہاتھ ہو چکی ہے۔ حالانکہ خالی ہاتھ تو وہ نہیں تھی۔ جنہیں وہ چاہتی تھی وہ اس کے بہت قریب تھے۔ مگر شاید ابتلا ہے۔ ورنہ ان کی ذاتی زندگی کتابوں‘ طلبا‘ جامعہ کی انتظامی سرگرمیاں اور نصابی مصروفیات تک محدود تھیں۔ اس لیے تنہائی کا شکار تھی۔ کاش ان کے ہاں ایک ہی اولاد ہو جاتی۔

☼ ☼ ☼

چند روز بعد مجھے واپس ملائیشیا لوٹنا تھا۔ میں نے اسے شہر کے ایک چائنیز ریسٹورنٹ میں پہنچ کر آفر دی اور کوشش کی کہ وہ پروفیسر صاحب کو بھی ساتھ لے آئے۔ میں صرف انہیں دیکھنا چاہتی تھی کہ جو شخص کبھی طلبا میں آئیڈیل حیثیت کا مالک تھا اب کیا ہو گیا ہے۔ ورنہ میں کیا اس پوزیشن میں تھی کہ انہیں کچھ سمجھا سکوں یا مشورہ دے سکوں۔

اس نے ٹیکسٹ میسج بھیجا۔

"وہ محترم تو آج کل اسٹڈی ٹور پر لاہور گئے ہوئے ہیں۔ اصل میں یہ ٹور تو ایک بہانہ ہے۔ بیٹی کو اپنی ماں سے ملانے گئے ہیں۔ سنا ہے مہارانی ایک بار پھر زندہ ہو گئی ہیں۔"

پھر جب وہ لنچ پر آئی تو بولی۔

"مجھ سے تو یہی کہا تھا کہ اس نے خلع کے لیے مقدمہ کر رکھا ہے اور وہ اب تک خوامخواہ کیس کو طول دے رہے تھے۔ مجھ سے ملنے اور شادی کا فیصلہ کرنے کے بعد ان کے لیے فیصلہ کرنا آسان ہو گیا ہے‘ لیکن پتا نہیں بیٹی کے جوان ہوتے ہی وہ ایک بار پھر کیسے زندگی میں داخل ہو گئی ہے۔ پہلے تو رات رات بھر میسجز آتے جاتے رہتے۔ وہ رویا کرتی۔ بیٹی سے ملنے کا پروگرام ترتیب دیتی۔ پتا نہیں کب کراچی آئی کب یہ لوگ دوبارہ اکٹھے ہو گئے۔ میں جو خود کو پڑھی لکھی اور باشعور سمجھتی ہوں‘ اس قدر لاعلم کیسے رہی۔ ان کے جانے کے بعد ان کے سیکریٹری نے بتایا‘ وہ حویلی والی بیگم کے ہاں ٹھہریں گے‘ یہ نمبر ہے۔ ہمیں کہہ گئے ہیں کہ جب بھی اشد ضرورت ہو تب ہی انہیں فون کیا جائے۔ امتحانی کاپیاں بھی جانچ کر نہیں گئے۔ ان کی بیگم کی طبیعت ناساز ہے۔ پتا نہیں مجھے اندھیرے میں رکھنے کی ضرورت کیا تھی۔ میں تو واقف تھی کہ وہ اپنے جہیز میں ملی ہوئی حویلی میں مقیم ہے۔ بڑی آن بان شان والی ہے۔ میرے اور خالد کے تعلق کو بڑی آسانی سے قبول کر لینے والی ہستی کوئی عام محبت تو ہو نہیں سکتی۔ میرے دل میں اس کے لیے احترام تھا۔ مگر اب ایسا لگتا ہے اس تقسیم شدہ تعلق میں سے سہاگ کی

گھڑیاں سمجھوتے کی شکل میں دیکھنے کو ملیں گی۔"

"تم نے کیا سوچا تھا ان کے سامنے اپنی فتح کا پرچم اٹھا کے لے جاؤ گی کہ دیکھو جوان اولاد کی ماں! مرد وہ ہستی ہے جو منزل پر کبھی نہیں پہنچتا۔ ایک ضرورت' دوسری ہوس' تیسری عشق اور چوتھی مجبوری۔ یہ اپنی تھکن اسی طرح اتارتا رہتا ہے۔ کبھی تھکتا نہیں' تھکاتا ہے۔"

"اب تم طنز کر رہی ہو؟"

"نہیں۔ میری بہن ابھی طنز نہیں کر رہی' مجھے ہمدردی ہے تم سے' مگر کیا کروں۔ تمہیں کیسے آمادہ کروں کہ تم اپنے مدار کے گرد ہی رہو۔ ان دونوں کو وہیں چھوڑ دو جہاں وہ ہیں۔ اگر تم خالد صاحب کو سزا دینے کا سوچ رہی ہو تو بھی غلطی پر ہو۔ بیٹی اس کی ہے اسی کی رہے گی' لاکھ محبتیں' عنایتیں لٹاؤ' احساس وہ کیوں کرے' وہ تو ماں کے بہکاوے میں آئی ہوگی۔ باپ کے بہلاوے میں کھلونوں کی سی کشش اور تاثیر بھی نہیں رہی ہو گی اب تک۔ اگر اس زندگی کو اذیت ناک بنانا ہے تو ان سے توقعات رکھو' ورنہ تم خود مختار اور اپنے پیروں پر کھڑی ہو۔ مت دیکھو پیچھے مڑ کر۔ وہ جہاں تک ساتھ نبھائیں۔ چلو۔ جہاں ہاتھ چھڑائیں۔ اسے تقسیم کا ایک سوال سمجھ لو۔ اب تک تو تم بھی جان گئی ہو گی کہ محبت کی محرومی اور توقع ادھوری رہ جانے سے شخصیت میں کرب اٹھ آتا ہے۔ سب فطری ہے نا۔ کبھی کبھی ہم جذبات سے مغلوب ہو کر اکٹھے ہو کر رہنے کا جاں فزا تجربہ کرتے ہیں' لیکن بعد میں عقدہ کھلتا ہے کہ دراصل ہم ایک دوسرے کے لیے نہیں بنے تھے' بنے ہوتے تو حالات بگڑتے ہی نہیں۔"

"اب مجھے احساس ہوتا ہے کہ میں نے جس عمر میں پروفیسر صاحب سے عشق کیا۔ وہ عمر جذباتی طور پر نابالغ تھی۔ مجھے لوگوں کا کہنا ماننا چاہیے تھا۔"

"تم اب بھی اپنے مدار سے باہر جا رہی ہو۔ محبت کر کے کوئی غلطی نہیں کی تم نے' مگر زندگی پھولوں کی سیج نہیں ہوتی' لیکن تم تو اس محبت اور زندگی کے لیے' کیونکہ یہ تمہارا اپنا حق ہے عبیو۔ تم خالد صاحب کی زندگی کی رفیق ہو' انہیں اپنی زندگی کا احساس دلاؤ۔ اپنی ناراضی کا ثبوت دو انہیں۔ یا اگر ہمت ہے تو دوسری شادی کے لیے پہلی کو ختم کر دو۔"

"نہیں۔ نہیں یہ مجھ سے نہ ہو گا۔ اچھا میں چلتی ہوں۔ خالد آج شام کو لاہور سے واپس آ رہے ہیں۔ مجھے کھانا پکانا ہے۔"

"سنو۔ چائنیز لے جاؤ یہیں سے۔ کیوں تھکاتی ہو اپنے آپ کو۔ گھر جا کر فیس پالش کرا لو' بال کٹوا لو اور نیا جوڑا پہن کر استقبال کرو ان کا۔" میں نے اپنی دانست میں وہی مشورہ دیا جو میں اپنے روٹھے ہوئے شوہر کو منانے کے لیے خود کرتی تھی اور کامیاب رہتی تھی۔

"میں آج اپنے ہاتھ سے ان کے لیے پراٹھے بناؤں گی۔"

"دیکھو قدر کرو اپنی بھی اور اس شخص کی بھی جسے رزق کی طرح خدا سے مانگا جاتا ہے۔"

واپسی پر ڈرائیور نے باہو کے کلام کی کیسٹ آن کر دی۔ باہو نے کیا خوب کہا تھا۔

"دل درزی کی دکان کی مانند ہوتا ہے' سمجھ میں نہیں آتا کون سی لیر کون سی لیر کے ساتھ جوڑی جائے محبت کی چولی سیتے وقت کئی بار دل سلائی میں آجاتا ہے تو سارا سلا ہوا ادھیڑ کر اسے پھر سے سینا پڑتا ہے۔ کبھی کبھی ایک ٹانکا ایک سال میں جا کے لگتا ہے تب کہیں جا کر دل کی چولی پر کوئی پھول خوشبو بکھیرتا ہے۔ محبت نہیں مرنی چاہیے۔ جس طرح ایمان کمزور نہیں پڑنا چاہیے۔"

"پتا نہیں عبیو۔ دوبارہ ملنا ہو یا نہ ہو' مگر کوشش کرنا پروفیسر خالد کی محبت احساس میں زندہ رہے۔"

یہ میرا آخری ٹیکسٹ میسج تھا جو میں نے اے ایرپورٹ سے ملائیشیا روانگی سے پہلے کیا تھا۔



مکمل ناول

فرحین اظفر

شبِ عشق ہے بڑی رنگ



کالج کے گراؤنڈ میں رونق لگی ہوئی تھی۔ بے فکر نوعمر لڑکیاں کینٹین سے خریدی گئی کھانے پینے کی اشیا لے کر وہیں آبیٹھی تھیں۔

"او مائی گاڈ سیما۔ لک ایٹ دس پکچر۔"

ایک لڑکی نے ادھ کھایا سموسہ اٹھا کر چکنے چکنے اخبار کو پورا کھولا۔

"اُف! کتنی خوف ناک لگ رہی ہے۔" دوسری لڑکی ترحم بھرے انداز میں اسے دیکھ رہی تھی۔

"خوف ناک نہیں ہوگی یار۔ اس نے اپنے منہ پر تیزاب ڈالا ہے۔"

"او مائی گاڈ اتنی ہمت کیسے کی ہوگی اس نے۔"

"پڑھوں ذرا کیا لکھا ہے۔" ذرا دیر کے لیے اس نے اخبار کے ٹکڑے پر نظریں جمائیں پھر منہ بنایا۔

"اونہہ یار۔ کال گرل تھی کوئی۔"

اس نے اخبار کا گولا بنا کر دور اچھال دیا۔ وہ خبر کی تفصیلات پڑھ چکی تھی۔

"ایسی لڑکیوں کا یہی انجام ہوتا ہے۔ ڈال دیا ہوگا کسی پرانے ناکام عاشق نے لے جا کے منہ پر۔" اس کی آواز میں حقارت تھی۔

"تیزاب منہ پر ڈالنے سے کوئی مرتا تو نہیں۔" دوسری لڑکی نے انگلی سے کھٹی چٹنی چاٹی۔

"چلو بھئی۔ ایسی تو جانے کتنی روز جیتی مرتی ہیں۔ کرتی کیوں ہیں ایسے منہ کالا کرنے والے کام۔"

دوسری لڑکی نے آخری چٹخارہ لے کر اپنا اخبار بھی دور پھینکا اور کولڈ ڈرنک کا گھونٹ لے کر کھڑی ہوگئی۔

"چلو پیریڈ ہونے والا ہے۔"

دونوں لڑکیاں اب باتیں کرتی گراؤنڈ سے باہر جارہی تھیں۔

اخبار کے گندے ٹکڑوں پر لپکتی بھنکتی مکھیوں کی تعداد میں اضافہ ہو رہا تھا اور لڑکی کی مڑی تڑی تصویر پر بھی۔



آج انہیں پھر بری طرح دورہ پڑا تھا۔ پیٹ کی رگیں



کھینچ کر حلق میں چلی آئی تھیں۔ پوری طاقت لگا کر بھی اپنے نیم مردہ وجود میں سانس بھرنے سے قاصر ان کا جسم ہانپ رہا تھا۔ انہوں نے پھر زور لگایا۔

پسلیاں ذرا کی ذرا پھولیں۔ اگلے ہی لمحے پھر نیلیاں ہو گئیں۔ پچکے ہوئے پیٹ کی ڈھیلی کھال گرے جا گی تھی۔ آنکھیں ابل رہی تھیں۔ ہونٹ تھرا رہے تھے۔

"ای۔ ای ایس..."

کسی نے ان ہیلر ان کے منہ سے لگایا اور بے قراری سے اس کا بٹن دبایا۔ پف سے ہوا نکلی اور کسی نے دوبارہ ان کے تن مردہ میں زندگی ڈال دی۔ ناہموار ہچکولے کھاتا وجود پھر سے تھمنے لگا۔

"بیجی۔ اب کیسی طبیعت ہے۔"

خوف زدہ نظریں ان پر جمی تھیں۔

"اور ان آنکھوں کا آخری سہارا میں ہی تو ہوں اور میرا آخری سہارا ہے یہ۔" انہوں نے نڈھال ہو کر آنکھیں بند کر کے ذرا کی ذرا سر ہلایا۔ سامنے کھڑے سہمے ہوئے وجود میں اطمینان کی لہر دوڑ گئی تھی۔

☼ ☼ ☼

ڈرائنگ روم سے باتوں اور ہنسی کی تیز ملی جلی آوازیں آرہی تھیں۔ قدرے بلند آواز میں گانے بج رہے تھے۔ خوشبوئیں، سگریٹ اور پرفیومز، قیمتی کپڑوں کی سرسراہٹیں۔ بابر سلطان کی جدید طرز کی اس کوٹھی میں گھر کے افراد کم تھے۔ بلکہ بہت ہی کم۔ ہاں نوکروں کی تعداد قابل ذکر تھی یا پھر کمروں کی۔

اس کے بے چین قدم ان ہی کمروں میں مشرقی او مغربی دیواروں کا فاصلہ ناپ ناپ کر تھک چکے تھے۔ دکھتے ہوئے سر کو دونوں ہاتھوں سے تھام کر اس نے دو تین جھٹکے دیے۔

"او میرے خدا۔ کس گناہوں کی سزا ہے یہ۔" اس نے یاد کرنے کی کوشش کی۔

"یقیناً ایک معصوم دل توڑنے کی، کسی کی حق تلفی کی سزا ہے یہ۔" اس کے اندر سے آواز ابھری۔ وہ دھیان لگا کر سننے لگی۔

ایک لمحے کے لیے پیش منظر پس منظر بنا گیا اور پس منظر۔ لیکن وہ پوری طرح ڈوبنے نہیں پائی تھی کہ دروازہ ایک زوردار آواز کے ساتھ کھلا۔

وہ خوف زدہ نظروں سے دیکھتی کھڑی ہو گئی۔

"تم ابھی تک ایسے ہی بیٹھی ہو۔" دروازے میں کھڑا شخص شرربار نگاہوں سے اسے گھور رہا تھا۔

"بس جا رہی ہوں تیار ہونے۔" اس نے تھوک نگل کے کہا تھا۔

☼ ☼ ☼

سنولائے ہوئے ہاتھ پیر اور جھکی لرزتی پلکوں والی لڑکی آفس کے ایک کونے میں زمین پر بیٹھی تھی۔

"کون ہے یہ؟" اس نے فضل داد سے پوچھا۔ وہ اسے وہاں لے کر آیا تھا۔ اس نے گھٹنے موڑ کر ہاتھ ان پر باندھے ہوئے تھے اور ایک بڑی سی بدرنگ اوڑھنی میں خود کو چھپایا ہوا تھا۔

"سائیں غریب لڑکی ہے کام مانگنے آئی تھی میں یہاں لے آیا۔"

"کام۔ کیسا کام؟"

"کوئی بھی کم سائیں، مانی بے لائے۔" (روٹی کے لیے)

اس نے ہنکارا بھر کر اسے دیکھا۔ ان کے این جی او میں اس قسم کے لوگوں کی آمد کوئی نئی نہیں تھی۔ خاص طور پر سیلاب سے مچنے والی تباہ کاریوں کے بعد۔

"سمجھاتا تو آ ہے؟" (کام کیا ہے) اب کے اس نے براہ راست اسے دیکھا۔ جواب ندارد۔

"شامل نام ہے جی۔"

"گھر والے کہاں ہیں؟"

"گھر والا کوئی نہیں ہے، ایک باپ تھا، سیلاب کے بعد ڈینگی کی وبا کا شکار ہو کے مر گیا۔" فضل داد ہی بول رہا تھا۔

"سلائی کڑھائی وغیرہ آتی ہے اسے، پوچھو اس

سے۔"

فضل داد نے مڑ کر سندھی میں اس لڑکی سے پوچھا۔ وہ سمجھ رہا تھا وہ صرف خوف زدہ ہونے کی وجہ سے اس کو جواب نہیں دے پا رہی تھی۔

وہ فضل داد کو بتا رہی تھی کہ سب کام آتا ہے۔

یوں ہی اس کا چہرہ تکتے "اس کی بات سنتے اسے رباب آنٹی کی یاد آ گئی۔ انہوں نے اس سے کسی کام والی کے بارے میں کہا تھا۔ انہیں ایک فل ٹائم ملازمہ کی ضرورت تھی۔

"شہر و ہندو کم بے لائے۔" (شہر جاؤ گی کام کے لیے) اس نے بے اختیار پوچھ لیا۔ جواب میں وہ بات ادھوری چھوڑ کر ان ہی خوف زدہ نظروں سے اسے دیکھنے لگی۔

"اتے کپڑا مانی تے گھر سب ملندو۔" (وہاں کپڑا روٹی گھر سب ملے گا) اس نے تسلی کے لیے کہا۔ اس نے زور سے نفی میں سر ہلا کر اپنے جسم کو مزید سمیٹا۔

"دیکھو، یہاں کوئی تمہیں یہ سلائی کڑھائی وغیرہ کا کام نہیں دے گا۔ کسی کو یہاں اس کام کی ضرورت نہیں ہے۔ شہر میں ایک سے ایک اچھا کام کیا کرایا مل جاتا ہے۔ تم سے تو لوگ کام کروانے کے بجائے—" وہ ایک دم چپ ہو گیا، باقی بات منہ میں دبالی۔

"اسے سمجھاؤ۔ میں ابھی آتا ہوں۔" وہ اٹھ کر دروازے کی طرف بڑھا۔

اسے قریب آتے دیکھ کر اس نے زمین کو چھوتا پلو سمیٹ کر گود میں رکھا۔ اس کے ہاتھوں میں اضطراب تھا۔ وہ یقیناً بہت خوف زدہ تھی۔ وہ ذرا کی ذرا اس کے قریب رکا۔ پھر پنجوں کے بل بیٹھ گیا۔

"مانی کھائیندی۔ بھوک لگی ہو ندی۔" (کھانا کھاؤ گی، بھوکی ہو؟) اس نے جواب نہیں دیا۔ وہ زمین گھورتی رہی۔

"فضل۔"

"جی سائیں۔" وہ مودب سا کھڑا تھا۔

"کھانا کھلواؤ اسے اور بتاؤ شہر جانے میں بہت فائدہ ہے۔" وہ دروازہ کھول کر باہر نکل گیا۔

☼ ☼ ☼

"بی بی جی۔ صاحب نے کہا ہے، جلدی آجائیں۔" سیاہ ستاروں کی جھلمل کرتی ساڑھی میں اس کی دبتی ہوئی رنگت بھی کھل اٹھی تھی۔ شوخ رنگوں کے میک اپ میں اس کا چہرہ بے تاثر تھا۔ ملازمہ سے آگے آگے قدم بڑھاتی وہ ڈرائنگ روم کی سمت بڑھ گئی۔ جیسے جیسے ڈرائنگ روم سے اس کے قدم قریب ہوتے جا رہے تھے۔ دل کی کیفیت عجیب ہو رہی تھی۔

اندر سے اڑتے باتوں کے شور میں زنانہ اور مردانہ دونوں آوازیں شامل تھیں۔

نتھنوں سے ٹکراتی پرفیومز کے ساتھ گھلی ملی تلخ ناگوار بو دروازے پر پہنچ کر اس کے اعصاب چٹخانے لگی۔ ایک لمحہ رک کر اس نے تمام تر حواس مجتمع کر کے دھیان، دل، دماغ اندر کی سمت لگایا اور کامیاب ہو کر اندر قدم رکھا۔

"آیئے آیئے۔" سامنے ہی بیٹھے ایک موٹی توند والے شخص نے فوراً "اٹھ کر اس کا استقبال کیا۔ اس کے ہونٹ کھسیانی انداز میں دائیں بائیں پھیل گئے۔

"وہ آئے محفل میں اتنا تو ہم نے دیکھا۔ آں۔" ایک ادا سے اس کا ہاتھ تھام کے آگے بڑھاتے ہوئے اس نے شعر پڑھا۔ "پھر اس کے بعد چراغوں میں روشنی نہ رہی۔" اس کے منہ سے اٹھتے ناگوار بھبکے اس کی برداشت سے باہر تھے۔ بے ساختہ بالکل نامحسوس انداز میں اسے ہاتھ سے پرے کرتے ہوئے وہ سامنے والی نشست پر براجمان شخص کے پہلو میں ایک ادا سے ٹک گئی۔

برابر میں بیٹھا مرد بجائے کھسک کر پرے ہونے کے کچھ اور نزدیک آ گیا۔

اس نے مسکراتے ہوئے ہاتھ ملا کر دیکھا۔ دائیں طرف اس کا شوہر آس پاس اسی کی طرح کی بے باک عورتوں میں گھرا داد اسی اور فخریہ انداز میں اسے دیکھ رہا

تھا۔

نظر ملنے پر اس نے اطمینان کا اظہار کیا اور اسے اپنا اطمینان رخصت ہوتا محسوس ہوا۔

☼ ☼ ☼

چھوٹے سے صحن میں سرما کی دھوپ دم توڑ رہی تھی۔

اس نے اپنی سوراخ والی جرابوں سے جھانکتی پھٹی ہوئی ایڑیوں کو دیکھا۔ کبھی یہ ایڑیاں بے حد نرم ملائم اور گلابی ہوتی تھیں۔

"بس کرو کتنا رگڑ رگڑ کر دھوگی۔ گھس گئیں تو قد چھوٹا ہو جائے گا۔" نمو اس کی صفائیوں سے چڑتی تھی۔

"کس کو دکھانی ہیں یہ کلائیاں، یہ پاؤں۔" اس کی جلی کٹی وہ دن بھر مسکرا کے سنتی رہتی۔

اب اس کی نظر اپنی دھبے دار سوکھی سنولائی کلائی پر بھٹک رہی تھی۔

"سی... ی... ی..." ایک بار اس پر جلتے تیل کے چھینٹے آ پڑے تھے اور ایک مضبوط مردانہ ہاتھ کی گرفت میں اس کی کلائی مچل اٹھی تھی۔

"کچھ نہیں ہوا۔ معمولی سی چھینٹ ہے۔"

"دیکھنے تو دو نا! دیکھو کیسی سرخ ہو رہی ہے۔"

"اچھا۔ میں کچھ لگاتی ہوں۔" اس نے مسکرا کر تسلی دی۔ اسے علم نہ تھا اس کا لہجہ کسی کے دل پر جلتے چھینٹے ڈال گیا تھا۔ اس نے دروازے سے پچھی کو پلٹتے دیکھا تھا اور ڈر گئی تھی۔

"ہونہہ!" ایک تلخ مسکراہٹ نے اس کے لبوں پر دم توڑ دیا۔

☼ ☼ ☼

"بیوٹی فل۔" وہ عورت اس کی ٹھوڑی چھو کر بولی تھی۔ اس نے نا سمجھی کے سے انداز میں بابر سلطان کو دیکھا۔

"او ڈارلنگ۔ یو آر رئیلی ویری بیوٹی فل۔" اس کی نظروں اور چہرے پر ستائش تھی۔ کمرے میں موجود دوسرے نفوس یوں خوش ہو کر ہنسے جیسے ان ہی کی تعریف کی گئی ہو۔ گہرے گلے سے جھلکتے بے تب جسم نے اسے بانہوں میں بھر لیا۔ وہ بے اختیار کھڑے ہونے پر مجبور ہو گئی۔

"واٹ اے عورت ہو تم جیسی۔" اس نے پھر کہا بھی سے اس تعریف کو وصول کیا۔ "یہ سانچے میں ڈھلا جسم، یہ چمپئی ملیح رنگت اس کے آگے وہ پیچھے کتنی بھی کیا اوقات، یہ تیکھے نقوش۔" کمرے میں یک دم ہی خاموشی چھا گئی۔ جیسے سب اس قصیدہ خوانی کو سننے میں محو ہو گئے تھے۔

"تم ہماری پارٹیز اٹینڈ کیوں نہیں کرتیں جان۔ یہ حسن کوئی چھپا کے رکھنے کی چیز ہے۔"

اس نے ایک ادا سے اس کی ساڑھی کا پلو کندھے سے گرا دیا۔ وہ ششدر رہ گئی اور سب کے قہقہے لگنے لگے گویا یہ حرکت پہلے سے ان کے علم میں تھی۔

نیم عریاں چست لباس پہنے بیٹھی عورتوں کے درمیان اپنے شوہر کو قہقہے لگاتے دیکھ کر اس کے ہاتھ کپکپا گئے۔

☼ ☼ ☼

کوریڈور میں تیزی سے قدم بڑھاتے ہوئے وہ فضل کے برابر آگیا۔

"ہاں فضل۔ کہڑی رپٹ آ ہے۔" (کیا رپورٹ ہے۔)

"سائیں! اس نے کھانا کھا لیا ہے۔ پر وہ بات ماننے کو تیار نہیں۔"

"تب تک وہ اپنے کیمپ میں ہی رہے جا کے۔ میں کچھ پیسے دے دوں گا۔" وہ آفس کے اندر گم ہو گیا۔

"سدا جیوے سائیں۔" فضل داد کو علم تھا وہ ایک ضرورت مند کو بالکل ٹھیک جگہ لے کے آیا ہے۔

"اور سنو۔" وہ لڑکی کے پیچھے پیچھے اپنے آفس سے نکلا۔

"سائیں۔" فضل داد نے ہاتھ جوڑے۔

"اپنے کیمپ تک چھوڑ کے آؤ اور جلد ہی کسی گھر میں اس کا بندوبست کرو۔ اس کا روز ادھر آنا ٹھیک نہیں۔" بات ختم کر کے اس نے نظریں لڑکی سے ہٹا کے فضل داد پہ جمائیں۔

"تم نہیں جانتے فضل! عورت کی عزت کتنا نازک آبگینہ ہوتی ہے۔ ذرا سی ٹھیس سے چکنا چور ہو جاتی ہے۔" وہ دل ہی دل میں فضل داد سے مخاطب تھا۔ نظریں بظاہر لڑکی کی ایڑیوں پر جمی تھیں۔

سیاہ رنگی پھٹی ایڑیاں، کسی کی نرم گلابی ایڑیوں میں بدل رہی تھیں۔

☼ ☼ ☼

سامنے بیٹھی طرح دار لڑکی اپنے ناخن فائل کرتی مسز باب کو مسلسل زچ کر رہی تھی۔

"آخر تمہیں اعتراض کس بات پر ہے۔"

"ایک دم ان پڑھ گنوار انسان ہے وہ۔ نہ ایٹی کیٹس نہ مینرز۔"

"تو تم کسی سے ملتے وقت اس کی خوبیاں دیکھتی ہو مت بھولو کہ تم اصل میں ہو کیا۔"

سخت لہجے میں ٹھہر ٹھہر کر بولتی وہ اٹھ کے اس کے سر پہ جا پہنچیں۔ اس نے اٹھنے کی کوشش کی مگر اس کے کندھے پر ان کا ہاتھ رکھا تھا۔ انگلیوں کی چبھن محسوس کی جا سکتی تھی۔

"آج میں تمہاری جگہ کسی اور کو بھیج دیتی ہوں۔ بٹ نیکسٹ ٹائم ڈونٹ فارگیٹ ویٹ ہو آئی ایم" (آئندہ یہ مت بھولنا کہ میں کون ہوں۔) مجھے تم جیسی ازلی بھوکیوں کو سدھانے اور ان کی چمڑی کسوانے کا فن خوب آتا ہے۔" ان کے سرد لہجے کی سفاکی اس کی ریڑھ کی ہڈی میں دوڑ گئی تھی۔ انہوں نے اس کا کندھا تھپتھپایا۔

"ناؤ یو گو اپ اسٹیئرز۔ سم ون از ویٹنگ دیئر فار یو۔" (اب تم اوپر چلی جاؤ کوئی تمہارا انتظار کر رہا ہے وہاں۔) وہ گہری سانس لے کر اوپر کی طرف بڑھ گئی۔

اس جہنمی زندگی میں آرام اور سکون کا ایک ذرا سا راستہ "اپنی" سو کالڈ آنٹی کے حکم کی بجا آوری کی صورت میں ہی نکلتا تھا۔

اوپر کون تھا۔ وہ نہیں جانتی تھی۔ مگر جو چاہتا کیا تھا۔ یہ اسے بخوبی معلوم تھا۔

☼ ☼ ☼

سرما کی مریل سی دھوپ میں امی کے پیروں کی مالش کرتے ہوئے اس نے سر اٹھا کے داہنی دیوار کو دیکھا۔ سدا بہار کے اکلوتے پودے پر پھولوں کا نام و نشان تک نہ تھا۔

"یہ کیسا سدا بہار کا پودا ہے۔ اس پر پھول کیوں نہیں آتے۔" اس کا دھیان بھٹک چکا تھا۔

"پورا سال اس پر پھول آتے ہیں۔ ہر موسم میں بہار کا موسم، سچ پوچھو تو یہ پودا بالکل تم جیسا ہے۔" کسی کی یاد بھی سدا بہار جیسی ہی تھی۔

تمہاری یاد کا موسم
جو ہر اک دکھ سے گہرا ہے

نہ جانے کتنی مدت سے ہمارے من میں ٹھہرا ہے
مگر تم نے نہیں جانا مگر تم نے نہیں سوچا
تمہارے پیار کا موسم
جو ہر موسم سے پیارا تھا
میرے ان بکھرے لمحوں کا اک واحد سہارا تھا
مگر تم نے نہیں سمجھا مگر تم نے نہیں سوچا۔
تمہارے بعد کا موسم
ایک کالی گھٹا جیسا ہے
جو جیتی ہے نہ ہاری ہے اک ایسی مات جیسا ہے
مگر تم نے نہیں دیکھا۔ مگر تم نے نہیں سوچا۔

"شاید ماحول کا اثر ہو گیا ہے اس پر۔" اس نے خود کلامی کی۔

"اسے کیا کہہ رہی ہے۔" چچی نے ہاتھ کا چھجا بنا کر مندی آنکھوں سے اسے دیکھا۔

"کہہ رہی ہوں۔ اس گھر میں تو سدا بہار کے پودے پر بھی بہار نہیں آتی۔" اس نے بات چھپانے کی کوشش نہیں کی۔

"مجھے تو پاگل لگنے لگی ہے۔ سارا دن دیواریں تکتی ہے اب کیا ان سے باتیں بھی شروع کر دیں۔"

"آپ نے مجھے پاگل کرنے میں کوئی کسر چھوڑی ہے کیا چچی۔"

"کیوں... میں نے کیا... کیا ہے؟"

وہ خاموش رہی۔

انہوں نے اصرار نہیں کیا۔ یوں بھی وہ جانتی تھیں کہ انہوں نے کیا کیا تھا۔

"اب کہاں چلی۔ دو گھڑی میرے پاس بھی بیٹھ جایا کر۔" چچی اٹھتے اٹھتے وہ ذرا ٹھہری۔

"میں نہیں ٹھہر سکتی۔ مجھے وحشت ہوتی ہے۔" وہ اٹھ کے چلی گئی۔ پیچھے وہ بڑبڑاتی رہیں۔

"چل دفع دور، میں کون سا مری جا رہی ہوں تجھے پاس بٹھانے کو۔ ہائے نمو! میری بیٹی۔ تجھے بیاہ کے تو میں تیری صورت کو ہی ترس گئی۔ تیری جگہ اسی کو بیاہ دیتی اس سانڈ سے تو بہتر رہتا۔"

ان کی آنکھوں سے اکلوتی بیٹی کی یاد میں آنسو بہہ نکلے۔

☆ ☆ ☆

بیش قیمت فرنیچر اور ڈیکوریشن پیسز سے سجا وسیع و عریض لاؤنج صاحب خانہ کے عمدہ ذوق کا منہ بولتا ثبوت تھا۔

مہنگی ترین لکڑی سے بنا وہ ترچھا بل کھایا صوفہ، جس کے ایک کونے میں وہ سکڑی سمٹی بیٹھی تھی۔ پوری طرح آرام دہ ہونے کے باوجود اسے سخت بے آرام لگ رہا تھا۔

"اوہ نو... یہ مسز بابر سلطان تمہارے نازک وجود پر بہت بھاری بھر کم لگتا ہے۔ کین آئی کال یو نمو... میں تمہیں نمو کہہ سکتی ہوں۔" یہ وہی عورت تھی جسے اس نے کچھ دن پہلے اپنی کوٹھی کے ڈرائنگ روم میں اپنی تعریفوں کے پل باندھتے دیکھا تھا۔ آج بابر سلطان اسے اچانک ہی لے کر یہاں چلا آیا تھا۔

"اوہ یہ انگریزی گٹ پٹ اس کی سمجھ میں کہاں آئے گی۔" وہیں ایک صوفے پر بابر نے بھی ٹانگیں پسار لی تھیں۔

"سب آجائیں گی۔ تم فکر مت کرو۔ میں سب سکھاؤں گی۔" وہ قربان ہو جانے والی نظروں سے اسے دیکھ رہی تھیں۔

"جب ہی تو لایا ہوں تمہارے پاس۔" وہ اپنے مخصوص بے ڈھنگے انداز میں ہنسا۔

وہ بھی ہنستی ہوئی باہر نکل گئی۔ لاؤنج میں مکمل خاموشی تھی۔

اس نے جھجکی نظروں سے اپنے خاوند کو دیکھا۔ گہرے سرمئی رنگ کا قیمتی سوٹ اس کی موٹی توند اور گھنی مونچھوں والے بڑے سارے منہ کے ساتھ ذرا بھی جچ نہیں رہا تھا۔ اس کی ساری شخصیت میں ایک بھونڈا پن نمایاں تھا۔

"مجھے یہاں کیوں لائے ہیں۔" کولڈ ڈرنک کا گلاس

اس کے لبوں تک جاتے جاتے رک گیا۔

"مجھ سے کچھ کہا۔" اس کی بناوٹی اداکاری بھی اسی طرح کی بھونڈی تھی۔

"پوچھ رہی ہوں۔ یہاں کیوں لائے ہیں مجھے۔" نا چاہتے ہوئے بھی وہ تلخ ہو گئی۔ "گھر چلیں۔ میرا دل گھبرا رہا ہے۔" اس نے بے چینی سے اس کی منت کی، جانتی جو تھی، یہاں نہ سوال کرنے کی اجازت تھی نہ انکار کرنے کی۔

"چپکی بیٹھی رہ، جھلی نہ ہو تو..." اور وہ اس کی تو تڑاخ سے پہلے ہی عاجز اور خائف رہتی تھی۔ اس وقت بھی دبک سی گئی۔

اسی وقت مسز رباب نے وہاں قدم رکھا تو ان کے ساتھ ایک الٹرا ماڈرن کم سن لڑکی تھی۔

"اوہ... لکنگ چارمنگ... میک اوور کرنا ہے۔" وہ اسی سے پوچھنے لگی۔ آواز اور انداز بھی ماڈرن تھے۔

"ہاں اسے لے جاؤ اور سنو... بی کیئر فل پلیز ہاں۔"

وہ خاصے مصروف انداز میں اس سے مخاطب تھیں۔ آخر میں ان کا لہجہ کچھ معنی خیز ہو گیا۔

وہ خوف زدہ سی اپنی جگہ سے اٹھی لیکن کچھ کہنے سے پہلے ہی بیوٹیشن نے اسے بازو سے تھاما اور آگے بڑھ گئی۔ وہ کچھ گومگو کے عالم میں بے جان سی اس کے ساتھ کھنچی چلی گئی۔

☆ ☆ ☆

دودھ کی پتیلی خالی تھی۔

اسے یاد آیا دودھ کی قیمت میں ہوتے مسلسل اضافے سے گھبرا کے اس نے کل ہی دودھ والے کو فارغ کر دیا تھا کہ اب آنے کی تکلیف نہ کرے لیکن اب وہ کرے کیا۔

وقت نکلا جا رہا تھا۔ اس کی تیاری مکمل ہو چکی تھی۔ لیکن پیٹ میں دوڑتے چوہے کچھ سمجھنے سے قاصر تھے۔ اس نے بے تابی سے سلیب پر ہاتھ مارا۔

مڑی تڑی تھیلی میں گڑ کی ڈلی پڑی تھی۔ جلدی سے روٹی کا ڈبہ کھول کر رات کو جان بوجھ کر بچایا گیا باسی روٹی کا ٹکڑا نکالا۔ گڑ کی ڈلی کے گرد لپیٹا اور ٹھونس لیا۔

"امی! دروازہ بند کر لیں۔" بھرے منہ سے آواز لگاتی وہ دروازے کی طرف لپک گئی۔ تیز تیز قدم اٹھاتی وہ دل میں عہد کر رہی تھی کہ پہلی تنخواہ ملتے ہی وہ اپنے لیے ایک سوئٹر تو لے ہی لے گی۔ یہ پتلی سی شال بھلا اس سردی کا کیا بگاڑ سکتی تھی۔

لیکن ابھی اس خواب کے شرمندۂ تعبیر ہونے میں پورے انتیس دن باقی تھے۔ تب تک یقیناً ضروریات کی فہرست طویل سے طویل تر ہو جاتی تھی۔

لیکن اس بار اس نے سوچ لیا تھا۔

اس بار وہ اپنی محنت کی کمائی پہلے خود پر اور بعد میں بلکہ بالکل آخر میں گھر والوں پر خرچ کرے گی۔ اس نوکری سے منسلک ہی اسے کتنی اشیا کی فوری ضرورت تھی۔

ایک گھڑی، سوئٹر، چند نئے جوڑے اور جوتے۔ بننے سنورنے کا شوق تو اسے پہلے بھی زیادہ نہیں تھا لیکن...

"سی... ی... ی..." بے ساختہ ٹھٹھر کر اس نے ہاتھ کی خشک چٹختی ہوئی جلد کو... سہلایا۔ "ایک کولڈ کریم یا لوشن تو "فوراً" ہی لینا چاہیے۔"

اور اس "فوراً" کے حاشیے میں اس کی کتنی ہی ضرورتیں کھڑی دہائی دے رہی تھیں۔ کتنی ہی ایسی چیزیں جن کا ذکر وہ صرف اپنی چچی اماں سے کر سکتی تھی۔ مگر کرنا نہیں چاہتی تھی۔ بھلا وہ اس کی ماں تھیں ہی کب، وہ تو نمو کی ماں تھیں۔ نمو نغمہ کی ماں۔ نمو کی یاد نے گھنٹی کیا بجائی دل میں جیسے اس سے جڑی کتنی ہی یادوں نے یلغار کر دی۔

نمو سے زرباب اور زرباب سے...

کئی سال پہلے سردیوں کے موسم میں اس کے کتنے کام بن کے ہو جاتے تھے۔ وہ کہتا تھا کہ روشی بہت خوددار ہے اور اسے اس کی خودداری پسند ہے۔ اس کے ہاتھ میں اپنی سیاہ جرابیں اور ایک استعمال شدہ پل

اور تھا۔

"نے لاتا تو تم اعتراض کرتیں۔" اس نے دونوں چیزیں اسے تھمائیں۔ "اور اپنے اس لیے لایا ہوں کہ تمہیں میری یاد آتی رہے گی اور تم پہنو گی بھی شوق سے۔"

"اس میں تمہاری خوشبو بھی تو ہے۔" اس نے فوراً" ہی پل اور پہن لیا تھا۔ اس کے لبوں پر بہت میٹھی مسکراہٹ تھی۔ وہ جانتا تھا وہ اس کے دل تک رسائی رکھتا تھا۔ اس کی آنکھیں پڑھ سکتا تھا۔

"وہ زبان سے بھی نہیں کہتی کہ اسے کسی چیز کی ضرورت ہے۔"

"او ہو تو تمہیں کیسے خبر ہو جاتی ہے۔" "معلوم ہو جاتی۔"

"مجھے۔" وہ ہنس دیتا۔ "بس ہو جاتی ہے دل کو دل سے راہ۔"

اس کے لبوں پر ایک سرد آہ نے چپکے سے فریاد کی۔

"کاش تمہارے دل کو راہ ہو جائے ایک بار پھر۔ مجھے تمہاری کتنی ضرورت ہے زرباب! کاش تمہیں پتا چل جائے۔" اسکول کی عمارت سامنے نظر آ رہی تھی۔

اس نے تمام سوچیں، یادیں ذہن کے کونے میں دھر کر ایک نئے عزم سے احاطے میں قدم رکھا۔

☼ ☼ ☼

"سائیں! وہ شائل بی بی آئی ہے۔"

"کون شائل؟" وہ اس وقت بے انتہا مصروف تھا۔

"سائیں وہی کیمپ واری۔ جیکو بابا بوڑھ میں مری ہوئی۔"

"او ہاں۔ کیا ہوا۔ تم نے پتا کیا تھا اس کے لیے کام وغیرہ۔ تم اسے وہ ساری دے دیتے ہو' روز کے روز۔"

"تو پھر۔ کوئی مسئلہ ہے۔" اس نے فضل داد کا "جی سائیں" سن کر بے دھیانی سے پوچھا۔

"سائیں! وہ کہتی ہے اسے وہاں نہیں رہنا۔"

"کیوں؟" وہ ایک دم چونک گیا۔

"پتا نہیں۔ اس کا کوئی ماما شاما آ گیا تھا۔ اس کا پتا کرتا ہوا۔"

"تو پھر؟" اب کے اسے اسکرین پر سے نظریں ہٹانی پڑی تھیں۔

"وہ اس سے ڈری ہوئی ہے۔ کہتی ہے وہ ٹھیک بندہ نہیں ہے۔"

وہ کچھ لمحے یوں ہی فضل داد کو دیکھتا رہا۔

"بلاؤ اسے۔" وہ پھر سے مانیٹر کی سمت گھوم گیا۔

"ہاں بھئی شائل! کیا بات ہے۔ کیا مسئلہ ہے۔"

اس دن کی نسبت وہ آج بہتر حلیے میں تھی۔ مگر زیادہ خوف زدہ۔

"سائیں! آج میرے کو شہر بھجا دو۔" وہ ہاتھ جوڑ کے بولی۔

"کل تک تو تم منع کر رہی تھیں۔ پھر آج اچانک۔"

"سائیں! اور میرا ماما آیا ہے۔ وہ بہت خراب آدمی ہے۔ میرے کو ڈر ہے وہ میرے کو کہیں اور اور کر دے گا۔"

"تو ادھر ادھر کرے گا مطلب۔" اب کی بار اس کے کان کھڑے ہو گئے تھے۔

"وہ اپنے ساتھ اپنی کسی جاننے والی کو لایا تھا اس سے پیسے لے کر میرے کو اس کے ساتھ چلتا کرے گا۔" اس کی آواز روہانسی ہو گئی تھی۔

"سائیں! آپ بڑے لوگ ہیں۔ کسی سے کہہ سن کے مجھے نکلوا دو ادھر سے۔ وہ ٹھیک بندہ نہیں ہے اور وہ عورت بھی ٹھیک نہیں تھی۔" وہ اب سندھی میں بول رہی تھی اور فریاد کرتے کرتے باقاعدہ رونے لگی تھی۔

"اچھا او کے۔ او کے۔ تم رو مت۔ میں تمہیں بھجوا دوں گا۔ کل ہی بھیج دوں گا۔ آج تو رک جاؤ۔ میں پہلے بات کر لوں۔ گھبراؤ مت' سب ٹھیک ہو جائے گا۔"

"سدا جیو سائیں۔ مولا سکھی رکھے۔" وہ دعائیں دیتی پلٹ گئی تھی۔

اس نے دیکھا اس کے پیروں میں آج بھی چپل نہیں تھی۔ موسم کی شدت کا اندازہ کرتے ہوئے وہ ایک لمحے کے لیے کپکپا سا گیا۔

"فضل یار۔ اسے کم سے کم ایک سوئٹر اور سلیپرز تو دے دو کہیں سے۔"

فضل داد سر ہلاتا باہر نکل گیا۔

☼ ☼ ☼

"لاؤ نکالو ہیرا لال۔"

مسز رباب کو واپس آتے دیکھ کر نشے میں بد مست بابر سلطان واپس ہوشیار ہو چکا تھا۔

"پہلے تم نکالو۔" وہ اطمینان سے سامنے صوفے پر ٹانگ پہ ٹانگ رکھ کے بیٹھ گئیں۔

"نئیں کیا۔" اس کی آنکھوں میں ہلکی سی خماری تھی۔

"تف۔ ڈائیورس پیپرز لو کیا اور کتنی بار کہا ہے۔ اتنا مت پیا کرو۔ دن میں بھی ادھر ادھر لڑھکتے رہتے ہو۔ بدبودار کہیں کے۔" وہ کراہت سے آواز نیچی کر کے بڑبڑائیں۔

"ہی۔ ہی۔ ہی۔" وہ اپنے بھونڈے انداز میں ہنسنے لگا۔

مسز رباب کے تیور "مال" وصول کرتے ہی بدل گئے تھے۔ وہ اب خاصے اکتاہٹ بھرے انداز میں اس کے اگلے قدم کی منتظر تھیں۔ اس نے کوٹ کی اندرونی جیب سے ایک لفافہ برآمد کیا اور ان کی طرف بڑھا دیا۔

مسز رباب نے لفافہ کھول کر سکون سے متن ملاحظہ کیا۔

"ہوں ٹھیک ہے۔" انہوں نے چیک بک نکالی اور چیک سائن کر کے اس کی طرف بڑھا دیا۔ وہ تھامتے ہی اٹھ کھڑا ہوا۔

"رکھ تو لو۔ اتنی ہی اماؤنٹ۔ جس پہ ڈن کیا تھا۔" وہ بھی کھڑی ہو چکی تھیں۔

"یہ غیروں والا سلوک تم ہمارے ساتھ کرتی ہو جانم۔ ہم نہیں، ہمیں تمہاری زبان پر بھروسا ہے۔"

وہ پاس آ کر لگاوٹ بھرے انداز میں ان کی لٹ کو انگلی پر لپیٹ کے بولا۔ مسز رباب نے بے زاری سے اس کا ہاتھ جھٹک دیا۔

"چلو اب چلتے پھرتے نظر آؤ اور سنو۔ آئندہ ذرا صاف ستھرے ہو کے آنا۔"

ان کا کام ہو چکا تھا۔ انہیں اس پر نثار ہونے کی ضرورت نہیں تھی۔

☆ ☆ ☆

وہ حیرت زدہ سی آئینے میں اپنا بدلا ہوا روپ دیکھ رہی تھی۔ بیوٹیشن کے ماہرانہ ہاتھوں نے اسے سر تاپا بدل ڈالا تھا۔ ہیئر کٹنگ' میک اپ اور وہ اسٹائلش کپڑے' جن میں وہ اس وقت قدرے بے چینی محسوس کر رہی تھی۔ اس کے متناسب جسم پر خوب سج رہا تھا۔

"ہاؤ ڈو یو تھنک ناؤ۔" بیوٹیشن مسکرائی۔

"جی۔" اس نے چونک کر اسے دیکھا۔

"کیسا لگ رہا ہے اپنا آپ۔"

"یقین نہیں آتا' میں اتنی خوب صورت بھی لگ سکتی ہوں۔" بیوٹیشن مسکرا کے اپنا سامان سمیٹنے لگی۔

"واؤ ڈارلنگ۔ یو آر لکنگ ویری پریٹی۔" مسز رباب اندر آ کے اپنے مخصوص انداز میں بولیں۔ وہ تھوڑا سا شرما گئی۔

"چلو آؤ۔" وہ اس کا ہاتھ پکڑ کے لاؤنج میں لے آئیں۔ لاؤنج خالی تھا۔

"وہ۔ وہ بابر۔" وہ خالی لاؤنج دیکھ کر تھوڑا سا گھبرا سی گئی۔

"بابر۔" خراماں سی مسز رباب ایک دم کچھ اٹک گئیں۔

"ہاں۔ وہ الجھ گیا اسے ایک میٹنگ میں جانا پڑ گیا۔ بالکل اچانک۔ بٹ یو ڈونٹ وری۔ تم آج کا دن ہمارے ساتھ گزارو گی۔ بہت انجوائے کرو گی اور شام کی پارٹی میں تو وہ ہمیں جوائن کر ہی لے گا۔ ہم۔ م۔ م" ان کا انداز ابھی بھی ویسا ہی پیار بھرا تھا۔ مگر اسے بے چینی نے آ گھیرا۔

یہ گھر اور گھر کے لوگ' یہ ماحول سب ایک دم اجنبی اور پرایا لگنے لگا تھا۔

☆ ☆ ☆

"میں دو دن کے لیے شہر جا رہا ہوں۔"

"اور تو زرباب' یہ کیا بات ہوئی۔ تم اس دن بھی دروازے سے مجھے ڈراپ کر کے چلے گئے تھے۔"

اسے پتا تھا آئمہ ناراض ہو گی۔ لیکن اس کا کام زیادہ ضروری تھا۔

آج صبح آفس آتے ہی اسے خبر ملی تھی کہ کیمپ میں کل رات شائل کے ساتھ کسی نے دست درازی کرنے کی کوشش کی تھی۔ اس کے شور مچانے پر سب سے پہلے اس کا ماما ہی وہاں پہنچا تھا۔ شائل اسی وقت وہاں سے نکل کے اس کے آفس آگئی تھی۔ اس نے پوری رات وہیں ٹھنڈے برآمدے کے یخ بستہ فرش پر بیٹھے بیٹھے گزار دی تھی۔

اسے یہ ساری معلومات فضل کے ذریعے حاصل ہوئی تھیں۔ جو فجر کے وقت آفس کھولنے آیا تو اس نے شائل کو برف جیسے فرش پر بیٹھے ہوئے پایا۔

شائل کا کہنا تھا کہ کیمپ میں اس کے ساتھ بدتمیزی کرنے والا شخص اس کے ماما کا ہی بھیجا ہوا تھا۔ اس کا ماما اسے خوف زدہ کر کے اپنے ساتھ لے جانے پر رضامند کرنا چاہتا تھا۔

زرباب اس واقعے کی تفصیل سن کر اتنا ڈسٹرب ہوا کہ اس نے فوراً ہی اسے اپنے ساتھ ہی کراچی لے جانے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ چونکہ یہ فیصلہ اس نے انتہائی ہنگامی بنیادوں پر کیا تھا۔ اس لیے نہ صرف آئمہ کو اس کے حصے کا سارا کام نپٹانا تھا۔ بلکہ وہ اس کے ساتھ ایک خوب صورت سفر سے' اسی وجہ سے محروم رہ جانے والی تھی۔ وہ اس کی ناراضی کا سبب سمجھتا تھا مگر مجبور تھا۔

مضافاتی علاقوں میں آباد گاؤں میں غربت کی لکیر اور خواندگی کی شرح پر کی جانے والی ریسرچ کی سروے رپورٹ اسے کل ہر حال میں فائل کر کے دینی تھی۔

اور کام اتنا زیادہ تھا کہ کل پر ٹالا نہیں جا سکتا تھا۔ جو مسئلہ ابھی اس کے سر پر پڑا تھا وہ بہرحال اپنی جگہ اہم تھا اور وہ ایک دن میں کراچی جا کے واپس نہیں آ سکتا تھا۔ آئمہ بھی یہ سب سمجھتی تھی۔ جب ہی اس نے ناراض تو تھی مگر بہت زیادہ نہیں۔

"پلیز آئمہ۔ ڈونٹ بی اینگری' پلیز انڈر اسٹینڈ۔"

"آئی کین انڈر اسٹینڈ۔" اس نے جتایا۔ "دیکھو اگر یہ سروے رپورٹ کا مسئلہ نہیں ہوتا' تو میں تمہیں ضرور ساتھ لے کر جاتا۔ ایک تم ہی تو میری فرینڈ ہو اور تم جانتی ہو میں تمہاری کمپنی کو ہمیشہ ہی انجوائے کرتا ہوں۔"

"اٹس اوکے' میں نہیں ہوں ناراض' مگر بس تم جلدی آجانا۔" وہ مسکرا دی تھی۔

وہ جانتی تھی' زرباب جھوٹ نہیں بول رہا تھا۔ وہ واقعی اس کا بہت اچھا دوست تھا اور وہ خود بھی اس کی بہترین دوست تھی۔ اپنی اس دوستی کو چھوٹی بہن کے حوالے سے رشتے داری میں بدلنا چاہتی تھی۔

"اور سنو' میں رپورٹ ریڈی کر کے باس کو دے دوں گی۔" اس نے آواز لگائی تھی۔

☆ ☆ ☆

اسکول میں اس کا پہلا دن توقع کے مطابق اچھا ہی گزرا تھا۔

پرنسپل کا انداز مشفقانہ تھا تو اسٹاف کا دوستانہ۔ کوئی بہت بڑا انگلش میڈیم اسکول نہیں تھا۔ درمیانے درجے کا ایک معمولی سا تنگ گلیوں کے مقابلے میں کھلے میدان میں کھلنے والا اسکول تھا۔ میٹرک تک کلاسز تھیں اور انگلش بولنے پر کوئی خاص زور نہ تھا۔ بلکہ زیادہ تر ٹیچرز معمولی سی بھی انگلش بولنے سے قاصر تھیں۔

ایسے میں اس کے منہ سے نکلنے والے انگلش کے چھوٹے چھوٹے جملوں نے اسے اچانک ہی سب اسٹاف کی نظر میں بہت پڑھا لکھا بنا دیا تھا۔ وہ ویسے بھی انگلش اور سائنس پڑھانے کے لیے رکھی گئی تھی۔ اس لیے دوسرے مضامین کی ٹیچرز کے مقابلے میں اسے وہ امتیازی حیثیت پہلے دن ہی حاصل ہو گئی تھی جو سائنسی مضامین اور نہم اور دہم جماعت پڑھانے والے اساتذہ کو حاصل تھی۔ یہی امتیاز یہاں ٹیچرز کی تنخواہوں میں بھی روا رکھا جاتا تھا۔

سارا دن ایک خوش کن احساس اس کے گرد چھایا رہا۔

چھٹی کے بعد گھر کی طرف اٹھنے والے قدموں میں تھکاوٹ کے باوجود ایک نیا جوش و جذبہ جھلک رہا تھا۔ اسے یقین تھا' وہ اپنے شاگردوں میں بھی اپنے حسن سلوک کی بدولت جلد ہی مقبولیت حاصل کر لے گی۔ اسے یاد تھا۔ جب وہ میٹرک میں تھی تو اپنا خرچ خود اٹھانے کی خاطر ٹیوشنز دیا کرتی تھی۔ تب بھی بچے اس کو زرباب کی نسبت زیادہ پسند کرتے تھے۔ زرباب اور اس نے اکٹھے ہی تو ٹیوشن دینی شروع کی تھی اور زرباب۔؟

سبک خرامی سے اٹھتے قدموں میں پہلا بریک آیا تھا۔

"یہ میں زرباب کو یاد کرنا کب چھوڑوں گی۔ اللہ جانے چھوڑ بھی سکوں گی یا ساری زندگی یادوں کے سہارے۔"

"او میرے خدا۔" دروازہ بجاتے ہوئے یہی آخری خیال آیا تھا۔

☆ ☆ ☆

وہ پریشان تھی۔ آدھی رات گزر چکی تھی اور پارٹی اپنے عروج پر تھی۔

اس کلاس میں پینا پلانا بڑی عام سی بات تھی اسے شادی کے شروع کے دنوں میں اگر کبھی حیرت' پریشانی یا کراہیت ہوتی بھی تھی تو اب وہ سارے احساسات ایک سرد اور جامد کیفیت میں بدل چکے تھے۔ شادی ایک جوا ہے اور وہ جانتی تھی وہ یہ جوا بہت بری طرح ہار چکی ہے۔

تھوڑے دن غم منانے کے بعد اس نے یہ ہار قبول

کرلی تھی۔
لیکن دور دور تک اسے پتا نہ تھا کہ وہ کیا کچھ ہار چکی ہے اور کیا کچھ ہے جو ابھی قبول کرنا باقی ہے۔ اس کا شوہر اسے ابھی تک لینے نہیں آیا تھا۔ وہ نہیں جانتی تھی وہ اب کبھی نہیں آئے گا۔ کم سے کم اسے لینے تو ہرگز نہیں۔
"ارے یہاں ایسے کیوں بیٹھی ہو۔" مسز رباب بہت دیر بعد اسے ڈھونڈنے میں کامیاب ہوئی تھیں۔
"نہیں کچھ نہیں۔ بس یونہی تھکن سی ہو رہی تھی۔" وہ شدید تھکن کا شکار تھی۔
"ارے ابھی سے تھکن؟ ڈارلنگ ڈونٹ وری میں ابھی تمہیں اندر بھجواتی ہوں۔" معین ادھر آؤ۔ انہوں نے پاس کھڑے ملازم کو آواز دی۔
"وہ بابر نہیں آئے؟" اس نے پوچھا۔
"ہاں۔ وہ۔" چونک سی گئیں۔
"آجائے گا نا۔ کہیں پھنس گیا ہوگا۔ جانی تم پریشان مت ہو۔ تم میرے پاس ہو۔ بالکل اپنوں کے پاس۔" وہ اس کا گال تھپتھپا کے بولیں۔
"اس کے ساتھ چلی جاؤ۔ بیگم صاحبہ کو ان کا بیڈ روم دکھاؤ۔"
وہ مصروف سے انداز میں کہہ کر کسی اور طرف بڑھ گئیں۔
اس کو اس طرح کی مخلوط محفلوں میں شرکت کرنے کی ابھی تک عادت نہیں پڑی تھی۔ وہ فوراً "ایسی بے باک محفل سے جان چھوٹنے پر شکر ادا کرتی۔" ملازم کے پیچھے چل دی۔ جہاں عریاں بازوؤں اور مختصر لباس والی عورتیں محرم اور نامحرم کا فرق بھولے۔ غیر مردوں کے گلے کا ہار بنی جا رہی تھیں۔ رنگین مشروب کے نشے میں ڈوبے سب ہی حال سے بے حال تھے۔
اور ایک نوکیلی سوچ جو مستقل اسے چبھ رہی تھی۔ "مسز رباب کو پتا تھا کہ بابر آج نہیں آئیں گے جب ہی انہوں نے میرے لیے بیڈ روم تیار کروایا۔ مگر۔ وہ یہ بات مجھے بتا بھی تو سکتی تھیں کہ مجھے آج یہیں رکنا پڑے گا۔ چھپانے کی کیا ضرورت تھی۔"



کراچی آنے میں کچھ ہی دیر باقی تھی۔
سورج سارا دن گزارنے کے بعد مغرب کی سمت سفر کر رہا تھا۔ مسلسل ڈرائیونگ سے اس کا جسم تھک کر چور ہو چکا تھا۔ یہاں اکیلے آنے کا فیصلہ اس کا اپنا تھا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ فقل دادو کو اس کے اکیلے نکلنے کا علم ہو۔
"آج تمہیں میرے گھر میں رکنا ہوگا۔" وہ پیچھے سیٹ پر سکڑ کے بیٹھی شامل سے مخاطب تھا۔
"گھر جاتے جاتے رات ہو جائے گی اور میں تھک بھی گیا ہوں بہت۔ کل چلیں گے وہاں۔ جہاں تمہیں کام مل جائے گا۔" وہ چپ تھی مگر وہ جانتا تھا وہ ڈر رہی ہے۔
"اچھا دیکھو مجھے بھوک لگی ہے۔ میں کھانا لا رہا ہوں۔ اگر تمہیں کچھ کھانا ہے تو بتا دو۔"
اس نے جب نفی میں سر ہلایا۔ پھر بھی واپسی پر اس کے ہاتھوں میں اس کے لیے برگر اور کولڈ ڈرنک تھی۔
"کھالو۔ مجھے پتا ہے تم بھوکی ہو۔" اس نے جھجکتے ہوئے اپنے سانولے ہاتھ اس کی طرف بڑھائے۔
چیزیں تھماتے ہوئے دونوں کی انگلیاں ذرا مس ہوئیں تو زریاب کو ان ہاتھوں کی نرمی کا احساس ہونے سے پچھو گیا اور ساتھ ہی کسی کی یاد بھی۔ وہ جانتا تھا۔ اب نہ یہ یاد نکلے گی نہ اس کی جان چھوڑے گی۔
وہ اگلے کئی گھنٹوں تک جاگنے کے لیے بالکل تیار تھا اور اگلے کئی گھنٹوں تک کوئی قابل غور کام کرنے کے لیے تیار نہیں تھا۔ اب اسے ڈرائیونگ پر پہلے سے زیادہ توجہ دینی تھی اور تھکاوٹ بڑھتی جا رہی تھی۔



کوئی موسم تو ایسا ہو
کہ جب بچھڑے ہوؤں کی یاد کے جگنو چمک کھو دیں

کوئی موسم تو ایسا ہو
کہ دل کے زخم بھر جائیں
اگر ایسا نہیں ہوتا تو پھر
ساری خواہشیں دل کی
سارے خواب اور ارماں
یوں ہی گھٹ گھٹ کے مر جائیں، مجھے آزاد کر جائیں
کوئی موسم تو ایسا ہو
کہ جو موسم تمہاری یاد کا موسم نہ ہو

اسکول کی مصروفیت میں دن رات کی سست رفتار نے قدرے تیزی پکڑی تھی۔ وہ اپنے نئے معمول سے مطمئن تھی۔
مستقبل قریب میں اس کا ارادہ تھا کہ وہ گھر پہ بھی ٹیوشنز شروع کرے گی۔
دل و دماغ کی مصروفیت اس سے بہتر اور کوئی نہیں تھی کہ کسی تعمیری کام میں لگایا جاتا۔ یہ الگ بات تھی کہ صبح صبح نوکری کے لیے گھر سے نکلنا اور پھر واپسی پر تمام کام نمٹانا اس کی تھکاوٹ میں کئی گنا اضافہ کرتا تھا۔ لیکن یہ مصروفیت تکلیف دہ یادوں سے پیچھا چھڑانے میں بہت مددگار معاون تھی۔
یادیں جو کسی تار عنکبوت کی طرح اس کے گرد اپنا جال کستی جاتی تھیں۔ وہ اپنا آپ چھڑاتے چھڑاتے ہلکان ہونے لگی تھی۔ بھلا اور کون سی خوشی تھی زریاب کے سوا اس کی زندگی میں اس کی خبر گیری کو۔ کوئی بھی تو نہیں تھا۔ نہ لاڈ اٹھانے والے ماں باپ نہ پیار بھری لڑائی کرنے والے بہن بھائی۔ ایک بہن تھی تو اس نے اپنا پن خوب نبھایا اور چچی۔ جنہیں وہ ماں سمجھتی تھی۔
دراصل وہ اس کی ماں بھی نہیں۔ نہ سگی نہ سوتیلی۔ وہ اس کے رشتے کی چاچی تھیں۔ اپنی پیدائش پر ہی ماں جیسی انمول ہستی سے محروم ہو جانے کے بعد۔ اسی گھر میں پلی کو دی۔ وہ ان ہی کو ماں سمجھتی چلی آ رہی تھی۔ ہمیشہ سے۔ ان کی اکلوتی اولاد نیرہ عرف نمو ہی اس کی اکلوتی بہن تھی۔

ہاں زریاب کی بات الگ تھی۔ اسے ہوش سنبھالنے سے بھی پہلے سے اس گھر میں آتے اور اپنا خیال رکھتے دیکھا تھا بہت سالوں تک۔ وہ فطرتاً بھی ایسا ہی تھا۔ محبت، مروت، فکر پروا کرنے والا، خیال رکھنے والا۔
لیکن وہ خاص نرم گرم جذبے جو کسی خاص شخص کے لیے دل میں ابھرتے ہیں۔ اس کا اظہار اس نے صرف رشنا سے ہی کیا تھا۔ اس میں کسی اور کو بھی شراکت دار نہیں بنایا۔ اس نے نہ رشنا نے۔ پھر بھی پتا نہیں کب کیوں اور کیسے نمو کے دل میں اس کے لیے نرم گوشہ پیدا ہو گیا اور اس نے اس راز میں سب سے پہلے اپنی ماں کو شریک کیا۔ کہنے کو تو زریاب، رشنا کی خالہ کا بیٹا تھا اور اسی کی وجہ سے اس گھر میں آتا تھا۔ لیکن نمو اس کی آمد کو اپنے آپ سے منسوب کرکے اس کی راہ تکنے لگی۔
رشنا کو احساس تک نہ ہوا کہ کتنی بڑی شکست اس کی بچی کچی، سیدھی سادی زندگی کی بساط الٹنے کے لیے تیار بیٹھی ہے۔
"چچی! میرے رشتے کے لیے پریشان ہیں۔ تمہاری تعلیم کب مکمل ہوگی۔ کب تم نوکری کرو گے۔" اس کے لہجے اور آواز میں مایوسی تھی۔
"اس کے لیے میری تعلیم اور نوکری کی کیا ضرورت ہے۔ میں آج ہی بات کرتا ہوں۔"
"پاگل ہو گیا۔ جب تک نوکری نہیں کر لیتے کس بل بوتے پر کہہ سکتے ہو۔"
"مجھے اپنے زور بازو پہ پورا بھروسا ہے یار۔"
"وہ تو سب کو ہے۔ خدانخواستہ کوئی تمہیں ناکارہ تو نہیں کہہ رہا لیکن تمہارے لیے شادی کی بات جلدی ہے۔"
"اور تمہارے لیے یہ جلدی نہیں ہے۔ تم مجھ سے کتنی چھوٹی ہو۔"
"ہاں تو لڑکیوں کی شادی کم عمر میں ہوتی ہے۔ انہیں اپنے پیروں پر کھڑے ہونے کا انتظار نہیں ہوتا۔" اس نے ایک گہری سانس لی۔

"تمہاری بچی جانتی ہیں' میں تمہیں پسند کرتا ہوں۔ تمہارے لیے یہاں آتا ہوں۔ پھر وہ کیوں یہ سب چکر چلا رہی ہیں۔"

"پتا نہیں۔" وہ خود الجھی ہوئی تھی۔ "ابو کے جانے کے بعد ہم تینوں بہت اکیلی سی ہو گئی ہیں۔"

"تو ٹھیک ہے' مجھے بات کرنے دو۔ ان کی فکر کم ہو جائے گی۔ ممی کی فکر آپ کریں۔ تمہاری فکریں میرے لیے چھوڑ دیں۔"

وہ بات کے آخر میں نرم لہجے میں اس کا صاف ستھرا چہرہ سمو کر مسکرا دیا۔



نیم تاریک کمرے میں بیٹھے ہوئے اسے یاد نہیں تھا کتنی دیر ہو گئی تھی اسے آنسو بہاتے ہوئے۔

کیا ہوا تھا' کیا ہو رہا تھا یا کیا ہونے والا تھا اس کے ساتھ' لاکھ چاہنے پر بھی وہ سمجھ نہیں پا رہی تھی۔ فقط چھ مہینے پہلے اسے بیاہ کر لانے والا شوہر چھ ماہ میں چھ بار بھی اس کے گھر والوں سے ملانے نہیں لے کر گیا۔ اس کے گھر میں فون نہیں تھا۔ موبائل کی سہولت تو خیر عیاشی ہی تھی۔ وہ فقط تین بار اپنے پڑوس میں فون کر کے امی سے بات کر سکی تھی۔ ایک بار انہیں دیے کا اٹیک ہوا تو وہ اس قابل نہیں تھیں کہ گھر سے نکل کر اس سے بات کرنے پڑوس تک آ پاتیں۔

پھر ایک دن اس کی کسی بات پر چراغ پا ہو کر بابر سلطان نے حکم جاری کیا کہ آئندہ وہ ماں سے ملنے نہیں جائے گی۔ اس نے احتجاج کیا تو سنگین نتائج کی دھمکی' دو' چار طمانچوں کے بعد مل گئی۔ اس نے بھی زبان بند کر لی۔ اتنی عقل تو تھی اسے کہ لوئر کلاس سے ڈائریکٹ اپر کلاس میں ایک ہی چھلانگ محض چند دنیاوی خواہشات کی تکمیل کے لیے مارنے کے نتیجے میں اسے جن چیزوں سے ہاتھ دھونے پڑے اس میں اس کی ماں بھی شامل تھی۔

اسے غم تو بہت زیادہ تھا' لیکن بہت جلد غلط کرنا پڑا۔

بابر سلطان گو وحشیانہ رویے سے ڈرا کے' آنے والی زندگی کی رنگینیوں کا سوچ کے اسے اس زندگی کا استقبال کرنا ہی تھا۔ جو بانہیں کھولے اس کی منتظر تھی۔

اور اس نے کیا بھی' خود کو اس ماحول میں جذب کرنے کی پوری پوری کوشش کی جو اس کی پچھلی زندگی سے اعشاریہ صفر صفر ایک فیصد بھی میل نہیں کھاتا تھا۔ اس کے لیے تو وہ جگہ' وہ محل نما گھر ہی کسی ونڈر لینڈ سے کم نہ تھا۔ اسے تو وہاں کی ٹونٹیوں اور دروازوں کو کھولنے اور بند کرنے کے طریقے بھی دو دو ملازموں نے سکھائے تھے اور اب جبکہ وہ وہاں کی محفلیں اٹینڈ کرنے اور مہمانوں کو کسی حد تک خوش کرنے کے بھی قابل ہو گئی تھی تو۔

ایک نیا دن' نیا موڑ اور نیا انتظار اس کی راہ میں کھڑا تھا۔

تین دن گزر چکے تھے اسے' ایک اور ونڈر لینڈ بلکہ مسٹری لینڈ کی سیر کرتے ہوئے۔

یہاں کی لینڈ لیڈی نے اسے شہزادیوں کی سی آن بان کے ساتھ ماتھے پر ایک بھی بل ڈالے بغیر رکھا ہوا تھا۔ بابر سلطان کہاں تھا۔ اب تک کیوں نہیں آیا تھا اور کب آنا تھا اسے' کچھ بھی علم نہ تھا۔ معمولی سی تشویش' ٹھیک ٹھاک پریشانی میں بدل چکی تھی۔ مسز رباب جنہیں وہ بھی دوسری لڑکیوں کی دیکھا دیکھی آنٹی بلانے لگی تھی۔ کوئی بھی تسلی بخش جواب دینے میں ناکام رہی تھیں۔ موبائل استعمال کرنا اسے آتا ہی نہ تھا۔ نہ بابر سلطان نے بھی اسے موبائل دلایا۔ نہ اس نے ضرورت محسوس کی۔ وہ اس وقت سخت بے بسی سے نیو آنا اس کا انتظار کرنے پر مجبور تھی۔

☆ ☆ ☆

رات اتنی طویل نہیں تھی۔ جتنی اس کے لیے بن گئی تھی۔

ماضی کی سنہری' رنگین اور زہریلی یادیں' اپنے نوکیلے پنجے اس کے دماغ میں گاڑے' دل میں کھونپے

قطرہ قطرہ اس کی غیرت چوستی رہی تھیں۔

اور وہ مجبور تھا اسے یاد کرنے پر۔ جس کے ساتھ زندگی گزارنے کے خواب دیکھے تھے۔ جس کے سنگ ہر خوشی' ہر غم کا سامنا کیا تھا۔

"روشنی' رشنا میری جان' سوری' آئی ایم سوری۔" الفاظ اس کے لبوں سے ٹوٹ کر بے آواز فضا میں تحلیل ہو رہے تھے۔ انگلیوں میں دبا سگریٹ جلتے جلتے پوروں تک آن پہنچا تو احساس ہوا۔ وہ پچھلے کئی گھنٹوں سے اسے سوچ رہا تھا۔ سگریٹ ایش ٹرے میں مسل کر جلتی آنکھوں کو دھیرے سے رگڑا۔

اسی پل دروازہ کھول کر کسی نے اسے پکارا تھا۔

"بھائی!" اس نے پلٹ کر دیکھا اور کھڑا ہو گیا۔

"بھائی! اب آئے آپ۔" دروازے سے آگے بڑھ کر وہ بے تابانہ اس سے لپٹ گئی تھی۔

"بہت دیر ہو گئی تم کہیں باہر گئی ہوئی تھیں۔"

"ہاں وہ آج۔" وہ کچھ رک کر بولی۔ "ہماری ویڈنگ اینورسری تھی آج۔"

"اوہ رالی سوری' ایم خوش ہوا اپنے ہبی کے ساتھ انجوائے کیا ڈنر۔" اس نے برابر میں بیٹھ کر اس کے شانے پر بازو نکالیا۔

"تو سمجھ لو میں بھی بہت خوش ہوں۔ میرے ہونے یا نہ ہونے سے کیا فرق پڑتا ہے۔"

"آپ کو نہیں' لیکن ہمیں پڑتا ہے۔ ہمیں فرق پڑتا ہے' مجھے اور آپی کو۔"

"بال' لیکن سمجھ کیسی ہے۔" رابعہ جواب دیے بنا اسے دیکھتی رہی۔

اس کے خوب صورت چہرے پر مسلسل بگاڑ سے تھکاوٹ ہو رہی تھی۔ آنکھوں کے گرد سیاہ پڑتے حلقے' گندمی رنگت سے میل نہیں کھا رہے تھے۔ مضبوط ہاتھوں کی نرم جلد بھی کھردری ہو چلی تھی۔ وہ بدل گیا تھا' بکھر گیا تھا اور کوئی سمیٹنے والا نہیں تھا۔

"آپ شادی کیوں نہیں کرتے بھائی۔" اس کی بات غیر متوقع تھی۔ مگر نہ نئی تھی' نہ انوکھی۔ اس کا

ہاتھ بے ارادہ رالی کے شانوں سے پھسل کر اپنی گود میں آگرا۔

"بھائی! آپ بھول کیوں نہیں جاتے ان کو۔" جواب ندارد۔

"اگر خالہ جان یا ہمارے والدین میں سے کوئی ایک بھی زندہ ہوتا تو یہ سب اس طرح نہ ہوتا' جس طرح ہوا۔"

"ہاں شاید تب کسی اور طرح ہوتا۔" اس کی آواز مضمحل تھی۔

"ہاں' ہاں تب شاید کوئی آپ کو اتنا آگے نہ بڑھنے دیتا۔ شروع میں ہی روک دیتا۔" اس کی گود میں دھری ہاتھوں کی انگلیاں آپس میں الجھ گئیں۔

"اب ایک بات جو ممکن ہی نہیں ہے' کیا آپ ساری زندگی اسے۔"

"رابعہ پلیز۔ میں اس ٹاپک پہ بات نہیں کر سکتا۔" وہ اٹھ کر وارڈ روب کے پاس چلا گیا۔

"بات کر نہیں سکتے یا کرنا نہیں چاہتے۔"

"کر نہیں سکتا اور پلیز مجھ سے اصرار مت کرو۔ میں مجبور ہوں بہت اس معاملے میں۔"

رابعہ یہ بات سمجھتی تھی۔ وہ صرف منہ چھپانے کی خاطر وارڈ روب میں گھسا کھڑا تھا۔

"صرف اسی معاملے میں بے بس نا' اور یہ بے بسی آپ کی طاری کی ہوئی ہے۔ کیوں نہیں سامنا کرتے حقیقت کا۔ ایک بار اعتراف کریں کہ ہاں آپ غلط تھے۔ انجانے میں سہی' لیکن۔"

"رابعہ۔" وہ اتنی زور سے چلایا تھا کہ رابعہ نہ صرف سہم کر چپ ہو گئی تھی۔ بلکہ اٹھ کر کھڑی بھی ہو گئی تھی۔

"ہزار بار منع کر چکا ہوں۔ تم کیوں ہر بار یہ تکلیف دہ بات شروع کر دیتی ہو' کیوں۔" اب کی بار وہ تیزی سے پلٹ کے اس کے سامنے آگیا۔

"وہ نہیں دینا چاہتیں نا تکلیف مجھے' سمجھانا چاہتی ہو نا' اذیت سے' تو آئندہ کبھی بھی میرے سامنے اس کا ذکر

"مت کرنا۔" اس نے رابعہ کے دونوں بوچے ہوئے بازو بری طرح جھنجوڑ ڈالے۔ رابعہ کچھ لمحے اسے دیکھتی رہی۔ پھر ڈبڈبائی آنکھوں سے اس کے لبوں نے بے آواز جنبش کی تھی۔

"آئی ایم سوری۔"

زریاب کو فوراً ہی اپنے رویے کی بدصورتی کا احساس ہو گیا۔

اگلے ہی پل اس نے اس کے بازو چھوڑ کے پیشانی پر بوسہ دے کر سینے سے لگا لیا تھا۔ رابعہ کی آنکھوں میں بھرے ہوئے آنسو اس کے فراخ سینے میں جذب ہو گئے۔

☆ ☆ ☆

وہ بہت انہماک سے سبزی کاٹنے میں مصروف تھی۔ چولہے پر چائے چڑھی تھی۔ آج بہت عرصے بعد اس نے دل سے کھانا پکانے کا سوچا تھا۔

گلی سے سبزی والا گزرا تو اس نے دوڑ کر بیگن، آلو، پیاز اور اس جیسی دو، تین سبزیاں اکٹھے خریدیں۔ گوشت تو خیر صرف بقرعید پر ہی ملتا تھا۔ اگر آس پڑوس سے آ جائے تو، لیکن اب وہ اتنی گئی گزری حالت میں نہیں تھی کہ چند ایک سبزیاں بھی نہ خرید پاتی۔

بڑھتی ہوئی سردی کی شدت اور اس کے کپڑوں اور جوتوں کی خستہ حالی کو دیکھتے ہوئے ایک ہمدرد دل رکھنے والی کولیگ نے حق دوستی ادا کرتے ہوئے اس کی مالی مدد کرنے کی کوشش کی تھی اور اسے اس کے ہاتھ سے پیسے پکڑتے ہوئے صحیح معنوں میں احساس ہوا کہ خودداری اور عزت نفس کی پامالی، کیسے کچوکے لگاتی ہے۔ انسان کسی کے سامنے اف تک نہیں کر سکتا۔

اس کی پلکیں جھک گئی تھیں، مگر لب انکار سے انکاری تھے۔

"دیکھو، میں جانتی ہوں تم مجھے ابھی اتنی گہری دوست نہیں سمجھتیں کہ مجھ سے اس طرح رقم لے لو۔ مگر یقین کرو میں تمہیں کبھی احساس نہیں دلاؤں گی کہ میں نے زندگی میں کبھی تمہیں کچھ بھی دیا تھا اور اگر تم چاہو تو ادھار سمجھ کر رکھ لو۔ سیلری ملے تو واپس کر دینا۔ مگر پلیز اپنے لیے نئے شوز لے لو ابھی، نہیں تو تمہارے پیروں کا حشر ہو جائے گا۔" اس کا خلوص اس کے لہجے میں بول رہا تھا۔

وہ تو صرف اسے شوز لینے کا کہہ رہی تھی۔ مگر شنا جانتی تھی۔ صرف شوز خریدنے کی مد میں دی جانے والی رقم اتنی تھی کہ وہ اس سے اپنی بہت سی ضروریات پوری کر سکتی تھی۔

دودھ ختم ہو چکا تھا۔ اس نے تین دن سے ایک کپ چائے تک نہیں پی تھی۔ پتی والوں کے ڈبے خالی تھے اور سبزی کی ٹوکری اجڑ چکی تھی۔

اس نے ایک گہری سانس بھر کے وہ پیسے اپنے خستہ حال بیگ میں ڈال لیے۔ جس کی زپ اس نے کل ہی پاس سے جا کے ٹھیک کی تھی اور جس کی اندرونی جیبیں ادھڑ چکی تھیں۔

سوچوں میں ڈوبے کپ میں چائے انڈیلتے اسے کسی غیر معمولی احساس نے چھوا تھا۔ اس نے یوں ہی پلٹ کر کمرے میں نظر ڈالی اور چائے کا برتن اس کے ہاتھ سے چھوٹ گیا۔

چچی بے تابی سے ہاتھ پٹختی اسے پکار رہی تھیں۔ ان کے منہ سے ڈھنگ سے آواز بھی نہیں نکل رہی تھی۔ جانے کب سے ان کو اٹیک ہوا تھا۔ اپنی سوچوں میں گم ہو کر اسے پتا تک نہ چلا۔ کانپتے ہاتھوں سے دروازہ کھول کر اس نے ہاتھ مارا۔ اب خدا جانے ان ہیلر کہاں پڑا تھا۔ چچی کی حالت بد سے بدتر ہوتی جا رہی تھی۔ وہ بری طرح سانس کھینچ رہی تھیں، تڑپ رہی تھیں۔

"یا اللہ کہاں چلا گیا۔" کارنس پر رکھا سامان الٹ پلٹ کرتے وہ بے طرح روئی۔

جب ہی آنسوؤں کی دھند کے پار اسے دور زمین پر بے یار و مددگار کھلونے کی طرح پڑا ان ہیلر نظر آیا۔ اس نے تیر کی طرح لپک کر ان ہیلر اٹھایا تھا۔

☆ ☆ ☆

"اوہ زریاب! اکیلے ہو تم۔" حسب توقع رباب آنٹی اسے دیکھ کے خوش ہو گئی تھیں۔

"کتنے دن بعد شکل دکھائی ہے تم نے۔ لگتا ہے ہمیں بھول ہی گئے۔" وہ ان کے اپنائیت بھرے شکوے کے جواب میں بس مسکرا دیا۔

"یہ کون ہے۔" ان کی نظر کونے میں بیٹھی لڑکی پر پڑ چکی تھی۔ ان کا چونکنا بڑا فطری سا تھا۔

"یہ بے سہارا لڑکی ہے۔ اسے کام چاہیے۔ آپ کو میڈ کی ضرورت تھی نا۔ آپ نے ذکر کیا تھا مجھ سے۔" انہیں یاد آ چکا تھا۔ "تو تم اسے لے کر آئے ہو۔"

"بس مجھے ٹھیک لگی، اکیلی ہے۔ اس کے گھر والے تو ہیں نہیں۔ میں نے سوچا آپ کے پاس رہ بھی لے گی اور آپ کا پرابلم بھی سولو ہو جائے گا۔ شمائل ہے اس کا نام۔"

"ہاں۔ ہاں ٹھیک ہے معین!" ان کا ذاتی ملازم دروازے کے باہر ہی کھڑا تھا۔ بوتل کے جن کی طرح حاضر ہو گیا۔

"اسے رسولن کے پاس لے جاؤ۔ کچن وغیرہ کا کام کرے گی اور اب یہیں رہے گی۔" وہ مودب سی معین کے پیچھے باہر نکلنے لگی۔

"کوئی فکر کی ضرورت نہیں ہے۔ آنٹی تمہارا بہت خیال رکھیں گی۔ میں بھی آتا رہوں گا۔" زریاب نے بات مکمل کر کے اسے دیکھا۔ وہ سر ہلا کر ہاتھ جوڑتی باہر نکل گئی۔

مسز رباب نے بہت دھیان سے اس کی تسلی کو نوٹس لیا تھا۔ بے سہارا غریب اور جوان لڑکیوں سے انہیں بہت رغبت تھی اور پھر ایسی لڑکی جو ان کا پسندیدہ شخص ان کے پاس لایا تھا۔ وہ زریاب کو بہت پسند کرتی تھیں۔ ایک روڈ ایکسیڈنٹ میں شدید زخمی ہو کر جب وہ موت کے بالکل دہانے پر پہنچ چکی تھیں تو زریاب نے ہی ان کو ہاسپٹل پہنچایا تھا۔

یہ سالوں پہلے کا واقعہ تھا۔

ہوش میں آنے کے بعد جب انہیں زریاب کا پتا چلا تو انہوں نے محض اس کا شکریہ ادا کرنے کے لیے اپنے پاس بلایا تھا۔ لیکن اس کے حالات اور اکیلے پن کی بابت جان کر نہ صرف اسے ماہانہ اخراجات کے لیے رقم بطور ادھار مخصوص کر دی تھی، بلکہ تعلیمی اخراجات بھی اپنے ذمے لے لیے تھے۔

زریاب ان دنوں رشتوں سے ناتا ٹوٹ جانے کے بعد بالکل منتشر ہو کے رہ گیا تھا۔ وسائل کی کمی نے تعلیم کا سلسلہ منقطع کر رکھا تھا۔ تو دل ٹوٹ جانے کے بعد روزگار کا سلسلہ بھی بحالت مجبوری جیسے تیسے جاری رکھا تھا۔ مسز رباب کی حوصلہ افزائی سے اس نے ایک نئے عزم و عہد کے ساتھ دوبارہ ایڈمیشن لیا۔ گریجویشن کے بعد انہوں نے ہی اس کو جاب دلوائی تھی اور اس سے چھوٹی دونوں بہنوں کی شادیوں کے سلسلے میں بھی اس کی بہت مدد کی تھی۔

ان کے بقول زریاب نے ان کی جان بچا کر ان کو ساری زندگی کے لیے اپنا احسان مند کر لیا تھا اور جواب میں انہوں نے زریاب پر جو احسانات کی بارش کی تھی۔ وہ ساری زندگی نہیں چکا سکتا تھا۔ یہ زریاب کا خیال تھا۔

صاف ستھرے بزنس کی آڑ میں سیاہ پیشہ کرنے والی مسز رباب کی شخصیت میں اگر کوئی انسانیت کا پہلو تھا تو صرف یہ کہ وہ اپنے ملازموں کے ساتھ بہت اچھی تھیں، اور زریاب پر ان کی خاص نظر کرم بھی تھی۔ جس نے انہیں ایکسیڈنٹ کے بعد بروقت ہاسپٹل پہنچایا تھا۔

"چلو اگر تم بزی نہیں ہو تو میرے ساتھ چلو۔"

"کہاں؟"

"کچھ شاپنگ کرنی ہے، تم سے گپ شپ بھی ہو جائے گی۔"

"چلیں۔ میں بھی رابی کے لیے گفٹ لے لوں گا۔ کل اس کی ویڈنگ اینورسری تھی۔" وہ مسکرا دیا۔

"اچھا۔ کیسی ہیں مسز تمہاری، چلو باقی باتیں راستے میں کریں گے اور سناؤ۔ ارے ناشتا کر لیا تم نے۔ ایسا کریں گے پہلے کچھ کھا پی لیں گے۔ میں نے ناشتا بھی نہیں کیا ہے اور شاپنگ سینٹرز اتنی جلدی کہاں کھلتے ہیں۔" وہ باتیں کرتی اس کے ساتھ باہر کی

سمٹ بیٹھ گئیں۔

☆ ☆ ☆

جانے کتنی دیر گزری تھی۔ کتنے گھنٹوں تک وہ سوئی تھی۔ کوئی اسے جگانے بھی نہیں آیا۔ اس نے مندی آنکھیں جھپک جھپک کر ٹائم دیکھا۔

"ارے بارہ بج گئے۔" وہ حیرت زدہ سی اٹھ بیٹھی۔

بڑی بڑی کھڑکیوں پر پڑے بھاری نفیس پردوں کے باعث وقت کا اندازہ کرنا مشکل تھا جن میں بھی رات کا سماں تھا۔ کمرے میں ملگجا اندھیرا تھا۔ وہ اٹھ کر دھیرے دھیرے چلتے ہوئے کھڑکی کے پاس گئی اور پردے سمیٹ دیے۔ نرم ملائم، سرمائی دھوپ کمرے میں بھری تو حدت اور تازگی کا ایک الگ سا احساس ہوا۔ اتنا سو کر بھی جسم ست اور سر بھاری لگ رہا تھا۔

شاید یہ رات بھر رونے کا اثر ہے۔

رات کے ذکر کے ساتھ ہی اسے اپنی پریشانی یاد آگئی اور بابر سلطان بھی۔

اس نے واش روم میں جا کے منہ پر پانی کے چھینٹے مارے اور مسز رباب سے بات کرنے کمرے سے نکل آئی۔ "یہ کیا چکر چلایا ہوا ہے دونوں نے مل کر۔ بابر کب آئیں گے۔ میں اپنے گھر کب جاؤں گی۔" گزرتے وقت کے ساتھ اس کی فکر بھی بڑھ رہی تھی۔

"بڑی بی بی تو نہیں ہیں۔ کوئی صاحب آئے تھے ان کے ساتھ باہر گئی ہیں۔" اس کے جوش پر پانی پھر گیا۔

"آپ ناشتا یہیں کریں گی یا کمرے میں؟" وہ وہیں کھڑے کھڑے ایک دم ہی کسی سوچ میں ڈوب گئی تھی۔ ملازمہ نے دوسری بار اسے آواز دی۔

"ناشتا کمرے میں لے آؤں جی۔"

"ہاں۔ کمرے میں۔" بے ربط انداز میں بولتی وہ واپس کمرے کی طرف بڑھ گئی۔ کمرہ ویسا ہی تھا سجا سجایا اور خاموش، لیکن اس وقت اسے کسی جیل سے کم نہیں لگا۔ ملازمہ ناشتا رکھ کے جا چکی تھی۔ لیکن اس کی توجہ ناشتے پر نہیں۔ سائیڈ ٹیبل پر رکھے لفافے کی طرف تھی۔ اس نے لفافہ اٹھاتے ہوئے یاد کرنے کی کوشش کی کہ رات میں یہ لفافہ یہاں تھا یا نہیں۔

"یقیناً" نہیں۔ ورنہ اسے نظر آچکا ہوتا۔"

اسے کھول کر اندر موجود کاغذات نکالتے ہوئے اس کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ اس میں صرف کاغذات نہیں۔ ایٹم بم ہے۔ وہ طلاق نامہ تھا۔ جو ایک دھماکے سے اس کے وجود کے پرخچے اڑا گیا تھا۔

☆

چچی پر سکون ہو چکی تھیں۔ وہ دیوار سے ٹیک لگا کے وہیں ٹھنڈے فرش پر بیٹھ گئی۔ چچی نڈھال سی مسہری پر سر ڈالے پڑی تھیں۔ ناہموار تیز سانسوں کی آوازیں اس کے اپنے کانوں میں گونج رہی تھیں۔ بے بسی کے شدید احساس تلے اس کی آنکھیں چھت کو چھوتی دھند تک آگئیں اور آنسوؤں سے بھر گئیں۔

ایک پل میں وہ پھوٹ پھوٹ کر رو رہی تھی۔ مسہری پر پڑے تھکے ماندے وجود نے سر اٹھا کے اسے دیکھا۔

"اب کیوں رو رہی ہے۔ اب ٹھیک ہوں میں۔ چل چپ ہو جا۔" پھولی سانسوں کے بیچ وہ رک رک کر بات مکمل کر پائیں۔ اس نے جواب نہیں دیا بدستور روتی رہی۔

"ارے کیا ہو گیا ہے آج تجھے۔ پاگل ہو گئی ہے کیا۔"

"ہاں پاگل ہو گئی ہوں میں۔" وہ روتے روتے سر اٹھا کے چلائی۔ "اور مجھے پاگل کرنے والی ہیں آپ۔"

"میں۔ لو میں نے کیا کیا ہے۔"

"آپ نے مجھے اکیلا کر دیا۔ بے سہارا کر دیا ہے مجھے۔ زریاب کو چھین لیا آپ نے مجھ سے۔ آپ نے ہی کہا تھا اس سے کچھ۔ مجھے یقین ہے۔ اسی لیے وہ پلٹ کر نہیں آیا۔ سب کیا دھرا آپ کا ہے۔" اس کی آواز غصے سے کانپ رہی تھی۔ کتنے دنوں سے منہ بند آتش فشاں آج پھٹ پڑا تھا۔

"کبھی میری ماں بن کے نہیں سوچا۔ ہر جگہ، ہر بار اپنی بیٹی کو مجھ پر فوقیت دی۔ اب اگر آج آپ کو کچھ ہو گیا تو کیا بنے گا میرا۔ کہاں جاؤں گی میں کیا کروں گی، کبھی سوچا ہے آپ نے؟" دل کے کسی کونے میں سر جھکا کے بیٹھا خوف امڈ کے باہر آیا تھا۔

"اور جو تو بھی چلی جاتی مجھے چھوڑ کے تب۔ میں تب۔" چچی کی کمزور آواز کمرے کے سناٹے کو بے ربط کر گئی۔

"تو یہاں بھی اپنا ہی سوچا نا، میرا تو نہیں۔"

"تب۔ تو کون سا سوچتی میرے بارے میں۔ چلی جاتی اس کے سنگ مجھے چھوڑ کے یہاں۔ ارے جب میری سگی اولاد نے میری خبر نہیں لی تو تو کہاں رکتی۔"

"میں رک جاتی امی! میں کہاں جاتی آپ کو چھوڑ کے۔" اس کی آواز اور آنسو دونوں ہی دھیمے پڑ گئے تھے۔ "ساری زندگی اولاد کی طرح پالا۔ لیکن اولاد نہیں سمجھا۔ جب ہی تو بھی بھروسا نہیں کیا میرے اوپر۔" اس کی آواز اب خود کلامی میں ڈھل رہی تھی۔

"کچھ بھی ہو۔ لیکن آپ نے میرے ساتھ اچھا نہیں کیا۔" وہ سر جھٹک کر آنسو پونچھتی دوبارہ سے کچن میں چلی گئی۔ چولہے پر چائے چڑھاتے ہاتھ کانپ رہے تھے۔

تمہارے بعد کیسی رونقیں اس دل کی نگری میں
سب ہی چراغ مدھم ہیں، کبھی ملنے چلے آؤ
تمہاری یاد اب دل کو بہت تکلیف دیتی ہے
نگاہیں بھی تو پرنم ہیں، کبھی ملنے چلے آؤ

☆

رابعہ کے لیے رباب آنٹی نے ایک خوب صورت جیولری سیٹ خرید کے دیا تھا۔ وہ خود بھی رابعہ کے لیے اور اس کے ہسبینڈ کے لیے سوٹ لے چکا تھا۔ اس کے بہت منع کرنے کے باوجود جب وہ نہ مانیں تو اسے لینا ہی پڑا۔ وہ ان کا بے حد ممنون تھا۔

شاپنگ سے پہلے انہوں نے اسے ایک عمدہ ریسٹورنٹ سے ناشتا بھی کروایا۔ اصل میں بھوک تو خود ان ہی کو لگی تھی۔ مگر زریاب بھی خوش گوار موڈ میں ان کا ساتھ دیتا رہا۔

شاپنگ سے واپسی پر اس کا موڈ رات کی نسبت بہت بہتر تھا۔ رابعہ کو اس کے گفٹس دیتے سے اس نے اس کے چہرے پر خوشیوں کے جو رنگ بکھرے دیکھے، دل میں بہت گہرائی تک اطمینان کو فیل کرنے لگا۔

ایک وقت وہ تھا جب وہ ایک ایک روپیہ دانتوں سے پکڑ کے خرچ کرتا تھا۔ ماں اور بہنوں کی تو کیا اپنی ضرورتوں سے بھی آنکھیں چراتا تھا۔ ان کے ساتھ مل بیٹھنے سے گریز کرتا تھا۔ ان کی سوال کرتی نگاہوں کا سامنا کرنا اس کے لیے مشکل سے مشکل ترین ہو جاتا۔ اس کی ماں، حالات بدلنے اور بہتری آنے کے خواب دیکھتی اپنی بیٹیوں کے گھر بسانے کے ادھورے سپنے لیے اس دنیا سے چلی گئی اور وہ بے بسی سے دیکھتا رہا۔ ادھوری تعلیم اور ناکافی وسائل کے ساتھ کوئی اسے نوکری دینے کے لیے تیار نہ ہوتا تھا۔

جہاں تعلیم ضروری نہ تھی، وہاں ہنر کی قدر تھی۔ جہاں ہنر نہیں چاہیے تھا۔ وہاں تعلیم کی مانگ اور جہاں ہنر اور تعلیم دونوں ہی کی شرط نہ تھی وہاں کنوینس ایک ایسی شرط تھی۔ جس پہ آکے وہ ہار جاتا تھا۔

اس کی تو ذاتی سائیکل خریدنے کی اوقات نہیں تھی تو بائیک کی شرط کہاں سے پوری کرتا۔ جب مسز رباب کی مہربانی سے اس کی پہلی جاب لگی تو وہ اس وقت ایک مکمل گریجویٹ بھی نہیں تھا گریجویشن مکمل ہوتے ہی زندگی میں پہلی بڑی خوش گوار تبدیلی، کمپنی سے ملنے والا وہ اسی گز کا فلیٹ اور آٹھ سو سی سی کار تھی۔ جو کچھ مسز رباب کی سفارش اور کچھ اس کی اپنی دن رات کی محنت سے بنائی گئی ریپوٹیشن کا ثمر تھا۔

کمپنی کے جی ایم محنتی لوگوں کو پسند کرتے تھے زریاب کے کام سے مطمئن تھے اور اپنے اطمینان کا اظہار انہوں نے بارہا زریاب کے سامنے بھی کیا۔ ان کی حوصلہ افزائی اور مسلسل محنت نے یہ دن دکھائے تھے کہ آج وہ اسی گز کے بجائے دو سو اسی گز کے ذاتی

گھر اور آٹھ سو سی سی کی ذاتی گاڑی کا مالک تھا۔

ایم بی اے مکمل کرتے ہی اس نے اپنی کمپنی کو خیرباد کہہ کر یہ این جی او جوائن کرلی تھی۔

وہ اپنے رب کا جتنا بھی شکر گزار ہوتا کم تھا۔

جس نے ایسے وقت میں اس کا ہاتھ تھاما جب وہ زندگی میں ہر شے سے مایوس ہو چکا تھا۔

✡ ✡ ✡

بہتے آنسو' رخساروں پر ثبت انگلیوں کے ابھرے نشانوں سے پھسلتے اس کی جلن میں کئی گنا اضافہ کررہے تھے۔ اس کے جبڑوں میں اب بھی دکھن باقی تھی۔

اور یہ جلن اور دکھن اس مزاحمت کا نتیجہ تھی۔ جو مسز رباب کے میٹھے لہجے کا بھید کھل جانے پر اس نے کی تھی۔

بدگمانی اور وسوسوں کی آخری حد پہ جاکے بھی اس نے یہ سب نہیں سوچا تھا۔ جو اس کے ساتھ یہاں ہوگیا تھا۔ اس کا شوہر بدکردار تھا۔ وہ چپ چاپ سہہ گئی۔ شرابی تھا' زانی بھی تھا اس نے برداشت کرلیا۔ اسے اپنے کردار کو بچانا تھا۔ اپنے آپ کو صاف رکھنا تھا۔ لیکن یہ سب کیسے ہوگیا جو اس نے کبھی سوچا بھی نہ تھا۔

اس کا شوہر اس کا شوہر تھا ہی نہیں۔ اس کا نکاح صرف ایک ایگریمنٹ تھا۔ ایک معاہدہ باعزت اور قانونی اغوا کی طرح۔ بلکہ بقول مسز رباب کچھ مہینے اسے اپنے نکاح میں رکھ کے اس نے صرف ایک کاغذ کے بل بوتے پر اتنے دن مفت میں مزے لوٹے تھے۔ اب ان کی باری تھی اور انہیں اس پروجیکٹ میں لگایا گیا تمام سرمایہ سود سمیت وصول کرنا تھا اور کیسے وصول کرنا تھا۔ یہ وہ اچھی طرح جانتی تھیں۔ پیسے کے لالچ میں اپنی سے دگنی عمر کے آدمی سے نکاح کرتے وقت اس کے فرشتوں کو بھی خبر نہیں تھی کہ فقط چھ مہینے میں اس کا دل بھر جائے گا اور وہ اپنی ہی عزت کی دلالی پر اتر آئے گا۔

ایک بدچلن' بدکردار' سیاہ کاری کرنے والی عورت کے ہاتھوں اسے بیچ کر چلا جائے گا کہ خود اسے کانوں کان بھی خبر نہ ہوگی۔

✡ ✡ ✡

وہی کمرہ تھا آراستہ پیراستہ۔ جو ذرا دیر پہلے اسے جیل لگ رہا تھا۔ اب تو جہنم کی مانند دہک اٹھا۔ آنسو بے آواز آنکھوں سے نکل کے بہتے گریبان میں جذب ہورہے تھے۔

طلاق کے کاغذات اب اس کے پاس نہیں تھے۔ وہ مسز رباب کے قبضے میں جاچکے تھے۔ اس نے اپنے خالی ہاتھ دیکھے۔ اسے لگ رہا تھا اس کے پاس کچھ بھی باقی نہیں بچا۔ مسز رباب صرف کاغذات پر نہیں بلکہ اس پر بھی قابض ہوچکی تھیں۔ اس کی زندگی' وجود' خوشیاں یہاں تک کہ آتی جاتی سانسوں پر بھی۔

"کیا ہوگیا' یہ سب کیا ہوگیا' او میرے خدا' مجھے بچالے' میرے مالک' میں کہاں آگئی ہوں۔ یہ کہاں پھنس گئی ہوں میں۔"

خود کلامی کرتے دونوں ہاتھ سر پہ رکھے وہ پھوٹ پھوٹ کر رو رہی تھی۔

✡ ✡ ✡

سردیوں کے موسم میں اسکول کی واپسی کے وقت سر پر چڑھے سورج کی تپش' راستے میں بڑا مزا دیتی تھی۔ لیکن اسے احساس تھا۔ گرمیوں میں یہی راستہ اس کے لیے بہت کٹھن ہوجائے گا۔ یونہی سوچوں میں ڈوبتے ابھرتے اس نے گھر کا دروازہ کھول کر صحن میں قدم رکھا تو امی کے ساتھ دھوپ میں چارپائی پر کسی کو بیٹھے دیکھا۔

وہ انتہائی ضعیف' جھریوں بھرا بوڑھا چہرہ' اسے دیکھ کے مسکرایا اور وہ پہچان کے مراحل ایک لمحے میں طے کرتی ہوئی بھاگ کر اس مہربان وجود کی بانہوں میں سما گئی۔

"عظمت بوا! عظمت بوا!" اس کا گلا بولتے ہوئے بھرا گیا۔ اور وہ مہربان وجود' اپنے پُرحدت لبوں سے

محبت کی گرمی اس کے چہرے پہ لکھتا رہا۔

اسے لگ رہا تھا۔ آج شاید اس کے آنسو بہانے کا آخری دن ہے۔ زریاب سے وابستہ کسی بھی شخص کو اس نے کتنی مدت بعد دیکھا تھا۔ ایسا لگ رہا تھا۔ چلتی دھوپ کے سفر مسلسل میں ایک گھنا سایہ دار اس کے سر پر آگیا ہو۔ وہ زریاب کی پیدائش سے بھی پہلے سے ان لوگوں کے پڑوس میں رہتی تھیں۔ ہر وقت کا آنا جانا تھا۔

زریاب اور رشنا دونوں کی ماؤں کو انہوں نے منہ بولی بہن بنایا اور نبھایا تھا۔ جب تک زریاب اس گھر میں رہا۔ ان کا یہاں آنا جانا بھی تواتر سے لگا رہتا تھا۔ مگر زریاب کی والدہ کے انتقال کے بعد اس میں کمی سی آگئی تھی۔

یوں بھی یہاں وہ صرف رشنا سے ملنے ہی آتی تھیں۔ اس کی پیدائش کے ساتھ ہی انتقال کرجانے والی ماں کو یاد کرنے۔ پھر ان کی زبانی' اسے پتا چلا تھا کہ زریاب اپنی بہنوں کو لے کر وہ گھر بیچ باچ کے کہیں چلا گیا۔

کہاں۔ یہ کسی کو نہیں پتا تھا۔ اس نے جاتے وقت عظمت بوا سے بھی ملنا گوارا نہیں کیا اور رشنا کو تو پہلے ہی اسے دیکھے ہوئے زمانہ گزر گیا تھا۔

آخری بار عظمت بوا تب ہی آئی تھیں۔ اس کے بعد تو سب کچھ جیسے وقت اور حالات کی چکی میں پس کر نگاہوں سے اوجھل ہی ہوگیا۔

وہ جلدی سے محلے کی دکان سے بیسن خرید کر لائی اور بوا کو بہت محبت اور اصرار سے کھانے پر روک کر بیسن کی گرم گرم روٹیاں کھلائیں۔

بوا بہت خوش ہو ہو کر اسے دعائیں دیتی رہیں اور وہ خود بھی ایسے خوش تھی۔ جیسے کوئی خزانہ مل گیا ہو۔ کھانے اور چائے کے بعد امی تو ذرا دیر لیٹنے اندر چلی گئیں اور وہ بہت ساری باتیں اور یادیں تازہ کرنے کی لالچ میں بوا کو لے کر ڈھلتی دھوپ میں پلنگ بچھا کر فرصت سے آبیٹھی۔

"بوا! مجھ سے زریاب کی باتیں کریں نا۔" کافی دیر پرانا وقت یاد کرتے گزر گیا۔ جب اچانک ہی اس کے منہ سے نکلا تھا۔

بوا نے ایک دم چونک کر اسے دیکھا۔

"ہاں۔" وہ ایک گہری سانس بھر کے بولیں۔

"اصل میں تو میں بھی تجھے اس کے بارے میں بتانے کے لیے ہی آئی ہوں۔"

"کیا۔ کیا بتانے آئی ہیں۔" اس کے کان ایک دم کھڑے ہوگئے۔

"پہلے سوچا۔ اب تو وقت گزر گیا۔ بتانے کا کیا فائدہ۔ مگر دل پر بہت بوجھ ہے۔ شاید کچھ کم ہوسکے۔"

"کیسا بوجھ بوا؟" اس کی آواز میں بے تابی تھی۔

"پہلے یہ بتا تیرا کوئی رشتہ وشتہ آیا کہ نہیں۔"

انہوں نے ایک دم موضوع پلٹا۔ وہ جھنجلا گئی۔

"ارے نہیں آیا۔ آپ بتائیں نا کیا کہہ رہی تھیں۔"

"چل چھوڑ کیا کرے گی سن کے۔ اب تو وہ چلا گیا' جانے کہاں۔"

"بوا! خدا کے لیے کچھ تو کہیں۔ آپ کو پتا ہے نا وہ کیوں چلا گیا یہاں سے سب چھوڑ کر۔ مجھے چھوڑ کر۔ آپ کو پتا ہے بوا بتائیں نا آپ کو میری قسم۔" وہ باقاعدہ منت پر اتر آئی۔

"وہ تیری بہن کہاں ہے۔" "اب انہیں اس کی یاد آگئی۔"

"چھ۔ شادی ہوگئی اس کی۔" اس نے مختصراً بات نپٹائی۔

"ارے۔ کس سے ہوگئی؟"

"اوفوہ۔ ایک بہت امیر بڑے آدمی کا رشتہ لائی تھی۔ کوئی رشتے کرانے والی۔ چپ چاپ نکاح کرکے روانہ کردیا۔ بہت کم لوگ شریک ہوئے تھے۔"

"تو ملنے آتی ہے' خوش تو ہے؟"

"ہاں۔ ہاں۔ خوش ہے۔"

"تو کہ میری دھی! جو بات میں تجھے بتانے جارہی ہوں نا۔ وعدہ کر اپنے تک رکھے گی۔ کسی کو نہیں

جائے گی۔"

"ہاں۔ ہاں۔ نہیں بتاؤں گی۔" اس نے ثقافت شرائط و ضوابط کے مراحل نبھائے۔

"مجھے رابعہ نے بتایا تھا کہ تو اور وہ آپس میں دودھ شریک بہنیں ہیں۔"

"کیا؟" اس کا منہ کھل گیا۔

"ایسا تیری چچی نے زریاب کو بولا تھا کہ تو اس کی بھی بہن لگتی ہے۔ تیری اور اس کی شادی نہیں ہو سکتی۔" اس کے سر پہ سات آسمان ٹوٹ پڑے۔ وہ بے اختیار دل تھام کر رہ گئی۔ سدھ بدھ ہوتی دھڑکنیں لگتا تھا ابھی بالکل ختم ہو جائیں گی۔ مگر اصل قیامت تو ابھی باقی تھی۔

"پر اصل بات یہ ہے کہ میری دھی کہ تیری چچی نے جھوٹ بولا تھا زریاب سے۔" اس نے بے ساختہ منہ پر ہاتھ رکھ کر اپنی چیخ روکی۔

"ایسی کوئی بات نہیں تھی۔ میں گواہ ہوں۔ رابعہ اور تیری میرے سامنے کی پیدائش ہے۔ بس یہ نمانی اس کی عقل تو کھاس چرنے چلی گئی تھی کہ مجھے بھی رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا واسطہ دے کر منہ بند کرا دیا تھا۔"

"پر۔ انہوں نے ایسا کیا کیوں؟" اس کی اپنی آواز اسے اجنبی سی لگی۔

"اپنی نمو کو بیاہنا چاہتی تھی زریاب سے، پر ہوا کیا؟ تجھ سے تو جڑ نہیں سکتا تھا۔ اسے بھی نہیں اپنایا۔ خدا جانے کہاں گیا زمانے کی خاک چھاننے، کہاں ہو گا، کیسا ہو گا۔"

اس کی پتھرائی ہوئی آنکھوں میں زندگی کی کوئی رمق نہ تھی۔ بوا کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔

"اصل میں تو میں بھی تیری مجرم ہوں۔ اگر میں اسی وقت رابعہ کو ساری بات سچ بتا دیتی تو شاید آج تو ایسے کلی نہ رہ رہی ہوتی۔ پر مجھے کیا پتا تھا کہ اس کے جانے کے بعد یہ تیری ماں تیرا بیاہ کہیں اور بھی نہیں ہونے دے گی۔ اسے صرف اپنی دھی کی فکر تھی۔ اس کو بیاہ دیا اس نے۔ تیری کوئی فکر ہی نہیں۔ تو مجھے معاف کر دے بچی۔ تاکہ میرا رب سوہنا بھی مجھے معاف کرے۔"

وہ اس کے سامنے ہاتھ جوڑ کر سسک پڑیں۔

"کتنے دن گزر گئے۔ میں کب سے سوچتی تھی کہ تیرا سامنا کیسے کروں گی۔ میری راتوں کی نیندیں دل کے بوجھ نے حرام کر رکھی ہیں۔ اس وقت میں نے سوچا نہیں تھا کہ وہ ایسے غائب ہو جائے گا اور تیری ماں نمو کی شادی کر کے تجھے بھول ہی جائے گی۔" اس کی نظریں بوا کے بندھے ہاتھوں پر جم گئی تھیں۔

"وہ مجھے بھول ہی تو نہیں سکیں بوا۔ ان کو میں ہمیشہ یاد رہی۔ چچی جو نہ میری سگی ماں تھیں، نہ سوتیلی۔ میری ماں نہ بن سکیں۔ لیکن نمو کی ماں کا فرض خوب نبھایا انہوں نے۔ اس کے راستے کی ساری رکاوٹیں ہٹا کر اپنی خواہش کے عین مطابق خوب اونچے پیسے والے گھرانے میں اس کی شادی کی اور میں......"

ڈبڈبائی آنکھوں سے سوچتی وہ کہاں سے کہاں نکل گئی تھی۔

"میں چلی جاتی تو ان کا سہارا کون بنتا۔ مجھے کوئی اور مل جاتا تو میں انہیں چھوڑ دیتی۔ اس لیے میرے آگے بڑھنے کا راستہ بند کر دیا انہوں نے۔ میری بیساکھیاں چھین کر مجھے بے سہارا کر دیا اور مدبر بھی انہی کی لاکر حقیقت پہچانہ چلتی تو میں اور وہ ہمیشہ اک دوجے سے شرم سار ہی رہتے۔ وہ مجھے بھول نہیں سکیں بوا! بھول سکتی ہی نہیں تھیں۔ میں انہیں ہمیشہ یاد رہی۔ بس اس پاک ذات کو بھلا دیا انہوں نے جو سب کا سب سے بڑا سہارا ہے۔

آپ نے تو کچھ بھی نہیں کیا بوا۔ مجھے شرمندہ مت کریں۔"

وہ بوا کے ہاتھوں پر چہرہ ٹکا کے رو دی۔

☼ ☼ ☼

صبح کا اجالا پوری طرح پھیلا نہیں تھا۔ ہر چیز موسم کی شدت کی لپیٹ میں تھی۔ کہر زدہ اشجار، اداس رستے، ویران راہیں، اسے ڈرائیونگ کرتے کئی گھنٹے ہو چکے تھے۔

جب وہ اپنے چھوٹے سے شہر کی حدود میں داخل ہوا تو آنکھوں میں سرخی کے ہلکے سے ڈورے تھے۔ اس نے کچھ سوچ کر گاڑی جانے پہچانے راستوں پر ڈال دی۔ کال بیل پر انگلی رکھتے وقت اس کے ذہن میں کسی کا حیرت زدہ ہنستا ہوا چہرہ تھا۔

"زریاب! اف زریاب کے بچے اتنی صبح۔" آئمہ کی چیخ نما آواز پورے فلیٹ میں گونج گئی۔ اس کے بال بکھرے ہوئے تھے اور تازہ پانی کی چھینٹیں چہرے پر چمک رہی تھیں۔ لائبہ ناشتا بنانے میں مصروف تھی۔ ان کی والدہ بھی اسے دیکھ کر خوش ہو گئی تھیں۔

"میں نے سوچا سرپرائز دے دوں۔"

"بہت اچھا کیا۔ مجھے بہت خوشی ہو رہی ہے۔"

وہ ویسے ہی حلیے میں اس کے سامنے ناشتا کرنے بیٹھ چکی تھی۔

گرم گرم خستہ پراٹھے اور تازہ مشروم آملیٹ کی خوشبو کے ساتھ بھاپ اڑاتی چائے کے مگ نے اس کی تو کسی جھجک کو آڑا بی دی تھی۔

لائبہ شرمائی لجائی اس کے آگے چیزیں رکھتی رہی اور وہ دونوں بہنوں کو دیکھ کر سوچتا رہا کہ بہت جلد دو ٹوک بات کرنا پڑے گی۔

☼ ☼ ☼

نہایت آرام دہ اور عمدہ ویزائن سے مزین جہازی سائز بیڈ پر بیٹھی وہ اپنے ریشمی گاؤن کے ربن سلجھا رہی تھیں۔ نگاہوں میں کسی سوچ کی گہری پرچھائیں تھیں۔ سامنے کھڑی مؤدب ملازمہ ان کے اگلے حکم کی منتظر تھی۔

کافی دیر بعد وہ بنکار پیٹ ٹھیک ہے آج کھانا دینے کی ضرورت نہیں۔ کل شام تک بھوک سے بھری ہوئی ٹرالی لے جانا۔ اس کا باپ بھی بھوکے کتوں کی طرح کھانے پر ٹوٹ پڑے گا۔"

ملازمہ شکایت لے کر آئی تھی کہ مسز یاب سلطان جو کہ اب پھر سے نیمہ گل بن چکی ہے۔ کھانا کھانے کو تیار نہیں ہے۔ وہ احتجاجاً کھانے سے منہ موڑے بیٹھی تھی۔

پورا دن گزر چکا تھا۔ کھانا تو دور کی بات اس نے پانی کا ایک گھونٹ تک نہ پیا تھا۔ مسز یاب اس طرح کے ہتھکنڈوں کو زیر کرنا بخوبی جانتی تھیں۔ انہوں نے اس کا احتجاج اس پر الٹ دیا تھا۔

دو دن تک مسلسل بھوکا رہنے سے دوسرے دن کی رات تک اس کی آنتیں بری طرح بل کھا گئی تھیں۔ اور تیسرے دن صبح تک وہ اپنی بھوک سے بالکل ہار چکی تھی۔ جب ہی گرما گرم ناشتا دیکھ کر اس سے رہا نہیں گیا۔ مسز یاب تک تمام رپورٹ پہنچ چکی تھی۔ وہ مسکراتے ہوئے سنتی رہیں۔

"ٹھیک ہے۔ آرام سے کھا لینے دو، پھر ہمیں بتانا۔"

کچھ دیر بعد جب ملازمہ نے اطلاع دی کہ اس نے ناشتا پر شاد و رغبت ختم کر لیا تب وہ اٹھیں۔

"ہم اس کے کمرے میں جا رہے ہیں۔ کوئی ڈسٹرب نہ کرے۔" وہ بڑے پُر حکمت اور فیصلہ کن انداز میں بول رہی تھیں۔

☼ ☼ ☼

اسکول میں اس کی غیر حاضر دماغی کو سب ہی نے نوٹ کیا تھا۔ ویار اس نے ایک ہی سوال کا غلط جواب لکھا۔ اس کا دھیان بار بار بھٹک جاتا۔ بچے اس کے سامنے کھڑے سوال کرتے رہتے اور وہ ان کا منہ تکتی رہ جاتی۔

اصل میں تو ہر چہرے کے پیچھے ایک ہی چہرہ چھپا تھا، ہر آواز کی اوٹ سے ایک ہی آواز جھانک رہی تھی۔ بریک ختم ہونے کی بیل بجی تو ساتھی کولیگ کو باقاعدہ اس کا شانہ ہلا کر ہوش میں لانا پڑا۔ باقی کا سارا وقت وہ اپنے آپ کو حواسوں میں رہنے کی تلقین کرتی رہی۔ اس کے ذہن میں ہیجان تھا۔

پھر بھی چھٹی کے بعد گھر پہنچ کر اس نے صحن میں قدم رکھا تو سارا صحن سرما کی نرم حرارت کے بجائے

گرا ہی جھلستی ہوئی دھوپ سے بھر گیا۔

جب وہ محلے کی ایک خاتون سے چچی کا کوئی کام کہنے گئی تھی اور انہوں نے اسے چائے پینے کے لیے بٹھالیا تھا اور جب گھنٹے بھر بعد اس کی واپسی ہوئی تو وہاں صحن میں نعیمہ کھڑی تھی۔ اس کے چہرے پر سوچ کی گہری پرچھائیں تھیں۔

"کیا ہوا امو؟"

"کچھ نہیں۔" اس کا لہجہ ٹالنے والا تھا۔

"زریاب آیا تھا کیا؟"

"تمہیں کیسے پتا۔" وہ اندر کی سمت بڑھ گئی۔

"اس کا مطلب ہے "آیا تھا۔"

"ہاں آیا تھا۔ امی سے کچھ بات کرنے۔ تمہیں کیسے پتا چل گیا اس کے آنے کا۔" اب کی بار وہ جھنجلائی یوں جیسے کہنا چاہ رہی ہو۔ "تمہیں کیوں پتا چل گیا اس کے آنے کا۔"

"جب پہلے آیا تھا تو آج آنے کا کہہ کر گیا تھا۔ مگر۔" وہ الجھی سی گئی۔ "اتنی جلدی کیوں چلا گیا۔"

"مجھے کیا پتا۔" اس کا یہ انداز اس بات کا اشارہ ہوتا تھا کہ اب اس موضوع پر بلکہ کسی بھی موضوع پر اس سے کوئی بات نہ کی جائے۔

"یعنی زریاب آیا تھا' اتنی جلدی کیوں چلا گیا۔" اب وہ ان کے سر پر سوار تھی۔

"کہہ رہا تھا' کہیں جانا ہے۔" وہ سلائی مشین کی سوئی میں دھاگا ڈال رہی تھیں۔

"آپ سے کیا بات ہوئی۔" اسے یقین نہیں آرہا تھا کہ وہ اس سے ملے بغیر بھی جاسکتا تھا۔

"کوئی خاص نہیں' بچیوں نے سلام کہلوایا ہے اور۔"

"اور۔" وہ مشین پر جھکا ان کا چہرہ کھوج رہی تھی۔

انہوں نے سیدھا ہو کر اسے دیکھا۔

"اور کیا کچھ نہیں۔ کیا کوئی خاص بات کرنا تھی اسے مجھ سے۔" وہ الٹا اس سے پوچھ رہی تھیں۔ اس نے گڑبڑا کر گہری سانس لی۔

"مجھے کیا پتا۔ میں تو خود آپ سے پوچھ رہی ہوں۔" وہ ذرا اکھڑی ہوئی۔

"تو تمہیں اتنی کھد بد ہو گی ہے۔ میں سمجھی کوئی ہو گی کوئی بات۔" وہ کان پر سے مکھی اڑا کر پھر سے مشین پر جھک چکی تھیں۔

وہ الجھن بھرے انداز میں دھیرے سے اٹھی۔

"اتنی جلدی کیوں چلا گیا اور وہ بھی مجھ سے ملے بغیر۔" امی نے کن انکھیوں سے اسے جاتے دیکھا۔ پھر پکار بیٹھیں۔ "سن!"

وہ یوں ہی بے خیالی میں چلتی ان تک آگئی تھی۔

"ذرا یہ سوئی میں دھاگا تو ڈال دے۔" انہوں نے بہت دھیان سے اس کا چہرہ دیکھا تھا۔

☼ ☼ ☼

زریاب جانتا تھا' آمنہ اسے پسند کرتی ہے مگر اپنے لیے نہیں' اپنی چھوٹی بہن کے لیے۔

آمنہ اس کی بہت اچھی دوست تھی اور محض ایک کولیگ سے دوست اور پھر بہت اچھی پاس سے اچھی دوست بننے کے لیے زیادہ تر کوشش خود آمنہ نے ہی کی تھی۔ وہ آفس میں شروع سے ہی لیے دیے انداز میں رہتا تھا۔ آمنہ نے خود ہی آگے بڑھ کر کئی دفعہ زیادہ کام کا بوجھ اس کے سر سے اپنے کندھوں پر لیا۔ خوش اخلاق تو وہ تھا لیکن اتنا فری کسی سے نہیں ہوتا تھا کہ غلطی سے بھی کسی کو اس کے ماضی میں جھانکنے یا ذاتیات میں دخل اندازی کا موقع مل سکے۔

ایسے میں آمنہ کی بے تکلفی کو اس کی دلچسپی سمجھ کر وہ اس سے کھنچا کھنچا ہی رہتا تھا۔ لیکن ایک دن آمنہ نے خود ہی اسے بتادیا کہ اس کی خاندان میں کہیں بات طے ہو چکی ہے اور اس کا فیانسی چند سال کے لیے ملک سے باہر گیا ہے۔ اس کی واپسی پر شادی ہو گی یا پھر وہ بھی باہر چلی جائے گی۔

غلط فہمی کے بادل چھٹنے کے ساتھ ہی ان کی آپس کی بے تکلفی بڑھنے لگی اور ایک اچھی دوستی میں بدل گئی۔ وہ خود بھی کئی سال اکیلے پن کا عذاب جھیلتے

جھیلتے تھک چکا تھا۔ مسز رباب کی حیثیت اس کے لیے بالکل ایک مالک یا محسن کی سی تھی۔ ان سے دوستی یا اتنی بے تکلفی کا سوچا بھی نہیں جاسکتا تھا۔ عمروں کا فرق بھی ایک واضح پہلو تھا۔

ایسے میں آمنہ کی بے غرض دوستی کو اس نے نعمت خداوندی کی طرح قبول کیا۔ مگر اپنے ماضی کے بارے میں بتانے کی غلطی بہرحال نہیں کی۔

آمنہ اس کی بہنوں سے مل چکی تھی۔ جس دن زریاب کی پروموشن ہوئی اور وہ آمنہ کے سینیئرز میں شامل ہوا۔ اس دن آمنہ کو اسے اپنا بہنوئی بنانے کا انوکھا خیال سوجھا۔ اس نے نہ صرف فوراً" ہی اپنے گھر میں بھی ذکر کردیا' بلکہ زریاب کو بھی اپنا ہم خیال بنانے میں دیر نہیں کی۔ اسے اپنی اور زریاب کی دوستی پر بہت بھروسا تھا۔

اسے یقین تھا' زریاب اس کی بات سے کبھی انکار نہیں کرے گا۔ لیکن ایسا ہو نہیں سکا۔ زریاب نے نہ صرف پہلی بار سنتے ہی معذرت کرلی تھی۔ بلکہ اسے آئندہ بھی اس قسم کی کوئی بات کرنے سے منع کردیا تھا۔ اس کا لہجہ اتنا سخت اور بے لچک تھا کہ آمنہ اس سے وجہ تک نہ پوچھ سکی۔ بہرحال اسے اپنی حدود کا اندازہ ضرور ہو گیا تھا۔

☼ ☼ ☼

"تم اچھی طرح سوچ لو۔" کمرے کے سناٹے میں ان کی نرم اور پر خلوص آواز گونج رہی تھی۔

اتنے دن سے اس کا چیخنا' چلانا' مزاحمت احتجاج اور بھوک ہڑتال سب بے کار گیا تھا۔ وہ جان چکی تھی کہ بظاہر سب جیسے نظر آرہے تھے ویسے تھے نہیں۔ نہ اتنے رحم دل' نہ پر خلوص' نہ سچے' نہ سیدھے اور نہ ہی شریف۔

"حالانکہ میں اتنا ٹائم ضائع کرنے کے حق میں نہیں۔ لیکن صرف تم کو سنبھلنے کے لیے وقت دینا چاہتی ہوں۔ کیونکہ راستہ بہرحال ایک ہی ہے اور تمہارے سامنے ہے۔" خاموشی کے وقفے میں اس کی دم توڑتی سسکیاں ابھر آتی تھیں۔

"فیصلہ تمہیں وہی کرنا ہے' جو ہم نے کروانا ہے' جلد یا بدیر اور ہو سکتا ہے' زیادہ دیر لگنے پر ہمیں تم پر اپنا فیصلہ ٹھونسنا پڑے۔ میں ایسا نہیں چاہتی۔ مجھے زور زبردستی اور تشدد پسند نہیں ہے۔ بہتر ہو گا تم خود ہی اپنے لیے بہتر فیصلہ کرلو۔ بھول جاؤ تمہارا کوئی ماضی تھا۔ تمہارا کوئی گھر تھا۔ شوہر تھا۔ یوں سمجھو وہ بدحال اور بدکردار آدمی اور وہ غربت بھری زندگی جو تم نے شادی سے پہلے گزاری' سب ایک بھیانک خواب تھا۔" وہ بہت چل فریبی سے لفاظی کا سنہرا جال اس کے گرد بن رہی تھیں۔

"اور خوابوں کی حقیقت ہی کیا ہے۔ آنکھ کھلی اور خواب ختم۔ بعض اوقات تو یاد بھی نہیں رہتا کہ۔" ان کی بات ادھوری رہ گئی۔ وہ تیزی سے اٹھ کر ان کے قدموں میں بیٹھ چکی تھی۔

"خدا رسول کا واسطہ ہے۔ اگر تمہاری کوئی اولاد ہے۔ کوئی بیٹی ہے یا تم خود کسی کی بیٹی ہو تو واسطہ ہے تمہیں اس رشتے کا۔ مجھے جانے دو۔ میں یہاں نہیں رہ سکتی۔ میں کسی کو کچھ نہیں بتاؤں گی۔ مجھے جانے دو۔ میں وہ سب نہیں کرسکتی جو تم چاہتی ہو' خدا کے لیے۔" وہ ان کے پیر پکڑے بلک رہی تھی۔

مسز رباب کے لیے یہ التجائیں' یہ منتیں کوئی نئی نہیں تھیں۔ کتنی ہی لڑکیاں ان کے پیروں میں گر کر ان کے قدموں میں سر رکھ کر گڑگڑائی تھیں۔ وہ نہ تو پہلی لڑکی تھی' نہ آخری۔ انہوں نے دھیرے سے اپنے پیر پیچھے کیے۔

"بے کار میں وقت ضائع کررہی ہو۔ اتنا کیوں رو رہی ہو میری جان۔" انہوں نے اس کی ٹھوڑی اونچی کرکے اس کا سرخ چہرہ دیکھا۔ "دیکھو کیا حال کرلیا ہے اور اگر میں تمہیں جانے بھی دوں تو تم جاؤں گی کہاں ہم م م۔"

وہ بہ شور سسک رہی تھی۔

"اٹھو۔ اٹھو۔" بے مثال ہمدردانہ اداکاری کے جوہر دکھاتے ہوئے انہوں نے اسے بستر پر بٹھادیا۔ "تم

اپنے گھر نہیں جا سکتیں چندا۔ کیونکہ اب تک تو تمہارا وہ نام نہاد خاوند تمہیں کسی فارن کنٹری میں مار چکا ہوگا۔ کوئی بھی ریزن دے کر۔ بلکہ اب تک تو تمہاری تدفین بھی ہو گئی ہوگی۔ کسی ایسے قبرستان میں جہاں تمہاری وہ دے کی مریضہ بوڑھی ماں بھی نہیں پہنچ سکتی۔ ایک ایسی قبر میں جس کا سرے سے کوئی وجود ہی نہیں اور جس کا کتبہ تمہارا کوئی نام لیوا بھی نہیں پڑھ سکتا۔" اس کا چہرہ دیکھ کر انہوں نے زوردار قہقہہ لگایا۔

وہ حیرت کی انتہا سے انہیں دیکھ رہی تھی۔ اس سے وہ نعیمہ کو بالکل اس خون آشام ڈائن کی طرح لگیں۔ جو اپنے نوکیلے پنجوں سے اس کا وجود کھونٹے اور لمبے دانتوں سے خون پینے کے لیے بالکل تیار بیٹھی ہو۔

"ان کے لیے تم مر چکی ہو ڈارلنگ! وہ تمہاری ان دیکھی موت پر رو دھو کر صبر کر چکے ہوں گے۔ بلکہ اب تک تو وہ تمہارے قل کے چنے بھی بانٹ چکے ہوں گے۔" وہ ایک بار پھر سے قہقہہ لگا رہی تھیں۔ نعیمہ نے بے حد نفرت سے ان کا مکروہ چہرہ دیکھا۔ ایک لمحے کو اس کا دل چاہا کہ ان کا خوب صورت چہرہ اپنے ناخنوں سے نوچ کر اتنا بھیانک کر دے کہ کوئی پہچان نہ سکے۔ لیکن وہ جانتی تھی' وہ ایسا نہیں کر سکتی۔ کم سے کم انہیں دھکا دے کر یہاں سے نکل ہی بھاگے مگر ایسا بھی ممکن نہ تھا۔

اسے اپنے کمرے سے لے کر بیرونی دروازے تک کا راستہ بھی ٹھیک سے معلوم نہ تھا اور فاصلہ کتنا تھا' یہ بھی معلوم نہ تھا۔ پتا ہوتا تو بھی کوئی فائدہ نہ تھا۔ کیونکہ اس محل کی ملکہ کے پالے ہوئے دیو ہیکل باڈی گارڈز اور ڈھیروں ملازم "ایک پل" میں اسے چت کر سکتے تھے۔

"ایک پل" میں وہ ممکنات کا سفر دور تک طے کر گئی تھی۔

بلکہ۔ بلکہ وہ تو۔

اس نے عورت کے اشاروں پر چلتے ہوئے اس کے ساتھ چلو بھی۔

آگے سوچنے کی اس کی ہمت نہیں تھی۔ اسے پورے جسم کے رونگٹے کھڑے محسوس ہوئے۔

☼ ☼ ☼

فضا میں سوگواری کی باس کے ساتھ اگربتیوں کی خوشبو گھل مل رہی تھی۔ گھر کے اکلوتے کمرے میں بچھی چاندنی پر دس' بارہ عورتیں بیٹھی سیپارے پڑھ رہی تھیں۔ ایک کونے میں سلمیٰ بیگم رشنا کی بانہوں میں سمٹی سسک رہی تھیں۔ پر ذرا دیر کے بعد وہ بے قابو ہو کر پچھاڑیں کھانے لگتیں۔

"نمو۔ میری نمو ہائے کہاں چلی گئی تو نمو۔"

ایسے میں رندھے گلے سے انہیں صبر کی تلقین کرتی رشنا کو خود بھی یقین نہیں آرہا تھا کہ نمو اب اس دنیا میں نہیں رہی۔

"امی! آپ کی طبیعت خراب ہو جائے گی' پلیز سنبھالیں خود کو۔" دائیں طرف بیٹھی عظمت بوا دلاسا دینے میں ناکام تھیں۔ خبر ہی اتنی غیر متوقع اور اندوہناک۔ عورتیں ترحم بھرے انداز میں بین کرتی سلمیٰ بیگم کو دیکھتیں اور پلکیں صاف کر کے پھر سے سیپارہ پڑھنے لگتیں۔

"اپنے آپ کو سنبھالیں۔ اللہ سے اس کے ایصال ثواب کی دعا کریں۔ بلکہ اللہ اسے سکون دے۔" وہ خود بری طرح بکھر چکی تھی۔ اسے خود بھی اندازہ نہیں تھا' وہ اندر سے کتنی کمزور ہو چکی ہے۔

کل جب پڑوس میں بابر سلطان کے فون کی خبر آئی تو اس کے بھی وہم و گمان میں نہ تھا' وہ اسے کیا خبر سنانے والا ہے۔ اپنے اندازوں کی آخری حد پر جا کے بھی وہ نمو کی موت کے بارے میں تو کبھی نہیں سوچ سکتی تھی۔

"لیکن اتنی اچانک کیسے؟" صدمے کے مارے اس کے منہ سے ڈھنگ سے بات بھی نہ نکل سکی تھی۔

"بس خدا جب بلائے تو بندے تو کچھ نہیں کر سکتے نا۔" پتا نہیں وہ کون تھا۔ بابر سلطان سے اس کا کیا رشتہ تھا۔

"بہت برا ایکسیڈنٹ تھا جی۔ بھابھی جی تو بچائی نہیں جا رہی تھیں۔ بابر بھائی کی حالت بھی نازک ہے۔ یہیں دبئی کے اسپتال میں ایڈمٹ ہیں۔ آپ دعا کیجیے گا جی۔ اللہ انہیں بہتر کرے اور بھابھی جی کی مغفرت کرے۔ ڈیڈ باڈی کی حالت بہت خراب تھی۔ پاکستان بھجوانے کا ٹائم نہیں تھا۔ اس لیے یہیں تدفین کروا رہے ہیں۔" فون کرنے والا خود بھی سوگوار تھا۔

اس کی اپنی حالت تو دیدنی تھی۔ فون بند کرنے کے بعد وہ وہیں اتنا بکھر کے روئی تھی کہ سنبھالنا مشکل ہو گیا تھا۔ سلمیٰ بیگم تو پھر ماں تھیں۔ ان سے صبر کی امید رکھنا بے وقوفی ہی تھی۔

"بے چاری کی ایک ہی تو اولاد تھی' وہ بھی گئی۔"

"بے سوچے سمجھے' پیسے کی لالچ میں "انجان لوگوں میں بیاہ دی۔ آخری شکل تک دکھانے نہ لائے۔" اب کیا کرے گی۔

"ارے نجانے کہاں جا کے اس کا آخری ٹھکانہ لکھا تھا۔ دیدار بھی نصیب نہ ہوا۔"

"چچ چچ۔ کوئی لڑکا ہی ہوتا بڑھاپے کا سہارا۔" ایصال ثواب اور تعزیت کے لیے آئی تمام عورتوں کو ان سے ہمدردی تھی مگر اپنے انداز میں۔

☼ ☼ ☼

"آفس سے واپسی پر مجھے مارکیٹ لے چلو گے۔" آنمہ اس کے آفس میں بیٹھی تھی۔

"کیوں۔ میرا ساتھ جانا ضروری ہے کیا؟"

"نہیں بس بے عزتی کروانے کا موڈ ہو رہا تھا اس لیے آ گئی۔" کمپیوٹر اسکرین پر نگاہیں جمائے وہ مسکرا رہا تھا۔

"اوفوہ۔ اس موڈ کو ذرا سنبھال کے رکھیں ابھی سے فرمائشیں۔ "اف اب تمہاری انسلٹ کر کیا میں اچھا لگوں گا۔"

"اب تو کر دی نا اب کیا۔" وہ روٹھی روٹھی سی تھی۔

"اوفوہ آج کچھ زیادہ ہی نخرہ دکھایا جا رہا ہے۔"

"تمہارے اوپر اٹھانے کی پابندی نہیں ہے۔"

"ہاں پابندی تو نہیں' مگر پھر بھی اب کیا میں اپنی اکلوتی دوست کے نخرے بھی نہیں اٹھا سکتا کیا۔" وہ چپ رہی۔

"ابھی چلیں۔" اس کا چہرہ کھل اٹھا۔

"اللہ زریاب ابھی۔ چلو چلو مجھے کیا اعتراض ہوگا۔"

"تمہارا کام ہو گیا۔"

"ہاں۔ ہاں بالکل فنش۔ میں ابھی بیگ لے کر آتی ہوں۔" وہ خوش ہو گئی۔ لیکن زریاب کی ساری

خوشی پر پانی پھر گیا جب اسے پتا چلا کہ وہ لائبہ کی برتھ ڈے کے لیے گفٹ لینے آئی ہے۔

اس کی دلچسپی ختم ہو چکی تھی۔ وہ بے دلی سے ہوں ہاں کرتا رہا۔ بلکہ بے مروتی کی انتہا کرتے ہوئے اس نے خود سے کوئی بھی گفٹ لینے سے انکار کر دیا اور یہ بھی جتا دیا کہ ہو سکتا ہے وہ اس پارٹی میں شریک نہ ہو سکے۔

آئمہ اس کا گریز جانتی تھی۔ وہ خود آئمہ کی خواہش سے لاعلم نہ تھا۔ مگر نہ جانے کیوں وہ دوبارہ بھی آئمہ سے کہہ نہیں سکا کہ وہ لائبہ کا ذکر اس کے سامنے اس لیے کرتی ہے کہ وہ بھی نہ کبھی اس کی طرف متوجہ ہو جائے گا تو یہ کوشش فضول ہے۔ نہ ہی آئمہ نے اپنی کوشش ترک کی۔ وہ پرامید تھی کہ کبھی نہ کبھی زریاب کو لائبہ کا نصیب بنا ہی دے گی۔

وہ بہت اچھا انسان تھا۔ آئمہ کا دوست تھا اور آئمہ اسے کھونا نہیں چاہتی تھی۔

☼ ☼ ☼

"ایک تو اسے اردو نہیں آتی۔" مسز رباب اس سے پریشان تھیں۔

"سکینہ! تم اسے سکھانے کی کوشش کرو اگر اسے اردو تھوڑی سی آجائے تو اچھا ہے۔" وہ سامنے بیٹھی شائل کو بے زار نظروں سے دیکھ رہی تھیں۔

"یہ زریاب بھی کیا چیز اٹھا کے لایا ہے۔" بات نہ سمجھ پانے کے باعث وہ یہاں کے دوسرے ملازمین کے لیے مسئلہ بن رہی تھی۔

"اچھا۔ وہ ہے نا مشعل۔" وہ کچھ سوچ کر سکینہ سے مخاطب ہوئیں۔ "اسے اس کے پاس لے جاؤ، کہنا کہ اسے سندھی آتی ہے۔ اردو سکھا دو۔ تھوڑی بہت تو یہ بھی بول ہی لیتی ہے۔ رواں ہو جائے تو اچھا ہے۔" انہوں نے اپنے ڈرائیور کا ذکر کیا۔

ملازمہ سر ہلاتی اسے لے کر چلی گئی۔

"اب میرے کرنے کو کوئی کام نہیں بچا، جو میں یہ کھڑاگ سمیٹوں بیٹھ کر۔" بے زاری سے بڑبڑاتی ہوئی وہ سیل پر کوئی نمبر ملانے لگی تھیں۔

☼ ☼ ☼

"بوا! آج مت جائیں نا۔ یہیں رک جائیں میرے پاس۔" وہ بہت منت سے بول رہی تھی۔

آج تیسرا دن تھا اسے بوا سے یہی فرمائش کرتے ہوئے پتا نہیں وہ اتنی خوف زدہ کیوں تھی۔

"کب تک رکی رہوں گی یہاں، وہاں گھر پر بھی میرا انتظار ہو رہا ہو گا۔"

"نہیں میری مجبوری جانیں، مجھے ڈر لگ رہا ہے۔"

"ارے ڈر کیسا۔ تو اکیلی کہاں ہے۔ وہ تیری ماں ہے نا۔" بوا کی تسلی کتنی بودی تھی۔ وہ خود بھی جانتی تھیں۔ جب ہی ان کا لہجہ کمزور تھا۔ اس نے ذرا کی ذرا گردن موڑ کر زندہ لاش کی مانند پڑی اپنی ماں کو دیکھا۔

"اچھا صرف آج۔"

"آج نہیں تو کل۔ مجھے جانا تو ہو گا نا۔ اصغر گھر سے نکل گیا ہے۔ [illegible] والا ہو گا۔" بوا نظریں چرا کر بول رہی تھیں۔ اس کے ہاتھ ڈھیلے پڑ گئے۔ پھر اس سے کچھ کہا نہیں گیا۔

☼ ☼ ☼

زندگی کرنے کے باقی سب ہی راستے مسدود ہو چکے تھے۔

صرف ایک راستہ کھلا تھا۔ گناہ کا "غلیظ گندگی میں لتھڑا راستہ" اور اسے اس گندگی میں اترنا ہی تھا۔ گردن تک یا پھر شاید سر تک۔ بہت مشکل تھا اس کے لیے اپنے آپ کو اس راستے پر آمادہ کرنا۔ لیکن مسز رباب کو اس مشکل کو آسان بنانا آتا تھا۔ بہت اچھی طرح۔ دیر سے ہی سہی، لیکن اپنے خوب صورت چہرے پر سے دوستانہ نقاب اتار کر وہ ایک بار پھر اس کے روبرو تھیں۔

"دیکھو میں آخری بار پوچھنے آئی ہوں تم سے۔"

"میرا جواب یہ ہے۔ آپ کو میں۔"

اس کی بات ادھوری رہ گئی۔ وہ خائف تھی۔ اس کی بات میں انکار تھا۔ مگر لہجے میں دم نہیں۔

"میں نے سوچا شاید تم نے اپنا فیصلہ بدل لیا ہو۔"

وہ چپ رہی۔

"کیوں خود سے دشمنی پر اتر آئی ہو تم؟" انہوں نے اپنے تئیں اسے سمجھانے کی آخری کوشش کی۔ پھر دروازے سے کسی کو آواز دی۔

"مشعل۔ او مشعل۔"

چند لمحوں بعد دروازے سے دیو ہیکل، ڈراؤنا چہرہ نمودار ہوا۔ جس کی نوک دار مونچھیں بڑھ کے اس کے کانوں کی لوئیں چھو رہی تھیں۔ موٹی موٹی آنکھوں میں سرخ ڈورے تھے اور نظریں درندوں کی طرح اس کے وجود پر چپک رہی تھیں۔

"لو بھئی مشعل! سنبھالو اب خود ہی۔" وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے ان دونوں کو دیکھتی سرہانے سے چپٹ سی گئی تھی۔ مسز رباب ترحم آمیز نظروں سے اسے دیکھتی اٹھیں اور دروازہ بند کرتی باہر نکل گئیں۔

☼ ☼ ☼

دن ایک دوسرے کے پیچھے بھاگتے کٹتے آگے نکل گئے تھے۔

شائل اردو بولنا سیکھ رہی تھی۔ اسے کپڑے پہننے کی تمیز بھی آگئی تھی اور وہ محنتی بھی بہت تھی۔

مشعل سے نعیمہ کی دھجیاں اڑوانے کے بعد اسے راستے پر لگانا بہت سہل ثابت ہوا۔ اس کے اندر یقیناً کسی مشعل کو دوبارہ برداشت کرنے کی ہمت نہیں بچی تھی۔

ایک ہفتے تک اس کے چہرے پر دردناک سوجن چڑھی رہی۔ جسم کا ایک ایک انگ دکھتا رہا۔ ٹوٹے ناخنوں کی کھرونچوں سے خون رستا رہا۔ جبڑے اپنی جگہوں سے جیسے ہل گئے تھے۔ ناخن اکھڑ چکے تھے اور سر کے پچھلے حصے میں کئی جگہوں پر درد کا احساس ابھی تک باقی تھا۔

دو دن تک تو وہ بستر پر کروٹیں بدلنے کے لیے بھی دوسروں کی محتاج رہی تھی اور ایک ہفتے بعد جب اس کے جسم اور چہرے کی نیلاہٹیں ہلکی زردی میں بدل چکی تھیں، تو وہ ایک بار پھر اس کے کمرے میں موجود تھیں۔

اس بار صرف وہ بولتی رہیں۔ اس نے جواب میں کچھ کہنے کی ضرورت نہیں سمجھی۔ بس نفرت آمیز نظروں سے انہیں دیکھتی رہی۔

"کل آئے گی رات میں۔ اچھی طرح ڈریس اپ ہو جانا۔ میں سوٹ اور جیولری بھجوا دوں گی۔" وہ فیصلہ کن انداز میں کہہ کر دروازے کی طرف بڑھیں۔ پھر کچھ سوچ کر اس تک پلٹ آئیں۔

"بے فکر رہو میری جان۔ آج رات تمہارا سامنا مشعل جیسے کسی وحشی سے نہیں ہو گا۔" وہ مسکرا کر اس کی ٹھوڑی چھو کر بولیں۔

"اور اگر آئندہ بھی میرے کہنے پر چلتی رہیں تو میں تمہارا خاص خیال رکھوں گی۔" اس نے نفرت سے ان کا ہاتھ جھٹک دیا۔ وہ ہنستی ہوئی باہر نکل گئیں۔

☼ ☼ ☼

ڈوبتے سورج کی شعاعوں کا عکس ہمیشہ پانیوں میں بھی نارنجی رنگ گھول رہا تھا وہ کراچی آتا تو اکثر یہیں آتا تھا۔ لیکن اسے کراچی آنا نہیں تھا۔ اسے کوئی کام نہیں تھا۔ مگر پھر بھی وہ یہاں آگیا تھا۔

وہ خود بھی بے خبر تھا۔ اپنے مستقبل سے لاعلم۔ حال سے انجان صرف ماضی کے سیاہ اوراق پلٹتا۔ ان گلیوں میں ان یادوں میں ڈوبتا ابھرتا رہتا۔ ان گلیوں میں بھٹکتا رہتا۔

جہاں اس کا شرارتی بچپن، امنگوں بھرا لڑکپن اور خوابوں سے سجی جوانی گزری تھی۔ شوریدہ سر لہریں اس کے شکستہ قدموں سے ٹکرا کر پلٹتی رہیں۔ جھکے کندھوں کے ساتھ رک رک کے قدم سے ساحلوں کی تنہائی بانٹتا رہا۔ کبھی کبھی کوئی آواز اس کے قدم تھام لیتی۔

"وہ تمہاری بہن ہے، رضاعی بہن۔ تم نے اس کے بارے میں سوچا بھی کیسے۔"

ساعتوں میں ٹوٹے کانچ چبھتے رہے۔ پگھلا سیسہ انڈیلتے سفاک الفاظ بپھری ہوئی موجوں کا شور شرابا جیسے کراس تک پہنچتے رہے۔

جلتی آنکھوں کے سرخ ڈورے گہرے ہوتے رہے۔ ناکام تھکے ماندے قدم جوتے کی نوک سے پتھر اڑاتے رہے۔

☼ ☼ ☼

صبح ہوتی ہے شام ہوتی ہے
عمر یوں ہی تمام ہوتی ہے

صبح اسکول' دوپہر میں گھر کے کام اور شام میں ٹیوشنز کی لگی بندھی روٹین پر وہ کسی روبوٹ کی طرح چلتی تھی۔ ایک سپاٹ تاثر ہمہ وقت چہرے پر جما بیٹھا رہتا تھا۔ بے رنگ آنکھیں اب کسی بات پر جگمگاتی نہیں تھیں۔ اسے پہلی تنخواہ کا بہت انتظار تھا۔ اس کی بہت سی خواہشیں اس پہلی تنخواہ سے جڑی تھیں۔ مگر ہوا کیا۔

اس نے وہ تنخواہ وہاں خرچ کی جہاں کا گمان بھی نہ تھا۔

دو کلو چاولوں کی تھیلی پکا کر نیمہ کے ایصال ثواب کے لیے مسجد اور محلے میں بھجوائی۔ قرآن خوانی کا اہتمام کیا اور اس کے لیے منگائی گئی چاندنیوں اور پانی کی ٹنکی کا کرایہ دیا۔ قرآن خوانی کے بعد چائے میں ڈالا جانے والا دودھ اور بسکٹ اور سموسے۔

گو کہ کسی کے انتقال پر ملال پر آنے والی خواتین کا کھانا پینا کوئی ایسا ضروری امر نہ تھا۔ لیکن جہاں اہتمام کے ساتھ دیگیں پکوائی جاتی ہوں اور دونوں ٹائم بریانی خوشبوئیں لٹاتی ہو وہاں اس غربت میں اتنا اہتمام بھی اس کے لیے بہت داد و ستائش کا باعث بنا۔ گو کہ اس کی یہ نیت نہ تھی۔ مگر وہاں کی ریت تو تھی۔

اور تیسرے دن کے بعد سے وہ جیسے پتھر کی ہو گئی۔

زریاب کے بچھڑ جانے کے بعد اس میں کسی اور کی جدائی سہنے کی طاقت نہیں بچی تھی اور وہ بھی دائمی جدائی۔ نمو جیسی بھی تھی اور اس کے ساتھ جو بھی کر کے گئی تھی' تھی تو اس کی بہن ہی نا۔ وہ زندگی میں بے شمار بار اس کے ساتھ مل کر ہنسی تھی' روئی تھی۔ نمو اس کی محبت سے واقف نہ تھی۔ لیکن اس کو تو نمو کے دل کا حال پتا تھا اور پھر جب نمو کی شادی ہوئی تو اس نے اس کی دائمی خوشیوں کے لیے صدق دل سے کتنی دعائیں کی تھیں۔

شروع میں دو تین بار جب وہ اس سے ملنے آئی تو ماحول میں ایک واضح فرق کے باوجود کتنی خوش تھی۔

"برائیاں کس میں نہیں ہوتیں روشی' پر میرے میاں دوسرے آدمیوں سے بہت اچھے ہیں۔ اب کی دیکھ لو کہ ایک بار کہا کہ چوڑے اچھے لگتے ہیں۔ اب ہر بار کہیں باہر نکلوں تو کلائیاں کبھی خالی نہیں ہوتیں۔"

اس کی شوخ زندہ آواز ابھی کانوں میں آباد تھی۔ مگر اب وہ آواز دوبارہ کبھی سن نہیں سکوں گی۔

اپنے آپ کو یقین دلاتے دن کے تمام ہی پہر کہیں ادھر ادھر ہو جاتے۔ اداسی میں گھرا سرا اس کے لیے دکھوں بھری شامیں ہی لاتا تھا۔ سورج کی تپش میں ہونے والا معمولی سا اضافہ جہنم کے دروازے جیسا لگتا تھا۔

کبھی آنسو کہیں سے بھولے بھٹکے اس کی آنکھوں کی خشک دہلیز سے نکل آتے تو وہاں کی ویرانیوں میں ان کا بھی جی نہ لگتا اور وہ گرنے سے پہلے ہی انہیں رگڑ ڈالتی۔

☼ ☼ ☼

راتیں جاگ اٹھی تھیں۔

تلخ جام گھونٹ گھونٹ حلق سے اتارنے کے بعد' بے دریغ لنڈھانے کی عادت پڑ گئی۔ میک اپ کی تہوں میں اس کے چہرے پر پڑی اذیت کی دراڑیں چھپ گئیں۔ بڑی سی چادر کی اوٹ سے ڈھکا رہنے والا جسم اب ایک کھلی دعوت عام کا روپ دھار چکا تھا۔ لمبی لمبی گاڑیاں جن کے دروازوں میں لگے آٹو جنگ لاک بھی نہ تو کھولنا اس کے بس کی بات تھی نہ بند کرنا۔ اب وہ ان کی ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھنے کی پریکٹس کر رہی تھی۔

رنگ برنگے لینسز کے پیچھے اس کی التجا کرتی آنکھوں کا رنگ کیا تھا۔ شاید اسے خود بھی یاد نہیں رہا تھا۔

سوکھی اور سانولی کلائیاں' صحت مند ہو کر جتنی پرکشش ہوتی گئیں۔ انہیں تھامنے اور موڑنے والوں کی تعداد میں اتنا ہی اضافہ ہوتا گیا۔

کبھی ایک بڑا سا دوپٹا اوڑھے وہ گھر کے اندر اور باہر کے کتنے کام نمٹا لیتی تھی۔ کوئی مسئلہ نہیں ہوتا تھا اور اب اسے ایک بالشت کا اسکارف سنبھالنا بھی مصیبت تھا۔

"اوفوہ۔" وہ اکثر الجھ کر اسے محفلوں میں صوفے کی پشت پر ڈال کے اٹھانا بھول جاتی۔

نیا نام' نیا چہرہ' نئی شناخت اور نیا شناختی کارڈ' بلکہ شناختی کارڈ اور اب پاسپورٹ بھی۔

"پاکستان میں تمہارے صحیح قدردان نہیں ہیں ڈارلنگ۔ تمہیں تو وہاں ہونا چاہیے۔ جہاں پر ہر کوئی تمہاری شان میں قصیدے پڑھے۔ تمہارے حسن کی دن رات نظر اتارے۔"

"لیکن میں اکیلی نہیں جاؤں گی' آپ کو میرے ساتھ چلنا ہو گا۔" اندر کہیں ان ہی تنگ و تاریک گلیوں میں بسنے والی لڑکی آج بھی چیخ پڑتی تھی۔

"میں کیا کروں گی جا کے' کلام تمہارا ہے' جانا بھی تم ہی کو ہو گا جانی۔" مسز زریاب کی اداسی کا وہی عالم تھا۔

☼ ☼ ☼

اداسی کی راتیں اور جاڑے کی اداسی مل کر راتوں کو کچھ اور بھی تنہا کر دیتے۔ اسے بھی اداسی پورے کمرے میں چکراتی ہوئی لگ رہی تھی۔ آج رسولن بڑی بی بی کے ساتھ ہی کہیں گئی تھی۔ شاید کام والی کی ضرورت تھی۔ اس سے پہلے اس کے کوارٹر میں کبھی رات کو اکیلے رکنے کا اتفاق نہیں ہوا تھا۔

ان کی خادمہ خاص جو اندرونی اور بیرونی معاملات اور دوسرے نوکروں کی نگرانی پر مامور تھی۔ وہ اور اس جیسے دوسرے ملازمین جو نچلے درجے سے ذرا اوپر کہلاتے تھے۔ ان کے کمرے گھر کی سب سے اوپری منزل پر تھے۔ وہ یہاں سرونٹ کوارٹرز میں نہیں رہتے تھے۔

شاہل یہاں آ کے خوش بھی تھی اور مطمئن بھی۔ تیز سرد ہوا سے دروازے کے پٹ پھڑپھڑا رہے تھے۔ اس کو ان آوازوں سے ڈر سا محسوس ہوا۔ نیند آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ وہ گھبرا کے باہر نکل آئی۔ لان کی سائیڈ پر چند ایک لائٹیں جل رہی تھیں۔ اس نے دور کونے میں چوکیدار کی کرسی پر مشعل کو بیٹھے دیکھا شاید آج اس کی گاڑی کی ضرورت نہیں پڑی تھی۔ اس کی انگلیوں کے بیچ جلتی سگریٹ کا شعلہ دہک رہا تھا۔

مشعل بھی اسے دیکھ چکا تھا وہ اٹھ کر تیز قدموں سے اس کی طرف آیا۔

"کیا بات ہے۔" اسے سندھی آتی تھی مگر یہ بڑی بیگم کا حکم تھا کہ اس کو اردو سکھاؤ۔

"میں کو ڈر لگ رہا ہے اور اکیلے۔"

"ارے تو اکیلی ہے۔ رسولن کہاں ہے؟"

"وہ گئی بی بی کے ساتھ۔" وہ ابھی بھی بولتے ہوئے اٹک جاتی تھی۔ اسے بتاتے وقت اندازہ نہیں تھا کہ بی بی کے ساتھ رسولن نہیں باقی لڑکیاں بھی جا چکی ہیں۔ گھر پر چند ایک ملازمین کے سوا کوئی نہیں۔ جو ہیں بھی تو اوپری منزل پر' سردی کی شدت سے کمروں میں دبکے آرام سے سو چکے ہیں۔ لیکن مشعل۔

وہ یہ بات اچھی طرح جانتا تھا اور یہ بھی جانتا تھا کہ یہ رات شاہل کی خوشی اور اطمینان کی آخری رات ہے۔

☼ ☼ ☼

آفس کی سرگرمیاں معمول کے مطابق جاری و ساری تھیں۔

"مجھے کل کراچی جانا ہے۔" آفس ٹائم ختم ہونے کے بعد اس نے آئمہ کو اطلاع دی تھی۔ "ایک پارٹی میں شرکت کرنی ہے۔ تم بھی چلو۔"

"میں انویٹیشن کے بغیر کہیں نہیں جاتی۔ تم

انجوائے کرو۔"

آمنہ بیگم رباب بختیار کو صرف اس کی آنٹی کی حیثیت سے جانتی تھی۔ یہ بھی ان ہی کی ہدایت تھی کہ وہ اپنے اور ان کے تعلقات کا زیادہ چرچا نہ کرے۔ خاص طور پر اس نئی جگہ جو کہ ایک این جی او تھی۔

"زریاب! سنو۔" وہ مڑتے مڑتے رک کر اسے دیکھنے لگا۔

"پلیز اپنی صحت کا خیال رکھا کرو۔ تم بہت کمزور ہوتے جا رہے ہو۔"

اس قدر غیر متوقع بات پر اس نے چند لمحے اس کی آنکھوں میں جھانکا، پھر دھیرے سے مسکرا کر آگے بڑھ گیا۔ آمنہ دیر تک وہیں کھڑی اسے جاتا ہوا دیکھتی رہی۔



اس طرح کے فنکشنز میں مسز رباب اسے انوائٹ نہیں کرتی تھیں، مگر اس بار ان کا موڈ ہی کچھ اور تھا۔

ایک بہت بڑی بزنس ڈیل جو پچھلے کئی مہینوں سے مختلف مسائل اور رکاوٹوں کا شکار تھی۔ اسی مہینے فائنل ہوئی تھی۔ آرڈر اتنا بڑا تھا کہ ان کے بزنس کو اس آرڈر کی تکمیل کے ساتھ ہی ایک بہت بڑا بریک ملنے والا تھا۔

وہ بے انتہا خوش تھیں۔ اسی لیے پارٹی میں زریاب کو آتے دیکھ کر بے اختیار اس کی طرف بڑھ کے اس کے گال سے گال ملا کر اپنی گرم جوشی کا اظہار کر گئیں۔ ورنہ اس کے سامنے وہ بہت سنبھل کے بہت احتیاط سے رہتی تھیں۔

"کیا بات ہے آنٹی! آج تو آپ بہت زبردست لگ رہی ہیں۔" اس نے بھی ذرا بے تکلف انداز میں تعریف کر ڈالی۔ بلیک جارجٹ کی ساڑھی میں ان کا تقریباً "ٹاپ لیس بلاؤز" نہیں بہت ہی بولڈ بنا رہا تھا۔

"او ہو تھینک یو ڈیئر۔" انہوں نے ایک ناز سے مسکرا کے اس کے کاندھوں پر مکا جڑ دیا۔ "تم نے مجھے کبھی فل فارم میں دیکھا ہی کہاں ہے۔" اب وہ ذرا فخریہ انداز میں کہہ رہی تھیں۔ "آؤ میں تمہیں اپنے سرکل کے دوسرے لوگوں سے ملواؤں۔"

وہ بہت اسٹائل سے اس کے بازو میں ہاتھ ڈال کے آگے بڑھ گئیں۔

ان کا حلقہ احباب بہت وسیع تھا۔

طرح طرح کے لوگ، بزنس مین، بیورو کریٹس اور سرکاری عہدے داران شامل تھے۔ ابھی وہ ان سے مل کر ٹھیک طرح سے مرعوب ہو بھی نہیں پایا تھا کہ روشنیوں سے چمکتے ہال کے ایک کونے میں اس کی نگاہ پڑی اور بھٹکو ہیں جم کے رہ گئی۔

وہ اگر وہ نہیں تھی تب وہ ماضی میں بھی جانتا تھا۔ تب بھی اس سے غضب کی مشابہت رکھتی تھی۔

"کیا اتنا بھی کوئی شکل و صورت میں کسی سے مل سکتا ہے۔" اس کا لباس اور انداز چیخ چیخ کر زبان خود بتا رہے تھے کہ سماج کے کس گھٹیا طبقے سے اس کا تعلق ہے۔ وہ یقین کر کے بھی یقین نہیں کرنا چاہتا تھا۔ وہ دو تین مردوں کے نرغے میں کھڑی۔ بلند و بانگ قہقہے لگاتی بے باک عورت۔

"منیب۔" اس کے لبوں کی جنبش سے ادا ہونے والا لفظ اتنا ہی بے یقین تھا۔ جتنا وہ خود۔

"نہیں وہ یہاں کہاں۔" انتہائی سرسری انداز میں سر جھٹک کر بھی وہ بے اختیار اس کی طرف بڑھتے قدموں کو روک نہیں سکا تھا۔

"زریاب!" کسی جاننے والے نے اسے روک کر کوئی بات کی، لیکن اس کا دھیان اسی لڑکی کی سمت تھا۔ وہ اسے دیکھ کر اپنی جگہ جم سی گئی تھی۔

وہ کہنے والے سے معذرت کرتا دو قدم آگے بڑھا اور اس نے اس کو دو قدم پیچھے ہٹتے دیکھا۔ اس کے چہرے پر اتنا خوف تھا۔ جتنا زریاب کے چہرے پر بے یقینی۔

زریاب کے قدموں میں تیزی آئی اور اس نے اس سے بھی زیادہ تیزی سے اس لڑکی کو پلٹ کر ہال سے باہر جاتے دیکھا۔

اماوس کی تاریکی کچھ اور بھی بڑھ گئی تھی اور اس کی ہولناکی اس کی باقی ماندہ زندگی نگلنے کو تیار بیٹھی تھی۔ کوئی بھی تو والی وارث نہ تھا اس کا اس بڑے سارے شہر میں وہ اس پاک ذات کے بھروسے ہی تو آئی تھی۔ اس پر گزرنے والے حادثے کا علم رسولن کو ہو چکا تھا۔

فضا میں بلند ہوتی اذانوں کی آوازیں سنتی وہ بکھرے ہوئے کواڑ کو دھکیلتی اندر آئی تو چارپائی پر پڑا شاپل کا بے بس وجود اپنے اوپر گزری داستان کا بزبان خود گواہ تھا۔

"ہائے میں مر گئی۔" اس نے زور سے سینے پر دو ہتڑ مارے اور بیگم کو بتانے بھاگی۔ یہ کوئی ڈھکی چھپی واردات نہیں تھی۔ سب جانتے تھے یہ مشہل کا کارنامہ ہے۔ گھر میں اس رات اس کے سوا کوئی نہ تھا۔

مسز رباب بذات خود چل کر اس کے کوارٹر تک آئیں اس کی حالت دیکھی اور تسلی دی تھی کہ وہ مشہل سے خود جواب دہی کریں گی۔

اس محل نما گھر میں بسنے والے ملازمین ان پڑھ تھے یا جاہل مگر پاگل یا بے وقوف ہرگز نہ تھے۔ سب ہی دیکھتے تھے کہ مشہل اس آوارگی کے ساتھ گھر کے اندر باہر آتا جاتا تھا جو بیگم رباب کی طرف سے اسے خاص طور پر ملی ہوئی تھی۔ کوئی بھی نہ تو بیگم رباب سے سوال کر سکتا تھا۔ نہ ہی ان کے ڈر کی وجہ سے مشہل کی طرف انگلی اٹھا سکتا تھا۔

"تمہارا دماغ ٹھیک ہے مشہل! اس لیے اتنی آزادی دی میں نے تم کو۔ اس دن کے لیے۔" معمولی سی سہی لیکن تشویش تو مسز رباب کو بھی تھی کہ آنے والی نئی ملازمہ کے پیچھے زریاب کا حوالہ جڑا تھا۔

"خدا نہ کرے اگر لانے والے کو اس کی خبر گیری کا خیال آ گیا تو کیا جواب دوں گی میں اسے۔ تم جانتے ہو کون لایا تھا اسے۔ نہیں نا۔ وہ بھی نہیں جانتا کیا کھیل ہوتے رہتے ہیں یہاں۔"

"معاف کر دیں بیگم صاحب! بس اس رات بڑی بھول ہو گئی۔ میں بھگتنے کو تیار ہوں۔ میں اس سے شادی کر لوں گا۔"

"چل بکواس نہ کر۔ تجھ جیسے لوفر، آوارہ گنوار سے تو میں کبھی اس کی شادی نہ کروں۔" مسز رباب نے ناک سکوڑ کر ناگواری سے کہا۔ مشہل نے بڑے صبر اور ضبط سے اس صاف گوئی کو برداشت کیا۔

"تو پھر اب میں کیا کروں۔"

"کرنا کیا ہے چکا بیٹھا ہے اور کیا۔" انہوں نے بہت آرام سے اس کا قصہ نمٹایا تھا۔

"اور آئندہ اگر میں نے تجھے اس کے کوارٹر کے آس پاس بھی دیکھا نا تو ٹانگیں تڑوا دوں گی تیری سمجھا۔"

"معاف کر دیں بی بی سائیں۔" وہ مکارانہ انداز میں ہاتھ جوڑ کر جانے کے لیے پلٹا۔

"اور سن۔" کچھ سوچ کر انہوں نے اپنے بیگ میں ہاتھ ڈال کر ایک نوٹ برآمد کیا۔

"ذرا پشوری کے لیے اپنا ہی ٹھکانہ ملا ہے تجھے۔ آئندہ بھوک لگے تو باہر جا کے کھانا سمجھا کہ نہیں۔"

انہوں نے نرمی سے کہتے ہوئے نوٹ اس کی جانب اچھال دیا۔ مشہل کے منہ سے دعاؤں کے پھول جھڑ رہے تھے۔ کہنے کی بات نہیں تھی "اپنے ملازموں کے لیے ہمیشہ سے نرم دل تھیں۔"



"باجی! اماں نے آپ کو بلایا ہے۔" محلے کی ایک بچی جو اس کے پاس ٹیوشن پڑھتی تھی۔ تیسری بار یہ پیغام لائی تھی۔

"کیوں بلایا ہے اور تمہاری اماں خود نہیں آ سکتی کیا۔"

"ہوں ہوں۔ رشنا تمیز سے بول کیا ہوتا جا رہا ہے تجھے۔"

"مجھے کیا ہوتا ہے چچی۔ آپ خود دیکھیں۔ یہ میرے پڑھانے کا ٹائم ہے۔ اب اس کی ماں کو کام ہے نا۔ وہ آ کے مجھ سے بول دے۔ یہ کیا کہ اس کا کام اور میں جاؤں سننے کے لیے یہ سارا ٹبر چھوڑ کر۔" وہ بری طرح تنک گئی تھی۔ چچی کچھ لمحے اسے دیکھتی رہیں۔

پھر باورچی خانے میں چلی گئیں۔
اسے ملال نے گھیر لیا۔
اس قدر بدتمیزی سے تو وہ بہت ہی کم بات کرتی تھی، جب بہت غصے میں ہوتی یا اس کی برداشت جواب دے جاتی۔ اسے یاد آیا اب وہ اکثر اسی طرح چیخ و پکار مچانے لگی تھی۔ بہت جلد ضبط کا دامن اس کے ہاتھ سے چھوٹ جاتا تھا۔ شاید یہ عظمت بوا کے کھولے گئے بھید کا نتیجہ تھا۔ اس کا دل بے چی کے لیے رہی سہی عزت بھی جاتی رہی تھی کہ اب اگر کوئی جذبہ موجود تھا تو وہ اس عمر میں اولاد کی جدائی سہنے کی وجہ سے صرف اور صرف ہمدردی کا جذبہ تھا۔ ورنہ وہ محبت اور عزت جو کبھی ان کے لیے وہ اپنے دل میں رکھتی تھی، شاید خیال و خواب ہی ہو گئی تھی۔ وہ نیند سے بوجھل آنکھوں پر پانی کے چھینٹے مارنے اٹھ گئی۔
اب یہ سب سوچنے کا فائدہ بھی کیا تھا۔ رشتے بدل گئے تھے، جذبات بدل گئے تھے۔ پر زندگی تو وہی تھی۔ سیاہ، بے رنگ، محض بوجھل۔

☼ ☼ ☼

"کیا بات ہے زریاب! یہاں کیوں کھڑے ہو اس طرح۔" وہ ہال کے استقبالیہ سے باہر آ کر اس گاڑی کو نقطہ کی طرح معدوم ہوتا دیکھ رہا تھا۔ جس میں بیٹھ کر وہ تیزی سے چلی گئی تھی۔
پتا نہیں وہ نعیمہ تھی بھی یا نہیں اور اگر وہ نعیمہ نہیں تھی تو اس طرح گئی کیوں؟ جانے کب تک وہ وہیں کھڑا ان ہی سوچوں میں غلطاں رہتا، لیکن مسز رباب نے آ کر اسے ہوش دلایا۔
"ہاں مجھے، مجھے آپ سے کچھ پوچھنا ہے۔" تیز روشنیوں میں اس کا جھلمل کرتا وجود، یہ محفلیں، یہ خوشبوئیں، یہ رنگ و بو کی ملاوٹیں دل کو لبھاتی اور نگاہوں کو گرماتی۔ سب جیسے اوجھل سا ہو گیا۔
"یہاں میں نے ایک لڑکی کو دیکھا۔ وہ نعیمہ تھی۔ آپ جانتی ہیں اسے۔" اس کا انداز بھی انتہائی گم صم اور بے ربط تھا۔ جتنا کہ اس وقت وہ خود۔ مسز رباب کو اس کی جانب داری سے قطع نظر اس بات کی قطعی توقع نہیں تھی کہ وہ ان کی "لڑکیوں" میں سے کسی کو جان بھی سکتا ہے۔
لمحے کے ہزارویں حصے میں ان کی سوچ تمام ممکنات اور غیر ممکنات کو کھنگال کر ایک نتیجہ لے کر واپس پلٹی تھی۔
"ارے یہاں ہزار بارہ سو کی پبلک میں ایک لڑکی کا پوچھ رہے ہو۔" انہوں نے مبالغہ آرائی سے کام لیتے ہوئے ہنس کے جیسے اس کی عقل پہ ماتم کیا اور بات ٹالی۔ مگر وہ یونہی سنجیدہ کھڑا انہیں دیکھتا رہا۔
"میں نہیں جانتی اس نام کی کسی لڑکی کو۔ ہو سکتا ہے میرے کسی فرینڈ کے ساتھ آئی ہو۔ یو نو، ینگ جنریشن یونہی پارٹیز انجوائے کرنے کے لیے کہیں بھی پہنچ جاتے ہیں۔ کسی کا بھی ریفرنس لے کر۔" زریاب ابھی بھی ذہنی طور پر پوری طرح وہاں حاضر نہ تھا۔ ورنہ ان کی بات کے پیچھے چھپے جھوٹ کو ضرور بھانپ لیتا۔
"کم، لیٹس انجوائے پارٹی۔"
وہ اس کا بازو تھام کر مسکراتی ہوئی اندر جا رہی تھیں۔ وہ کسی بے جان بت کی مانند کھنچتا گیا۔

☼ ☼ ☼

اندھیری راتوں پر ڈراؤنے ہیولوں کی پرچھائیاں قابض تھیں۔
ایک بہت بڑے ہوس کے جن نے اس کی جنت جنت کر رکھی عمر بھر کی کمائی کو چند لمحوں میں ڈکار لیا تھا۔ سرد سرسراتی ہوا کی سرگوشیاں۔ اس کی برف سماعتوں میں پھنکارتیں، راستہ ڈھونڈ ڈھونڈ ہانپتی بنجر آنکھوں سے بہہ نکلتیں۔ ایسے میں جو رسولن کی نظر پڑ جاتی تو بددعاؤں کا نہ ختم ہونے والا سلسلہ، مشعل کے لیے اس کے لبوں سے جاری ہو جاتا۔ وہ اس کی نسلوں اور پشتوں کو کوستی اور جی بھر گالیاں دیتی۔ شائل اسے اپنی اولاد کی طرح پیاری ہو گئی تھی۔ وہ تھی بھی اتنے نیک اطوار کی لڑکی۔ دھلے دھلائے کپڑوں میں بندی سی اوڑھنی لیے۔ صبح سے شام کر دیتی مگر مجال ہے کوئی کام

اس کے ماتھے پر شکن تک لے آئے۔ سیدھے سادے انداز اور بھولا چہرہ۔
وہ اس کی شادی کے خواب بہت جلدی جاگتی آنکھوں سے دیکھنے لگی تھی۔ وہ سوچتی تھی بیگم صاحب سے بات کر کے، ان کے دوستوں یا جاننے والوں کے گھر کے کسی ملازم، ڈرائیور، مالی، خانساماں یا چوکیدار، کوئی بھی مناسب عمر کا آدمی دیکھ کر اس کا بیاہ کروا دے گی۔ لیکن واہ ری قسمت۔ غریبوں کو اتنے غریب خواب دیکھنے کی بھی اجازت نہیں۔ بھلا کیا جاتا کسی کا جو وہ بیاہ کے کسی کی عزت بن جاتی۔ اور بیگم صاحب وہ سب جانتے بوجھتے "آنکھیں اور کان" منہ بند کر کے بیٹھ گئیں۔ ٹھیک ہے اندر ہی اندر ان کا اور مشعل کا معاملہ اور تھا۔ وہ ان کا خاص آدمی تھا۔ لیکن ایسی بھی کیا بے حسی۔ وہ مالکن اور ملازمن سب ہی سے شکوہ کناں تھی۔ لیکن اس سب کا فائدہ بھی کیا تھا۔ اس نے ایک بھاری ہوتی سانس کھینچی۔ گھٹنوں پر ہتھیلیاں ٹکا کے پورے جسم کا وزن ڈال کے کھڑی ہوئی۔ پھر دھیرے دھیرے چلتی اس کے سر پر پہنچی۔
"شائل، اے شائل، دوا کھالی تو نے؟" اس کی بے جان آنکھوں میں لمحے بھر کو زندگی جاگی۔ پھر اثبات میں سر ہلا کر وہ آسمان تکنے لگی۔ رسولن کے سینے میں ایک ماتم بپا تھا۔

☼ ☼ ☼

محفل کی جوانی اپنے عروج پر تھی۔ وہ سارا وقت مسز رباب کی خاص نظر کرم کے حصار میں تھا۔ وہ اسے لیے ساری محفل میں یہاں سے وہاں پھر رہی تھیں۔ اور لوگوں میں اسے اپنا بھتیجا کہہ کر متعارف کروا رہی تھیں۔ زریاب نے جو کچھ چند لمحے پہلے دیکھا وہ اگر بہت زیادہ اثر پذیر تھا بھی تو اب اتنے بھانت بھانت کے لوگوں سے ملنے کے لیے سر سے جھٹکنا ہی پڑا تھا۔ اب وہ شوخ و چنچل لڑکیوں کے ایک غول کے پاس کھڑی، ان سے زریاب کے بارے میں بے باک کمنٹس سن کر لطف اندوز ہو رہی تھیں۔
تب ہی ان کے موبائل کی بیپ نے ان کی توجہ کچھ دیر کو سب طرف سے ہٹا دی۔ بڑے انداز میں انہوں نے سیل کان سے لگا کے ہیلو کہا تھا۔ مگر دوسری طرف جانے کون تھا۔ پل بھر میں ان کے چہرے کا رنگ بدل گیا۔
"واٹ۔ اوہ نو۔ مائی گاڈ۔" آس پاس کھڑے سب ہی لوگ ان کے انداز پر ان کی طرف متوجہ ہو چکے تھے۔ "اوکے۔ اوکے۔ میں آرہی ہوں۔ آئی ایم کمنگ۔"
بہت جلدی میں انہوں نے سیل بند کر کے اس کی طرف دیکھا۔
"زریاب! میری ایک بہت قریبی دوست کا ایکسیڈنٹ ہو گیا ہے۔ اس کی حالت نازک ہے۔" زریاب کے ذہن میں فوراً "گاڑی لے کر وہاں سے نکلتی لڑکی" گھوم گئی۔ "میں آپ کو لے چلوں اپنے ساتھ۔"
"ہاں۔" اب کے انہوں نے اپنی گھبراہٹ سنبھال کے اسے دیکھا۔
"نہیں نہیں۔ اس کی ضرورت نہیں، میں چلی جاؤں گی۔ تم پارٹی انجوائے کرو یہاں۔" وہ اس کا گال تھپک کر تیزی سے آگے بڑھ گئیں۔
زریاب نے محض کچھ ہی منٹ ان کے جانے کے بعد وہاں لگائے۔ "یہ کون قریبی دوست تھی جو اس گرینڈ فنکشن میں مدعو نہیں کی گئی۔" اس کی گاڑی مسز رباب کی گاڑی کا پیچھا کر رہی تھی۔

☼ ☼ ☼

کتنی دیر گزر گئی تھی۔ ٹھنڈے ٹھار صحن کا طول و عرض ناپتے وہ نہیں جانتی تھی۔ اس رات جیسی سیاہی میں اسے تن تنہا چھوڑ دینے والی ماں نے اس کے ساتھ چپ چاپ یہ کھیل کھیلا ہوگا۔ شاید بوا نہ بتاتیں تو وہ زندگی بھر جان ہی نہ پاتی۔
میں اور زریاب کی بہن۔

اف! شرمندگی اور اذیت میں تہہ در تہہ لپٹی حقیقت تھی۔ یقیناً" زریاب کے اندر اس کا سامنا کرنے کی ہمت ہی نہیں بچی ہوگی۔ جب ہی چپ چاپ اپنا گھر بیچ کر دونوں بہنوں کو لے کر یہاں سے منتقل ہو گیا تھا۔ پہلی بار تو اسے سن کر بھی یقین نہیں آیا تھا۔

"تو آج کی یہ اطلاع نمو نے سنی تم نے"

"کیا" وہ بے دلی سے پیالی کے ٹکڑے ناشتے میں چائے کے ساتھ نگل رہی تھی۔

"زریاب کہیں چلا گیا اپنا گھر بیچ کر۔"

اس کے منہ سے آواز ہی نہ نکل سکی۔ نوالہ اس کے ہاتھ سے چھوٹ گیا۔ "کہاں چلا گیا؟"

"کیا پتا۔" نمو ایسی بن گئی جیسے اسے کچھ پروا نہیں۔ مگر وہ جانتی تھی۔ اندر ہی اندر متفکر تو وہ بھی ہوگی۔

"تو ایسے کیسے جا سکتا ہے۔ بنا بات کیے بغیر کچھ بتائے۔"

"کیوں نہیں جا سکتا۔"

"ارے اتنی بڑی حرکت ہم سے ملے بتائے بغیر وہ کر ہی نہیں سکتا۔ کھانے کو پیسے نہیں ہیں اس کے پاس' وہ کیا پاگل ہے، جو گھر بیچے گا۔" وہ اسے جھٹلاتے سے خود بھی یقین نہیں کر رہی تھی۔

"چلو دیکھتے ہیں۔" نمو نے کندھے اچکا دیے۔

اس کی نمازوں میں پابندی اور سجدوں میں طوالت آگئی۔ لیکن جانے والا پھر پلٹ کر نہیں آیا۔ انتظار کی گھڑیاں اتنی لمبی ہو گئیں کہ کئی سال گزار کر بھی مختصر نہ ہو سکیں۔

یہی صحن تھا۔ جہاں وہ زریاب کو سوچوں میں بسائے تتلی کی طرح اڑتی پھرتی تھی۔ یہاں سے وہاں اور آج اسی صحن میں صحراؤں کی سی وسعت اتر آئی تھی۔

اماوس کی تاریکی میں جاگتا ہوا ریگستان۔ اس کی زندگی کی طرح۔ جہاں نہ کوئی سمت تھی نہ روشنی نہ ہی کوئی اندازہ نہ ہی کوئی کنارا۔

☼ ☼ ☼

مسز رباب اسپتال کی ایمرجنسی کی طرف جا چکی تھیں۔ وہ ریسپشن کی طرف بڑھ گیا۔

یہ کوئی بہت بڑا اور نامور اسپتال نہیں تھا۔ اسے جلد ہی تمام معلومات حاصل ہو گئی تھیں۔ اس کا خدشہ ٹھیک ہی تھا۔ وہ لڑکی اپنی بوکھلاہٹ اور تیز رفتاری کے باعث حادثے کا شکار ہو گئی تھی۔

"یا اللہ۔" جانے کون کون سے واہموں نے اچانک ہی اس کے سامنے ہاتھ جوڑ دیے تھے۔

"وہ جو بھی ہے۔ بس ٹھیک ہو۔" اس کے لب قرآنی آیات کا بے آواز ورد کر رہے تھے۔ وہ واپس جا کے گاڑی میں بیٹھ گیا۔ اسپتال میں وہ مسز رباب یا ان کے ایسے کسی بھی جاننے والے کی نظروں میں آسکتا تھا جو اسے جانتے تھے اور مسز رباب سے اس کے کسی بھی قسم کے تعلقات سے آگہی رکھتے تھے۔

صرف ایک موہوم سے خدشے اور بے پناہ شباہت نے اس کی نیند اجاڑ کے رکھ دی تھی۔ وہ ساری رات اس نے وہیں گاڑی میں جاگ کر گزار دی تھی۔ اور اس وقت تک اس کی خبر لیتا رہا۔ جب تک اس کی حالت خطرے سے باہر ہونے کی نوید نہ مل گئی۔

اس نے ایسا کیوں کیا تھا۔ وہ خود بھی نہیں جانتا تھا۔ ذہن میں اودھم مچاتے سوالوں کی تعداد اتنی زیادہ اور نوعیت اس قدر گمبھیر تھی کہ وہ اپنے آپ کو ان کے جوابات کے قابل نہیں سمجھتا تھا۔

صبح کے اجالے کے آثار تھے۔ جب اس نے جلتی آنکھوں کو زور سے بھینچ کر کھولا اور گاڑی اسٹارٹ کر دی۔ اسے اس وقت بدین کے لیے نکلنا تھا۔ صبح آفس کی چھٹی نہیں تھی۔

☼ ☼ ☼

"مس رشنا! میں نوٹ کر رہی ہوں۔ اسٹارٹنگ میں آپ ایک ایکٹو اور انرجیٹک ٹیچر ہوتی تھیں۔ لیکن اب بتدریج آپ کے رویے میں چینج آرہا ہے۔ کیا میں اس کی وجہ پوچھ سکتی ہوں۔" وہ اس پیشی کے لیے تیار نہیں تھی۔ ابھی پہلا پیریڈ بھی شروع نہیں ہوا تھا

ورا سے یہ نبیل کے آفس میں کال کرلیا گیا تھا۔

"اور جانتی ہیں۔ کتنی کمپلینٹس آچکی ہیں پیرنٹس کی طرف سے آپ کی۔" وہ سر جھکائے بیٹھی رہی۔ اس کے پاس کوئی جواب تھا ہی نہیں۔

"دیکھیے اگر آپ کو کوئی پرابلم ہے۔ اسکول میں یا گھر میں یا --- کوئی بہت پرسنل پرابلم بھی ہے تو آپ ایک دوست سمجھ کر میرے ساتھ شیئر کر سکتی ہیں۔" مس نبیل بہت کوآپریٹو تھیں۔ وہ اسے بہت نرم انداز میں سمجھاتی رہیں۔

"سوری میم آئندہ آپ کو شکایت کا موقع نہیں ملے گا۔"

اس نے وہ واحد بات ان کے سامنے کی۔ جسے کہنے کے علاوہ اس کے پاس کچھ بھی نہیں تھا۔

☼ ☼ ☼

رات بھر جاگنے کے باعث اس سے آفس میں کام نہیں کیا گیا۔ بے پناہ سر کے درد نے اس کی حالت خراب کروالی تھی۔ آمنہ کے زور دینے پر --- آفس ٹائمنگ سے پہلے ہی گھر آ گیا تھا۔

اس نے گھر آ کے آمنہ کو فون کر کے دو دن لیو کے لیے کہہ دیا تھا۔ کیونکہ سخت ترین ذہنی مشقت کے بعد وہ اتنا نڈھال ہو چکا تھا کہ اپنے آپ کو کسی بھی قسم کے باقی کام کے لیے تیار نہیں پا رہا تھا۔ گو کہ یہ دو دن کی چھٹی اس نے ذہنی اور جسمانی آرام کے لیے لی تھی۔ اور فون کر کے رابعہ کو کراچی سے اپنے پاس بدین بھی بلوا لیا تھا۔ مگر یہ دو دن الٹی سیدھی سوچوں نے اس کے گرد گھیرا تنگ کیے رکھا۔

وہ لڑکی جو بھی تھی نعیمہ کی یاد دلا گئی تھی۔ اور اگر وہ نعیمہ ہی تھی تو بھلا وہاں کیا کر رہی تھی۔ اس کا حلیہ اور انداز پکار رہے تھے۔ جس جگہ سے اس کا تعلق تھا۔ مسز رباب نے اسے پہچاننے سے انکار کیوں کیا تھا۔ بعد میں وہ اسے اپنی قریبی دوست بتانے لگی تھیں۔ اگر وہ ان کے پیچھے نہ جاتا تو شاید یہ بات اس سے پوشیدہ ہی رہ جاتی۔ اس کا سر دکھتا ہی رہتا۔ انگلیوں کے بیچ سگریٹ سلگتی رہتی۔ نگاہیں خلا میں بھٹکتی رہتیں۔ اسے ایک رازداں کی ضرورت تھی۔ ایک دوست کی ضرورت تھی۔ لیکن وہ ایکدم سے کسی پر اعتبار کرے تو کیسے۔

☼ ☼ ☼

"ایک بندہ آنے والا ہے تو ایسا کر شانزل کو کچن سے نکال۔ میں اس کے لیے کپڑے بھجوا رہی ہوں۔ ذرا ڈھنگ سے کنگھی چوٹی کر کے اوپر کی منزل پر بھیج دینا۔" وہ رسولن سے بڑی مصروفیت میں بات کر رہی تھیں۔

رسولن کے چہرے پر زلزلے کے آثار تھے۔ مگر وہ اپنے فون میں مصروف دیکھ نہیں پائیں۔

"اب دیکھ کیا رہی ہے کھڑی کھڑی۔ جا جلدی کر۔ ابھی آتا ہوگا۔" وہ بدقت پلٹی اور شانزل کو بڑی بی بی کا پیغام سنانے چل دی۔ اس سے کسی بھی قسم کی ہمدردی رکھنا۔ اپنے ہی جی کو روگ لگانے کے برابر تھا۔ یہ کھیل تو یہاں چلتے ہی رہتے تھے۔ کون اس کھیل میں کس طرح اپنا کردار ادا کرتا ہے۔ یہ اس کی قسمت۔ شانزل تا بھی اسے دیکھتی رہی۔ پھر باہر چل دی۔

رسولن ایک بار بھی اس سے نظر نہیں ملا پائی تھی۔ اور وہ خود تو نہیں مگر رسولن جانتی تھی اب وہ اس سے بھی نظر ملانے کے قابل نہیں رہے گی۔ بڑی بیگم صاحب کو اسپتال جانا تھا۔

یہاں داخل ہونے والی لڑکی "نمو" جسے مستقبل کے ڈر سے بیگم صاحب نے سدھایا تھا۔ اب خطرے سے باہر تھی۔ اور کچھ ہی دن میں ڈسچارج ہو کے گھر آنے والی تھی۔

"بیچ گئی بدبخت۔ اپنی زندگی بھی باقی اور آزمائش بھی۔" ہر لڑکی اس کے لیے "وہی رانی" تھی۔ اور گھر والوں کے لیے "مال" "بولی لگنے والا۔ خریدار اور بیچا جانے والا مال۔

☼ ☼ ☼

اسکول میں اس کی کارکردگی پہلے سے بہتر ہونے لگی تھی۔ سردیوں کا اختتام تھا اور بہار کی آمد آمد تھی۔ سدا

بہار کا پودا ابھر رہا تھا۔ اس کی زندگی کی طرح۔

چچی کی حالت البتہ قدرے بہتر تھی۔ یوں بھی سردیوں میں ان کا سانس کا مرض زور پکڑ لیتا تھا۔ پھر موسم بدلنے کے ساتھ اس میں بہتری کے آثار آنے لگتے۔ اب وہ اس کے اسکول سے واپس آنے تک کھانا پکا کے رکھ چکی ہوتی تھیں۔ گھر بھی صاف ستھرا ملتا۔

نہ چاہتے ہوئے بھی اس کے دل میں شکر گزاری کے جذبات زور پکڑ لیتے۔ وہ ضعیف تھیں۔ بیمار تھیں۔ مگر حتی المقدور اس کا خیال رکھنے کی کوشش کرنے لگی تھیں۔ اس کی چڑچڑاہٹ البتہ اپنی جگہ قائم و دائم تھی۔

سالانہ امتحانات کے اختتام پر اسے ایک نئی استاد کی حیثیت سے بہتر کارکردگی دکھانے پر انعام ملا۔ یہ انعامی سلسلے اسکول کی پرنسپل کی طرف سے شروع کیے گئے تھے۔ تاکہ ٹیچرز اپنی پرفارمنس کو بہتر سے بہتر بنا سکیں۔

گو کہ اس مقابلے میں وہ تیسرے نمبر پر ہی آسکی تھی۔ مگر تمام اسٹاف' اسٹوڈنٹس اور خود اس کے لیے یہ انعام اس لیے زیادہ اہمیت کا حامل تھا کیونکہ اسے یہ نوکری شروع کیے ہوئے ابھی زیادہ عرصہ نہیں گزرا تھا۔

یہ انعام ایک عدد سرٹیفکیٹ اور کچھ نقد رقم پر مشتمل تھا۔ اس نے پرنسپل سے وصول کرتے وقت اپنی آنکھوں کو نم محسوس کیا۔ اسے احساس ہوا کہ وہ زریاب کو اس وقت اتنی شدت سے یاد کر رہی ہے کہ اسے لگ رہا ہے کہ وہ آس پاس ہی کہیں موجود تعریفی نگاہوں سے اسے دیکھ رہا ہے۔

☼ ☼ ☼

دو مہینوں کی لگاتار ڈیوٹی کے بعد آج یہ چھٹی اور آرام کا دن نصیب ہوا تھا۔ سال کے اختتام پر شروع ہونے والا کلوزنگ کا کام نئے سال کی پلاننگ کے ساتھ دو مہینے گھسیٹ لے گیا۔

اوپر سے اس کی الجھی ہوئی ذہنی حالت کے باعث' رپورٹس اور فگرز میں بار بار ہائی لائٹ ہونے والی غلطیاں۔ آئمہ تک سخت عاجز آگئی تھی۔

اس کے ذہن سے وہ لڑکی' اس کا ایکسیڈنٹ اور رباب آنٹی کا جھوٹ نکالے نہیں نکل سکا۔ ایک دوبار فون پر اس نے باتوں باتوں میں ان سے ان کی دوست کی خیریت معلوم کرنا چاہی تو انہوں نے بہت سرسری سا جواب دے کر موضوع ہی بدل دیا۔

"میں تم سے ایک بات کہنا چاہتی ہوں۔ پلیز تم مائنڈ مت کرنا زریاب۔" کلوزنگ کے اینڈ پر سلا ویک اینڈ گھر میں آرام کرکے جب وہ صبح آفس آیا تو طبیعت قدرے بہتر تھی۔

"ہاں بولو نا۔ اتنی فارمل کیوں ہو رہی ہو۔"

"میرا خیال ہے' تمہیں شادی کرلینی چاہیے۔" وہ اپنی بات کہہ کر خاموش ہوگئی۔ مگر زریاب جانتا تھا وہ ابھی کچھ اور بھی کہنے والی ہے۔

"شکریہ آئمہ انجم --- بہت اچھی ہو۔ اور میں تمہارا مشورہ ضرور مانوں گا۔ بہت جلد تم کوئی اچھی خبر سنو گی۔"

اس کے ذہن میں کسی کا چہرہ تروتازہ ہوتا جارہا تھا۔ وہ جانتا تھا آئمہ بے خبر ہے۔ اور اتنی آسانی سے یہ بات قبول نہیں کرے گی۔ مگر اسے اپنے فیصلے پر عمل کرنا تھا۔

کسی کی زندگی اس کے محض ایک قدم سے سنور سکتی تھی۔ تو وہ یہ قدم اٹھانے کے لیے تیار تھا۔

یوں بھی اس کا دل اپنے جذبات کو کسی کے لیے گروی رکھ چکا تھا۔ اب اس کی شریک حیات کوئی ایسی لڑکی ہونی چاہیے تھی۔ جو دل کے علاوہ اس کی طرف سے دی جانے والی ہر چیز کو اپنے لیے کافی سمجھے۔ جس کے لیے زریاب کا وجود' اس کی توجہ اور احساس ذمہ داری اتنا کافی ہو کہ وہ اس سے محبت کی طلب نہ کرسکے۔

اور ایسی لڑکی۔ ایسی لڑکی تھی۔ اسے مل بھی سکتی تھی۔ اس نے اپنے ارادے پر پختگی کی مہر لگائی۔ اسے جلد سے جلد کراچی جانا تھا۔

☼ ☼ ☼

"بخت کی سیاہی پھیل کر کالک کی طرح منہ پر بھی مل جاتی ہے رسولن۔ تجھے کیا پتا۔" اس کا رندھا ہوا گلا دل کی تکلیف کا آئینہ تھا۔

"زندگی کتنی تکلیف دہ چیز ہے۔ کیوں ہے یہ ایسی میرے لیے کیوں ہو گئی۔" آنسو اس کے رخساروں پر پھسلتے جارہے تھے۔ رسولن کے دل کو جیسے کسی نے مسل ڈالا تھا۔

"پہلے سیلاب میں میرے گھر والے ختم ہو گئے۔ ایک باپ تھا وہ بھی چھوڑ گیا۔ کیا تھا میرے پاس ایک عزت کے سوا۔ سارے جہان سے بچائی چھپائی میں ادھر سے ادھر بھاگتی پھری۔ اور جہاں آکر چھت ملی تو وہ ہی میری چادر کو سر سے کھینچ لے گئے۔" بے بسی کے شدید احساس تلے وہ رو پڑی تھی۔

"میں مری کیوں نہیں رسولن' مر کیوں نہیں گئی میں۔" رسولن نے بڑھ کے اسے سینے سے لگا لیا۔ وہ بری طرح بلک رہی تھی۔

☼ ☼ ☼

"بڑی تیزی سے امپروو کیا ہے تم نے۔ ویل ڈن۔ میں تو بہت ڈر گئی تھی۔" مسز رباب بہت خوش تھیں۔ ان کا مخاطب نعیمہ تھی۔ "جب تمہارے ایکسیڈنٹ کی خبر ملی۔ میرے ہاتھوں کے توتے اڑ گئے تھے۔ جب تمہیں ٹھیک سے ڈرائیونگ نہیں آتی تو کیا ضرورت تھی یوں گاڑی لے کر نکلنے کی۔"

وہ خاموشی سے سامنے رکھی ٹرے میں سے ڈبل روٹی کا پیس اٹھائے کتر رہی تھی۔

"آئندہ سے کوئی تنگ کرے یا کوئی پرابلم ہو تو مجھ سے کہنا۔" اس کے ہاتھ ایک لمحے کے لیے رکے اور پھر سے رواں ہو گئے۔

"اس طرح کا رسک لینے کی ضرورت نہیں۔" وہ اس کا سپاٹ چہرہ دیکھ کر اندر ہی اندر بہت الجھ رہی تھیں۔

"خدا نہ کرے۔" انہوں نے ایک انداز سے اپنا دایاں ہاتھ سینے پر رکھا۔ "اگر تمہیں کچھ ہو جاتا۔ فرینکلی۔ اینی جاب آف سیریس انجری تو پھر۔" انہوں نے بات ادھوری چھوڑ کر اس کے چہرے پر ابھرتی کڑوی مسکراہٹ دیکھی۔

"اور کچھ نہیں تو تمہارے فیس پر ہی کوئی مارک آجاتا تو' نو گاڈ۔ آئی کانٹ افورڈ۔"

کھلی کھڑکی سے چھن کر آتی دھوپ کمرے میں درجہ حرارت بڑھا رہی تھی۔ روشن کھلا کمرہ' صبح کا وقت اور پر گرم ناشتہ۔ طبیعت کو بہلانے کے لیے ایک بڑا ہی خوش خیال منظر سامنے تھا۔ لیکن مسز رباب اور ان کی بے تکی باتیں' اس کی برداشت کو مسلسل آزما رہی تھیں۔

"تم نہیں جانتی ہو' کتنا خوفناک ایکسیڈنٹ تھا۔ گاڑی کا قیمہ بن گیا۔ کوئی مریکل (معجزہ) ہی تھا کہ تم بچ گئیں۔ ورنہ جان بھی جاسکتی تھی تمہاری۔"

انہیں اندازہ تھا' وہ جب سے کمرے میں آئی ہیں۔ خود ہی بولے جارہی ہیں۔ مزید بک بک کرنا فضول لگا تھا۔

"خیر میں تو یہ بتانے آئی تھی۔ تمہاری سیٹ کنفرم ہو گئی ہے۔ پرسوں تم یہاں سے دبئی فلائی کر رہی ہو۔" وہ بات سمیٹ کر اٹھ گئیں۔

"آنٹی!" اتنی دیر میں یہ پہلا لفظ اس وقت اس کے منہ سے نکلا جب وہ دروازے کے ہینڈل پر ہاتھ رکھ چکی تھیں۔ "پلین کریش ہو جائے تو سب مر جاتے ہیں نا۔ اس میں تو کوئی بھی زندہ نہیں بچتا۔" اس کی آواز بڑی پراسرار تھی۔ اس کی مسکراہٹ کی طرح۔

مسز رباب کو اس کی ذہنی حالت پر شبہ ہوا تھا۔

☼ ☼ ☼

اسے ایک ڈیلی گیشن کے ساتھ' دبئی ہیڈ آفس وزٹ کے لیے بھیجا جارہا تھا۔ وہ خود تو خوش تھا ہی۔ آئمہ بھی اس کی خوشی میں برابر کی شریک تھی۔ دیگر اسٹاف اور یہاں تک کہ فضل دادا کی طرف سے بھی' اسے مبارکباد موصول ہوئی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ این جی او کے منیجمنٹ ڈپارٹمنٹ سے تعلق نہ رکھنے

کے باوجود اس وفد میں شامل کیا گیا۔ جس میں سب ہی شرکا سے وہ تین گنا زیادہ اسکیل کی پوسٹ پر تھے۔ اور این جی او کے مینجمنٹ کے اہم ارکان سمجھے جاتے تھے۔ اپنے سینئرز کے ساتھ بیرون ملک کا دورہ اس کے لیے ایک ایسا خواب تھا۔ جو بن دیکھے ہی تعبیر بن گیا۔

آئمہ اس کے چلے جانے سے اداس تو تھی۔ لیکن مستقبل میں اس اقدام سے جڑی جوش و موش زریاب کی منتظر تھی اسے ملنے کی خوشی اس اداسی پر غالب آگئی تھی۔ اس نے خود زریاب کے ساتھ جاکے اس ٹور کے لیے شاپنگ کی تھی۔ گھنٹوں بازار میں اس کے کپڑوں کی سلیکشن کے لیے خوار ہوئی تھی۔ اس ٹرپ سے پہلے آئمہ کے ساتھ گزارا ٹائم اس نے حقیقتاً بہت انجوائے کیا تھا۔ اور وہ وقت اس کے لیے یادگار بن گیا تھا۔

اپنے دبئی جانے سے پہلے وہ رابعہ اور خاص طور پر شائل سے ملنے کراچی گیا۔ رابعہ کو بھی اس کے جانے کی خبر سن کر خوشی ہوئی۔ رباب آنٹی تو گھر پر نہ ملیں۔ مگر شائل کو اس نے دور سے ہی کوارٹر کے پاس کھڑے دیکھ لیا تھا۔ اسے شائل کو دیکھ کر ایک شدید جھٹکا لگا تھا۔

وہ سب بدل گئی تھی۔ شاید سر سے پاؤں تک ہی۔ گولڈن ڈائی کیے ہوئے بال اس قدر مختصر تھے کہ کس کے باندھی گئی پونی ٹیل کے آس پاس بکھرے ہوئے تھے۔ اس نے کاٹن کا ایک بہت اچھا سوٹ پہنا ہوا تھا جو اس کی شخصیت پر بالکل سوٹ نہیں کر رہا تھا۔ ہونٹوں پر شوخ رنگ کی لپ اسٹک کی گاڑھی تہہ جما رکھی تھی اور پیر چپل کی قید سے آزاد تھے۔ یوں لگتا تھا کسی نے گاؤں کی دیہاتن کو شہری گیٹ اپ دینے کی کوشش کی ہو۔ اس کے گہرے سانولے رنگ پر نہ وہ چبھتے ہوئے رنگ کا عمدہ کاٹن کا سوٹ اچھا لگ رہا تھا اور نہ ہی وہ میک اپ۔ اور نہ ہی بے دردی سے کتر دیے جانے والے سنہری بال۔

اس کے حلیے سے بھی زیادہ عجیب بات یہ ہوئی کہ اس نے زریاب کو آتے دیکھا تو بھاگ کر کوارٹر میں چلی گئی اور کمرے کا دروازہ سختی سے بند کر دیا۔ زریاب نے دو تین بار دروازہ کھولنے کو کہا۔ مگر وہ اس کی کوئی بات سننے کو تیار نہیں تھی۔ ہار مان کر وہ وہاں سے واپس چلا آیا۔

"یہ ایسی کیوں ہو گئی۔ اسے مجھ سے کیا شکایت ہو سکتی ہے۔ اسے کیا ضرورت تھی اس طرح کا حلیہ اپنانے کی۔ کیا کسی نے اسے مجبور کیا تھا۔" سوالوں کا ایک ہجوم تھا جو اس کے دماغ میں اور بے جواب۔

☼ ☼ ☼

وہ ہفتے ڈیلی گیشن کے ساتھ آفس ورک میں لگے۔ اس کے بعد آخری ہفتہ انہیں گھومنے پھرنے اور سیر و تفریح کے لیے دے دیا گیا۔ مسلسل ایک ہفتے کے آرام اور دبئی اور انجان جگہ کی سیر اور تفریحی پروگراموں نے اس کی طبیعت اور مزاج پر بہت اچھا اثر ڈالا تھا۔

اپنے آفیسرز کے ساتھ آفس کے مخصوص ماحول سے نکل کر دوستانہ انداز میں گھومنے پھرنے اور خاص طور پر لوور نائٹ فنکشنز اٹینڈ کرنے میں اسے بہت مزا آیا۔ اس سارے ٹور میں ایک ذرا سا جو افسوس ناک پہلو تھا۔ وہ اس وقت سامنے آیا جب اس نے نائٹ پارٹیز میں اپنے کولیگز کو پینے پلانے کا شغل کرتے دیکھا۔ غیر ملکی حسیناؤں، جو خاص کر ان ہی کی دل لگی کے لیے بلوائی گئی تھیں، ان کی بانہوں میں جھولتے ہوش و حواس سے بیگانہ ہوتے دیکھا۔

یہ رات ان کی دبئی میں آخری رات تھی۔ کل سہ پہر کے وقت ان کی پاکستان کی فلائٹ تھی۔ وہ افسوس بھری نظروں سے اپنے آفیسرز کو ان دو ٹکے کی عورتوں پر نثار ہوتے دیکھ رہا تھا۔ جو اپنے ملک میں ایک نام، ایک پہچان رکھتے تھے۔ اور بہت باعزت روزگار سے منسلک تھے۔ اس نے ایک گہری سانس بھر کے ان بوجھل سوچوں کو اپنے قریب آنے سے روکنے کی خاطر ہال میں اس طرف نظر ڈالی، جہاں نو عمر شوخ اور

بے باک لڑکیوں کا ایک گروپ مستیوں میں مصروف تھا۔ آنکھوں کو سینکنے کی حد تک تو اس نے بھی بے ایمانی کر لی تھی۔ بڑی فرصت سے مسکراتے ہوئے ان چہکتے ہوئے چہروں اور نازک ڈال کی طرح لچکتے جسموں کو دیکھے گیا۔ وہ خود تو کم از کم دوسرے مردوں کی طرح ہوش و حواس سے بیگانہ نہیں ہوا تھا۔ اور اس وقت ہال میں قدرے الگ تھلگ بیٹھا تھا اس لیے جلد ہی ان کی نظروں میں آ گیا۔

وہ اسے دیکھ کر ہاتھ ہلانے اور بلانے لگیں۔ اسے ایک دم سے ہنسی آگئی۔ اور وہ یونہی ہنس کے اپنا منہ پھیر لینا چاہتا تھا مگر ایسا کر نہیں سکا۔ اسی گروپ سے ایک لڑکی نکل کر بیرونی دروازے کی طرف بڑھی تھی۔ اس کی مسکراہٹ سکڑی اور جسم و جاں میں بجلی سی بھر گئی۔ لمحے سے بھی کم وقت میں وہ اڑتا ہوا اس لڑکی کے سر پر جا پہنچا تھا۔ جو خود برق رفتاری سے وہاں سے نکل رہی تھی۔ اس نے ایک جھٹکے سے اس کا بازو پکڑ کر کھینچا تھا۔

"شیبی۔" وہ پلٹ کر درشتی سے بولی۔ اس کی مصنوعی رنگوں والی آنکھوں میں پہچان کے رنگ بالکل اصلی تھے اور وہ حیرت اور صدمے سے ایسا گنگ ہوا کہ اس کی شکل ہی دیکھتا رہ گیا۔

"آئی سیڈ۔ جسٹ لیو می۔" پہلے سے زیادہ غصے سے بولی۔

"شٹ اپ۔" زریاب کا لہجہ بے انتہا سرد تھا۔

"مائنڈ یور اون بزنس۔" وہ اس کے چہرے کی طرف نہیں دیکھ رہی تھی۔

"شائل..." اس کی آواز سرگوشی سے زیادہ بلند نہیں تھی۔ "کیا کر رہی ہو تم یہاں۔" وہ زیادہ دیر تک برف نہیں رہ سکتا تھا۔

"دیکھ نہیں رہے کیا کر رہی ہوں؟" اس نے جھٹکا دے کر اپنا بازو چھڑانا چاہا مگر وہ زریاب کی سخت گرفت میں تھا۔

"او نو..." اس کے منہ سے ایک کراہ نکلی۔

"چھوڑو مجھے۔" اس نے پھر مزاحمت کی۔ "چھوڑو مجھے زریاب! پلیز۔"

بے اختیار اس کے لبوں سے نکلا اور اس کی مزاحمت ختم ہو گئی۔ زریاب کے ہاتھ سے اس کا بازو چھوٹ گیا۔ شاید وہ اب تک کسی انہونی مشابہت یا نظر کے دھوکے کا خواہش مند تھا۔ بے ہنگم تیز میوزک، لوگوں کی آوازیں، باتیں، قہقہے۔ سب ایک لمحے کے لیے اپنی حقیقت کھو بیٹھے۔ بے یقینی کے ایک گہرے حصار میں صرف وہ دونوں کھڑے رہ گئے۔ ایک دوسرے کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے۔ باقی سب معدوم ہو گیا۔

چند لمحوں بعد اس کی نیلی ــــ آنکھوں میں نمی ابھری اور اس نے پلٹ کر اسے ہال سے باہر جاتے دیکھا۔ چند لمحوں پہلے جب وہ دوڑ کر ہال سے باہر جا رہی تھی تو وہ اس سے زیادہ تیز رفتاری سے اس کے پاس جا پہنچا اور اب جبکہ اس کے قدم نڈھال اور شکستہ ہو چکے تھے۔ زریاب کو اسے روکنے یا اس کے پاس جانے کی کوئی خواہش نہیں ہوئی تھی۔ تھوڑا سا ابہام تھا سو دور ہوا۔

وہ شیبی ہی تھی لیکن، کیوں تھی۔ یہاں کیوں تھی۔ وہاں کیوں نہیں تھی۔ جہاں اسے ہونا چاہیے تھا۔

باہر نکلنے سے پہلے اس نے ایک بار بھی پلٹ کر زریاب کو نہیں دیکھا۔ زریاب بھی شاید یہی چاہتا تھا کہ وہ مڑ کر بھی نہ دیکھے۔

☼ ☼ ☼

نیم روشن کمرے میں خنکی اور خاموشی کا راج تھا۔ بہت زیادہ رو چکنے کے بعد آنکھوں میں شدید جلن اور سوزش پیدا ہو گئی تھی۔ سیاہ ٹاپ لیس ریشمی میکسی اس کے گھٹنوں پر سے سمٹ کے صوفے پر دائیں طرف پڑی تھی۔ گوری سڈول ملائم پنڈلیاں ایک دوسرے پر دھری تھیں اور عریاں بازو دائیں بائیں بے ترتیبی سے گرے ہوئے تھے۔ دائیں ہاتھ میں سگریٹ تھی اور بائیں ہاتھ میں تھا گلاس اس نے صوفے پر ہی لڑھکا دیا تھا۔ دھواں دھواں ہوتے ماحول میں کتنے ہی

چہرے سامنے بنتے بگڑتے جا رہے تھے۔

"ارے کچھ پہن تو لے پاؤں میں۔ نہیں تو ٹھنڈ بیٹھ جائے گی۔" یہ چہرہ اس کی ماں کا تھا۔

"دیکھو کیسے کھوں کھوں کر رہی ہو۔ امی ٹھیک ہی کہتی ہیں۔ تمہیں اپنی بالکل پروا نہیں۔" اس کی ماں جا چکی تھی۔ جس کے ساتھ اس نے کتنی بڑی زیادتی کی تھی۔ ہمیشہ کے لیے اس کو تنہا کر ڈالا تھا۔

"تم میرے لیے بالکل بہن جیسی ہو نعیمہ۔ حیرت ہے تم نے میرے بارے میں اس طرح کیوں سوچنا شروع کر دیا۔" یہ بھی ایک جانا پہچانا چہرہ تھا۔ ایک شناسا چہرہ۔ ایک محبوب چہرہ۔ دل نے ایک سسکی لی۔ دھوئیں کے بنتے مٹتے مرغولوں میں کتنے ہی چمکتے، بجھتے، روشن، مکروہ، بھیانک چہرے اس کے سامنے تھے۔

"بے فکر رہو۔ آئندہ تمہارا سامنا شمائل جیسے کسی شخص سے نہیں ہو گا۔" ایک مجرم کا چہرہ۔

"لے تو پہلے جا رہی ہے۔ میں تیرے لیے پہلے دن ہی گجرے لا رہا تھا۔" مکروہ موقع پرست مطلبی چہرہ۔

"خبردار جو آواز نکالی۔ ٹوٹے کردوں گا ٹوٹے۔"

موٹی موٹی سرخ آنکھوں والا بھیانک چہرہ۔

سگریٹ کا سرخ شعلہ جلتا ہوا انگلیوں کے سرے تک پہنچ گیا۔ اس نے بے خیالی میں اسے جھٹکا۔ اٹھ کر کھڑکی تک پہنچی اور دور دور تک پھیلے منظر کو دیکھنے لگی۔ اسے یقین تھا وہ آج آخری بار یہ دنیا دیکھ رہی ہے۔

☆ ☆ ☆

وہ ایک بار پھر شمائل کے روبرو تھا۔ کتنے دن لگے تھے اسے۔ شاید چند ہفتے یا مہینے۔ دبئی سے ڈیلی گیشن کے ساتھ واپسی پر اس کی حالت پہلے سے زیادہ ابتر تھی۔

آفس ورک کو پورے دھیان سے نمٹانے کے باوجود آئمہ کو دکھا کر اطمینان کرنا ضروری ہو جاتا کہ اس میں کوئی غلطی نہیں ہے اور ہر بار ہی کوئی نہ کوئی غلطی اس کا منہ چڑا رہی ہوتی۔

"مجھے کراچی جانا ہو گا۔" اس کا فیصلہ اٹل تھا۔

مگر چھٹیاں ملنے میں تاخیر ہوتی گئی اور اس کی بے تابی بڑھتی گئی۔ مگر اس نے کراچی آ کے دم لیا۔ آنے سے پہلے رباب آنٹی کو مطلع کرنا اس نے ضروری نہیں سمجھا تھا۔ وہ چاہتا تھا وہ ان کی غیر موجودگی میں شمائل سے ملے اور اس کی یہ احتیاط بے کار نہیں گئی تھی۔ وہ اس کے مد مقابل سر جھکائے بیٹھی تھی۔ حلیہ وہی تھا مگر چہرہ سپاٹ۔

"تم بہت بدل گئی ہو۔" اس نے دھیرے سے سر ہلایا۔

"کیا ضرورت تھی یہ بہکی انداز اپنانے کی۔" اس نے سر نہیں اٹھایا۔

"اور مجھے رسولن نے بتایا۔ تم اردو بہت صاف بولنے لگی ہو۔ کس نے سکھائی تمہیں۔" زریاب کو اس کی خاموشی سے الجھن ہو رہی تھی۔ اس نے اپنے بڑے سے دوپٹے کو چاروں طرف لپیٹا ہوا تھا۔

"میں تم سے ایک بات کرنے آیا ہوں۔ پتا نہیں تمہیں کیسی لگے۔ شاید بری یا بہت عجیب۔ مگر میرے لیے یہ بات بالکل عجیب نہیں۔" اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ بات کہاں سے شروع کرے اور تمہید کہاں ختم کرے۔ جس کلام کو، جس بات کو وہ بہت آسان سمجھ رہا تھا وہ اتنا بھی آسان نہیں تھا۔ ایک کم صورت، گنوار، غریب، لاوارث لڑکی سے نکاح کی خواہش۔ یقیناً بہت لوگوں کی نظر میں ناقابل معافی ہوتی۔

"شمائل میں..." اس نے رک کر گلا کھنکھارا۔ اس کا جھکا ہوا سر اب تک نہ اٹھا تھا۔ "مجھ سے شادی کرو گی تم۔ میں... تم سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔"

اس کے وجود میں جنبش نہیں ہوئی۔ جس حیرت کی توقع وہ اس سے کر رہا تھا۔ وہ خود اسی کے چہرے پر چمکنے لگی۔

اس نے اپنا جھکا سر اٹھا کے اس کی آنکھوں میں جھانکا۔ کیا تھا ان آنکھوں میں زریاب کو اپنے وجود میں بے چینی سی ہونے لگی۔

"میں تمہیں اپنے ساتھ لے جانا چاہتا ہوں۔ چلو گی میرے ساتھ۔" اس نے پھر سر جھکا لیا۔

"کتنے دن کے لیے صاب!" اس کا جواب اس کی توقعات سے قطعی مختلف تھا۔

"کیا مطلب کتنے دن کے لیے۔" وہ واقعی نہیں سمجھا تھا۔ "شادی کرنے کے لیے کہہ رہا ہوں تم سے۔" اس نے شمائل کو اپنی بات سمجھانا چاہی۔

"کیا کرو گے شادی کر کے صاب! میں ویسے ہی آپ کے ساتھ چلنے کو تیار ہوں۔"

"دماغ ٹھیک ہے تمہارا۔" وہ بری طرح بدک گیا تھا۔

"ایسا لگتا ہوں میں تمہیں؟" اسے شمائل کی بات سے حقیقتاً دکھ پہنچا تھا۔ "کیا میں کر سکتا ہوں ایسا تمہارے ساتھ۔" وہ اب دھیما پڑ چکا تھا۔

اس نے جواب نہیں دیا۔ بس زخمی نگاہوں سے چہرہ دیکھتی رہی۔ پھر اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ وہ ایک بار پھر ناسمجھی سے اس کا منہ تک رہا تھا۔

اس نے اٹھ کر اپنے سر سے دوپٹا کھینچا اور زمین پر ڈال دیا۔

زریاب اپنی جگہ سن ہو چکا تھا۔

☆ ☆ ☆

کمرے میں خاموشی تھی۔ مکمل خاموشی۔ موت کا سا سناٹا۔ سوائے گھڑی کی ٹک ٹک کے۔ بیڈ کی چادر بے شکن تھی۔

ملتے ہوئے پردے اور کمرے کے دروازے کے عین سامنے اور وسط میں بڑے سے قالین پر بے ہنگم انداز میں گرا ہوا اس کا وجود انتہائی بے بسی اور لاچاری کی تصویر تھا۔

تربوزی رنگ کے دبیز قالین پر جگہ جگہ خون کے دھبے پڑ گئے تھے۔ ننھے ننھے باریک سے خون اس کی کٹی ہوئی کلائیوں سے نکلا تھا۔ عریاں بازو [illegible] تھے اور برہنہ ٹانگیں ڈھلک سی گئی تھیں۔ اس نے بہادرانہ قدم اٹھانے سے پہلے پوری آستینوں والی قمیص زیب تن کر لی تھی۔ نیم وا مردہ آنکھوں سے زندگی کی خواہش نچوڑ چکی تھی۔

خشک پپڑی زدہ ہونٹ کھلے سے رہ گئے تھے۔

پورا وجود کرب و اذیت کی عبارت بنا ہوا تھا۔ چہرہ بھیانک ہو کر اپنی شناخت کھو چکا تھا۔ پچکے پچکے رخساروں کی جلد پھٹ کر گوشت باہر نکل آیا تھا اور آنکھیں اس اذیت پر ابل گئی تھیں۔ ہونٹ آدھے نیلے اور آدھے اپنی جگہ سے غائب ہی ہو گئے تھے۔ اس کی شکل دیکھنا کسی کمزور دل والے کے بس کی بات نہیں رہی تھی۔ معاً دروازے پر دستک ہوئی۔

ایک بار، دو بار، لگاتار، پھر کوئی ناب گھما کے اندر آ گیا۔

"توما!"

"توما۔ او مائی گاڈ۔" اندر داخل ہونے والا وجود تیزی سے اس کی طرف بڑھا۔

"توما۔" زمین پر گرے وجود کو سیدھا کرتے اس کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ سامنے کیسا منظر اس کا منتظر ہے۔ وہ توما نہیں تھی۔ ایک بھیانک مسخ شدہ چہرہ اس کے سامنے تھا۔ اگلے ہی لمحے پورا کمرا اس کی دردناک چیخوں سے گونج اٹھا تھا۔

☆ ☆ ☆

اس کا وجود اس پر بیتنے والی سیاہ راتوں کا منہ بولتا ثبوت تھا لیکن وہ اتنی جلدی یقین کرنے کے قابل نہیں تھا۔

"تم..." اس کے منہ سے سرگوشی نما سرسراہٹ نکلی۔ "تم پریگننٹ ہو شمائل!" اس کی آواز ایک ہلکی سرگوشی سے زیادہ بلند نہیں تھی۔

"ہاں میں ماں بننے والی ہوں۔" وہ اس کے سامنے کھڑی اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بول رہی تھی۔ وہ بے یقینی سے اسے دیکھتا کھڑا ہو گیا تھا۔

"تمہاری شادی ہو گئی۔ مجھے کسی نے بتایا تک نہیں۔" وہ جان بوجھ کے سمجھنا نہیں چاہتا تھا۔ اس نے اس کا دوپٹا اٹھایا اور نرمی سے اس کے سر پر ڈال دیا۔

"میری شادی نہیں ہوئی صاحب۔" شائل اسے کسی غلط فہمی میں نہیں رہنے دینا چاہتی تھی۔

"میری شادی نہیں ہوئی پھر بھی میں ماں بننے والی ہوں۔" اس کی آنکھیں بے قراری سے دائیں بائیں بھٹک رہی تھیں۔ جیسے گھپ اندھیرے میں اپنی رہائی کے لیے روزن تلاش رہی ہوں۔ اس کا انتہائی لرزتا ہوا لہجہ۔ لمحہ لمحہ تیز ہوتا گیا۔ زریاب کو اپنے سینے میں دھمک محسوس ہونے لگی۔

"اور میں۔ میں نہیں جانتی اس بچے کا باپ کون ہے۔" زریاب کو اپنا وجود منوں وزنی بوجھ تلے دبتا ہوا محسوس ہوا۔ اس نے دونوں ہاتھوں کی مٹھیوں میں اپنے بال جکڑ لیے تھے۔

"میں نہیں جانتی۔ میں نہیں جانتی۔" اس کی کیفیت بے بس ہو چکی تھی۔ وہ اب جنونی انداز میں اپنے بال نوچ رہی تھی۔ "میں نہیں جانتی۔ مجھے نہیں پتا۔ مجھے نہیں پتا۔"

اس کی آواز تیز چیخوں میں بدل گئی۔ رسولن دوڑی آئی۔ زریاب اپنی جگہ ساکن سا کھڑا تھا۔

رسولن کے بوڑھے وجود نے نحیف بازوؤں میں بھر کے اسے باہر کی سمت دھکیل دیا۔ اس کے بال بکھر چکے تھے۔ اوڑھنی گر گئی تھی۔ کمرے میں اب خاموشی تھی۔ شائل کی چلاتی آوازیں دور ہوتی جا رہی تھیں۔ اسے لگا اگر وہ چند لمحے یہیں کھڑا رہا تو یقیناً" مفلوج ہو جائے گا۔ اس نے تھوک نگل کر خشک لبوں پر زبان پھیری۔

پھر گہری سانس بھر کے اپنے زندہ ہونے کا یقین کیا اور تیز تیز قدم اٹھاتا وہاں سے چلا گیا۔ ملازمین کے کوارٹرز دور ضرور تھے، لیکن سامنے نظر ڈالتے ہی نظر آجاتے تھے مگر وہ وہاں نظر نہیں ڈالنا چاہتا تھا۔

☼ ☼ ☼

مسز رباب بے حد ماؤف ذہن کے ساتھ سر کو ہاتھوں میں تھامے بیٹھی تھیں۔

آج ان کی شخصیت میں وہ مخصوص دمک مفقود تھی جو دیکھنے والے کو پہلی نظر میں متاثر کر دیتی تھی۔ وہ بار بار اضطراب سے بالوں میں انگلیاں چلاتیں۔ انہیں سنوارنے کی کوشش میں مزید بگاڑ چکی تھیں۔

"ایک وہ ذلیل میری جان کو رو رہی ہے بیٹھ کے اور اب یہ دوسری نحوست۔" ان کے انداز' ان کی ہر پریشانی کو چیخ چیخ کر بیان کر رہے تھے۔

وہ نیمہ عرف نوما پر بہت بھروسا کرنے لگی تھیں۔ ایک بار "ہلمز" سے لگ جانے کے بعد اس نے انہیں کبھی شکایت کا موقع نہیں دیا تھا۔ وہ کبھی خواب میں بھی نہیں سوچ سکتی تھیں کہ وہ اس طرح کی جاہلانہ جرات بھی کر سکتی ہے۔ اگر انہیں ایک فیصد بھی اندازہ ہوتا تو شاید وہ کبھی اسے اکیلا نہ چھوڑتیں اور دوسری طرف شائل نے انہیں پریشان کر ڈالا تھا۔ وہ پریگنینٹ ہو چکی تھی یہ بات سن کر وہ اچھی خاصی چراغ پا ہوئی تھیں۔ "یقیناً" وہ میڈیسن لینے میں ہیرا پھیری کرتی رہی ہے لیکن کب اور کیسے۔" رسولن تک اس بات سے مکمل انجان تھی۔

زریاب کی آمد پر تو انہیں زمین آسمان اپنے سامنے گھومتے ہوئے لگ رہے تھے۔ ابھی نیمہ والا معاملہ ٹھنڈا نہیں پڑا تھا۔ انہیں اپنے پورے پورے تعلقات اور اختیارات کا استعمال کرنا پڑا تھا۔ تب کہیں جا کے دبئی اعلا حکام کے ذریعے اس کیس کو پولیس کیس بننے سے بچایا تھا۔ وہ اپنے ملک میں جو چاہے کرتی پھرتیں مگر بیرون ملک یقیناً" کسی اسکینڈل کی متحمل نہیں ہو سکتی تھیں۔ اس واقعے کی دھول ابھی بیٹھی نہیں تھی کہ زریاب کے ان کے پاس فون پر فون آنے لگے۔ اس کا ایک ہی تقاضا تھا۔ وہ ان سے ملنا چاہتا تھا۔ جبکہ وہ ابھی اس پوزیشن میں نہیں تھیں۔ انہیں شائل کے لیے ابھی ایک نئی کہانی تیار کرنی تھی۔ ایک ایسی کہانی جس میں وہ بے گناہ ثابت ہوں اور شائل کے ساتھ ہونے والی زیادتی بلکہ زیادتیوں کی تفصیل بھی نہ بتانی پڑے۔ سیل کی بجتی ہوئی ٹون نے انہیں سوچوں کے سمندر سے نکالا۔ دکھتا ہوا سر اٹھا کے انہوں نے سیل اسکرین کو دیکھا۔

"زریاب کالنگ!" زریاب کی کال آ رہی تھی۔

انہوں نے لائن کاٹ کے سیل آف کر دیا۔ انہیں سر کے درد میں اضافے کا احساس ہو رہا تھا۔ چند لمحے بعد انہوں نے سر اٹھایا۔ ان کی سیکریٹری کھڑی تھی۔

"مس رائنہ! میری طبیعت ٹھیک نہیں۔ آج کی تمام اپائنٹمنٹس کینسل کر دو۔ آئی ایم گوئنگ ٹو ہوم۔"

"اوکے میم۔"

"اور سنو۔" کچھ سوچ کر انہوں نے اسے مخاطب کیا۔

"پاکستان میں موجود تمام "ورکنگ گرلز" میں یہ بات پھیلا دو کہ نوما کی ڈیتھ ایک روڈ ایکسیڈنٹ میں ہوئی ہے۔ کچھ بدخواہ اسے زبردستی سوسائیڈ کیس بنانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ اس کے گروپ کی دوسری تمام لڑکیوں اور گروپ انچارج انیلا رضوی کو بھی یہ خبر پہنچا دو۔"

"اوکے میم۔"

انہوں نے ایک گہری سانس لے کر اپنے آپ کو سنبھالا اور مضبوط قدم اٹھاتی باہر نکل گئیں۔

☼ ☼ ☼

وہ پورے انہماک سے آٹا گوندھنے میں مگن تھی۔ ذہن جانے کس سمت جا نکلی تھی۔ اس کی شکل سے اندازہ لگانا مشکل تھا۔

"میں پوچھتی ہوں۔ آخر اس میں برائی کیا ہے۔" امی ابھی تک اسی بات کو لیے بیٹھی تھیں جس سے الجھ کر وہ کمرے سے نکل آئی تھی۔

"اور میں پوچھتی ہوں۔ اچھائی کیا ہے۔" اس کے لہجے میں اطمینان تھا۔

"اے لو کوئی ایک۔ اچھائیاں ہی اچھائیاں ہیں۔ تمہارا گھر بس جائے۔ اس سے اچھی بات اور کیا ہوگی۔ اور وہ نیک شریف ہے۔ کماؤ پوت ہے۔"

"امی!" اس نے کوفت سے گندھا ہوا آٹا اٹھا کر سلیب پر پٹخ دیا۔

"مت پڑیں میرے پیچھے۔ نہیں کرنا مجھے شادی۔" اس کی شکل بگڑ گئی۔

"پھر وہی ضد۔ کیوں نہیں کرنی۔ کوئی وجہ بھی تو ہو۔" امی ذرا کی ذرا چپ ہو کے پھر شروع ہو چکی تھیں۔

"کوئی وجہ نہیں میں کیا وجہ بتاؤں آپ کو۔" گیس کا بٹن پورا کھول کر اس نے جلتی ہوئی تیلی اس میں جھونکی۔ بھڑ بھڑ آگ جل اٹھی۔ اسے لگا امی نے بھی ایسی ہی ایک جلتی ہوئی تیلی پھینک کر اس کی زندگی جلا کر راکھ کر دی۔

"اتنا اچھا رشتہ بیٹھے بٹھائے گنوا دوں؟"

"کوئی کتنا بھی اچھا ہو۔ مجھے اس کی اچھائیوں' برائیوں سے کوئی سروکار نہیں ہے۔" اس کا لہجہ اٹل تھا۔ امی مایوس ہو گئی تھیں۔

"کبھی نہ کبھی زندگی میں بے تکے فیصلے بھی کرنے پڑتے ہیں اور بے سر پیر کے جھوٹ بھی بولنے پڑتے ہیں۔" چولہے سے نکلتی تپش سے بے نیاز وہ وہیں کھڑی سوچے گئی۔

☼ ☼ ☼

اس وقت صبح کے سات بجے تھے۔

زریاب نے جان بوجھ کر یہ وقت منتخب کیا تھا۔ اسے محسوس ہو گیا تھا کہ رباب آنٹی اس سے ملنے سے کترا رہی ہیں اور وہ صاف منع بھی نہیں کر سکتیں۔ اس لیے حیلے بہانوں سے اسے ٹال رہی ہیں۔ سوجی آنکھوں کو بمشکل کھولے وہ بڑے مرے مرے قدم اٹھاتی ساڑھے آٹھ بجے ڈرائنگ روم میں داخل ہوئیں۔ ملازمہ نے سات بجے ہی ان کو زریاب کی آمد کی اطلاع دے دی تھی اور ان کی نیند تب ہی اڑ گئی تھی۔

"تم نے اسے بتا دیا کہ میں گھر پر ہوں۔" صبح کے سات بجے اس سوال کی کوئی تک نہیں تھی۔

"جی بیگم صاحب!" انہوں نے دل ہی دل میں اسے گالیوں سے نوازا۔ پھر بولیں۔

"کہہ دو میں ابھی سو رہی ہوں۔ تھوڑی دیر پہلے ہی سوئی ہوں۔ ایک بجے تک اٹھوں گی۔ آپ تب آجائیے گا۔" انہوں نے کہلوا کر اطمینان کر لیا تھا مگر ملازمہ الٹے پیروں واپس آگئی۔

"وہ کہہ رہے ہیں میں انتظار کر لوں گا اور تب تک شاہل سے بھی مل لوں گا۔" ان کے پیروں تلے سے زمین نکل گئی۔

"کہاں ہے وہ ابھی ڈرائنگ روم میں ہے نا۔ گیا تو نہیں کوارٹرز کی طرف۔" ان کی آواز تک سے گھبراہٹ مترشح تھی۔

"اچھا تم ایسا کرو۔ مشہل کو جگاؤ اور کہو اس منحوس کو لے کر ابھی گاؤں نکل جائے اپنے۔" ملازمہ نے سمجھ کے سر ہلایا۔

"اور سنو۔" انہوں نے مزید تانے بانے بنے۔

"زریاب کو ناشتا دو۔ وہ اٹھ کر باہر نہ جانے پائے اور مشہل سے کہنا۔ بیگم صاحبہ نے کہا ہے پانچ منٹ بعد اس کوٹھی میں دکھائی مت دینا۔"

"جی۔" ملازمہ پلٹی۔

"اور سنو۔" انہیں جیسے مزید کچھ یاد آیا۔

"آ... آ... زریاب سے کہو۔ بیگم صاحبہ تھوڑی دیر میں آرہی ہیں۔ اتنی جلدی ان سے اٹھا نہیں جا رہا۔ وہ اطمینان سے ناشتا کرے اور... اگر وہ شاہل کا پوچھے تو کہنا کہ بیگم صاحبہ نے اس کی شادی کروا دی اور اسے اس کے سسرال بھجوا دیا گاؤں۔" ملازمہ کے جانے کے بعد وہ کمرے میں بے چینی سے ٹہلنے لگیں۔

وہ کسی قیمت پر زریاب سے ملنا نہیں چاہتی تھیں اور ذہنی طور پر اس پیشی کے لیے تیار ہی نہیں تھیں۔ ان کا خیال تھا زریاب کچھ دیر ان کا انتظار کر کے وہاں سے چلا جائے گا پھر بھی وہ اسے مطمئن کرنے کے لیے ایک بہت مربوط کہانی بن رہی تھیں۔

اب نیند کس کم بخت کو آنی تھی۔

آٹھ بجے ان کے پوچھنے پر ملازمہ نے یہ حوصلہ شکن جواب دیا کہ زریاب نے ناشتا نہیں کیا۔ وہ گھر سے کر کے آیا ہے اور ابھی تک ڈرائنگ روم میں انتظار کر رہا ہے۔ انہوں نے بے اختیار ایک گہری سانس کھینچ کر خود کو پرسکون کیا۔

"اوکے اس سے کہو۔ میں آتی ہوں۔"

منہ پر پانی کے چھینٹے مار کر انہوں نے باقی حلیے کو یونہی بکھرا رہنے دیا تھا۔ وہ اپنی شخصیت سے پورا تاثر دینا چاہتی تھیں کہ وہ صرف اس کے انتظار کرنے کی وجہ سے کچی نیند سے اٹھ کے آئی ہیں۔ کمرے سے نکلنے سے پہلے انہوں نے کھڑکی سے پورچ میں کھڑی اپنی گاڑی کی غیر موجودگی کا یقین کیا۔ مشہل یقیناً شاہل کو لے کر وہاں سے جا چکا تھا۔

"کیا زریاب! اتنی سی بات کے لیے اس پاگل کے لیے پریشان تھے تم۔" وہ یوں بولیں۔ گویا جس واقعے نے تمہاری نیندیں حرام کر دی ہیں۔ وہ تو اصل میں کوئی بات ہی نہیں تھی۔

"نہ یہ اتنی سی بات ہے۔ نہ وہ لڑکی پاگل ہے۔" وہ انہیں کچھ ناراض سا لگا۔ یقیناً "شاہل کی بربادی کا ذمہ دار وہ انہیں سمجھ رہا تھا جو کہ حقیقت میں کچھ ایسا غلط بھی نہ تھا۔

"دیکھو زریاب جیسا تم سوچ رہے ہو۔ ویسا کچھ بھی نہیں ہے۔" اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔

"شاہل کی اس حالت کی ذمہ دار میں نہیں۔ وہ خود ہے۔" وہ نا سمجھی سے الجھ کے انہیں دیکھنے لگا۔

"معاشقہ چل نکلا تھا اس کا میرے نئے ملازم کے ساتھ، بلکہ میرے لیے تو دونوں ہی نئے تھے۔" انہوں نے بات میں ایک ڈرامائی وقفہ دیا۔ "میں اسی لیے بغیر چھان بین کے کسی کو اپنے پاس نہیں رکھتی اور وہ بھی کل وقتی ملازمت۔ شاہل کو تم لے کر آئے تھے اس لیے میں نے کچھ نہیں کہا۔ بغیر سوچے سمجھے روٹی، کپڑا، چھت، روزگار سب کچھ دیا اسے۔" انہوں نے زریاب پر احسان جتانے کی کوشش کی۔

"ایک تو وہ بھی کم عمر لڑکا تھا۔ شاہل کی عمر کا ہی ہو گا۔ دوسرے اس کا تعلق بھی انٹیریئر سے تھا۔ دونوں ہی جوان تھے اور ایک دوسرے کی زبان سمجھتے تھے۔ وہ بھی سیلاب کی بربادیوں کا مارا تھا۔ یہ بھی۔ دکھ سکھ کہہ لینے میں کوئی برائی نہیں تھی مگر مجھے کیا پتا تھا کہ یہ کھیل کھیلنے لگیں گے۔ جمعہ جمعہ آٹھ دن ہوئے نہیں تھے اسے آئے۔ دیا ہو گا شادی کا جھانسہ اور یہ بیگم صاحبہ آگئیں اس کے دام میں۔" انہوں نے اپنی شکل ایسی کر لی گویا انہیں بھی شاہل سے اس بد اطواری کی امید نہیں تھی۔ کن انکھیوں سے زریاب کو دیکھ کر اندازہ لگایا کہ اس پر ان کی کہانی کا اثر ہو رہا تھا۔

"مجھے تو تب پتا چلا جب وہ چھٹیاں لے کر نکل گیا گاؤں اور واپس ہی نہیں آیا۔"

"پھر؟" زریاب کو کھوئی کیفیت میں گھر گیا۔

"پھر کیا۔ مجھے تو جب پتا چلا۔ میں نے تو شامت بلا دی اس کی۔" وہ جیسے ساری کہانی مکمل کر کے اطمینان سے بیٹھ گئیں۔ زریاب سر جھکائے سوچ میں ڈوب گیا۔ شاہل کی حالت کچھ اور کہتی تھی اور رباب آنٹی کی کہانی کچھ اور۔

"مجھے ابھی آپ کی میڈ نے بتایا کہ آپ نے اس کی شادی کر دی۔" اس کی آواز میں ابھی بھی شک بھرا ہوا تھا۔

"تو اور کیا کرتی پھر اتنے اثر و رسوخ والی عورت ہوں۔ ایک معمولی سے بندے کا پتا لگانا میرے لیے مشکل تھا کیا۔ اوفوہ زریاب!" انہوں نے اکتانے کی جاندار اداکاری کی۔

"اتنے فکر مند کیوں ہو رہے ہو اس کے لیے ذہنی حالت بگڑتی جا رہی تھی اس کی۔ تم ملے تو تھے اندازہ ہوا تو تھا ہو گا تمہیں۔" انہوں نے بڑے دھیان سے اس کا چہرہ جانچا۔

"ہوں۔" وہ پر سوچ انداز میں سر ہلا کر رہ گیا۔

"مجھے بہت دکھ ہوتا تھا اسے دیکھ دیکھ کر۔ میں نے تو کہا تھا کہ... مگر وہ مانی ہی نہیں۔ اس پر اس کی بہکی بہکی باتیں اور اتنی رف کنڈیشن۔ مجھے ڈر تھا وہ کہیں اپنے آپ کو کوئی نقصان نہ پہنچا لے۔" انہیں اندازہ تھا۔ شاہل سے ہمدردی ہی ان کے لیے سود مند رہے گی۔

انہیں خود بھی اپنی صلاحیتوں پر بہت بھروسا تھا اور زریاب تو یوں بھی دل و ذہن کا صاف اور شریف آدمی تھا۔ اوپر سے رباب آنٹی پر اس کا اعتبار اور بھروسا کوئی ایک دو دن نہیں، سالوں پرانا تھا۔ اس نے ایک گہری سانس لے کر خود کو ڈھیلا چھوڑ دیا۔ مسز رباب بہت دھیان سے اس کی ایک ایک حرکت نوٹ کر رہی تھیں۔

"دیکھو زریاب!" وہ بہت ہمدردی سے اٹھ کر اس کے پاس آبیٹھیں۔ "تم میرے لیے بیٹے جیسے ہو۔" انہوں نے آستین سے بے نیاز ہاتھ اس کے کاندھے پر ٹکایا۔

"اللہ نہ کرے۔" زریاب کے دل سے بے اختیار صدا نکلی۔ وہ ابھی تک اپنے نائٹی میں ملبوس تھیں۔ زریاب سے نظر اٹھا کے ان کی طرف دیکھنا مشکل ہو رہا تھا۔

"اس لیے بہت خلوص سے تمہیں مشورہ دے رہی ہوں۔ کسی کے دکھ میں اس سے ہمدردی کرنا اچھی بات ہے، لیکن دوسروں کے مسائل کو اتنا سر پر سوار مت کیا کرو کہ جینا مشکل ہو جائے۔ زندگی میں اپنے دکھ کیا کم ہیں جو تم دوسروں کے روگ بھی پال لیتے ہو۔"

زریاب بنا کچھ کہے اپنے ہاتھوں کو گھورتا رہا۔

☼ ☼ ☼

وہ آج بہت دن کے بعد اپنا لاکر صاف کروا رہا تھا۔ پچھلے چند مہینے اتنے اپ سیٹ گزرے تھے کہ اس نے اپنے آفس روم، کیبنٹس اور لاکر کی طرف بالکل توجہ نہیں دی تھی۔ وہ اکتایا ہوا کرسی پر بیٹھا تھا۔ اسی وقت قفل والے نے ایک لفافہ اسے پکڑایا۔

"یہ آپ کے نام کی رجسٹری آئی تھی جی۔ بہت دن ہو گئے۔" اس نے سرسری انداز میں دیکھا۔ پھر چونک گیا۔ اس پر دبئی کی مہر تھی۔

وہ تیزی سے لفافہ چاک کرنے لگا۔

اندر موجود تحریر نے اس کی توجہ کھینچ لی تھی۔

"میرے بہت اچھے دوست زریاب!
یہ میں ہی ہوں نعیمہ۔
جب تم یہ خط پڑھ رہے ہو گے۔ میں اس دنیا سے جا چکی ہوں گی۔ شاید یہی میری قسمت تھی‘ یہی نصیب۔ میں نے یہ خط تمہیں صرف یہ کہنے کے لیے لکھا ہے کہ ہو سکے تو امی اور مجھے معاف کر دینا۔ انہوں نے تم سے جھوٹ بولا تھا۔ رشنا تمہاری بہن نہیں ہے۔ نہ سگی نہ رضاعی۔ وہ صرف تمہاری خالہ زاد تھی۔ جس سے نہ تمہاری پسندیدگی کوئی جرم تھی۔ نہ نکاح کوئی گناہ۔

امی چاہتی تھیں تمہاری شادی مجھ سے ہو جائے۔ شاید میں خود بھی یہی چاہتی تھی مگر زندگی مجھے اس جھوٹ کی سزا اتنی بھیانک شکل میں دے گی۔ مجھے پتا ہوتا تو کبھی تم سے جھوٹ نہ بولتی۔

تم نے مجھے پہچان لیا۔

میری بدقسمتی پر لگنے والی آخری مہر وہ پہچان کے رنگ تھے جو تمہاری آنکھوں میں میں نے اس وقت دیکھ لیے تھے۔ جب تم نے مسز رباب کی پارٹی میں مجھے دیکھا تھا۔ مسز رباب سے میرا کیا رشتہ تھا۔ میں وہاں تک کیسے پہنچی اور کیوں؟ یہ ایک الگ کہانی ہے۔

میں نے جو انکشاف اس خط کے ذریعے تم پر کیا ہے۔ میں نہیں سمجھتی اسے جان لینے کے بعد تم مزید کوئی آگہی برداشت کرنے کے متحمل ہو سکو گے۔ سو اس بحث کو لاحاصل جان کر یہیں ختم کر دو اور بھول جاؤ کہ زندگی میں کبھی تم نعیمہ نام کی کسی لڑکی کو جانتے بھی تھے۔

بس ایک آخری گزارش یہ ہے کہ میری ماں کو میری حقیقت کا علم کبھی نہ ہونے دینا۔ اب تک تو وہ مجھ پر رو دھو کر صبر کر چکی ہوں گی جو بھی کہانی تم کو سنائیں۔ خدارا اس پر یقین کر لینا۔

فقط تمہاری معافی کی طلب گار‘ ایک گناہ گار‘ لیکن پشیمان لڑکی۔"

کاغذ اس کے ہاتھ میں اٹکا رہ گیا۔ اس نے بہت تیزی سے سامنے کے منظر کو دھندلاتا اور پھر نمی کو آنکھوں سے نکل کر رخساروں پر بہتا ہوا محسوس کیا۔

"سائیں۔ سائیں!" فضل داد نے نرمی سے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا‘ لیکن وہ اس وقت وہاں موجود ہی نہیں تھا۔ فضل داد نے جو اپنے اتنی مضبوط شخصیت والے سرکار سائیں کو روتے دیکھا تو گھبرا کے آفس سے نکلا۔

وہ آئمہ کے کمرے کی طرف جا رہا تھا۔

❁ ❁ ❁

اپنی ہی سوچوں میں گم اس نے بنا پوچھے دروازہ کھول دیا تھا۔

"آپ!" سامنے کھڑے بابر سلطان کو دیکھ کر اس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ کیا کہے۔

"میں اندر آ سکتا ہوں۔" اس کا لہجہ بہت مہذب اور سنجیدہ تھا۔ اس نے ایک طرف ہٹ کے اندر آنے کا راستہ دیا اور امی کو بتانے چل دی۔

اس نے امی کو روتے دیکھا اور چائے کا پانی رکھنے گئی۔ ماضی میں ہی سہی بہر حال وہ اس گھر کا داماد تھا۔ امی اسے دیکھ کر ٹھیک ٹھاک جذباتی ہو چکی تھیں۔ بظاہر تو وہ بھی بڑا مغموم نظر آرہا تھا۔

"کیا بتاؤں بس‘ میں تو خود ابھی تک شاکڈ ہوں۔ یقین ہی نہیں آتا کہ وہ اس قدر جلدی‘ اتنی اچانک چلی جائے گی۔ سچ ہی ہے۔ رب کی مرضی کے آگے کسی کی نہیں چلتی۔" وہ بجھے بجھے انداز میں انہیں تسلیاں دے رہا تھا۔

"ہائے میں تو اپنی بچی کی شکل بھی نہ دیکھ سکی۔"

"غم مت کریں آنٹی! یہی حال میرا ہے۔ میں خود کون سا دیکھ سکا اسے آخری ٹائم میں۔ میں خود ہاسپٹلائز تھا۔ کب اس کی ڈیڈ باڈی آئی۔ کب تدفین کر دی۔ بس جب ہوش آیا تو پتا چلا کہ اس کی حالت اتنی خراب ہو چکی ہے کہ زیادہ دیر تک رکھ نہیں سکتے تھے۔ اور پاکستان لے کر کون آتا۔ مجھے تو اپنا ہی ہوش نہ تھا۔" وہ سر جھکائے دھیرے دھیرے بول رہا تھا۔ رشنا یہ ساری تفصیل فون پر سن چکی تھی۔

"آپ کو کتنے دن ہوئے پاکستان آئے۔" اس نے بہت اچانک ہی سوال کیا تھا۔ اس نے سنبھل کر رشنا کو دیکھا اور پھر اس کی نگاہیں گویا جم سی گئیں۔

"میں کل ہی تو پہنچا ہوں۔ پندرہ دن پہلے اسپتال سے ڈسچارج ہوا۔ پھر کچھ دن بیڈ ریسٹ کیا۔"

اس نے کوئی تبصرہ نہیں کیا۔ وہ اس کی گہری نگاہیں اپنے وجود پر محسوس کر کے الجھ رہی تھی۔

"لیکن سچ پوچھیں تو ایک بے چینی سی لگ گئی تھی دل کو۔ جب تک آپ سے مل نہ لوں‘ چین نہیں پڑے گا جی کو۔" وہ چائے کا خالی کپ میز پر رکھ کر پھیل کر بیٹھ گیا۔ وہ اس کی گہری نگاہیں اپنے وجود پر محسوس کر کے الجھ رہی تھی۔ یقیناً" اس کا ابھی مزید بیٹھنے کا ارادہ تھا۔

وہ جز بز سی ہوئی کیوں کہ زیادہ دیر تک اس کی آرپار ہوتی نظریں برداشت نہیں کر سکتی تھی۔

❁ ❁ ❁

گاڑی تیزی سے اپنی منزل کی طرف رواں دواں تھی۔

وہی پرانے راستے تھے مگر آج جیسے گم گشتہ منزلیں اس کے انتظار میں تھیں۔ فضل داد ڈرائیو کر رہا تھا۔ اس کی آنکھیں خوشی کا ایک الگ ہی رنگ لیے باہر کے مناظر پر پھسل رہی تھیں۔ ہونٹوں پر بھی بڑی جاندار ہونے والی مسکراہٹ تھی۔ آنکھوں کی دہلیز نم تھی مگر خوشی اس کے دل میں ایسے پر پھیلائے کھڑی تھی کہ کوئی آنسو کی ایک بھی بوند دل کی اس ہریالی کھیتی پر گرنے نہیں دے رہی تھی۔ ماضی میں گزرا اک اک پل اس کی نگاہوں میں کسی فلم کی طرح چل رہا تھا۔

سورج کی روانی کا منظر تھا۔ وہ مغرب میں ڈوبتے نارنجی گولے کی شعاعوں کی خوب صورتی بھی اپنے دل پر محسوس کر رہا تھا۔ فضا میں مغرب کے بعد کا اندھیرا بڑھتا جا رہا تھا۔ جب کسی کے رونے کی بہت ہلکی سی آواز اس کے کانوں میں پڑی۔

جس طرح وہ سن کے ایک دم چونکا تھا اسی طرح فضل داد کا پاؤں بھی بے اختیار بریک پر جا پڑا تھا۔ یہ کسی چھوٹے سے گاؤں کی حدود تھیں۔ سے کچے گھروں کی رسوئیوں سے خوشبودار دھواں اٹھ کے فضاؤں میں گھل مل رہا تھا۔

"تم یہ آواز سن رہے ہو نا فضل!"

"جی سائیں پر۔" اس کا انداز رکا رکا سا تھا۔ "یہ قبرستان کی پیچھے والی دیوار ہے اور سائیں وقت بھی مغرب کا ہے۔"

"تو۔"

"سائیں ایسے وقت میں ایسی جگہوں پر۔" وہ سمجھ گیا تھا وہ کیا کہنا چاہ رہا تھا۔

"فضول باتیں نہ کرو اندر چلو۔ گاڑی گھماؤ جلدی۔"

گاڑی گھما کے وہ دروازے کے سامنے لایا اور فضل کو ساتھ لے کر اندر کی طرف بڑھ گیا۔ قبرستان کا رقبہ زیادہ بڑا نہیں تھا۔ اسی لیے انہیں آواز کے منبع تک پہنچنے میں دشواری نہیں ہوئی۔

اور پھر وہاں جو منظر اس نے دیکھا۔

اس کے ہوش اڑانے کے لیے کافی تھا۔

فضل نے بہت احتیاط سے روتے ہوئے بچے کو اٹھا کر اپنی گرم شال میں لپیٹ لیا جبکہ وہ ہارے ہوئے جواری کی مانند گھٹنے زمین پر ٹکا کر گر سا گیا۔

ایک زندگی کی حرارت سے آزاد مجبور‘ لیکن معصوم وجود خدا کے حضور قسمت کی اس بے وفائی پر شکوہ کناں تھا۔ اس نے اس کا بے جان اور لاچار وجود اٹھا کے باہوں میں بھر لیا۔

"میں تم سے کیسے معافی مانگوں گا شائل!" ضبط کی لاکھ کوششوں کے بعد بھی ایک زخمی آواز اس کے دل سے نکل کر لبوں تک آہی گئی۔

چھوٹا سا گاؤں تھا۔ ذرا دیر میں اس کی وہاں موجودگی کی دھوم مچ گئی۔ اسے اور بچے کو ہاتھوں ہاتھ لیا گیا۔ گاؤں کی بڑی بوڑھیوں نے بچے کی مالش اور غسل وغیرہ کر کے اسے پرسکون کر دیا۔ کوئی بھی شائل کی شناخت نہیں کر سکتا تھا۔ وہ ان کے گاؤں کی تھی ہی

نہیں۔ گور کن سے بات کر کے قدرے الگ تھلگ سی جگہ پر اس کی قبر بنوائی۔ اس نے کانپتے ہاتھوں سے اسے سپرد خاک کر کے مٹی ڈالی۔
قفل والے نے اپنے سائیں کو کبھی اتنا مغموم نہیں دیکھا تھا۔ جتنا ان دو دنوں میں۔

☆ ☆ ☆

"یہ اچھائی کیا کم ہے کہ ایک بار پھر وہ یہیں چلا آیا۔" وہ کچھ کہے بنا ان کی عقل پہ ماتم کرتی نگاہوں سے دیکھتی رہی۔
"اس چلے آنے نے ہی تو کھٹکا دیا ہے مجھے۔"
"اس میں کھٹکنے کی کیا بات ہے۔"
"کھٹکنے کی بات ہے امی! اتنا امیر کبیر آدمی' ایک ایسی غریب لڑکی سے شادی کرنا ہی کیوں چاہتا تھا جس کے پاس نہ خوب صورتی تھی نہ تعلیم' نہ اس کی کلاس کے ادب آداب۔ چلو' مانا کہ نیکی کرنے کا خیال اس کے دل میں آ گیا یا اس کا سر پھر گیا۔
مگر اب اس کے گزر جانے کے بعد وہ دوبارہ پھر اس بے نام و نشان گھر کی دوسری لڑکی سے شادی رچانے آ گیا۔ کچھ تو عقل کے ناخن لیں امی! انسان ایک بار کیچڑ میں گرا کنول اٹھا سکتا ہے' لیکن بار بار نہ تو وہ سارے کنول اٹھا سکتا ہے' نہ اپنے کوٹ کے کالر میں سجا سکتا ہے۔"
"کہنا کیا چاہ رہی ہے تو۔"
"صرف یہ کہ وہ اتنا بھی سیدھا نہیں ہے جتنا آپ کو لگتا ہے۔" اسے اس کی گستاخ نظریں یاد آئیں۔
"اس کے دوبارہ یہاں آنے میں کوئی نہ کوئی غرض ہے۔ جو فی الحال مجھے نظر نہیں آ رہی' لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ اس بار بھی سب کچھ پہلے جیسا اس کی مرضی کے مطابق ہوتا رہے گا۔"
"کیا مطلب؟" امی ٹھٹک گئیں۔
"مطلب یہ کہ میں اس سے شادی کروں گی تو اسے اتنی اجازت دوں گی کہ وہ جب چاہے یہاں آ جائے۔" اس کا لہجہ حد درجے تیز تھا۔

"وہ داماد ہے میرا۔"
"بے نہیں تھا۔" وہ چیخ کر بولی اور بالٹی میں رکھے کپڑے زور زور سے جھٹک کر الگنی پر ڈالنے لگی۔
امی کی بڑبڑاہٹیں شروع ہو چکی تھیں' لیکن اسے پروا نہیں تھی۔

☆ ☆ ☆

وہی سفر تھا۔ وہی راستے۔ وہی سوچیں۔ بس اس سفر میں ان دونوں کے ساتھ ایک ننھے وجود کا اضافہ ہو چکا تھا۔
زریاب نے اس کا معصوم چہرہ دیکھا اور پیشانی چوم لی۔ پورے چاند کا سفر جاری تھا اور اس کی رنگا رنگ رتوں کا بھی۔
ابھی اسے رابعہ کو فون کر کے اس حقیقت سے آگاہ کرنا تھا جو اس کی زندگی کا روگ بن گئی تھی مگر در اصل حقیقت تھی ہی نہیں اور اس معصوم جان اور اس کی بے گناہ ماں پر بیتنے والی ناانصافی کا ذکر بھی کرنا تھا۔
مسز رباب کی اصلیت اس پر آشکار ہو چکی تھی' لیکن وہ اپنے کیفر کردار کو پہنچ چکی تھیں۔ ایک ایکسیڈنٹ کے نتیجے میں وہ مفلوج ہو گئی تھیں۔ ریڑھ کی ہڈی پر شدید چوٹ آئی تھیں۔ ان کی بینائی بھی کھو چکی تھی۔ ایک اندھی' مفلوج عورت عبرت کا نشان تھی۔ وہ انہیں دیکھ کر کچھ نہ کہہ سکا تھا صرف اتنا ہی منہ سے نکلا تھا۔
"یہ سزا تو دنیا میں ملی ہے۔ آخرت ابھی باقی ہے۔ اگر کچھ بھلائی کے کام کر سکتی ہیں تو کر لیں۔ جن لڑکیوں کو آپ نے اپنے گناہوں میں شامل کیا ہے انہیں آزاد کر دیں۔"
مسز رباب کی آنکھوں سے دو آنسو نکلے تھے۔

☆ ☆ ☆

وہ آج پھر آیا بیٹھا تھا اور اس کا آنا اب تو روز کا معمول بن گیا تھا۔ امی کی شہ پا کر اس کی ہمت اتنی بڑھ گئی تھی کہ وہ اس سے دوبدو شادی کی بات کرنے بیٹھ

گیا۔ رشنا کا جی چاہا سامنے رکھی ٹرے اٹھا کے اس کے سر پہ دے مارے۔
"میں آل ریڈی کمٹڈ ہوں۔ آپ سے شادی نہیں کر سکتی۔ نہ کرنا چاہتی ہوں۔" اس نے سخت تحمل سے بات مکمل کی۔
"آپ کی کمٹ منٹ والی بات کی حقیقت سے میں واقف ہوں۔" اس کے لبوں پر ایک زہریلی مسکراہٹ تھی۔
"میری مرضی۔ اس سے بہتر جواب نہیں ہے میرے پاس۔"
"یہ تو میرے سوال کا جواب نہ ہوا نا۔" وہ حد درجے مطمئن تھا۔
"بھاڑ میں جاؤ تم اور تمہارا سوال۔" وہ ایک دم ہی اخلاقیات کی تمام حدود پار کر کے آپے سے باہر ہو گئی تھی۔ ایک پل کے لیے اس کی آنکھوں میں سفاکی کی عجیب سی چمک لہرائی۔ وہ جو ایک دم نڈر سی ہو کے کھڑی تھی۔ ڈر سی گئی' لیکن اس پر ظاہر نہیں کرنا چاہتی تھی۔
"براہ مہربانی میری بات مانو۔ روز روز مت آیا کرو۔ میرا دماغ خراب ہوتا ہے اور ریپوٹیشن بھی۔" اس کی ادھوری بات ہونٹوں میں دبی رہ گئی۔
دروازے پر دستک ہو رہی تھی۔ امی دیکھنے کے لیے باہر گئیں اور اس نے اس تنہائی کا فائدہ اٹھا کر اس کی کلائی دبوچ لی۔ وہ حق دق رہ گئی۔ اس کی گرفت اس قدر سخت تھی کہ اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔
"رشنا' میں تمہارا کیا کام ہے' تمہیں پتا ہے۔"
اس کا لہجہ اس کی گرفت اور اس حرکت کے عکس بالکل ٹھنڈا تھا۔ رشنا کی سانس تک رک چکی تھی۔ خوف زدہ نظریں اس کی سفاک آنکھوں میں اٹک گئی تھیں۔
"ایک بار میرے پاس آ جاؤ۔ بہت اچھی طرح سمجھاؤں گا۔"
وہ ابھی بھی اس کی آنکھوں میں دیکھ رہا تھا۔ اس کی اٹکی ہوئی سانس رک رک کر باہر نکلی۔ عین اسی وقت کسی نے کمرے کے دروازے میں قدم رکھا۔

☆ ☆ ☆

وہی گلیاں تھیں۔ وہی کوچے
وہی در و بام تھے۔ وہی چوبارے
یادوں کا دھاگا گرہ گرہ بندھا اس کے دھیان کی پتنگ کو تھامے' تصور کے آسمان پر ڈھیلا اور ڈھیلا ہوتا جا رہا تھا۔
کتنے ہی خوشیوں بھرے' انمول لمحات' دبے پاؤں اس کی یادوں کے تاج محل کی دہلیز تک چلے آئے تھے۔ اس کے ہونٹوں پر دلکش مسکراہٹ تھی۔ آنکھوں میں چمکتی ہوئی نمی۔
کب سوچا تھا اس نے' کسی دن اچانک کسی کا خط اس کے لیے دوبارہ زندگی کی نوید لے آئے گا۔ اور آہ۔ اگر نعیمہ جاتے جاتے اس پر احسان نہ کر جاتی تو۔ اس سے آگے وہ سوچنا نہیں چاہتا تھا۔
اپنی پچھلی زندگی کے گزارے کتنے ویران ماہ و سال۔ اس کے اجڑے دل میں اڑتی جدائی کی دھول کے گواہ تھے۔ وہ دھول جو دن رات کے کتنے ہی لمحوں میں چپکے سے اس کی آنکھوں میں جا پڑتی اور اسے ہر جگہ سے نظریں چرا کے اپنی آنکھیں صاف کرنی پڑتیں۔
اداسی کا ایک لمحہ بہت چپکے سے دل کے کسی کونے سے نکل کر فضا میں تحلیل ہو گیا۔ اس نے دھیان سے موڑ کاٹا۔
وہی زنگ آلود' رنگ اڑا ہوا دروازہ' کچھ اور بھی خستہ حال سا اس کے سامنے تھا۔ چند لمحے تو اس نے اس دروازے کو تکتے ہوئے گزار دیے۔ دائیں ہاتھ کی طرف ذرا اوپر۔ کبھی یہاں کال بیل ہوتی تھی۔
وہ دن رات اسے ٹھیک کرنے کو کہتی رہی اور وہ ٹالتا رہا۔ پھر شاید کبھی کوئی اس پر انگلی رکھنے والا نہ آیا۔ نہ گھر کے مکینوں کو کسی کی آمد کی اطلاع کی ضرورت ہی رہی۔ اس نے سوچوں سے پیچھا چھڑا کر سر جھٹکا اور دستک دی۔ کچھ ہی دیر میں دروازہ کھل چکا تھا۔ ایک بوڑھا مگر جانا پہچانا چہرہ اس کے سامنے تھا۔

"زریاب!" لرزتی ہوئی آواز میں بے یقینی بھر گئی تھی۔ سامنے دھوپ کی چمک میں مسکراتا چہرہ وہ کیسے بھول سکتی تھیں۔

ان مسکراتے لبوں سے ہنسی خود انہوں نے ہی تو نوچی تھی۔ ایک سفاک جھوٹ بول کے۔ ایک لمحے میں خوشی اور غم کے کتنے ہی موسم ان گدلی آنکھوں میں لہرائے۔ وہ ایک قدم پیچھے ہٹ گئیں۔ عجب عالم خود فراموشی ان پر طاری تھا۔ وہ مسکراتا چہرہ ان کی طرف بڑھا اور اس نے ان کو اپنی بانہوں میں بھر لیا۔ خود فراموشی کا طلسم ٹوٹ گیا۔ وہ اس کے سینے پر سر رکھ کے آنسو بہانے لگیں۔ وہ ان کا سر تھپکتا رہا۔

"روشی اندر ہے۔" تھوڑی دیر بعد وہ الگ ہو کے سنبھل کے بولیں۔ وہ کہتے ہوئے بالکل بھول ہی گئیں کہ اندر روشی اکیلی نہیں ہے۔

ڈھیروں آرزوئیں، لبوں سے پھوٹتی بے ساختہ ہنسی اور دل میں اٹھتا گدگدی کا انوکھا احساس لیے وہ اندر بڑھا اور کمرے کی دہلیز پر قدم رکھا۔ لیکن وہاں کا منظر اس کے گمان سے بہت دور تھا۔

ایک اجنبی مرد اور استحقاق سے جکڑی اس کی کلائی۔

اس کا دل ایک لمحے میں پوری زندگی بھلا کر سکڑا۔

سہمی چڑیا کی طرح خوف زدہ نگاہوں سے اسے دیکھتی رشنا اس کی زندگی، حاصل زیست۔ رشنا نے گردن موڑ کر اسے دیکھا۔

"زریاب!" بے آواز سرگوشی لبوں سے نکل کر فضا میں پھیل گئی۔

اس کی کلائی آزاد ہو گئی اور وہ جیسے کسی خواب سے جاگ اٹھی۔

"زریاب!" اب کی بار ایک قدم بڑھا کے اس کے نام کی پکار یوں تھی گویا "یہ تم ہو؟"

"زریاب۔" تمام شرم و حیا بالائے طاق رکھ کر وہ چیخی اور بھاگ کر اس سے لپٹ گئی تھی۔ زریاب نے کسی متاع جان کی طرح اسے سمیٹ لیا تھا۔ اس کا نام کسی تسبیح کے ورد کی طرح لبوں پر جاری تھا اور وہ بری طرح رو رہی تھی۔ زریاب نے اسے اپنے فراخ سینے میں سمو لیا تھا۔ برسوں سے جلتی آگ پر ٹھنڈے چھینٹے پڑ گئے تھے۔

"روشی۔ روشی۔" اور ہر بار اس نے پکارے جانے پر جواب دیا تھا۔ جیسے اس کے ساتھ ساتھ خود کو بھی اس منظر کی سچائی کا یقین دلانا چاہتا ہو۔

یہ چہرہ، یہ آواز، یہ مانوسیت، یہ محبت اس کا اثاثہ کھو گیا تھا۔ آج واپس ملا تھا۔

کمرے میں کھڑا آدمی بالکل غیر محسوس انداز میں ایک طرف سے ہو کر باہر نکلا اور صحن میں نم آنکھوں سے کھڑی امی کو نظر انداز کرتا تیزی سے باہر نکلتا چلا گیا۔ وہ اپنی کار کی طرف جا رہا تھا۔ کبھی واپس نہ آنے کے لیے۔ کیوں کہ وہ زریاب کو جانتا تھا اور مسز زریاب سے اس کے تعلق کو بھی۔

"اب بھی کیوں آئے ہو، میرے مرنے کا انتظار تو کرتے۔" کتنی دیر رو چکنے کے بعد اب وہ ہلکے ہلکے سسک رہی تھی۔

"آج تو یہ بات کہہ دی ہے آئندہ مت کہنا۔" اس نے ہاتھوں کے کٹورے میں وہ مانوس چہرہ تھاما۔

"کیوں کہ بہت سے پیاروں کی جدائی دیکھ چکا ہوں۔ بنا انتظار اور بنا کسی خواہش کے اب کسی کو کھونے کی سکت نہیں ہے۔" اس کی آواز میں صدیوں کے دکھ بول رہے تھے۔

"مجھ میں بھی نہیں ہے۔" دونوں کی آنکھیں نم تھیں مگر وہ جو ہنسی کی گیلی پھوار میں بھیگ رہے تھے۔



نبیلہ عزیز

ماورا مرتضیٰ، عافیہ بیگم کی اکلوتی بیٹی ہے۔ فارہ کے ساتھ یونیورسٹی میں پڑھتی ہے۔ عافیہ بیگم اس کا اپنی سہیلیوں سے زیادہ ملنا جلنا پسند نہیں کرتیں۔ اس کے علاوہ بھی اس پر بہت ساری پابندیاں لگاتی ہیں جبکہ ماورا خود اعتماد اور اچھی لڑکی ہے۔ عافیہ بیگم اکثر اس سے ناراض رہتی ہیں۔ البتہ بی گل اس کی حمایتی ہیں۔

فارہ اپنی ثمینہ خالہ کے بیٹے آفاق یزدانی سے منسوب ہے۔ دو سال پہلے یہ نسبت آفاق کی پسند سے طے پائی گئی تھی مگر اب وہ فارہ سے قطعی لاتعلق ہے۔ فارہ کی والدہ منورہ بیگم اپنی بہن ثمینہ یزدانی سے ملنے کراچی جاتی ہیں۔ آفاق انہیں ایئر پورٹ لینے نہیں جاتا۔ مجبوراً "ساشا" کو جانا پڑتا ہے۔ وہ آفاق کی بدتمیزی پر خفا ہو کر واپس چلی جاتی ہیں۔

منورہ، ثمینہ اور نیوی کے بھائی رضا حیدر کے دو بچے ہیں۔ تیمور حیدر اور عزت حیدر۔ تیمور حیدر بزنس مین ہے اور بے حد شان دار پرسنالٹی کا مالک ہے۔ ولید رحمن اس کا بیسٹ فرینڈ ہے۔ اس سے حیثیت میں کم ہے مگر دونوں کے درمیان اسٹیٹس حائل نہیں ہے۔ نیوی کے بیٹے سے فارہ کی بہن حسنہ بیاہی ہوئی ہے۔

عزت اپنی آنکھوں سے یونیورسٹی میں بم دھماکا ہوتے دیکھ کر اپنے حواس کھو دیتی ہے۔ ولید اسے دیکھ کر اس کی جانب لپکتا ہے اور اسے سنبھال کر تیمور کو فون کرتا ہے۔ تیمور اسے اسپتال لے جاتا ہے۔ عزت کے ساتھ یہ حادثاتی ملاقات ولید کو ایک خوشگوار حصار میں باندھ لیتی ہے۔ عزت بھی ولید کے بارے میں سوچنے لگتی ہے اور ڈھکے چھپے لفظوں میں ولید سے اپنی کیفیت کا اظہار بھی کر دیتی ہے مگر ولید انجان بن جاتا ہے۔

آفاق فون کر کے فارہ سے شادی کرنے سے انکار کر دیتا ہے۔ فارہ بہت روتی ہے۔ ثمینہ اور اشتیاق یزدانی کو علم ہوتا ہے تو انہیں سخت صدمہ ہوتا ہے۔ ثمینہ کی طبیعت بگڑنے لگتی ہے۔

اشتیاق یزدانی، آفاق سے حد درجے خفا ہو کر اس سے بات چیت بند کر دیتے ہیں۔ آفاق مجبور ہو کر شادی پر راضی ہو جاتا ہے۔ فارہ دل سے خوش نہیں ہوپاتی۔ عزت، تیمور کے موبائل سے ولید کا نمبر لے کر اسے فون کرتی ہے مگر ولید اس



کی حوصلہ افزائی نہیں کرتا۔ رضا حیدر 'تیمور کو فارہ کی شادی کے سلسلے میں فیصل آباد بھیجتے ہیں۔ فارہ اپنی تاریخ میں ماورا کو بصد اصرار مدعو کرتی ہے۔ ماورا 'عافیہ بیگم کی ناراضی کے باوجود چلی جاتی ہے۔ وہاں تیمور اور ماورا کی ملاقات ہو جاتی ہے۔ عزت اپنے دل کی کیفیات ماشا سے بیان کرتی ہے۔ ماورا پی کل کو بتاتی ہے کہ وہ رضا حیدر کے بیٹے تیمور حیدر سے کی ہے۔ بی کل دم بخود رہ جاتی ہیں۔

شادی میں تیمور حیدر' ماورا کے قریب آنے کی کافی کوشش کرتا ہے مگر ماورا کا سخت اور کھردرا رویہ بہار اسے ناکام کرتا۔ تیمور' ماورا سے رضا حیدر کو ملواتا ہے۔ رضا حیدر اسے دیکھ کر چونک جاتے ہیں مگر باوجود کوشش کے وہ سمجھ نہیں پاتے۔ فارہ کی ہی شادی میں عزت کی ملاقات تیام مرزا کے بیٹے مونس مرزا سے ہوتی ہے۔ وہ سخت بیزار ہوتی ہے جبکہ مونس خوب دلچسپی لیتا ہے۔

آفاق تو بھی رات کو غائب ہو جاتا ہے۔ فارہ پریشان ہوتی ہے۔ وہ صبح آکر بتاتا ہے کہ اس کے دوست کے ساتھ کوئی ایمرجنسی ہو گئی تھی۔ اس نے اس کے آرام کا خیال کرتے ہوئے وہ بغیر بتائے چلا گیا تھا۔ مگر فارہ اس کی بات پہ یقین نہیں کرتی۔ تیمور' فارہ کے ذریعے ماورا کو اپنے آفس میں ایک شاندار پیکیج پہ جاب کی پیشکش کرتا ہے جسے ماورا کافی حیل حجت کرنے کے بعد قبول کر لیتی ہے۔

سولہویں قسط ۱۶

اس کی نظریں عزت کے چہرے کے گرد طواف کرنے لگی تھیں۔

کیونکہ لیپ ٹاپ کی روشنی نے اس کے چہرے کے ارد گرد اک عجیب سحر انگیز سا ہالہ باندھ رکھا تھا جس کا اثر اس کے چہرے سے ولید کے دل تک محسوس ہو رہا تھا اور وہ سحر انگیز سا لمحہ نہ دیکھنے کا اور اس کا سامنا نہ کرنے کا عہد بھول گیا تھا۔

''صاحب! آپ بیٹھیے۔ تیمور صاحب تھوڑی دیر میں فریش ہو کر آ رہے ہیں۔'' اس کے چہرے اور ولید کے دل کا طلسم ملازم کی آواز نے توڑا تھا جس پہ عزت نے بھی یکدم چونک کر ڈرائنگ روم کے داخلی دروازے کی طرف دیکھا۔ اور دیکھتے ہی ٹھٹک گئی۔

''السلام علیکم!'' آنے والا ولید تھا۔ اس لیے سلام میں پہل کرنا اس کا فرض تھا۔

''وعلیکم السلام!'' عزت سنبھلتے ہوئے سیدھی ہو بیٹھی اور لیپ ٹاپ گود سے اٹھا کر ٹیبل رکھ دیا۔

''وہ۔ مجھے دراصل تیمور سے ملنا تھا۔ اگر وہ فری نہیں ہے تو میں دوبارہ آجاؤں گا۔ چلتا ہوں۔'' ولید جو ابھی ابھی عزت کے سامنے اسکرین پہ دھواں دھار گفتگو کر رہا تھا۔ یوں اچانک سامنا ہو جانے پہ بات کرنے کے لیے الفاظ ڈھونڈنے لگا تھا۔

''میری وجہ سے جا رہے ہیں تو مت جائیں۔ میں چلی جاتی ہوں۔'' عزت کی آواز پہ اس کے پلٹتے قدم رک گئے۔

''آپ کیوں جائیں گی۔ یہ آپ کا گھر ہے۔ میں تو مہمان ہوں میں نے تو جانا ہی ہے؟'' ولید کے لہجے کا طنز چھپا ہوا نہیں رہ سکا تھا۔ مونس مرزا والی ضرب اس کے دل پہ اب بھی تازہ تھی۔

''اسی لیے تو جا رہی ہوں کہ میرے گھر آپ جیسا مہمان بہانہ بنا کے محض آکر چلا جائے مجھے گوارا نہیں؟'' وہ کہتے ہوئے اپنی جگہ سے اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔

''کبھی کبھی بہت کچھ گوارا کرنا پڑ جاتا ہے مس عزت حیدر!'' ولید کا اشارہ اپنی ناگواریت کی طرف تھا۔

''گر تو رہی ہوں۔'' وہ اپنی بات کر رہی تھی اور وہ اپنی بات کر رہا تھا۔ کیونکہ چوٹ زدہ دونوں ہی تھے۔

''مونس مرزا کے ساتھ جانا گوارا تھا؟'' ولید کے دل کی جلن زبان کی کڑواہٹ بن کے لفظوں میں ڈھل گئی تھی۔

عزت اس کے منہ سے ایسا طنز بھرا اور کاٹ دار سوال سن کر چونک گئی تھی کہ کیا اسے یہ بھی خبر ہے کہ وہ مونس مرزا کے ساتھ گئی تھی؟

''بتائیے ناں مس عزت حیدر۔ مونس مرزا کے ساتھ جانا گوارا تھا۔؟''

اس نے عزت کی طرف مڑتے ہوئے اس کے چہرے پہ نظریں جماتے ہوئے پوچھا تھا۔

''میں مونس مرزا کے ساتھ جاؤں۔ یا کسی اور کے ساتھ۔ یہ میرا پرسنل میٹر ہے۔ اس سے آپ کا کیا تعلق؟''

اس نے تو جیسے ولید کی دکھتی رگ پہ ہاتھ رکھ دیا تھا۔ وہ یکدم تڑپ ہی تو گیا تھا۔

''اس سے میرا ہی تو تعلق ہے اور میں یہ برداشت نہیں۔'' ولید کے منہ سے غصے اور جھلاہٹ میں آکر نکلا ہوا یہ آدھا ادھورا سا جملہ عزت حیدر کو پوری طرح سرشار اور مطمئن کرنے کے لیے کافی تھا۔ اس کا دل خوشی کے مارے قہقہے لگاتا ہوا قلابازیاں کھانے لگا تھا۔ جبکہ ولید اپنے منہ سے نکلے تیر کو قابو کرنے کی کوشش میں چپ کا چپ رہ گیا تھا۔

''میرا خیال ہے میں اب چلتی ہوں۔ تیمور بھائی آ رہے ہوں گے۔'' وہ بڑے اطمینان سے کہتے ہوئے اپنا لیپ ٹاپ بند کرنے کے لیے پلٹ گئی تھی۔

''ویسے جاتے جاتے آپ کو بتاتی جاؤں کہ مونس مرزا کے ساتھ جانا۔ گوارا کر رہی تھا۔ میں دیکھنا چاہتی تھی کہ آپ سے ہٹ کے بھی کوئی مجھے گوارا ہو سکتا ہے یا نہیں۔ مگر افسوس کہ نہیں ہوا۔ وہ ناگوار کا ناگوار ہی رہا۔'' وہ اس کے قریب سے گزر کر جاتے جاتے اسے بتا ہی گئی تھی۔

''عزت۔ بات سنو۔'' ولید نے بے ساختہ اسے پکارا۔

''ضرور سنوں گی مگر ابھی نہیں۔'' وہ اپنی مسکراہٹ دبا کر وہاں سے چلی گئی تھی۔

اس کے جانے کے فوراً بعد ہی تیمور بھی آ گیا تھا۔

''السلام علیکم!'' تیمور نے اندر داخل ہوتے ہی بڑے نپے تلے سے انداز میں سلام کیا تھا۔

''وعلیکم السلام!'' ولید اپنی جگہ سے کھڑا ہو گیا تھا۔

''بیٹھیے تشریف رکھیے!'' تیمور اسے بیٹھنے کا اشارہ کر کے خود اس کے سامنے والے صوفے کی طرف بڑھ گیا تھا۔ جبکہ ولید اس کے طرز تخاطب سے ہی سمجھ گیا تھا کہ وہ خوامخواہ موڈ میں ہے۔

''کیسے ہو؟'' ولید نے خود ہی حال احوال پوچھنے میں پہل کی تھی۔

''ٹھیک ٹھاک۔ مجھے کیا ہو گا بھلا۔'' اس نے کندھے اچکائے۔

''نظر تو نہیں آ رہا کہ تم ٹھیک ٹھاک ہو۔'' ولید چھیڑنے والی شرارتی نظروں سے دیکھتے ہوئے بولا۔

''رات سو نہیں سکا۔ نیند پوری نہیں ہوئی اس لیے۔'' تیمور کا سر درد سے بوجھل ہو رہا تھا اور آواز بھی گمبھیر سی لگ رہی تھی۔

''کیوں رات بھر سو کیوں نہیں سکے۔ ابھی تو تمہاری شادی بھی نہیں ہوئی۔ پھر نیند پوری نہ ہونے کا مطلب؟'' ولید جان بوجھ کر بات کو ادھر ادھر گھما رہا تھا۔

''پلیز ابھی کوئی بھی الٹی سیدھی بات کے موڈ میں نہیں ہوں۔'' تیمور نے خفگی کا اظہار کرتے ہوئے اسے ٹوکنے کی کوشش کی تھی۔

"تو پھر کس موڈ میں ہو۔۔۔؟" ولید پھر بھی باز نہیں آیا تھا۔

"ولید پلیز۔۔۔! میں پہلے ہی رات بھر کا تھکا ہوا ہوں' مجھے مزید ڈسٹرب مت کرو۔" تیمور نے اپنی کنپٹی کو سہلایا تھا۔

"تیمور۔۔۔! میں وہی تم سے پوچھ رہا ہوں خیریت تو ہے ناں؟" ولید کا لہجہ بھی بدل گیا تھا کیونکہ اسے محسوس ہو چکا تھا کہ تیمور کچھ پریشان بھی ہے اور ست بھی۔

"ہوں! خیریت ہے۔۔۔ بس رات کو کہیں جانا پڑ گیا تھا۔" تیمور کے لہجے اور آواز دونوں سے ہی تھکن جھلک رہی تھی۔

"کہاں۔۔۔؟" ولید کی تشویش ہنوز تھی۔

"ہاسپٹل۔۔۔!" وہ بہت مختصر سی بات کر رہا تھا جس پہ ولید مطمئن ہونے والا نہیں تھا۔

"ہاسپٹل۔۔۔ مگر کیوں۔۔۔؟"

"وہ ماورا مرتضیٰ نے بلایا تھا۔۔۔" تیمور کا موڈ ویسے برا حال تھا۔ اسی لیے عجیب بے ربط سے انداز میں جواب دے رہا تھا۔

"وات نان سینس یار۔۔۔! کوئی بات بتانی ہے تو سیدھی طرح بتاؤ۔۔۔ یہ کیا پہیلیاں بجھوا رہے ہو؟ ماورا مرتضیٰ نے ہاسپٹل بلایا تھا کس لیے بلایا تھا۔" ولید کو اچھی خاصی خفگی ہوئی تھی اسی لیے ذرا جھنجلا کے بولا تھا۔

"اس کی بی گل بیمار تھیں۔۔۔ ان کو لے کر ہاسپٹل جانا تھا۔۔۔ وہ اپنی امی کے ساتھ اکیلی تھی۔ اس لیے اس نے مجھے کال کی۔۔۔ اور مجھے جانا پڑا۔۔۔ رات بھر وہیں رہا ہوں۔۔۔ ابھی صبح ہی آیا ہوں۔" تیمور بتاتے ہوئے بھی اپنی کنپٹی مسل رہا تھا۔

"ہوں۔۔۔! بی گل کون ہیں۔۔۔ اس کی نانی اماں یا دادی اماں؟" ولید نے وہ سوال اٹھایا تھا جو خود تیمور کے ذہن میں بھی نہیں آیا تھا۔

"یہ تو مجھے بھی نہیں پتا۔۔۔ لیکن ماورا اور اس کی امی انہیں بی گل ہی کہتی ہیں۔" تیمور نے لاعلمی کا اظہار کیا تھا۔

"یعنی کہ ان کی بی گل کے ساتھ کوئی اور ہی رشتہ ہے۔۔۔؟" ولید نے پرسوچ سے انداز میں کہا۔

"ہو گا۔۔۔!" تیمور کی لاتعلقی بتا رہی تھی کہ اسے تھکن کے علاوہ کوئی اور بھی مسئلہ ہے لیکن وہ کھل کے بتا نہیں رہا۔

"ہو گا؟ یعنی تمہیں اس سے کوئی مطلب نہیں ہے۔ تمہاری بلا سے۔۔۔؟" ولید نے پھر کریدنے کی کوشش کی تھی۔

"یہی سمجھ لو۔" تیمور نے کندھے اچکائے۔

"ماورا سے کوئی بات ہو گئی ہے۔۔۔؟" اب کی بار ولید کے استفسار پہ وہ یکدم غصے سے پھٹ پڑا۔

"ہاں۔۔۔ ہو گئی ہے بات۔۔۔ ہو گئی ہے۔ اس لیے مجھے اب اس سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ کوئی مطلب نہیں ہے۔ تم سے بھی نہیں۔۔۔ تم بھی اور وہ بھی۔۔۔ سب ایک جیسے ہو۔۔۔ بے وفا' دھوکے باز' انا پرست اور خود غرض۔۔۔ تم لوگوں کو بس اپنے آپ سے مطلب ہے' کسی دوسرے سے نہیں۔۔۔ کوئی دوسرا تم لوگوں کے لیے مرے یا جیے تمہاری بلا سے تمہیں کوئی فرق نہیں پڑتا۔"

تیمور کہتے کہتے ذرا دیر کے لیے رکا اور پھر کچھ توقف کے بعد دوبارہ شروع ہو گیا۔

"مگر اب۔۔۔ اب میں نے بھی اپنے دل کے ساتھ یہ عہد کر لیا ہے کہ۔۔۔ اب مجھے بھی کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ نہ تم سے' نہ اس سے۔"

تیمور نے بڑی آسانی سے انہیں اپنی ذات سے پرے جھٹک دینے کی کوشش کی تھی جو کہ ایک ناکام سی کوشش تھی۔۔۔ ولید اچھی طرح جانتا تھا کہ اس کے اس طرح جھٹک دینے سے تعلق ختم تو نہیں ہو سکتا۔۔۔ یہ تو محض اس کے غصے کی حالت تھی۔

"اچھا۔۔۔؟ وہ اگر اتنی ہی بے وفا' دھوکے باز' انا پرست اور خود غرض ہے تو اس کی خاطر رات جاگ کر کیوں گزار دی؟ اور اگر میں اتنا ہی بے وفا' دھوکے باز' انا پرست' اور خود غرض ہوں تو میرے لیے اٹھ کر کیوں آ گئے ہو؟ کیوں بے آرام اور بے سکون ہوتے ہو ہمارے لیے؟" ولید نے اس کا دل جلانے والا نکتہ اٹھایا تھا۔

"کیونکہ مجھے تم لوگوں کی پروا ہے۔ تم لوگوں کو نہیں ہے۔" تیمور حد درجہ بدگمان اور متنفر نظر آ رہا تھا۔

"کون کہتا ہے کہ ہمیں تمہاری پروا نہیں ہے۔۔۔؟" ولید کے سوال پہ تیمور کا خیال بے اختیار ماورا کی طرف چلا گیا تھا۔ جب وہ صبح فجر کے وقت اس کے بے حد قریب تھی اس کے سر کے نیچے اپنی چادر کا تکیہ بنا کے رکھ رہی تھی۔

"میں کسی بحث میں نہیں پڑنا چاہتا۔" تیمور نے سر جھٹک دیا۔

"بحث میں نہیں پڑنا چاہتے۔۔۔ لیکن بدگمانی میں فوراً" پڑ جاتے ہو۔۔۔؟" ولید نے کہتے ہوئے اسے طنزیہ اور تمسخرانہ نظروں سے دیکھا تھا۔

"یہ بدگمانی نہیں حقیقت ہے۔" تیمور نے بے حد مضبوط لہجے میں اپنی بات پہ زور دیا تھا۔

"اتنے یقین سے کہو گے تو مجھے بھی حقیقت ہی لگے گا۔۔۔ جبکہ لگنے میں اور ہونے میں بڑا فرق ہوتا ہے۔" ولید اسے سمجھانے کی سعی کر رہا تھا۔

"ٹھیک ہے۔۔۔ جو بھی ہے میرا مسئلہ ہے اور میں اپنے مسئلے کا حل نکال لوں گا۔" تیمور نے ایک بار پھر لاتعلقی کا مظاہرہ کیا۔

"یہ صرف تمہارا مسئلہ نہیں ہے کیونکہ اس میں ہم بھی انوالو ہو رہے ہیں اور وہ بھی بے گناہ اور بے وجہ۔۔۔"

ولید کی اس بات نے بھی اسے چونکنے پہ مجبور کر دیا تھا۔

"بے گناہ اور بے وجہ۔۔۔؟"

"او کے۔۔۔ او کے! میں تو چلو مان لیتا ہوں کہ میں گناہ گار ہوں' قصوروار ہوں' لیکن ماورا مرتضیٰ وہ بے چاری۔۔۔ اس کا کیا قصور ہے بھلا؟"

ولید نے کافی تاسف کا اظہار کیا تھا۔

"وہ بے چاری نہیں ہے۔۔۔ سارا قصور ہی اس کا ہے۔۔۔ وہ بے حس ہے' بے مروت ہے۔ میرے دل سے کھیل رہی ہے۔" تیمور چیخ کر بولا۔

"اس طرح دل دو گے تو وہ تو کھیلے گی ہی ناں؟" ولید دل ہی دل میں بڑبڑایا۔

"ایسا بھی کیا قصور ہو گیا ہے اس سے؟ کیا کہہ دیا اس نے؟" ولید اس سے اصل بات اگلوانا چاہتا تھا۔

اور تیمور اس قدر ڈپریشن کا شکار تھا کہ بے دھیانی میں سب کہہ گیا تھا۔

"وہ میرے ساتھ فیئر نہیں ہے۔۔۔ وہ دل پرستانی کی مالک ہے۔۔۔ میں اس کا چہرہ دیکھ رہا ہوں۔۔۔ اس کا باطن کیا ہے' یہ مجھ سے پوشیدہ ہے۔ لیکن اب میں اس کا باطن دیکھنا چاہتا ہوں۔۔۔ اس کو اندر سے جاننا چاہتا ہوں کہ وہ کیا

چاہتی ہے؟" تیمور کی سوچ اب بھی وہی تھی۔

"حالانکہ یہ بات تمہیں پہلے سوچنا چاہیے تھی۔" ولید نے سرزنش کی۔

"اب تو سوچ لی ہے ناں...؟" تیمور کی خفگی اور بیزاریت عروج پہ تھی۔

"اچھی بات ہے اگر سوچ لیا ہے تو اس پہ عمل کرنے کے لیے اپنے رویے اور اپنے طرز عمل کو بدلو... ورنہ اس طرح غصے اور خفگی سے تمہیں کسی چیز کا کچھ پتا نہیں چلے گا۔ کیونکہ سیانے کہتے ہیں کہ کسی کے اندر کا حال جاننے کے لیے اس کے اندر اترنا پڑتا ہے... سمندر کی گہرائی کنارے پہ کھڑے رہنے سے کبھی بھی معلوم نہیں ہو سکتی... تم اگر ماورا رضی کے اندر کی گہرائی جاننا چاہتے ہو تو تمہیں اس کے قریب جانا ہوگا... اس طرح دور دور سے کچھ بھی آشکار نہیں ہوگا۔" ولید کے اک نئے مشورے نے اسے مزید چونکا دیا تھا مگر اس نے جواباً کہا کچھ بھی نہیں۔

"کیا بات ہے... چپ کیوں ہو گئے ہو؟" ولید کو اس کے موڈ پہ الجھن اور تشویش ہو رہی تھی۔ تیمور نے نفی میں سرہلا دیا تھا۔

"نہیں... کچھ نہیں ہے۔"

"ٹھیک ہے... میں اب چلتا ہوں... دوبارہ ملاقات ہوگی۔" ولید اٹھ کھڑا ہوا تھا اور تیمور نے بھی اپنے ذہنی تناؤ کی وجہ سے اسے روکنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ ولید اور تیمور کے بیچ کا غصہ اور ناراضی بیچ میں ہی رہ گئے تھے۔ نہ ولید نے اس قصے کو چھیڑا تھا اور نہ تیمور نے!



آفاق ابھی آفس پہنچا ہی تھا کہ فارہ کی کال آ گئی تھی۔

"ہیلو...؟" اس نے فوراً کال ریسیو کی۔

"آپ کہاں ہیں...؟" فارہ کی آواز تھوڑی پریشان سی لگ رہی تھی۔ آفاق بھی پریشان ہو گیا تھا۔

"آفس... اور کہاں...؟" وہ بریف کیس رکھتے ہوئے بولا۔

"اوہ!" فارہ کا انداز مایوس سا ہو گیا۔

"کیوں کیا ہوا؟ خیریت...؟" آفاق کو فکر لگ گئی۔

"وہ دراصل ماورا کی بی گل بیمار ہیں... رات سے ہاسپٹل میں ایڈمٹ ہیں... ان کے پاس ہاسپٹل جانا تھا۔" فارہ نے وجہ بتائی۔

"اوہ... تو اس میں اتنا پریشان ہونے والی کیا بات ہے؟ ڈرائیور کے ساتھ چلی جاؤ۔" آفاق نے بڑی لاپروائی سے جواب دیا تھا جبکہ فارہ کا مدعا کچھ اور تھا۔

"ڈرائیور کے ساتھ تو چلی جاؤں لیکن میں چاہ رہی تھی کہ آپ بھی اگر آجاتے تو اچھا ہوتا... وہ دراصل ماورا اور اس کی امی اکیلی ہیں... کوئی مرد بھی نہیں ہے۔ آپ کے آجانے سے ان کی کچھ ہیلپ ہو سکتی تھی۔" فارہ نے مدعا کھل کے بیان کیا تھا۔

"ہوں تو یہ بات ہے... اوکے ابھی تم جاؤ... میں ایک دو گھنٹے میں کام نپٹا کر وہیں ہاسپٹل آجاؤں گا... اور آنے سے پہلے تمہیں کال بھی کر دوں گا۔" آفاق نے ہامی بھرلی تھی جس پہ فارہ فوراً ہی خوش بھی ہو گئی تھی۔

"اوکے تھینک یو... میں ابھی تھوڑی دیر میں جا رہی ہوں۔"

اس نے خوشی خوشی کہہ کر فون بند کر دیا تھا۔ جانے سے پہلے وہ ثمینہ یزدانی کو بتا کر اور ان کی اجازت لے کر گئی تھی۔



دروازے پہ دستک کے بعد ابھرنے والی تیمور حیدر کی آواز نے فارہ اور ماورا دونوں کو ہی چونکا دیا تھا۔

"وعلیکم السلام...!" ماورا اسے دیکھتے ہی اپنی جگہ سے کھڑی ہو گئی تھی۔ وہ شاور وغیرہ لینے کے بعد ٹک سک سے تیار مردانہ کلون کی خوشبوؤں سے مہکتا ہوا اچھا خاصا فریش لگ رہا تھا اتنا ہی لاتعلق بھی نظر آ رہا تھا۔

کیونکہ اس کی نظریں ماورا کے بجائے بی گل کی طرف تھیں۔ پھر وہ ان ہی کی طرف بڑھ گیا۔

"السلام علیکم بی گل! کیسی ہیں آپ؟" اس نے یوں ان کو مخاطب کرتے ہوئے ان کا حال احوال پوچھا تھا جیسے صدیوں سے شناسائی اور بے تکلفی چلی آ رہی ہو۔

"وعلیکم السلام... جیتے رہو بیٹا! اللہ کا بڑا کرم ہے... اور تمہارا بھی بہت احسان ہے ہم پہ... ساری رات خوار ہوتے رہے۔" ماورا نے بی گل کو ہوش میں آتے ہی سب کچھ بتا دیا تھا۔

"اٹس اوکے...! میری جگہ کوئی اور بھی ہوتا تو یقیناً ایسا ہی کرتا... کیونکہ مشکل وقت میں کوئی بھی مطلب مانگے تو بندے سے انکار نہیں ہو سکتا۔"

تیمور بات تو بی گل سے کر رہا تھا لیکن جس کو سنانا تھا اسے سنا دیا تھا۔ اور وہ سن کر سمجھ بھی گئی تھی۔

"ہاں بیٹا... یہ بات تو ٹھیک ہے لیکن کچھ لوگ لاپروائی کر جاتے ہیں... لیکن تم تو پوری رات..."

"پلیز بی گل! میں نے کوئی اتنا بڑا کام بھی نہیں کیا۔ اس لیے پلیز بار بار شرمندہ مت کریں۔ آئندہ میرے لائق کوئی خدمت ہو تو بتائیے گا... میں ان شاء اللہ حاضر ملوں گا۔" اس نے بڑے مخلصانہ انداز میں کہا تھا اور بی گل اس کے اتنے اچھے لب و لہجے پہ اسے دیکھتی اور سوچتی رہ گئی تھیں کہ یہ رضا حیدر کا بیٹا ہے... اتنا اچھا...؟

"کیا دیکھ رہی ہیں...؟" تیمور ان کے یوں یک ٹک دیکھنے پہ مسکرایا۔

"دیکھ رہی ہوں ماشاء اللہ بہت خوب صورت ہو... اللہ عمر دراز کرے اور نظر بد سے بچائے۔" بی گل نے قریب کھڑے تیمور کا ہاتھ پکڑ کر بہت اپنائیت سے تھپکا تھا۔ تیمور ان کی دعا پہ چپ ہو کے رہ گیا۔ "خوب صورت ہوں یا نہیں یہ مجھے نہیں پتا... میری عمر دراز ہے یا نہیں یہ بھی مجھے نہیں پتا۔ البتہ یہ ضرور پتا ہے کہ نظر بد سے نہیں بچ سکا... جو لگنی تھی وہ لگ گئی۔"

اس نے تمسخرانہ سے انداز میں کہتے ہوئے جیسے اپنے آپ کا مذاق اڑایا تھا۔

"کہاں سے لگ گئی... ماشاء اللہ ٹھیک ٹھاک تو ہو...؟" بی گل نے اسے سر تا پا دیکھا تھا۔

"یہی تو حیرت ہے کہ پھر بھی ٹھیک ٹھاک ہوں...؟" اس نے سر جھٹکا۔

اس کی بات پہ ماورا نے بے ساختہ فارہ کی طرف دیکھا تھا۔

جبکہ فارہ خود نظریں جھکائے رہ گئی تھی۔

کیونکہ ماورا کے ساتھ ساتھ وہ بھی تیمور کی نظروں میں اپنے آپ کو چور محسوس کرنے لگی تھی۔

"ارے نہیں بیٹا! ایسی باتیں نہیں کرتے... اور تم کھڑے کیوں ہو... ماورا! کہاں دھیان ہے تمہارا؟" بی گل نے ماورا کی طرف متوجہ ہوتے ہوئے اسے سرزنش کی۔

"سوری بی گل! آپ لوگ بات کر رہے تھے تو میں نے دھیان نہیں کیا۔ آئیے تشریف رکھیے۔" ماورا نے ذرا

سائیڈ پہ رکھی کرسی کھینچ کر اسے بیٹھنے کا کہا تھا۔
"تو تھینکس! مجھے ڈاکٹرز کا نے کال کی تھی۔ بتا رہے تھے کہ شام کو بی گل کو ڈسچارج کر دیا جائے گا اس لیے میں نے سوچا کہ میں ایک بار خود تسلی کرلوں۔"
اس نے اپنے آنے کی وجہ بتائی۔
"تھینک یو سر! آپ نے دوبارہ زحمت کی بی گل واقعی پہلے سے کافی بہتر ہیں۔"
"اوکے۔ ابھی بات کرتا ہوں ڈاکٹرز سے۔" تیمور نے اثبات میں سر ہلایا۔
"لیکن سر! ابھی تو امی کسی کام سے گھر گئی ہوئی ہیں' وہ آجائیں تو پھر۔" ماورا نے اسے روکا۔ وہ قدم اٹھاتے اٹھاتے رک گیا تھا۔
"ڈسچارج ابھی نہیں کیا جارہا۔ شام کو ہوں گی۔" تیمور نے اپنی بات پہ زور دیا۔
"ان کے بلز بھی سیٹلڈ ہو جائیں گے۔ ڈونٹ وری۔"
"مگر سر! مجھے یہ اچھا نہیں لگتا۔" ماورا دبے لفظوں میں بولی۔
"آپ کو تو میں بھی۔" تیمور کا ادھورا مگر جست جواب تھا۔
جس کے بعد ماورا بھی چپ ہو گئی تھی اور تیمور بھی۔
البتہ فارہ اور بی گل کے سامنے دونوں کا ہی کچھ بھرم رہ گیا تھا کیونکہ وہ دونوں آپس میں محو گفتگو تھیں۔
"چلتا ہوں!" وہ کہہ کر باہر نکل گیا تھا اور ماورا پھر وہیں کھڑی دیکھتی رہ گئی۔

☆ ☆ ☆

فارہ نے پورا دن آفاق کا انتظار کیا تھا۔
مگر ہمیشہ کی طرح آج بھی وہ وعدے سے مکر گیا تھا۔
فارہ نے دو تین بار اس کے نمبر پہ کال بھی کی تھی مگر اس کا نمبر بند جارہا تھا' پھر اس نے آفس کے نمبر پر کال کی۔
وہاں سے پتا چلا کہ وہ دن بارہ بجے ہی آفس سے اٹھ گئے تھے۔ "آفاق!" فارہ مٹھیاں بھینچ کے رہ گئی تھی۔
"فارہ! کیا بات ہے۔ کچھ پریشان ہو تم۔" ماورا نے اسپتال سے نکلتے ہوئے استفسار کیا۔
"ہن۔ نہیں۔ ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ بس صبح سے بیٹھے بیٹھے تھک گئی ہوں۔" فارہ نے تھکن کا بہانہ بنا دیا تھا۔
"ٹھیک ہے۔ اب تم گھر جاکر آرام کرو۔ ہم بھی نکلتے ہیں۔" ماورا گاڑی کا دروازہ کھولتے ہوئے بولی۔
"اوکے۔ اگر کوئی پرابلم' کوئی مسئلہ ہو تو مجھے فون کر دینا۔ جھجکنے کی ضرورت نہیں ہے۔" فارہ اسے تاکید کرتے ہوئے گاڑی میں بیٹھ گئی تھی۔
ماورا نے پلٹ کر تیمور کی گاڑی کی طرف دیکھا تھا۔ وہ ماورا کے گاڑی میں بیٹھنے کا انتظار کر رہا تھا' کیونکہ وہ ان لوگوں کو اپنی نگرانی میں گھر چھوڑنے کی ذمہ داری پوری کرنا چاہتا تھا۔
فارہ کی گاڑی نکلتے ہی ماورا بھی بی گل کے ساتھ اپنی گاڑی میں بیٹھ گئی تھی اور ان کے بیٹھتے ہی تیمور نے بھی اپنی گاڑی آگے بڑھا دی تھی۔

☆ ☆ ☆

گاڑی میں روتے آتے ہی فارہ کے ضبط کا بند ٹوٹ گیا تھا۔ اور اس کے آنسو اس کے رخساروں پہ بہ نکلے تھے۔ اسے آفاق کے گھر نہ آنے کا دکھ شدت سے رلا گیا تھا۔ وہ بے اختیار دونوں ہاتھوں میں منہ چھپا کر رو پڑی تھی۔
اور پھر گھر آنے تک اس کی ہچکیوں کا اور آنسوؤں کا سلسلہ جاری رہا تھا۔
اس کے آنسو اور ہچکیاں رکنے میں نہیں آرہے تھے' جبکہ گاڑی گھر کے پورچ میں آرکی تھی۔ ڈرائیور نے پلٹ کر اس کی طرف دیکھا پھر اسے ڈسٹرب کیے بغیر گاڑی سے نیچے اتر گیا تھا۔
اس کے فون پہ بجنے والی رنگ ٹون نے اسے سنبھلنے پہ مجبور کیا۔ اس نے آہستگی سے اپنے آنسو پونچھتے ہوئے موبائل نکال کر دیکھا تھا۔ ثمینہ یزدانی اسے کال کر رہی تھیں۔ وہ ان کی کال ڈس کنیکٹ کرکے گاڑی سے نیچے اتر آئی تھی اور اپنے آپ کو کنٹرول کرتے ہوئے اندر آگئی تھی۔
"السلام علیکم آنٹی!" فارہ ان کا سامنا تو نہیں کرنا چاہتی تھی لیکن اب وہ اس کے لیے پریشان تھیں تو ان سے بات کرنا تو ضروری تھا۔
"وعلیکم السلام! اتنی دیر کر دی تم نے؟ میں پریشان ہو رہی تھی۔"
وہ فوراً لپک کے اس کے قریب آئی تھیں۔
"سوری آنٹی! وہ ماورا کی بی گل ابھی اسپتال سے ڈسچارج ہوئی ہیں' وہ اکیلی تھیں تو میں بھی زیادہ دیر رک گئی۔" فارہ نے نظریں جھکاتے ہوئے معذرت کی تھی۔
"کیوں؟ آفاق نہیں آیا کیا؟" انہیں مزید تشویش ہوئی تھی کیونکہ وہ کافی دیر سے آفاق کے نمبر پہ بھی ٹرائی کر رہی تھیں مگر نمبر بند جارہا تھا اور وہ سمجھ رہی تھیں کہ شاید آفاق بھی اسپتال ہی چلا گیا ہوگا۔
"نہیں!" فارہ نے کہتے ہوئے چہرہ جھکا لیا تھا۔
"لیکن اس نے تمہیں کہا تو تھا کہ وہ آجائے گا؟" ثمینہ یزدانی کی پریشانی حد سے سوا ہو گئی تھی۔
"وہ صرف کہتے ہیں۔ کرتے نہیں ہیں۔" فارہ روہانسی آواز میں کہتی ہوئی یکدم اک جھٹکے سے پلٹ کر اپنے بیڈ روم میں چلی گئی۔
اور ثمینہ یزدانی کو اک نئی ٹینشن لگ گئی تھی۔

"اف! یہ لڑکا اب بھی اپنی لاپروائیوں سے باز نہیں آرہا؟ میں کیا کروں اس کا۔" ثمینہ یزدانی بے چینی کے ساتھ ڈرائنگ روم میں ادھر سے ادھر ٹہلنے لگی تھیں۔
انہیں بار بار فارہ کی سرخ روئی روئی آنکھوں اور بھرائی ہوئی آواز کا خیال آرہا تھا۔ جب سے ان کی شادی ہوئی تھی۔ انہوں نے ایک بار بھی فارہ کو خوش باش اور کھلکھلاتے ہوئے نہیں دیکھا تھا۔ اس کی تو مسکراہٹ بھی انہیں زبردستی کی مسکراہٹ لگتی تھی۔ اسی چیز کو سوچ سوچ کر ان کا دماغ شل ہوتا رہتا تھا۔

☆ ☆ ☆

"آفاق! کہاں جارہے ہو تم؟" زوبیہ اسے بیڈ سے اٹھتے دیکھ کر یکدم اس کے پاس آئی تھی۔
"گھر۔ اور کہاں؟" آفاق اپنے بوٹوں کے تسمے باندھنے لگا۔
"لیکن آفاق! تمہیں پتا ہے اس طرح۔" زوبیہ نے کچھ کہنا چاہا تھا مگر آفاق نے اسے ٹوک دیا تھا۔
"مجھے پتا ہے۔ لیکن پہلے ہی بہت لیٹ ہو چکا ہوں۔ میری زوجہ اور میری والدہ مجھ پہ فاتحہ پڑھ چکی ہوں گی۔" وہ کہتا ہوا بیڈ سے اٹھ کھڑا ہوا تھا۔

"اف، اللہ نہ کرے کہ ایسا ہو۔ کیسی باتیں کرتے ہو۔" ذوبیہ نے خفگی کا اظہار کیا۔

"کیا ہو رہا ہے بھئی؟" ذوبیہ کے والد شاہنواز نے کمرے میں آتے ہوئے استفسار کیا تھا۔

"ہونا تو کچھ نہیں رہا۔ بس آپ اپنی بیٹی کو سمجھا دیں کہ میرے لیے اتنی کانشس نہ ہوا کرے۔ ورنہ میرے دل کو کچھ ہونے لگتا ہے۔" آفاق کہتے ہوئے مسکرایا تھا۔ جس پہ وہ دونوں باپ بیٹی بھی ہنس پڑے تھے۔

"تم بھی کمال کے ہو اور تمہارا دل بھی کمال کا ہے۔ پل میں کچھ ہونے لگتا ہے۔" وہ دونوں باپ بیٹی خاصے لطف اندوز ہوئے تھے۔

"ہاں جی! آپ لوگوں کو پورا حق ہے کہ آپ ہمارا مذاق اڑاؤ۔ سرحال اتنی خاطر تواضع کا بہت بہت شکریہ۔ میں ابھی چلتا ہوں۔ گھر جا کر بھی بہت کچھ فیس کرنا ہے۔"

وہ بھی جواباً مسکرایا تھا اور پھر ان لوگوں سے اجازت لے کر وہاں سے نکل آیا تھا۔

☼ ☼ ☼

ثمینہ یزدانی اس کے انتظار میں ابھی تک ڈرائنگ روم میں ٹہل رہی تھیں۔ ان کو اس طرح پریشانی اور فکر مندی کے عالم میں اپنے انتظار میں ٹہلتے دیکھ کر آفاق بے اختیار شرمندہ ہوا۔

"السلام علیکم مام!" آفاق کی آواز اور لہجہ شرمندگی کے مارے دھیما ہو گیا تھا۔

"کہاں تھے تم؟" ثمینہ یزدانی نے بے لچک انداز میں پوچھا۔

"اپنے ایک دوست کے ساتھ تھا۔" اسے یقین تھا کہ آج وہ اس کا یقین نہیں کریں گی۔

"جھوٹ مت بولو آفاق! مجھے سچ سچ بتاؤ کہاں تھے تم؟ کہاں سے آ رہے ہو؟" ثمینہ یزدانی کا غم و غصے سے برا حال تھا۔

"ایم سوری مام! میری طبیعت خراب"

"شٹ اپ! شٹ اپ آفاق! مجھے تمہاری بکواس نہیں سننی۔ جھوٹ پہ جھوٹ۔ جھوٹ پہ جھوٹ۔ سن سن کر تھک گئی ہوں میں۔ شادی ہو چکی ہے تمہاری۔ اب بدل جاؤ۔ پہلے والی لاپروائیاں اور کوتاہیاں چھوڑ دو۔ ہمارا نہ سہی اس کا ہی خیال کر لو جو اپنے ماں باپ، گھر بار اور شہر تک چھوڑ آئی ہے تمہاری خاطر۔ اور تم اس کی خاطر عادتیں نہیں چھوڑ سکتے؟"

ثمینہ یزدانی یکدم پھٹ پڑی تھیں اور آفاق کا سر جھک گیا تھا۔ وہ اس کی کوئی بھی بات سننے کو تیار نہیں تھیں۔

"میں آخری بار کہہ رہی ہوں۔ اپنی عادتیں بدل لو آفاق! ورنہ مجھے فارہ کے لیے کوئی انتہائی فیصلہ کرنے میں دیر نہیں لگے گی۔ یہ نہ ہو کہ بعد میں تم کو پچھتانا پڑے۔"

ثمینہ یزدانی بپھرے ہوئے انداز میں کہہ کر اس کے پاس سے گزر کے چلی گئی تھیں اور آفاق گہری سانس خارج کرتے ہوئے پلٹ کر دھیلے ڈھالے قدم اٹھاتا اوپر آگیا تھا۔ دروازہ کھول کے اندر داخل ہوا ہی تھا کہ قدم ایک بار پھر ٹھٹک گئے تھے۔

سامنے ہی فارہ کھڑکی کے دونوں پٹ کھولے کھڑکی سے باہر دیکھ رہی تھی۔

اس نے دروازے کی آہٹ پہ بھی پلٹ کر پیچھے نہیں دیکھا تھا وہ دروازہ بند کر کے آہستہ قدموں سے چلتا اس کے قریب آیا۔

"ایم سوری فارہ! ایم رئیلی سوری!" اس نے آہستگی سے معذرت کی۔ "مجھے پتا تھا تمہیں بہت انتظار رہا ہو گا۔ تم نے

فون بھی ٹرائی کیا ہو گا لیکن پھر بھی۔" آفاق کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اب اس کے سامنے کون سا بہانہ کرے؟ کہ وہ مان جائے۔ ثمینہ یزدانی تو اس پہ اپنا غبار نکال کر چلی گئی تھیں۔

"فارہ! وہ دراصل۔" اس نے اس کے عقب میں کھڑے کھڑے اس کے کندھوں پہ دونوں ہاتھ رکھے تھے اور فارہ بدک کر دور ہٹ گئی تھی۔

"ڈونٹ ٹچ می آفاق یزدانی! ڈونٹ ٹچ می!" وہ غصے سے پھنکار اٹھی تھی۔

"فارہ!" اس نے بھی کچھ کہنا چاہا تھا۔

"بس۔ اب اور نہیں۔ اب اور برداشت نہیں ہے مجھ میں۔ انگیجمنٹ سے لے کر اب تک بہت سہہ لیا میں نے۔ بہت دیکھا، بہت سوچا، بہت چاہا۔ مگر وہ حاصل نہ ہوا جس کے آپ نے دعوے کیے تھے اور جس کے آپ نے وعدے کیے تھے۔ سب بے کار ہے۔ میں بھی اور میری محبت بھی۔ کوئی قدر نہیں، کوئی ویلیو نہیں ہے آپ کی نظروں میں۔ اور جہاں انسان کی کوئی اہمیت نہ ہو وہاں وہ پاؤں کی جوتی کے برابر ہوتا ہے۔ ضرورت کے وقت پہن لینا، پھر اتار پھینکنا۔"

فارہ نے اس کے سامنے کبھی اس طرح سخت لہجے اور سخت الفاظ استعمال نہیں کیے تھے۔ مگر آج برداشت جواب دے گئی تھی۔

آج اس کی ماں اس کے سامنے بکی ہوئی تھی۔ کل کو کسی اور کے سامنے بھی ہو سکتی تھی۔ آج اس کا اپنی دوست کے سامنے مان ٹوٹا تھا، کل کو اپنے گھر والوں کے سامنے بھی ٹوٹ سکتا تھا، جبکہ وہ ٹھہری ایک نرم اور حساس لڑکی۔ اس سب سہنا مشکل ہی نہیں بلکہ بہت ہی مشکل تھا۔

"صرف اس بار معاف کر دو فارہ! آئندہ ایسا کچھ نہیں ہو گا۔" آفاق نے پھر ایک کوشش کی۔

"ایک شرط پر معاف کر سکتی ہوں۔" فارہ نے روئی روئی متورم آنکھوں سے اس کی آنکھوں میں دیکھا مگر بہت سرد و سپاٹ سے انداز میں۔

"کیا؟" آفاق نے فوراً پوچھا۔

"مجھے طلاق دے دیں۔" فارہ نے جیسے بم پھوڑ دیا تھا۔

"چٹاخ!" وہ سرے ہی لمحے آفاق کا ہاتھ اٹھا اور ہاتھ کی پانچوں انگلیوں کا نشان فارہ کے چہرے پر نقش کر گیا تھا۔

"آئندہ تمہاری زبان نے اس لفظ کو چھوا بھی تو مجھ سے برا کوئی بھی نہیں ہو گا۔" آفاق کا چہرہ غصے سے تپ اٹھا تھا اس کے لہجے اور آواز کی نرمی، سختی میں بدل گئی تھی۔

فارہ کے آنسو چھلک آئے تھے۔

"میری بیوی بننے کے بعد تم صرف بیوہ ہو سکتی ہو، طلاق یافتہ نہیں۔ آزاد ہونا چاہتی ہو تو میرے مرنے کی دعا کرو۔"

فارہ روتی بلکتی وہیں بیڈ پہ ڈھیر ہو گئی تھی۔

ان دونوں کی رات یونہی جلتے سلگتے اور تڑپتے ہوئے گزر گئی تھی۔

☼ ☼ ☼

"مجھ سے ملو۔" عزت کے نمبر پہ ولید کا میسج بے چین سا اور لودیتا ہوا میسج موصول ہوا تھا اور عزت نیند سے

اٹھتے ہی جیسے دن بھر کے لیے سیراب ہو گئی تھی۔
"کیسے؟" اس نے بڑی شرارت سے پوچھا۔
"ملو گی تو بتاؤں گا کہ کیسے۔" فوراً" جواب آیا۔
"ابھی بتاؤ۔" اس نے بچوں کی طرح ضد کی۔
"ابھی مل لو۔" وہ بھی اسی کے سے انداز میں کہہ رہا تھا۔
"اتنی بے چینی کیوں۔"
"میرا دل کہہ رہا ہے، جیسے کچھ ہونے والا ہے۔ اور اس ہونے سے پہلے کچھ اور ہو جائے" بس یہی دل چاہ رہا ہے۔" ولید کا میسج پڑھ کر عزت کا دل دہل گیا تھا۔
"صبح صبح ایسی باتیں؟" وہ خفا ہوئی۔
"صبح صبح دل چاہ رہا تھا کہ آنکھ کھلے اور نظروں کے سامنے تمہاری صورت ہو۔ لیکن افسوس۔"
"افسوس بعد میں کرنا۔ ابھی ناشتا کرو۔" عزت بیڈ سے اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔
"پھر ملو گی؟" اگلا میسج آیا۔
"نہیں! پھر یونیورسٹی جانا ہے۔" جواب بھی تیار تھا۔
"پھر اس کے بعد ملو گی؟" پھر استفسار۔
"نہیں! پھر گھر آنا ہے۔" پھر انکار۔
"عزت!" اس کی التجا اک لفظ سے ہی نظر آ رہی تھی۔
"جی ولید!" اس کی شرارتوں کو عروج مل رہا تھا۔
"میری محبت، میرے اظہار، میری بے چینی اور میرے قرار کا پہلا دن ہے آج۔ ستاؤ مت۔ ساتھ دو۔ حوصلہ افزائی کرو۔ دل بہت دھڑک رہا ہے۔"
ولید کا یہ میسج پڑھ کر تو عزت کے منہ سے یکدم ایک کھلکھلاتا ہوا قہقہہ پھوٹ نکلا تھا، اور اس قہقہے سے اس کے کمرے کے در و دیوار گونج اٹھے تھے۔
"ارے واہ! یہ اکیلے اکیلے پھول کیوں بکھیرے جا رہے ہیں۔؟" رضا حیدر اس کے بیڈ روم کے سامنے سے گزرتے گزرتے ٹھہر گئے تھے اور پھر دروازہ کھول کر اندر بھی آ گئے تھے۔
"کچھ نہیں بابا! ایک دوست کا میسج پڑھ کر ہنسی آ گئی۔" عزت آگے بڑھ کے ان کے کندھے سے لگ گئی تھی۔
"ہوں گڈ! خوش رہو۔ ہمیشہ ہنستی رہو میری جان۔" رضا حیدر نے اس کا ماتھا چوم کر اس کا سر تھپکا تھا۔
"تھینک یو بابا! دعا کریں میری زندگی کی ہر صبح ایسی ہی ہو، تازہ، امنگوں اور محبتوں کے احساس سے بھری ہوئی۔" عزت نے بڑی چاہ سے کہا تھا اور رضا حیدر مسکرا اٹھے تھے۔
"ان شاء اللہ!"
"تھینکس اگین بابا!" وہ آج بات بے بات چہک رہی تھی۔
"چلو۔ اب جاؤ اور فریش ہو کر نیچے آ جاؤ۔ ناشتا تیار ہو چکا ہے۔" وہ اس سے کہتے ہوئے پیچھے ہٹ گئے تھے اور عزت ابھی آنے کا کہہ کر پھر سے موبائل کی طرف متوجہ ہو گئی تھی۔
"سوری! بابا آ گئے تھے۔ لیکن تم نے بتایا نہیں دل کیوں دھڑک رہا ہے؟"

وہ اس سے سننا چاہتی تھی۔
"سب بتاؤں گا۔ تم ایک بار ملو تو سہی۔" وہ جیسے زچ ہو گیا تھا۔
"او کے سوچتی ہوں۔" وہ بھاؤ کھانے لگی۔
"کس بارے میں؟" اسے تعجب ہوا۔
"یہی تم سے ملنے کے بارے میں۔" وہ اترا کے لکھ رہی تھی۔
"ہاں ہاں۔ تمہارا حق بنتا ہے کہ تم بدلہ چکاؤ۔ ٹھیک ہے۔ میں صبر سے انتظار کرتا ہوں۔" "شاباش۔ گڈ بائے۔"
عزت نے آخری میسج لکھنے کے ساتھ ہی واش روم کا رخ کیا تھا کیونکہ وہ لیٹ ہو رہی تھی اور اسے یونیورسٹی کے لیے تیار بھی ہونا تھا ابھی۔

☼ ☼ ☼

"مس سحرش! مس ماورا مرتضیٰ کہاں ہیں۔" تیمور اس کی خالی سیٹ دیکھ کر اپنی پی اے کی طرف پلٹا تھا۔
"سوری سر! ماورا مرتضیٰ تو آج بھی نہیں آئیں۔" اس کی پی اے نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے تیمور کو ٹھٹکنے پر مجبور کر دیا تھا۔
"واٹ! وہ مسلسل تین دن سے غیر حاضر ہیں کیوں۔؟" تیمور کو خفگی اور الجھن ہوئی تھی۔ "آپ نے کانٹیکٹ کیا ان سے؟" اس نے سحرش زمان سے کنفرم کروانا چاہا تھا۔
"جی سر! ابھی تھوڑی دیر پہلے ہی کانٹیکٹ کیا ہے۔ ان کی شاید دادی اماں بیمار ہیں" اس لیے ان کی تیمارداری کی وجہ سے نہیں آ رہیں۔" سحرش زمان سے جو کہا گیا تھا، اس نے بتا دیا تھا۔
"وہ جانتی ہیں ان کا پروجیکٹ کتنا لیٹ ہو رہا ہے۔ اس کی وجہ سے ہمارے کام پہ کتنا برا اثر پڑے گا" اور کتنا نقصان ہو گا۔" تیمور کو غصہ آیا تھا۔
"سر! وہ کہتی ہیں کہ وہ کور کر لیں گی۔"
"کیسے؟ تین چار دن کا کام کیسے کور ہو گا۔؟" وہ مسلسل جھنجلا رہا تھا۔
"سر! انہوں نے اپنی فائل گھر پہ ہی تیار کر لی ہے" اور آج ڈرائیور کے ہاتھ آفس بھجوا دیں گی۔ اس لیے پروجیکٹ لیٹ نہیں ہو گا اور نہ ہی کام میں کوئی رکاوٹ آئے گی۔"
ماورا مرتضیٰ اس سے بھی دو ہاتھ آگے ثابت ہوئی تھیں کہ اس نے تیمور کے اعتراض والا بیج ہی نہیں اگنے دیا تھا سر اٹھاتے ہی ختم کر دیا تھا۔
"ہوں۔ تو یہ بات ہے۔" (یعنی وہ آفس سے کترا رہی ہے۔) وہ اب اس کی اصل رمز سمجھ گیا تھا اسی لیے سحرش زمان سے مزید استفسار نہیں کیے تھے۔
"او کے۔ ٹھیک ہے۔" وہ کہہ کر اپنے روم میں آ گیا تھا، مگر اسے بھلا چین کب آ سکتا تھا؟ اس نے کچھ دیر بعد ماورا کا نمبر ڈائل کر لیا تھا۔
"ہیلو۔!" ماورا کی بہت بھری ہوئی سی آواز سماعتوں سے ٹکرائی تھی۔
"تیمور حیدر بات کر رہا ہوں۔" اس نے جان بوجھ کر تعارف کروایا۔
"میرے سیل کی اسکرین فی الحال ٹھیک کام کر رہی ہے۔ نام اور نمبر با آسانی دیکھے جاتے ہیں۔"
"لیکن آپ کے ذہن کی اسکرین کے سسٹم میں شاید کوئی خرابی ہے۔ آپ کو بھول چکا ہے کہ تین چھٹیوں سے

زیادہ کی اجازت نہیں ہے۔ اور یہ اس آفس کے رولز میں ہے۔ آپ یہ رولز نہیں توڑ سکتیں۔" تیمور کا دماغ اور ہی ہو رہا تھا۔

"لیکن سر! آپ اگر اپنے ذہنی سسٹم سے کام لے کر غور کریں تو آپ کو پتا چلے گا کہ میں نے آپ کے آفس کے رولز بالکل نہیں توڑے۔ آج میری تیسری چھٹی ہے۔ چوتھی نہیں۔ آپ کو یہ کال کل کرنی چاہیے تھی۔ وہ بھی تب جب میں آفس نہ آتی۔"

وہ اس کی بات پر بے ساختہ چونکا تھا اور پھر اس کی ذہانت پہ سر جھٹک کر رہ گیا تھا۔

"یہی بات افہام کرنے کے لیے کال کی ہے کہ مزید چھٹی کی گنجائش نہیں ہے' پلیز اب احتیاط کریں۔" تیمور بھی پینترا بدل گیا تھا۔

"اگر میں اس جاب سے ہی احتیاط کرنا چاہوں تو؟" ماورا کی بات پہ اس کا ماتھا ٹھنکا۔

"کیا مطلب؟" وہ پوچھے بغیر نہیں رہ سکا تھا۔

"مطلب یہ کہ اگر میں یہ جاب چھوڑ دوں تو؟" ماورا جو اتنے دنوں سے سوچ رہی تھی کہہ ہی گئی تھی مگر تیمور حیدر کو حیرتوں کے سمندر میں دھکیل گئی تھی۔

"یہ جاب چھوڑ دیں گی مگر۔" تیمور کچھ کہتے کہتے رک گیا تھا۔

"کیا مگر؟ آپ جو کہنا چاہتے ہیں کھل کے کہیں پلیز۔" ماورا نے اسے بولنے پہ اکسایا تھا۔

"کچھ نہیں! آپ کل آفس آئیں پھر آپ سے بات ہوگی۔" اس نے فون بند کرنا چاہا تھا۔

"اس سے کیا فرق پڑے گا بھلا؟" وہ لاپروائی سے بولی۔

"آپ چاہتی کیا ہیں آخر۔" تیمور کا دماغ ماؤف ہونے کو تھا اور وہ لڑکی ہے یا بھول بھلیاں۔ اس کی ذات کا اس کی بات کا اس کی ملاقات کا کوئی سرا ہی ہاتھ نہیں آرہا تھا۔

"میں جو چاہتی ہوں وہ آپ کے اختیار سے باہر ہے۔" ماورا کا استہزا تیمور کو کھا گیا تھا۔

"ایسا کیا ہے آخر؟" وہ زچ ہونے کو تھا۔

"آپ کے لیے شاید کچھ بھی نہ ہو۔ مگر میرے لیے بہت کچھ ہے۔ اس لیے میں یہ جاب چھوڑ کر کہیں اور قسمت آزمانا چاہتی ہوں۔ مجھے اپنی قسمت پر پورا بھروسا ہے۔" وہ بڑے پرسکون اور تحمل آمیز لہجے میں بات کر رہی تھی۔

"دیکھیں مس ماورا مرتضیٰ! آپ کل آفس آرہی ہیں اور میری آپ سے بات اب آفس میں ہی ہوگی اور جو بھی بات ہوگی وہ زندگی کی فیصلہ کن اور آخری بات ہوگی۔ یہ میرا آپ سے وعدہ ہے۔ تیمور حیدر کا وعدہ یعنی ایک مرد کا وعدہ۔ اللہ حافظ۔"

تیمور نے کہہ کر فون بند کر دیا تھا اور کچھ دیر کے لیے دونوں طرف سناٹا چھا گیا تھا۔

(باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ)



سیدہ مشکور حسین یاد

حسن گلاب



ممانی صابرہ کو ان کی شہادت سے تین مہینے پہلے ہی میری ماں اپنے بھائی یاور حسین کے لیے کرنال سے بیاہ کر لائی تھیں۔ میں نے مذاق میں امی سے پوچھا کہ آپ کی بھابی اور ہماری ممانی کیسی ہیں؟ کہنے لگیں۔ "بس گلاب جیسا میری بھابی کا رنگ ہے۔"

میں نے کہا۔ "اللہ کرے مزاج بھی گلاب کی طرح مہکتا ہوا ہو۔"

ایک دم بولیں۔ "میں کوئی بہت بڑی قیافہ شناس تو نہیں لیکن پھر بھی یوں لگتا ہے میری بھابی اسم مسمیٰ ہے۔"

"کیا مطلب؟"

"مطلب یہ کہ نام ہی کی صابرہ نہیں' صبر و تحمل واقعی اس کے مزاج کا جزو معلوم ہوتا ہے۔" اور واقعی جب رونمائی میں ہم نے ممانی صابرہ کو دیکھا تو وہ گلاب جیسی نظر آئیں۔ آنکھیں جھکی جھکی اور شرم و حیا کا مجسمہ ہونے کے ساتھ ساتھ ایک خاص طرح کا نظم و ضبط بھی ان کے خدوخال سے نمایاں تھا۔ آدمی جب اپنے آپ کو سنبھالتا ہے تو اس کے چہرے کے خدوخال خود بخود ایک نظم و ضبط کا حصہ نظر آنے لگتے ہیں۔

صابرہ ممانی کے صبر و تحمل کی تصدیق ان کی بہن زاہدہ یوسف نے بھی کی۔ زاہدہ یوسف کے شوہر یوسف اپنے زمانے کے خاصے معروف ڈاکٹر تھے۔ ان کا کلینک لاہور ہوٹل سے ذرا فاصلے پر لارنس روڈ پر واقع تھا۔ زاہدہ صاحبہ نے خود بھی نرسنگ وغیرہ کی تربیت حاصل کی ہوئی تھی' شوہر کے مرنے کے بعد بڑی ہمت اور حوصلے کے ساتھ انہوں نے یہ کلینک بہت دنوں تک چلائے رکھا۔ اب غالباً" بند ہو گیا ہے اور زاہدہ نے قلعہ گوجر سنگھ سے منتقل ہو کر جاتنہ چوک کے قریب سرکٹ ہاؤس کے آس پاس رہائش اختیار کرلی ہے۔ زاہدہ صاحبہ سے جب ہم نے ان کی بہن کے بارے میں مزید دریافت کیا تو زاہدہ کو بار بار اپنی بہن کا صبر و تحمل ہی یاد آرہا تھا۔ چھوٹے بہن بھائیوں کی نگرانی اور والدین کا خیال رکھنے میں بھی صابرہ ممانی

اپنی مثال آپ تھیں۔ حتی الوسع کبھی کسی شکایت کا موقع نہیں دیا۔ بہن بھائیوں میں بھی وہ صلح کل مشہور تھیں۔ ایسی صورت میں خود تو وہ کسی سے کیا فرماتیں؟

جب صابرہ ممانی سسرال آئیں تو ان کی خاطر تواضع کے لیے ماشاء اللہ کئی کئی نندیں، دیور اور بزرگوں میں ساس سسر کے علاوہ سوتیلی اولاد کے ماموں وغیرہ الگ موجود تھے۔ اول تو ہمارے معاشرے میں شادی کے پانچ چھ ماہ تک دلہن سے کوئی کام ہی نہیں لیا جاتا پھر بھی جب بھی صابرہ ممانی کو موقع میسر آتا وہ اپنے بزرگوں کی خدمت کرنے سے قطعی نہیں چوکتی تھیں۔ بلکہ بعض اوقات تو ہمارے نانا حیران رہ جاتے تھے کہ انہوں نے ابھی اپنے دل میں خیال ہی کیا کہ وہ پانی پئیں اور وہ ان کے لیے پانی حاضر کر دیتی تھیں۔

نانا کہتے۔ "مشکور میاں! ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہماری بہو کا تعلق براہ راست کسی بڑے ولی اللہ سے ہے یا پھر دوسرے لفظوں میں یوں کہیے کہ یہ خود کوئی ولی اللہ ہے۔"

میں نے ازراہ مذاق کہا۔ "کیا اولیا اللہ کی شان ولایت اسی بات سے آشکار ہوتی ہے کہ وہ خلق خدا کو پانی پلاتے ہیں۔ ولی اللہ کے لیے سقہ یا بہشتی ہونا بھی ضروری ہے۔"

نانا بولے۔ "برخوردار! آپ اس وقت مزاح کے موڈ میں ہیں لیکن میں آپ پر واضح کرنا چاہتا ہوں کہ صابرہ اگر کوئی بڑی صوفی یا ولی اللہ نہیں ہے تو خالص صوفی اور خالص ولی اللہ ضرور ہے۔"

"وہ کیسے؟"

"وہ ایسے کہ ابھی صبح کی بات ہے، میرا جی چاہ رہا تھا کہ ناشتے میں پراٹھا ہونا چاہیے۔ پھر سوچا بہو بھی کیا کہے گی کہ سسر صاحب بوڑھے ہو گئے لیکن ناشتا کرتے ہیں جوانوں جیسا! اس لیے خاموش ہو گیا۔ مگر جب پراٹھا سامنے آیا تو حیران رہ گیا۔"

"یہ تو اتفاق ہو گیا۔"

"مگر یہ بھی اتفاق ہو گیا کہ پراٹھے کے ساتھ میرا جی بالائی کھانے کو چاہ رہا تھا۔ کیا دیکھتا ہوں بالائی بھی موجود ہے۔"

مجھے پھر مذاق سوجھا۔ "نانا جان! یہ تو آپ کے لیے بہت اچھا ہو گیا ہے کہ آپ کی بہو صوفی یا ولی اللہ ہے مگر اس کی توجہ ترک دنیا کی طرف نہیں، ورنہ آپ کو پیاز کی گٹھی اور سوکھی روٹی ملتی تو دن میں تارے نظر آجاتے۔"

نانا جان کہنے لگے۔ "مشکور میاں! آپ بڑا مذاق اڑائیں مگر صابرہ بیٹی کے ولی اللہ ہونے میں کوئی شک نہیں ہے۔"

"کوئی اور معجزہ؟"

"جی ہاں! تم جانتے ہو، یاور حسین پاکستان میں ضلع کیمبل پور میں ملازم ہے۔ وہ ابھی ابھی چھٹی سے واپس وہاں پہنچا ہے۔ اس کے آنے سے ایک دن پہلے صابرہ نے اپنی ساس کے سامنے اعلان کیا، 'مجھے یوں لگتا ہے ابی اماں کل یہاں پہنچ رہے ہیں۔'"

میں نے ہنس کر کہا۔ "نانا جان! نئی نئی شادی میں ایسے معجزات اکثر نئے دولہا دلہن کے ساتھ ظہور میں آتے رہتے ہیں۔"

نانا بولے۔ "نہیں میاں! یاور حسین کے ساتھ اس کا تھانے دار بھی تھا۔ اس نے مجھے بتایا کہ سید صاحب ہمارا آج یہاں آنا معجزے سے کم نہیں، اچانک ایک کام نکل آیا اور ہم آگئے۔"

غرض ممانی صابرہ صوم و صلوٰۃ کی پابند اور ہمیشہ صبر و شکر کے عالم میں وقت گزارنے والی خاتون تھیں۔ لیکن ہمارے یہاں آکر ان پر کچھ عجیب قسم کا عالم طاری تھا۔ مجھ سے نہ رہا گیا۔ اس لیے میں نے براہ راست ممانی صابرہ سے پوچھ لیا۔ "کیا بات ہے ممانی! میں نے آپ کو اس طرح افسردہ کبھی نہیں دیکھا؟"

ممانی بولیں۔ "بھیا! بات دراصل یہ ہے کہ موت تو برحق ہے۔ مجھے سب سے بڑا قلق اس بات کا ہے کہ میں اپنے میاں کے سامنے نہیں مروں گی۔"

"یہ تو بہت اچھی بات ہے۔ آپ اپنے میاں کے

سامنے کیوں مریں؟ ابھی آپ کی شادی کو جمعہ جمعہ آٹھ دن نہیں ہوئے اور آپ مرنے کی باتیں سوچ رہی ہیں۔"

"میں ایسا سوچ نہیں رہی۔ حالات و واقعات سے صاف پتا چل رہا ہے کہ ہم لوگ زندہ نہیں رہیں گے۔"

"پھر تو اور بھی اچھا ہے۔ آزادی پر قربان ہو کر شہادت کا رتبہ حاصل ہو جائے گا۔"

"اللہ آپ سب کو سلامت رکھے۔ مجھے تو بس اپنے میاں یاور حسین صاحب کا خیال آرہا ہے۔"

"کیا یہ زیادہ اچھی بات نہیں ہے کہ اس وقت وہ محفوظ پاکستان میں ہیں۔"

"ارے ہاں بھائی صاحب! میں نے اس طرح تو سوچا ہی نہیں تھا۔ میں بھی کتنی خود غرض ہوں۔"

ہماری اس گفتگو کے بعد میں نے دیکھا کہ جیسے ممانی صابرہ کی تمام ذات سے افسردگی اس طرح دور ہو گئی جس طرح صبح کے وقت اندھیرا دور ہوتا ہے اور اس کی جگہ ہر طرف روشنی پھیل جاتی ہے۔ وہ ایک دہکتا مہکتا گلاب نظر آرہی تھیں۔ آزادی کے اس گلاب کو ہم پر حملہ ہونے کے اگلے روز صبح کو میرے والد صاحب کے جانے کے بعد ہندو حملہ آوروں نے کلہاڑیوں سے اس طرح پتی پتی کیا کہ چاروں طرف خون کے چھینٹے یوں لگ رہے تھے جیسے شہیدوں کی لاشوں پر کسی نے برگ ہائے گلاب نچھاور کیے ہیں۔

عجیب بات یہ ہے کہ جب ہندو حملہ آور ان کے جسم پر کلہاڑیاں برسا رہے تھے تو ان کی زبان سے ایک لفظ بھی چیخ یا پکار کی صورت میں نہیں نکلا۔ بس شروع شروع میں یا اللہ یا اللہ کی صدا دو تین مرتبہ سنائی دی اور پھر ممانی صابرہ اس طرح خاموش ہو گئیں جیسے وہ اپنے اس مقدر کے لیے پوری طرح تیار تھیں۔

جب ہندو پولیس نے ممانی صابرہ کے ٹکڑے ٹکڑے جسم کو اٹھا کر ٹرک میں ڈالا تو وہ بھی رو رہے تھے مگر سوچنے کی بات ہے اس طرح کے آزادی کے گلاب نجانے کتنی تعداد میں آزادی کی راہوں میں بکھرے ہوں گے۔ میری شہید ممانی صابرہ کے ساتھ آپ ان تمام شہیدوں کو بھی یاد رکھیں جن کے خون جگر پہ یہ مملکت قائم ہوئی ہے۔

صراحی کا بھرم کھلتا نہ میری تشنگی ہوتی
ذرا تم نے نگاہِ ناز کو تکلیف دی ہوتی

جہاں بدلا مگر آدابِ مے خانہ نہیں بدلے
کبھی اے گردشِ دوراں ادھر بھی آ گئی ہوتی

رہِ ہستی کے ہر منظر پہ رکتی ہے نظر اپنی
وہ مل جاتے تو کیا دنیا میں ایسی دلکشی ہوتی

مقامِ عاشقی دنیا نے سمجھا ہی نہیں ورنہ
جہاں تک تیرا غم ہوتا وہیں تک زندگی ہوتی

بھڑک اٹھتی ہیں شاخیں پھول شعلے بنتے جاتے ہیں
ہمارے آشیانوں سے کہاں تک روشنی ہوتی

تمہاری آرزو کیوں دل کے ویرانے میں آ پہنچی
بہاروں میں پلی ہوتی ستاروں میں رہی ہوتی

رضائے دوست قابل میرا معیارِ محبت ہے
انہیں بھی بھول سکتا تھا اگر ان کی خوشی ہوتی

قابل اجمیری

کس کی آواز کان میں آئی
دور کی بات دھیان میں آئی

یہ کنارہ چلا کہ ناؤ چلی
کہیے کیا بات دھیان میں آئی

علم کیا، علم کی حقیقت کیا
جیسی جس کے گمان میں آئی

ایسی آزاد روح اس تن میں
کیوں پرائے مکان میں آئی

آنکھ نیچی ہوئی، ارے یہ کیا؟
کیوں غرض درمیان میں آئی

یگانہ چنگیزی

عہد کا پاس کیا، زخم کی شہرت نہیں کی
ہم نے اس بار بھی توہینِ محبت نہیں کی

جبر کی رات چراغوں کی حفاظت میں کٹی
تیرگی! ہم نے ترے ہاتھ پہ بیعت نہیں کی

تنگ تھی آب و ہوا درپے آزار تھے لوگ
ہم نے اس وقت بھی اس شہر سے ہجرت نہیں کی

یہ خرابہ تو مہک جاتا، چمک بھی جاتا
لیکن اس شخص نے اس دل میں سکونت نہیں کی

اس نے جب کر ہی لیا فیصلہ منہ موڑنے کا
کج کلاہانِ محبت نے بھی منت نہیں کی

خالد معین



دل کا دروازہ

تیرے بعد دل کے سب کواڑ
اتنی مضبوطی سے بند ہوتے ہیں
کہ لاکھ دستک دے کوئی اس پر
شہرِ دل کا دروازہ
کسی بھی دستک پر
اب کھلتا ہی نہیں ہے!

نوشین اقبال نوشی

مشورہ

"محترم جناب ماہر نفسیات صاحب!
مجھے ایک ایسی بدصورت لڑکی سے، جسے دیکھ کر بچے تک ڈر جاتے ہیں، سچی محبت ہے جبکہ ایک خوب صورت لڑکی جسے دیکھ کر اکثر بیویاں ڈر جاتی ہیں، مجھ سے سچی محبت کرتی ہے۔ میں صرف آپ سے یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ مجھے ان دونوں میں سے کس کا انتخاب کرنا چاہیے۔"

فقط ایک پریشان حال

ماہر نفسیات نے کچھ دیر سوچا اور پھر مسکراتے ہوئے جواب لکھا۔

"میرا مشورہ مانیے! اپنی سچی محبت کا گلا ہرگز نہ گھونٹیے۔ اور اسی سے شادی کیجیے جسے آپ دل سے چاہتے ہیں۔ رہا دوسری لڑکی کا مسئلہ۔ آپ ان کا نام مجھے بتا دیجیے۔ میں انہیں سمجھاؤں گا کہ آپ کا پیچھا چھوڑ دیں۔"

سیدہ نسبت زہرا۔ کہروڑ پکا

ہم سا ہو تو!

لڑکی! "آپ کیا کام کرتے ہیں؟"

لڑکا۔ "میں ایک نیوز نیٹ ورک میں برانڈ ایمبیسڈر کے طور پر جاب کر رہا تھا لیکن اب میں نے جاب چھوڑ دی ہے۔"

لڑکی۔ "آپ نے جاب کیوں چھوڑ دی؟"

لڑکا۔ "اب کون سردیوں میں صبح صبح گھروں میں اخبار پھینکنے جائے۔"

شبانہ عندلیب۔ گوجرانوالہ

لاجواب

ایک نوجوان ملازمت کے سلسلے میں انٹرویو دینے گیا۔ انٹرویو لینے والے صاحب نے نوجوان سے اس کی اہلیت و قابلیت پوچھنے کے بعد ایک عجیب سوال کیا۔ جس کا مقصد نوجوان کی تحمل مزاجی آزمانا تھا۔

"اگر میں آپ کی بہن سے شادی کرنا چاہوں تو آپ کو کوئی اعتراض تو نہیں ہوگا؟"

نوجوان چند لمحے خاموش رہا پھر بولا۔ "تو سر! مجھے تو کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔ مگر ایک مسئلہ ہے۔"

"کیا مسئلہ!" باس نے تجسس انداز میں پوچھا۔

"ہمارے ہاں وٹے سٹے کی شادیوں کا رواج ہے۔" نوجوان نے تحمل سے جواب دیا۔

ارم کمال۔ فیصل آباد

سزا

ایک سردار صاحب کو اپنے کندھے پر چیونٹی رینگتی ہوئی محسوس ہوئی۔ انہوں نے اسے پکڑ کر اپنے پاؤں پر چھوڑ دیا۔ وہاں سے رینگتی ہوئی دوبارہ کندھے تک آ گئی۔ سردار صاحب نے اسے پکڑ کر پھر پاؤں پر چھوڑ دیا۔ وہ رینگتی ہوئی پھر کندھے تک آ گئی۔ جب انہوں نے آٹھ دس مرتبہ ایسا ہی کیا تو قریب بیٹھا ہوا دوست جھنجلا کر کہنے لگا۔

"سردار صاحب! اسے مار ہی ڈالیں اب۔"

سردار جی بولے۔ "نہیں! میں اسے چلا چلا کر ماروں گا۔"

حرا قریشی۔ ملتان

کم ہمتی

ایک تاجر کا حوصلہ بندھاتے ہوئے نفسیات کے ڈاکٹر نے کہا۔

"دیکھیے۔ کاروبار میں اتار چڑھاؤ آتے رہتے ہیں۔ آج مندا ہے تو کل چمکے گا۔ بس حوصلہ بلند رکھیں۔ خوش رہنے کی کوشش کریں۔ مصیبت، پریشانی اور نقصان کا ڈٹ کر مقابلہ کریں۔ وہ خود کمزور پڑ جائیں گے۔"

"میں اتنی ہمت نہیں کر سکتا ڈاکٹر صاحب!" تاجر نے سمجھانے کے باوجود مایوسی سے کہا۔ "میری بیوی مجھ سے زیادہ صحت مند اور لمبی چوڑی ہے۔ میں اس کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔"

حنا عاصم۔ ضلع اٹک

چیدہ چیدہ

☆۔ "ایک گدھا دو گز کی رسی سے بندھا ہوا ہے۔ چھ گز کے فاصلے پر گھاس پڑی ہے۔ گدھا گھاس کیسے کھائے گا۔"

☆ "ہوں۔ ہار مان لی۔"

☆۔ "گدھے نے بھی ہار مان لی تھی۔"

☆ لڑکا۔ "بابا! میری شادی کیوں نہیں ہو رہی؟"

نجومی۔ "بیٹا! ایسے ہو سکتی ہے۔ تمہاری قسمت میں تو کنوارے ہی سکھ لکھا ہوا ہے۔"

☆۔ "میں فارغ وقت میں پینٹنگ کرتا ہوں۔"

"کیا پینٹنگ کرتے ہیں۔"

☆۔ "اپنے گھر کے دروازے، کھڑکیاں، دیواریں۔"

رشیدہ بتول۔ کراچی

بخار

ایک مرتبہ ایک شاعر کو بہت تیز بخار چڑھ گیا۔ جس کی شدت سے وہ بے ہوش ہو گئے۔ کچھ دیر بعد ہوش آیا تو غنودگی سی کیفیت میں پوچھنے لگے۔ "میں کہاں ہوں۔ کیا میں جنت میں آ گیا ہوں؟"

پاس ہی ان کی زوجہ کھڑی تھیں۔ جھٹ ان کا ہاتھ تھام کر بولیں۔

"اللہ نہ کرے۔ کیا ہو گیا آپ کو۔ دیکھتے نہیں میں آپ کے سامنے کھڑی ہوں۔"

الماس تنویر۔ ہزارہ

فرض کرو

ٹرین کے ڈبے میں ایک مشہور سیاسی لیڈر کی سیکریٹری اس پر اپنی اداؤں اور باتوں کا جادو چلانے کی کوشش کر رہی تھی جبکہ سیاسی لیڈر کو سخت نیند آ رہی تھی۔ سیاسی لیڈر نے نیند سے بوجھل ہوتی اپنی آنکھوں کو بمشکل کھولتے ہوئے سیکریٹری کا ہاتھ پکڑ کر کہا۔

"سنو! اگر ہم تھوڑی دیر کے لیے یہ فرض کر لیں کہ ہم دونوں میاں بیوی ہیں تو کیسا رہے گا۔"

"مجھے کوئی اعتراض نہیں۔" سیکریٹری خوش ہوتے ہوئے بولی۔

"تو پھر اپنی بکواس بند کرو اور مجھے سونے دو۔"

افشاں فرقان۔ کراچی

عجیب دنیا

ایک بوڑھی غیر شادی شدہ عورت نے اخبار میں خبر پڑھ کر اپنی ہم عمر غیر شادی شدہ سہیلی کو اپنی تیسری شادی کر کے سہیلی کے بارے میں بتایا۔

"کل کیتھرین کا تیسرا شوہر بھی مر گیا۔ وصیت کے مطابق اسے بھی نذر آتش کیا گیا ہے۔" بوڑھی سہیلی نے تاسف سے آہ بھرتے ہوئے کہا۔

"کیسی عجیب دنیا ہے۔ کسی کو ایک شوہر بھی نصیب نہیں ہوتا اور کوئی شوہر پہ شوہر ہی جلائے جاتی ہے۔"

شگفتہ فیاض۔ مشی گن امریکا

☆

خالدہ جیلانی

کھلتا کسی پہ کیوں مرے دل کا معاملہ

شاداب ______ بالا نیو
تو جو بچھڑا ہے تو محسوس ہوا ہے اکثر
جیسے کوئی دیتا ہے دور سے آواز مجھے

آسیہ جاوید ______ علی پور چٹھہ
ان لمحوں کی یادیں سنبھال کر رکھنا
ہم یاد تو آئیں گے لیکن لوٹ کر نہیں

عینی زہرا ______ گھڑی والدی موڑ
ساری دنیا اداس پاؤ گے
مجھ سے توڑے جو سلسلے تم نے

آمنہ اجالا ______ ڈہرکی
ہمارا تذکرہ چھوڑو ہم ایسے لوگ ہیں جن کو
محبتیں کچھ نہیں کہتیں وفائیں مار دیتی ہیں

مسرت الطاف احمد ______ کراچی
رونے سے نہیں حاصل کچھ اے دل سودائی
اشکوں کی بھی بربادی ہو اس کی بھی رسوائی
ہم لوگ سمندر کے بچھڑے ہوئے ساحل ہیں
اس پار بھی تنہائی اس پار بھی تنہائی

ثمن ______ گاؤں منڈ گجرات
تم لاکھ چھپاؤ سینے میں احساس ہماری چاہت کا
دل جب بھی تمہارا دھڑکا ہے آواز یہاں تک آئی ہے

مریم صدیق ______ صادق آباد
اس قدر ذہن میں احساس ہے تنہائی کا
بارہا خود کو بھرے گھر میں بھی تنہا سمجھوں
کوئی چہرہ نہ کوئی ہاتھ نہ سایہ کوئی
میں کسے زخم جدائی کا مداوا سمجھوں

شمع مسکان ______ جام پور
لاحاصل منزل کی آرزو میں
تمام عمر بھٹکتے ہوئے گزار دی

رضوانہ شکیل راؤ ______ لودھراں
لفظ تاثیر سے بنتے ہیں تلفظ سے نہیں
اہل دل آج بھی ہیں اہل زباں سے آگے

نوشابہ منظور ______ سمبڑیال
ہم نے خود سے بھی چھپایا ہے اور سارے شہر کو
تیرے جانے کی خبر دیوار و در کرتے رہے

روفی ______ گھوٹکی
اس کائنات محبت میں ہم مثل شمس و قمر کے ہیں
اک رابطہ مسلسل ہے اک فاصلہ مسلسل ہے
ہم خود کو کھو دیں پھر بھی ہم تجھ کو پا نہیں سکتے
ہیں عام سا ہمیشہ ہوں تو خاص سا تسلسل ہے

ارم کمال ______ فیصل آباد
درخت کاٹ کے سایہ فروخت کرتے ہیں
اور اس کے بعد کڑی دھوپ سے گزرتے ہیں
ہمیں خود اپنے مسائل پہ غور کرنا ہے
کہ روز روز صحیفے نہیں اترتے ہیں

بشریٰ گوندل ______ کوٹ مومن
سبز جنگل کے پرندوں کے ٹھکانوں میں کہیں
وقت لے آیا ہمیں گزرے زمانوں میں کہیں
گم بھی ہو سکتے ہیں ہم تاریخ کے اوراق میں
مل بھی سکتے ہیں پر تازہ فسانوں میں کہیں

امبر گل ______ مجھوڑو (سندھ)
خود کو یوں محصور کر بیٹھا ہوں اپنی ذات میں
منزلیں چاروں طرف ہیں راستہ کوئی نہیں

شفاعت بتول بنت تارا ______ جام پور
اس درجہ عشق موجب رسوائی بن گیا
میں آپ اپنے گھر کا تماشائی بن گیا

صائمہ ______ لاہور
میرے ہاتھ میں قلم ہے میرے ذہن میں اجالا
مجھے کیا دبا سکے گا کوئی ظلمتوں کا پالا
مجھے فکر امن عالم، مجھے اپنی ذات کا غم
میں طلوع ہو رہا ہوں تو غروب ہونے والا

مدیحہ نورین مہک ______ برنالی
کتابوں سے دلیلیں دوں یا خود کو سامنے رکھوں
وہ مجھ سے پوچھ بیٹھا ہے محبت کس کو کہتے ہیں

ثمن آمنہ ریشم ______ گاؤں 347
پیار بانٹنے سے کبھی کم نہ ہو گا امجد
دل کے دریا تو نہیں ہوتے اترنے والے

حرا قریشی ______ ملتان
تیرا خیال کہ ہے تار عنکبوت تمام
مرا وجود کہ جیسے کوئی پرانا کھنڈر

آمنہ اجالا ______ ڈہرکی
سفر اک ایسا ہوا تو تھا، کوئی ساتھ اپنے چلا تو تھا
مگر اس کے بعد ہوا یوں ہوا نہ سفر نہ ہم سفری رہی
وہی خواب خواب حکایتیں، وہی خالی خالی روایتیں
وہی تم رہے، وہی ہم رہے، وہی دل کی بے ہنری رہی

شفق راجپوت ______ گوجرہ
اب اس مقام پہ لائی ہے زندگی مجھ کو
کہ چاہتا ہوں تجھے بھی بھلا دیا جائے
گریز عشق سے لازم بھی مگر رغبت
جو دل ہی بات نہ مانے تو کیا کیا جائے

افشاں خان ______ شاہ پور چاکر
خود کو کسی کی راہ گزر کس لیے کریں
تو ہم سفر نہیں تو سفر کس لیے کریں
منسوب جس کے نام ہوا ہو کوئی پیکر جمال
کر سکتے ہیں پہ سمام نظر کس لیے کریں

شاہ جہاں گل ______ منڈا لوچہ
ہر اک شکست تمنا پہ مسکراتے ہیں
وہ کیا کریں جو مسلسل فریب کھاتے ہیں
نگاہ ناز بھی کیا چیز ہے، خدا جانے
نظر کے ساتھ زمانے بدلتے جاتے ہیں

ارم کمال ______ فیصل آباد
تھوڑا تھوڑا جھوٹ ملاؤ اپنی سچی باتوں میں
ورنہ جھوٹے لوگوں میں تو کیسے عمر گزارے گا
شہر کے چوراہے پر مت جانا آئینہ لے کر
اپنا چہرہ دیکھ کر ہر کوئی تجھ کو پتھر مارے گا

عذرا ناصر ______ کراچی
رہنما خود اپنا دل تھا یوں رہے ثابت قدم
مصلحت نے ورنہ ہر اک گام بہکایا بہت
اے صبا شہر نگاراں سے گزر ہو جب تیرا
بھولنے والے سے کہنا یاد کیوں آیا بہت

ہدیہ مریم ______ ڈیرہ غازی خان
وہ جس کی یاد میں سارا جہان چھوڑ دیا
بنا کے اس نے مجھے داستان چھوڑ دیا

نمرہ اقراء ______ کراچی
مزا ہے کہ جب ہم طاقت پرواز کھو بیٹھے
قفس نے کہہ دیا پنچھی سے جا آزاد کرتا ہوں

عمارہ امر عباس ______ کبیر والا
اب پھول کھلتے ہیں تو خوشیاں نہیں اترتیں
تارے بھی چمکتے ہیں تو محشر نہیں ہوتا
بے سود ہے اختر یہ تیری عرض و گزارش
ایسا بھی کوئی بت ہے جو پتھر نہیں ہوتا

نوشین اقبال نوشی ______ گاؤں بدو ملہی
میکدہ تھا، چاندنی تھی، میں نہ تھا
اک مجسم بے خودی تھی، میں نہ تھا
میکدے کے موڑ پر رکتی ہوئی
مدتوں کی تشنگی تھی، میں نہ تھا

کوثر خالد ______ جڑانوالہ
ایک وہم ہے یہ دنیا، اس میں
کچھ کھو دو تو کیا اور پاؤ تو کیا
بے لوث بھی زیاں اور یوں بھی زیاں
جی جاؤ تو کیا، مر جاؤ تو کیا

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا،

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔
"میت پر نوحہ کرنا جاہلیت کا رواج ہے۔ نوحہ کرنے والی اگر توبہ کیے بغیر مر گئی تو اسے قیامت کے دن اس حال میں اٹھایا جائے گا کہ اس کے جسم پر تارکول کی قمیصیں ہوں گی۔ پھر ان پر آگ کے شعلوں کی قمیص پہنائی جائے گی۔"

حسن کلام،

ایک دن آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حفصہ رضی اللہ عنہا سے کوئی بات رازدارانہ کہی لیکن انہوں نے اسے افشا کر دیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم ان کے ہاں گئے۔ وہاں شفا بنت عبداللہ رضی اللہ عنہا بیٹھی تھیں جنہوں نے طب سیکھ رکھی تھی اور لوگوں کا علاج کرتی تھیں۔ آپ نے حفصہ کو ان کی غلطی یاد کرانے کی خاطر شفا رضی اللہ عنہا سے مخاطب ہو کر فرمایا۔
"جس طرح تم نے اسے لکھنا پڑھنا سکھایا اسی طرح اسے چیونٹی کا منتر (رقیۃ النملۃ) کیوں نہیں سکھاتیں؟"
(سنن ابی داؤد 1522 مسند احمد 24515)
چیونٹی کا منتر چند بول تھے جو عرب خواتین کہا کرتی تھیں۔ یہ کلام نہ نفع دے سکتا تھا نہ نقصان۔ اس کے بول یہ تھے۔

"دلہن تیار ہو رہی ہے
مہندی لگا رہی ہے
آنکھوں میں سرمہ ڈال رہی ہے
تم ہر کام کرنا لیکن شوہر کی نافرمانی نہ کرنا"

(زندگی سے لطف اٹھائیے۔ محمد بن عبدالرحمن العریفی)

نفس پر قابو،

ایک روز کعب رضی اللہ عنہ احبار نے کہا۔
"آسمان کا بادشاہ زمین کے بادشاہ پر افسوس کرتا ہے۔"
حضرت عمرؓ نے فرمایا "مگر اس بادشاہ پر نہیں جس نے اپنے نفس کو قابو میں رکھا۔"
اس کو سن کر کعبؓ نے کہا "واللہ توریت میں بھی یہی الفاظ موجود ہیں۔"
یہ سن کر حضرت عمرؓ سجدے میں گر گئے۔

عبادت کا مفہوم،

خلیفہ عبدالملک بن مروان اور دو اور نوجوان مسجد میں نماز پڑھا کرتے تھے اور عصر تک پڑھتے رہتے تھے۔ سعید بن مسیبؒ سے کسی نے دریافت کیا کہ جیسے یہ جس نماز پڑھتے ہیں اگر ہم بھی نماز پڑھا کریں تو کچھ حرج تو نہیں؟"
انہوں نے فرمایا "عبادت زیادہ نماز پڑھنے اور اکثر روزہ رکھنے کا نام نہیں بلکہ عبادت ذات الٰہی کے متعلق غور کرنے اور گناہوں سے بچنے کا نام ہے۔"

فوزیہ ثمریٹ۔ ہانیہ عمران۔ گجرات

اتحاد،

یہ سن 1939ء کا ذکر ہے۔ مسلم اسٹوڈنٹس فیڈریشن کا سالانہ اجلاس لاہور میں منعقد ہوا۔ شریف بانا ایک نامور مصور ہوتے ہیں۔ وہ فیڈریشن کے رکن اور طالب علم رہنما تھے۔ اس دور میں انہوں نے قرآن پاک کی آیات مبارکہ اور مفکر پاکستان علامہ محمد اقبالؒ کی نظموں کے حوالے سے پینٹنگز بنانے کا آغاز کیا۔
قرآنی آیات اور قومی شعراء کے کلام کے اشتراک سے تیار کی جانے والی ان پینٹنگز کی نمائش فیڈریشن کے سالانہ اجلاس کے موقع پر رکھی گئی تھی۔ اجلاس کے اختتام پر طالب علم رہنماؤں نے قائداعظم کو یہ پینٹنگز دکھائیں۔ نواب ممدوٹ، ممتاز دولتانہ اور حسن امام بھی قائداعظم کے ہمراہ تھے۔
ان پینٹنگز کو دیکھتے دیکھتے قائداعظم ایک جگہ رکے انہوں نے اس طالب علم سے جو ان تصاویر کا منظر بیان کر رہا تھا۔ کہا "اسٹاپ۔"
یہ پینٹنگ "امت واحدہ" کی ترجمانی کرتی تھی۔ اس کے توسط سے امت کو فرقہ بندی سے بچنے اور گروہوں میں تقسیم ہونے سے باز رہنے کا پیغام دیا گیا تھا۔ یہ علامہ اقبال کے ایک شعر

ایک ہوں مسلم حرم کی پاسبانی کے لیے
نیل کے ساحل سے لے کر تابخاک کاشغر

اور قرآن پاک کی ایک آیت کے اشتراک سے تیار کی گئی تھی۔
قائداعظم نے طالب علم سے آیت کا ترجمہ دوبارہ پڑھنے کے لیے کہا۔ اس نے آیت کا ترجمہ یوں پڑھا۔
"اور آپس میں جھگڑا نہ کرو، ورنہ تم کمزور پڑ جاؤ گے اور تمہاری ہوا اکھڑ جائے گی۔"
ترجمہ سن کر قائداعظم نے بڑے تجسس اور حیرت سے دریافت کیا۔
"کیا قرآن یہ پیغام دیتا ہے؟"
ہاں میں جواب ملنے پر انہوں نے فرمایا۔
"اگر یہ پیغام قرآن پاک میں ہے تو میں سمجھتا ہوں کہ ہماری منزل قریب ہے۔ یہی تو وہ پیغام ہے جو میں قوم کو دینا چاہتا ہوں کہ باہم منظم اور متحد ہو۔"
انہوں نے پینٹنگ کو دوبارہ غور سے دیکھا ان کا چہرہ خوشی سے سرخ ہو گیا۔
انہوں نے نواب ممدوٹ کو کندھے سے پکڑا اور کہا "اس نے میرے دل کی بات تخلیق کی ہے۔ میں منزل کے قریب پہنچ گیا ہوں۔ یقیناً پاکستان بن کر رہے گا۔"
(ماہنامہ ذہن، لاہور، قرارداد لاہور نمبر، ص 17)

خوف خدا،

عباسی خلیفہ ہارون الرشید کے سامنے ایک باغی کو ہتھکڑیوں میں پیش کیا گیا۔ یہ ایک خطرناک شخص تھا۔ ہارون فیصلہ کر چکا تھا کہ اسے قتل کر دے گا۔ قتل کا حکم صادر کرنے سے پہلے ہارون نے غضب ناک آواز میں باغی سے پوچھا۔
"تمہارے ساتھ کیا سلوک کیا جائے؟"
"وہی سلوک جو اللہ آپ کے ساتھ کرے گا۔ جب آپ اس کے سامنے جائیں گے۔"
ہارون کا غصہ کافور ہو گیا۔ اس نے سر جھکا لیا۔ چند لمحوں بعد درباریوں نے اس کی تھکی ہوئی آواز سنی۔ "اسے آزاد کر دیا جائے۔"
سپاہیوں نے ہتھکڑیاں کھول دیں۔ باغی دربار سے چلا گیا۔ درباریوں میں سے کسی نے ہارون الرشید کو مخاطب کیا۔
"امیر المومنین! آپ نے باغی کا ایک جملہ سن کر اسے آزاد کر دیا۔ یہ بھی نہ سوچا کہ اس کی گرفتاری میں سپاہیوں کو کتنی زحمت ہوئی تھی۔ نیز اس کی رہائی سے شرپسندوں کو اور شہ مل سکتی ہے۔"
ہارون الرشید نے بے ساختہ حکم دیا "باغی کو دوبارہ گرفتار کر لیا جائے۔"
باغی دوبارہ اس کے سامنے ہتھکڑیوں میں پہنچا اس نے آتے ہی ہارون الرشید سے کہا۔
"حضور! میرے متعلق دوسروں کی رائے پر کان نہ دھریے۔ اگر اللہ آپ کے متعلق دوسروں کی رائے سنتا تو آپ ایک لمحہ بھی خلیفہ نہیں رہ سکتے تھے۔"
ہارون الرشید نے اسے پھر آزاد کر دیا۔

مسرت الطاف احمد۔ کراچی

تاثیر میٹھے لہجے کی،

* کوشش کیجیے' جن کے ساتھ عمر گزارنے کا سودا طے کرنا ہو' ان سے دل ملیں یا نہ ملیں' ذہن ضرور ملتے ہوں۔
* ندامت کا اظہار محض لفظوں کا محتاج نہیں' یہ رویوں سے بھی ظاہر ہوتی ہے۔
* معاف کرنے کا مطلب ہے کسی بھی ناخوشگوار واقعہ کو اس طرح بھلا دیا جائے جیسے یہ کبھی وقوع پذیر ہی نہ ہوا ہو۔
* اپنی غلطی تسلیم کرنا مشکل ترین کاموں میں سے ایک ہے۔ لیکن ناممکن کاموں میں سے نہیں۔
* ایسی خوبیاں جو محض دنیا دکھاوے کو اپنائی گئی ہوں' خامیوں سے بھی بدتر ہوتی ہیں۔
* اگر تمام لوگ کائنات کی بدصورتی ہوتے تو یہ دنیا جہنم ہوتی اور اگر تمام لوگ کائنات کا حسن ہوتے تو یہ دنیا جنت ہوتی۔

حمزہ، اقرا' کراچی

بڑی بات،

دیکھنے والے نے مالِ تجارت لے کر جنگل سے گزرتے ہوئے ایک راہ گیر کو دیکھا تو احساس ہوا لڑکے کی یہ عمر تو کسی مکتب یا مدرسے میں گزارنے کی ہے۔ اور یہ ہے کہ آوارہ پھر رہا ہے۔ سواری روک کر لڑکے کو پاس بلایا اور پوچھا۔

"بیٹا! تمہاری یہ عمر اس طرح جنگل میں گھومنے پھرنے کی تو نہیں۔ کاش کبھی تم نے قلم اور کتاب کی قدر و قیمت جانی ہوتی۔"

لڑکے نے متانت اور لجاجت سے جواب دیا۔

"اگرچہ میں نے زیادہ تعلیم حاصل نہیں کی تاہم صرف چار باتیں سیکھی ہیں اور مزید سیکھنے کی طلب نہیں۔ کیونکہ انہی چار باتوں پر عمل ہو جائے تو زندگی سنور جائے گی۔"

پوچھنے والے نے حیرت اور مسرت کی ملی جلی کیفیت کے ساتھ پوچھا۔

"بیٹا! ذرا مجھے بھی تو بتاؤ کہ چار باتیں کون سی ہیں؟"

لڑکے نے عاجزانہ اور منکسرانہ لہجے میں کہا۔

"مجھے جن چار باتوں کا علم ہے وہ ہے زبان کا علم' سر کا علم' کانوں کا علم' دل کا علم۔"

پوچھنے والا اگرچہ حدیث' تفسیر اور فقہ کا مشہور عالم تھا مگر وہ لڑکے کے اس جواب سے مطمئن نہ ہوا کہنے لگا۔

"بیٹا! اگرچہ تم نے بڑی اور جامع ــــــ بات کی ہے لیکن ذرا اس کی تفصیل تو بتاؤ۔"

لڑکے نے کہا۔ "اللہ کا ذکر کرنے کے لیے زبان' اللہ کے حضور ــــ جھکانے کے لیے سر' اللہ کا کلام سننے کے لیے کان اور اللہ کی یاد بسانے کے لیے دل ہے۔"

پوچھنے والے نے جیسے ہی جواب سنا تو بے اختیار واہ واہ کا نعرہ لگایا اور کہا۔

"بیٹا! اب تمہیں کسی مکتب یا مدرسہ جانے کی ضرورت نہیں۔ تم نے علم کا لب لباب پا لیا ہے مجھے بھی کچھ نصیحت کرو کیونکہ بزرگی عقل سے ہوتی ہے' عمر سے نہیں۔"

لڑکے نے کہا۔ "آپ مجھے بہت بڑے عالم معلوم ہوتے ہیں۔ میں آپ کو کیسے نصیحت کر سکتا ہوں البتہ اتنی گزارش ہے کہ اگر آپ نے علم خالص اللہ کے لیے حاصل کیا ہے تو دنیا والوں سے جزا کی توقع نہ رکھیے اور اگر دنیا والوں کے لیے حاصل کیا ہے تو اللہ سے اجر کی امید نہ رکھیے۔"

اس نوجوان لڑکے کی یہ بات سنتے ہی پوچھنے والے مشہور بزرگ حضرت شیخ عبداللہ بن مبارک کی زبان سے صرف اتنا نکلا۔

"بے شک علم اللہ کا نور ہے۔ وہ جس دل میں چاہے اتار دے۔ اس میں عمر' نسب' یا امارت کی کوئی شرط نہیں۔"

عمارہ رفیق۔ فاضل پور

گل صفر سہیل



شکایت

نیلم منیر آج کل ہر چینل پر تقریباً" ہر دوسرے ڈرامے میں نظر آرہی ہیں۔ نیلم منیر کہتی ہیں کہ "فلم انڈسٹری کی طرح ڈرامہ انڈسٹری میں بھی لابی ازم کا رجحان فروغ پا رہا ہے۔ جس کی وجہ سے ٹیلنٹ ضائع ہو رہا ہے۔" (کس کا ٹیلنٹ نیلم؟) فنکار اپنی خداداد صلاحیتوں کی بنا پر اپنا مقام بناتا ہے اس کی محنت کو کسی گاڈ فادر کی جھولی میں ڈالنا درست عمل نہیں۔ (آپ کا گاڈ فادر کون ہے۔ نیلم؟) لابی ازم نہیں ہو گا تو نیا ٹیلنٹ سامنے آئے گا (وہ تو آرہا ہے۔ نیلم سامنے) اور نئے ٹیلنٹ کی ہماری انڈسٹری کو بہت ضرورت ہے۔ لیکن نیلم! اسٹارز کسی بھی انڈسٹری کا ستون ہوتے ہیں۔ اگر ستون ہٹ جائیں تو عمارت کا برقرار رہنا مشکل ہوتا ہے۔ اور نئے آرٹسٹ جن میں دراصل ٹیلنٹ ہوتا ہے۔ ان کا راستہ کوئی بھی نہیں روک سکتا۔ کیوں ٹھیک ہے ناں!)

معیار

لیجیے جناب ایک اور اعزاز مل گیا (بھئی ملالہ کو اور کس کو) لیکن ہمیں کوئی یہ تو بتائے کہ ملالہ نے کیا کیا (ڈائریاں لکھنے کے علاوہ) جو اس کو اعزاز پہ اعزاز مل رہے ہیں۔

اب تو موصوفہ کو نوبل انعام پکڑا دیا ہے (یقیناً" ملالہ نے عبدالستار ایدھی اور بلقیس ایدھی سے بڑھ کر کوئی کام کیا ہوگا!) ملالہ یوسف زئی پہلی پاکستانی مسلمان ہے جس کو یہ انعام ملا ہے اس سے پہلے ایک پاکستانی سائنس دان عبدالسلام کو بھی یہ انعام مل چکا ہے لیکن وہ ختم نبوت پر یقین نہیں رکھتے تھے اور ملالہ اب تک نوبل انعام پانے والے 'ملالہ' کو ملا کر کل دس



مسلمان ہیں۔ حقیقت کی نظر سے دیکھا جائے تو یہ انعام دراصل ان مسلمانوں کو دیا گیا ہے جو مسلمانوں کے خلاف کام کرتے ہوئے ترقی پسندی کے علم بردار بنے۔ کسی خالص مسلمان اور خالص پاکستانی کو یہ انعام نہیں دیا گیا۔

ملالہ نے اپنی کتاب میں توہین رسالت کے مرتکب سلمان رشدی کی حمایت کی ہے۔ شاید اسی بنا پر وہ اتنے بڑے انعام کی مستحق قرار پائی ہوں۔

پہچان

فلم "نامعلوم" کے ایک اہم کردار محسن عباس جو کہ ڈی جے کے نام سے مشہور ہوئے کہتے ہیں کہ "میرا کیریئر بہت پرانا ہے۔ عرصہ بارہ سال سے اس فیلڈ میں جدوجہد کر رہا ہوں۔ ٹی وی شوز میں حنا ربانی کھر عاصمہ جہانگیر اور شاہ چیچہ کا گیٹ اپ کرتا تھا۔ لیکن لوگ مجھے پہچانتے نہیں تھے۔ اب بھی لوگ مجھے ڈی جے کے نام سے جانتے ہیں اس نام کو ابھی بھی قبول کرنے میں مجھے لگتا ہے کہ میری عزت نفس مجروح ہوتی ہے۔ مجھے بہت خوشی ہوگی اس دن جب لوگ



مجھے میرے اصل نام سے پہچانیں گے کیونکہ یہاں تک پہنچنے کے لیے میں نے بڑی محنت اور جدوجہد کی ہے۔"

پریشانی

پاکستانی نژاد برطانوی گلوکار زین ملک ساری دنیا کو اپنی سریلی آواز اور مدھر دھنوں سے تو متاثر کر ہی چکے تھے۔ لیکن "دی ایکس فیکٹر" نامی مشہور رئیلٹی شو میں شرکت کرنے کے بعد ان کی شہرت اتنی بڑھ گئی کہ بولی وڈ کے پروڈیوسر گلشن گروور نے اپنی ہیوی بجٹ فلم میں ایک گانے کے عوض زین ملک کو پانچ لاکھ پاؤنڈ معاوضے کی پیشکش کر دی جس کے بعد زین نے سنجیدگی سے اس طرف سوچنا شروع کر دیا ہے۔ گلشن گروور بھارت میں زین کی بڑھتی ہوئی مقبولیت کی وجہ سے انہیں اپنی فلم میں اداکاری کی پیشکش بھی کر چکے ہیں۔ گلشن گروور کا کہنا ہے کہ اس اکیس سالہ نوجوان کو ڈانس یا میک اپ کی تو ضرورت نہیں ہوگی، لیکن اگر وہ فلم میں کام کرنے پر راضی ہو گیا تو اسے ایکشن کے مناظر کے لیے ضرور ٹریننگ کرنی ہوگی۔ سنا ہے کہ زین کی بولی وڈ آمد کے باعث علی ظفر اور عاطف اسلم کے ساتھ ساتھ نوویر سنگھ، رنبیر کپور اور عمران خان کو بھی پریشانی لاحق ہو گئی ہے۔

خطرہ

بھارت میں پاکستانی ٹی وی ڈراموں کی مقبولیت کی وجہ سے ہمارے فنکار اب وہاں بھی مقبولیت حاصل کر رہے ہیں۔ فواد خان کو بھی ٹی وی ڈراموں کی وجہ سے بالی وڈ میں لیا گیا۔ اب عدنان صدیقی کو بھی بھارتی ٹی وی ڈراموں اور فلموں میں کام کرنے کی متعدد آفرز آئی ہیں۔ اس بارے میں عدنان صدیقی کہتے ہیں کہ "میں ذاتی طور پر تذبذب کا شکار ہوں کہ اگر بھارتی ٹی وی ڈراموں میں کام کرتا ہوں تو ڈر ہے کہ کہیں صرف ڈراموں تک ہی محدود نہ رہ جاؤں اور اگر فلم کی آفر قبول کرتا ہوں تو اپنے ٹی وی ڈراموں سے دور ہونے کا

خطرہ ہے۔ (بھلا بتایئے انہیں اب بھی ڈر ہے)

بحران

ٹی وی ڈراموں سے شہرت حاصل کرنے والی فنکارہ عروہ حسین نے فلم نامعلوم افراد میں بھی اپنی اداکاری کے جوہر دکھائے۔ فلم میں کام کرنے کے حوالے سے عروہ کا کہنا ہے کہ "فلم میں کام کرنے کا تجربہ بہت اچھا رہا۔ اس طرح کی فلموں سے ہی فلم انڈسٹری بحران سے نکلے گی (ہر نئی آنے والی فلم کے متعلق یہی کہا جاتا ہے کہ انڈسٹری بحران سے نکلے گی۔ ابھی تک تو نکلی نہیں) فلم میں جو میرا کردار تھا مجھے لگا کہ یہ کردار میرے لیے ہی لکھا گیا تھا (عروہ! سب یہی کہتے) عروہ حسین نے کہا کہ مستقبل میں فلموں میں اسکرپٹ دیکھ کر کام کروں گی۔" (تو ابھی کیا بغیر دیکھے کر لیا تھا؟)

کچھ ادھر ادھر سے

کراچی 80'90 کی دہائی تک اپنی یادگار ادبی تہذیبی اور سماجی زندگی کے دور سے گزر رہا تھا۔ دن کا آغاز ہوتا تو شب کی خبر نہ ہوتی۔ شہر پر سکون تھا کوئی ڈر خوف نہ تھا۔ راتیں جاگتی تھیں ان مہکتے تھے۔ شامیں رنگ کھیلتی تھیں۔

(خالد معین کی جسارت سے گفتگو)

☆۔ 12 اکتوبر 99ء کو نواز شریف زیر حراست تھے۔ پرویز مشرف نے دو کتے اٹھا کر اور اتاترک کو اپنا آئیڈیل کہہ کر مغرب کو پیغام دے دیا۔ جنرل کا نشانہ ٹھیک بیٹھا۔ مغرب کے ریڈار نے یہ مثبت اشارے وصول کرنے کے بعد جنرل مشرف سے اس طرح دوستی کر لی جیسے لوگ ماضیوں کا انتقام سب مل کر بھی خوشی رہنے لگے۔

(عارف بہار صدائے حریت)

☆۔ ایک نئی تحقیق سے وابستہ سائنس دانوں نے کہا ہے بچپن میں صبح کا ناشتا چھوڑنے کی عادت جوانی میں ذیابیطس کے خطرے سے دوچار کر سکتی ہے صبح کے ناشتے میں سیریل کھانا جو کہ فائبر حاصل کرنے کا



ایک اہم ذریعہ ہے اس بیماری کے خلاف مدافعت پیدا کرنے میں مدد دیتا ہے۔

☆۔ کیا ملالہ کو علم ہے کہ امریکہ اور برطانیہ کے گٹھ جوڑ سے افغانستان اور عراق میں کتنی کم عمر بچیاں شہید ہو گئیں۔ کوئی ایک جملہ فقط ایک ان کے قاتلوں کی مذمت کے لیے بھی۔ لیکن پھر نوبل انعام واپس لے لیا جائے۔ کاش ملالہ یہ بتا سکتی کہ اس نے پاکستان میں کتنی لڑکیوں کی تعلیم کے لیے کچھ کیا ہے۔ چلیں یہی بتا دے کہ بارہ سال کی عمر میں اس کے نام سے ڈائریاں کون لکھتا تھا؟

(ایم عثمان۔ ٹوکیو)

☆۔ طاہر القادری کے جلسے میں ایک خاتون رپورٹر نے جلسہ شروع ہونے سے پہلے بعض غریب خواتین کی طرف جاتے ہوئے کہا کہ ناظرین آیئے آپ کو ان باسیوں سے ملواتے ہیں لیکن فوراً ہی اسے اپنی غلطی کا احساس ہو گیا۔ حقیقت یہی تھی کہ فیصل آباد کے ارد گرد واقع دیہات سے شہر کام کے لیے آنے والی ماسیوں کو جلسے میں شرکت کے لیے دہاڑی پر لایا گیا۔ جنہوں نے کبھی طاہر القادری کا نام بھی نہ سنا ہو وہ انقلاب کے بارے میں کیا جانتیں۔

(روزنامہ امت کا اداریہ)

دستک دستک دستک

شاہین رشید



کاشف خان

"جی جناب! کیسے ہیں؟"

"الحمدللہ۔"

"آج کل ٹی وی چینلز کو بڑا ٹائم دینے لگے ہیں؟"

"جی۔ سب محبت سے بلاتے ہیں تو چلا جاتا ہوں اور اچھا لگتا ہے پروگرام میں شریک ہونا۔"

"ہوں۔ لگتا ہے آپ کو تو صبح اٹھنے کی عادت نہیں ہے۔ پھر مارننگ شوز میں کیسے شرکت کرتے ہیں؟"

"بات تو آپ نے پتے کی کی ہے۔ اصل میں ہماری رات صبح ہوتی ہے۔ تو جب کوئی صبح کی نشریات میں بلاتا ہے تو ہم سوتے ہی کب ہیں۔ پروگرام میں شرکت کے بعد سو جاتے ہیں اور بس نیند پوری کر لیتے ہیں۔"

"آج کل انڈیا کے ٹور" نہیں لگ رہے؟"

"لگ رہے ہیں جی، کیوں نہیں لگ رہے مگر مسئلہ یہ ہے کہ ہماری خبریں بریک نہیں ہوتیں۔ شاید اس لیے کہ فنکار لوگ کافی تعداد میں جانے لگے ہیں۔"

"ہوں۔ اور زندگی کیسی گزر رہی ہے۔ مجھے یاد ہے کہ آپ نے ایک بار کہا تھا کہ تعلیم کی اہمیت بہت زیادہ ہے اور آپ دوبارہ پڑھائی شروع کریں گے؟"

"جی بالکل۔ تعلیم کی اہمیت بہت زیادہ ہے اور ہر فیلڈ میں تعلیم بہت ضروری ہے۔ مگر اب ہماری مصروفیات اتنی زیادہ ہو گئی ہیں کہ مزید تعلیم حاصل کرنے کے لیے ٹائم ہی نہیں ہے اور ویسے بھی ہم بڑے ہو گئے ہیں۔"

"کب ہوئے۔ کتنے بڑے ہو گئے ہیں آپ؟"

"جی 17 اگست 1977ء میری تاریخ پیدائش ہے۔ اب آپ خود اندازہ کر لیں کہ کتنا بڑا ہو گیا ہوں۔"

"ویسے آپ کے خیال میں ڈگری انسان کو سکھاتی ہے یا پریکٹیکل لائف؟"

"میرے خیال میں تو پریکٹیکل لائف انسان کو بہت کچھ سکھاتی ہے۔ بے شک ڈگری بھی بہت ضروری ہے۔ تعلیم آپ کو شعور دیتی ہے۔ سوچ دیتی ہے۔ مگر پریکٹیکل لائف آپ کو زندگی گزارنے کا سلیقہ سکھاتی ہے۔ آپ دنیا کے تجربات سے بہت کچھ سیکھتے ہیں۔"

"اب تو آپ کو بہت شہرت مل گئی ہے۔ لیکن جب آپ نئے نئے اس فیلڈ میں آئے تھے تو لوگوں کا رویہ کیسا تھا آپ کے ساتھ؟"

"بس ٹھیک ہی تھا۔ اتنے تجربات سے میں نے یہ سیکھا ہے کہ اس فیلڈ میں جگہ بنانا بہت مشکل کام ہے۔ جب شروع شروع میں بات نہیں بن پاتی تھی تو اکثر سوچتا تھا کہ اس فیلڈ کو چھوڑ دوں، کچھ اور کام کر لوں۔ مگر میرا شوق اور میرا جنون کہتا تھا کہ ایک دن جگہ بن ہی جائے گی اور شکر ہے کہ آخر ایک دن میں کامیاب ہو ہی گیا۔"

"مثلاً کیا مشکلات آئیں؟"

"میں نے دیکھا ہے کہ ہمارے ملک میں کامیڈینز کی کوئی عزت نہیں ہے، جن کا نام بن گیا، وہ تو ٹھیک ہیں، لیکن جو نئے ہوتے ہیں ان کو جگہ بنانے میں بہت دشواری ہوتی ہے۔ جب لوگ مسخرہ کہہ کر پکارتے تھے تو بہت تکلیف ہوتی تھی۔ حالانکہ میں سمجھتا ہوں کہ دوسروں کو ہنسانا ایک مشکل ترین کام ہے۔ مجھے یاد ہے کہ جب ہم شو کے لیے کسی پروگرام کے لیے جایا کرتے تھے تو گلوکار حضرات ہماری ذرا بھی عزت نہیں کرتے تھے اور ہمیں عجیب سی نظروں سے دیکھتے تھے۔ تب دل بہت خراب ہوتا تھا۔"

"اور اب۔ کس طرح لوگوں کے رویے بدلے؟"

"اصل میں ٹرننگ پوائنٹ وہاں سے ملا، جب ہم انڈیا میں پروگرام لافٹر چیلنج کرکے آئے اور میں پہلا پاکستانی تھا جس نے ون کیا تھا اور انڈیا والوں کے یہ الفاظ کہ ہم نے ایسا ٹیلنٹ پہلے کبھی نہیں دیکھا تو پھر اپنے ملک کے لوگوں کو بھی احساس ہوا کہ بندہ کسی کام کا ہے۔"

"یہ تو ہے کہ ہمارے یہاں چڑھتے سورج کی ہی پوجا کی جاتی ہے۔ ان باتوں پر غصہ تو آتا ہوگا؟"

"بالکل آتا تھا۔ مگر کنٹرول کرتا تھا اور جب غصہ آتا تھا تو اپنے آپ کو لگتا ہے بس محسوس کرتا تھا کہ اپنے آپ کو مارنے کو دل چاہتا تھا۔ خیر اب تو میرا غصہ کم ہو گیا ہے اور یہ بھی احساس ہو گیا ہے کہ غصہ کام خراب ہی کرتا ہے اسے کنٹرول میں رکھنا چاہیے۔"

"وہ باتیں انسان کو کسی کام کے کرنے پر مجبور کرتی ہیں، پیسہ یا پھر جنون۔ آپ کو پیسہ کمانے کا جنون تھا یا کچھ کر دکھانے کا جنون تھا؟"

"کچھ کر دکھانے کا جنون تھا۔ پیسہ بھی ضروری تھا مگر پھر سوچتا تھا کہ کچھ بن جاؤں گا تو پیسہ خود بخود مل جائے گا۔ اور مجھے یاد ہے کہ جب میں نے کام شروع کیا اور ایک اسٹیج ڈرامے میں کام کیا تو مجھے دو سو روپے ملے اور جب پی ٹی وی پر کام کیا تو ایک سو چالیس روپے ملے۔ تو افسوس ہوتا تھا کہ محنت کا اتنا سا صلہ۔"

"اب کیا صورت حال ہے؟"

"اب تو اللہ کا بہت کرم ہے۔"

"اب فضول خرچی کو دل چاہتا ہوگا؟"

"نہیں۔ فضول خرچی کا تو کبھی بھی دل نہیں چاہا۔ پیسے کی ہمیشہ قدر کرتا ہوں، بہت مشکل سے کمایا جاتا ہے۔ لیکن یہ ضرور ہے کہ جو چیز پسند آتی ہے اور ضرورت بھی ہوتی ہے تو ضرور خرید لیتا ہوں کہ پتا نہیں کل یہ بھی میسر ہو۔ یا نہیں۔"

"اور بیگم؟"

"الحمدللہ بیگم بھی میرے جیسی ہی کفایت شعار ہے، کبھی فضول خرچی نہیں کی۔"

"گھر میں بیگم کے ساتھ تعاون کرتے ہیں کام کاج میں؟"

"میرا تو دل چاہتا ہے کہ گھر کے کاموں میں بیگم کا ہاتھ بٹاؤں مگر وہ منع کر دیتی ہے کہ نہیں، آپ گھر سے باہر محنت کرکے آتے ہیں گھر کو سنبھالنا اس کی دیکھ بھال کرنا میرا کام ہے۔ مگر پھر بھی میں اپنے سارے کام خود کرتا ہوں۔"

"کیوں؟"

"اس لیے کہ مجھے ہمیشہ سے ہی اپنے کام خود کرنے کی عادت ہے۔ کھانا پکانے سے مجھے بہت زیادہ دلچسپی ہے۔ اس لیے کبھی کبھی پکا بھی لیتا ہوں۔ رات دیر ہو جائے تو کھانا بھی خود ہی گرم کر لیتا ہوں۔"



"ارے واہ بیگم کے تو مزے ہو گئے؟"

"ایسا نہیں ہے۔ وہ بھی تو سارا دن بچوں کو سنبھالتی ہے۔ ان کی تربیت کرتی ہے۔ گھر کی دیکھ بھال۔ بھئی میاں، بیوی گاڑی کے دو پہیے ہیں۔ دونوں کو ہی چلنا چاہیے۔"

جویریہ اجمل

"ہیلو۔ کیسی ہو؟"

"جی اللہ کا شکر۔"

"کیا ہو رہا ہے آج کل؟"

"کام۔ اور کافی کام کر رہی ہوں۔ اس لیے مصروف رہتی ہوں۔ نہ کہیں آنے جانے کی فرصت ہے اور نہ ہی کسی سے بات کرنے کی۔"

"اچھا۔ گڈ۔ آج کل تمہارا سیریل "بشریٰ" دیکھ رہے ہیں۔ بڑا خطرناک رول ہے۔ کیا رسپانس مل رہا ہے؟"

"اچھا رسپانس مل رہا ہے۔ سب تعریف بھی کر رہے ہیں اور جو صرف ڈرامے کو ڈراما سمجھ کر دیکھتے ہیں انہیں تو معلوم ہے کہ میں اداکاری کر رہی ہوں۔ لیکن جو بہت گہرائی سے دیکھ رہے ہیں وہ جب بھی راستے میں ملتے ہیں تو بڑے بڑے مزے کے ریمارکس دیتے ہیں۔ کچھ مجھے برا کہتے ہیں، تو کچھ اچھا۔"

"تم نے مجھے اپنے پہلے انٹرویو میں کہا تھا کہ رومانٹک رول کرنے میں بہت مشکل ہوتی ہے۔ اب بھی ہوتی ہے تو بشریٰ میں تو ـــ؟"

"جی جی۔ بشریٰ میں ایسا رول نہیں ہے کہ جھجک ہو۔ صرف فون پر بات ہوتی یا ایک دو ملاقاتیں۔ ہاتھ پکڑنے والے اور آمنے سامنے ڈائیلاگ بولنے والے کردار میں مشکل ہوتی ہے۔ کافی ریلیکس ہوتی ہوں میں۔ لیکن خیر اب حالات پہلے سے بہتر ہیں۔ اب کام کر کے عادت سی ہو گئی ہے۔"

"فیوچر میں کیا کرنا ہے؟"

"جی اداکاری بھی کرنی ہے۔ ہوسٹنگ بھی اور میڈیا کی تعلیم حاصل کر کے بہت آگے تک جانا ہے۔"

"ہوسٹنگ۔ پہلے کبھی کی ہے؟"

"جی ہوسٹنگ کر چکی ہوں۔ اصل میں تو مجھے اداکاری سے زیادہ کمرشلز میں کام کرنے اور وی جے بننے کا شوق تھا اور آکسیجن چینل پہ میں نے ہوسٹنگ سے ہی اپنے کیریر کا آغاز کیا تھا۔ بس ریفرنس ابو کے دوست کا تھا۔ باقی میرا ٹیلنٹ۔ اور ابھی بھی کمرشلز کر رہی ہوں۔ البتہ اداکاری کی وجہ سے ہوسٹنگ چھوڑ دی۔"

"اداکاری میں بھی کوئی خاص ترجیح ہے رولز کے لیے؟"

"نہیں۔ میں ہر طرح کے رولز کرنا چاہتی ہوں۔ نیگیٹو بھی، پوزیٹو بھی، ماڈرن بھی اور سیدھی سادی سی معصوم لڑکی کے بھی۔ میں ایک ورسٹائل فنکارہ بننا چاہتی ہوں۔"

"1996ء کی آپ کی پیدائش ہے۔ بہت چھوٹی ہیں آپ۔ تو اس فیلڈ میں کس سے متاثر ہو کر آنے کا سوچا؟"

"کسی خاص شخصیت سے متاثر نہیں ہوئی، بلکہ جب کمرشل دیکھتی تھی تو سوچتی تھی کہ میں بھی کر سکتی ہوں۔ یہ کون سا مشکل کام ہے۔ پھر جب کسی کو اداکاری کرتے ہوئے دیکھتی تو سوچتی ایسا تو میں بھی کر سکتی ہوں۔ مطلب مجھے دوسروں کا کیا ہوا ہر کام آسان لگتا تھا مگر جب کہیں آڈیشن کے لیے جاتی تو یہ کہہ کر ٹال دیا جاتا تھا کہ آپ ابھی چھوٹی ہیں۔ پھر ایک دن تھک ہار کر ابو کے ایک فرینڈ سے بات کی۔ انہوں نے میرا آڈیشن لیا اور پھر دوسرے ہی دن مجھے آکسیجن چینل سے (میوزک چینل) کال آگئی کہ آپ آجائیں اور مجھے پروگرام "مادام" کی ہوسٹنگ دے دی۔"

"پھر مادام مست قلندر ہوا یا تمہاری سوچ کی طرح یہ کام تو میں بھی کر سکتی ہوں، تم نے آسانی سے پروگرام کر لیا؟"

"ہنستے ہوئے" "سچ میں انسان سوچتا کچھ ہے اور ہوتا کچھ ہے۔ کیمرے کے سامنے، وہ بھی لائیو پروگرام کرنا مشکل تو بہت لگا۔ پھر آہستہ آہستہ جھجک دور ہو گئی اور اپنے آپ سے میں نے کہا کہ "بیٹا کام اتنا آسان نہیں، جتنا تم سمجھ رہی تھیں۔" مگر شوق حاوی ہوا اور میں اچھے طریقے سے کام کرنے لگی۔ پھر ڈرامے کی آفر آگئی تو مت پوچھیں، کتنی خوشی ہوئی اور اب تو میں بہت ہی خوش ہوں کہ میرے پاس کافی کام ہے۔"

"لوگ اور گھر والے حوصلہ افزائی کرتے ہیں؟"

"بہت زیادہ۔ میرے ناظرین بھی اور میرے گھر والے بھی میری پرفارمنس کو بہت پسند کرتے ہیں۔"

"اوکے جویریہ۔ پھر بات کریں گے تمہارے کسی نئے سیریل کے آنے پر۔"

"جی ضرور۔"

حنا حبیب

"کیسی ہیں حنا صاحبہ؟"

"اللہ کا شکر ہے۔"

"اب ربیع الاول قریب ہے۔ آپ کی مصروفیات تو بڑھ جائیں گی۔"

"جی بالکل بڑھ جائیں گی۔ عام دنوں میں بھی میں مصروف رہتی ہوں، لیکن رمضان المبارک اور ربیع الاول میں بہت زیادہ مصروفیات ہو جاتی ہیں۔"

"مصروف رہنا اچھا لگتا ہے یا گھر میں بیٹھ کر آرام کرنا؟"

"دونوں۔ رمضان المبارک اور ربیع الاول کے مہینوں میں ہی زیادہ مصروفیات ہوتی ہیں اور ان دو ماہ میں تو اتنا جوش و خروش ہوتا ہے اور اتنے جذباتی ہو جاتے ہیں سب کہ۔ ویسے ہی سب بہت اچھا لگتا ہے۔ بہت برکت والے مہینے ہوتے ہیں۔"

"حنا! آپ نعتیہ محفلوں میں زیادہ بلائی جاتی ہیں یا ٹی وی چینل پہ؟"

"جن دو ماہ کا ذکر میں نے کیا ہے ان میں تو پرائیویٹ، سرکاری اور ٹی وی چینلز میں بہت زیادہ بلائی جاتی ہوں۔ جبکہ عام دنوں میں بھی نعتیہ محفلوں میں۔ لوگ جب شادی کی تقریبات کا آغاز کرتے ہیں تو میلاد کرتے ہیں تو پھر ان موقعوں پر بھی ہمیں بلایا جاتا ہے۔"

"اتنی مصروفیات میں سے اتنا ٹائم مل جاتا ہے کہ امی کے ساتھ گھر کے کاموں میں ہاتھ بٹائیں؟"

"گھر میں سب سے بڑی ہوں اور بڑی ہونے کی وجہ میرا فرض بنتا ہے کہ میں امی کے ساتھ گھر کے کاموں میں ہاتھ بٹاؤں۔ مگر مجھے وقت ہی نہیں ملتا امی کے ساتھ کام کرنے کا۔ چھوٹی بہنیں زندہ باد۔ میرے ساتھ بہت تعاون کرتی ہیں۔ اللہ انہیں خوش رکھے۔"

"اور کیا مشاغل ہیں تمہارے؟"

"بس کبھی فرصت میں ہوتی ہوں تو فیس بک اور انٹرنیٹ کو دیکھ لیتی ہوں۔ یا کبھی کبھار شاپنگ پر چلی جاتی ہوں۔"

وہ اِک پری تھی

نازیہ جمال

انڈس ہائی وے پر ایک سیاہ کار شمال کی جانب رواں دواں تھی۔ اس کار میں بیٹھے پانچ بے حد خوب صورت افراد کے خوشی سے دمکتے چہروں پہ منزل کے قریب پہنچنے کا احساس دھیما دھیما بکھیر رہا تھا۔

پانچوں نے بے حد خوب صورت' اسٹائلش اور قیمتی کپڑے زیب تن کر رکھے تھے۔ خواتین کی کلائیوں میں طلائی زیورات دمک رہے تھے۔

آخر کیوں نہ اتنے اہتمام سے آتے؟ اپنی خالہ زاد بہن شازیہ جمال نیر کی شادی میں شرکت جو کرنے آرہے تھے۔

خالہ کو اپنی بھانجی کو دلہن کے روپ میں دیکھنے کا ارمان کشاں کشاں لیے چلا آرہا تھا۔

"اتنے مہینوں بعد رشتہ داروں' عزیزوں سے ملیں گے۔ خوب گپ شپ رہے گی۔ خوب ناچیں گے' ہلا گلا کریں گے۔" اسی ایک سوچ نے ان پانچوں کو رستہ بھر ترنگ میں جتائے رکھا۔

"میری بٹیں بھائی ضعیف العمر والد کیسے اتنے سارے پیاروں کو تھام دے پاؤں گی۔ شادی میں مہمانوں کو بھی بھگتانا ہوگا۔ آخر کو دولہا' دلہن کی خالہ ہوں مہمان بن کر ایک طرف تو نہیں بیٹھ جاؤں گی۔"

بے حد نفیس' خوب صورت اور ادھیڑ عمر باوقار خاتون نے دھیمے سے مسکراتے ہوئے دل میں سوچا۔

"پیر کو میری جنم کا پیپر ہے۔ بس شازیہ کی رخصتی تک ہی رکیں گے۔ ولیمہ اٹینڈ کرتے ہی واپسی کرنی ہوگی۔ میرا عبداللہ میرے بغیر زیادہ نہیں رہ سکتا۔"

ماں کے پہلو سے لگ کر بیٹھی خوب صورت سراپے کی مالک لڑکی نے اپنی مخصوص میٹھی اور دلنشین آواز میں سب کو اپنے ارادے سے آگاہ کیا۔

اچانک شمال کی جانب سے ایک ٹرالر نمودار ہوا۔

گورے مضبوط مردانہ ہاتھوں نے اسٹیرنگ سنبھالنے کی بہت کوشش کی مگر تقدیر سے زیادہ اثر پذیر چیز بھلا کچھ اور بھی ہے۔ کار اور ٹرالر کے زوردار تصادم کی آواز سے پنچھیوں نے ایک دم سے اشجار چھوڑ دیے۔

رستے ایک دم ٹھٹک سے گئے۔ خوف سے دم سادھی فضا نے فرحانہ ناز ملک کو دم توڑتے دیکھا تو دہر کو سسک کر رو پڑی۔

ایک دوسرے کو اپنی جان کہنے والے تینوں بہن بھائی ایک ساتھ جان دے دیتے۔ اپنے بچوں پہ ہر دم مہربان' شفیق اور جان نچھاور کرنے والی ماں داعی اجل کو لبیک کہنے میں پہل کیوں نہ کرتی؟

☼ ☼ ☼

11 اکتوبر 2014ء

آج کا دن میرے لیے بے حد اہم اور خوشی کا دن تھا۔ میں نے ہاتھوں پہ سعدیہ سے مہندی لگوائی۔ ناخنوں کو گلابی رنگ سے رنگا۔ کلائیوں میں بھر بھر چوڑیاں چڑھائیں۔ آخر یہ سب کیوں نہ کرتی؟ آج میری بہت پیاری' بہت میٹھی' بہن شازیہ جمال نیر کی مایوں تھی۔ ہر فرد بے حد مصروف و بے حد خوش۔

"آپی! آؤ ذرا میرے ساتھ' یہ دریاں چیک کروالو۔ پوری ہیں یا نہیں؟" فیصل نے مجھے پکارا۔

"میرے لال! میں نے چہرے اور بازوؤں پہ ملیح لگا رکھی ہے۔ میں کیسے تمہاری مدد کروں۔" میں نے معصومیت سے عذر پیش کیا۔

"یہ پچھلے آدھے گھنٹے سے صرف اس لیے ملیح تھوپے بیٹھی ہے کہ کوئی کام نہ کرنا پڑے۔"

رات کے فنکشن کے لیے کپڑے استری کرتی سعدیہ نے جل بھن کر کہا۔ شازیہ شرمیلی مسکان لبوں پہ سجائے مایوں کی زرد قمیص اپنے ساتھ لگائے فٹنگ چیک کررہی تھی۔

اچانک جنوب سے آتی ہوا کرلانے لگی۔ سب ایک دم سہم سے گئے۔

"یا اللہ! خیر۔ فرحت لوگ ابھی تک نہیں پہنچے جانے کب روانہ ہوئے ہیں۔" امی نے سینے پہ ہاتھ رکھ کر سراسیمگی سے کہا۔ سب کے دل ایک ساتھ ایک ہی رفتار سے کیسے دھڑک سکتے ہیں؟ مگر ہمارے دھڑکنے لگے تھے۔ جیسے تیز رفتار ریل گاڑی' چھکا چھک' چھکا چھک۔ ابو کے سیل پہ کال آئی۔ وہ کال نہیں تھی' بلکہ صور اسرافیل تھا جس نے ہم سب کو کھڑے کھڑے زندہ در گور کردیا۔ مہندی کا رنگ ایک دم پھیکا پڑ گیا تھا۔ فیشل زدہ گورے چہرے ایک دم زرد۔ آسمان سر پہ ٹوٹ پڑنا۔ قہر برپا ہونا۔ پیروں سے زمین نکلنا۔ یہ سارے الفاظ میں نے اردو کی کتاب میں پڑھے اور بارہا انہیں بہت آرام سے جملوں میں استعمال کیا۔ مگر ان جملوں کی اصل کیفیت اتنی دردناک' بھیانک اور جان لیوا ہوتی ہے۔ یہ میں نے آج جانا تھا۔

میں فرحانہ ناز ملک کو بہت محبت' احترام' اپنائیت' لاڈ اور عقیدت سے باجی بے بی کہتی تھی۔ انہیں میں نے ہمیشہ ایک ہی روپ میں دیکھا۔ بے حد آسودہ' مطمئن' خوش باش' سریلے قہقہے بکھیرتی' بے حد خوب صورت اور اسمارٹ اور ہمیشہ انہیں اسی روپ میں دیکھنے کی چاہ تھی۔

مگر آج دن میں نے بہت ٹوٹا پھوٹا' بے جان لاشہ۔ نہیں' نہیں۔ یہ میری باجی بے بی نہیں ہوسکتیں۔ کبھی نہیں۔

کتنی چاہ سے ہم نے انہیں شادی پہ مدعو کیا تھا۔ مگر یہ کیا؟ وہ ہمارے گھر شادی اٹینڈ کرنے کے بجائے منوں مٹی اوڑھ کر سوگئیں۔ ساتھ میں ماں' بہن اور بھائی کو بھی لے لیا۔

"یا اللہ! یہ آزمائش کا کون سا روپ ہے جو تونے ہمیں دکھایا ہے؟ اتنا صبر' اتنا حوصلہ کہاں سے لائیں۔؟"

وہ صرف میری خالہ زاد بہن ہی نہیں' بلکہ بہت اچھی دوست' غمگسار اور دم ساز ساتھی بھی تھیں۔ ان کی صحبت میں مجھے ہمیشہ ایک لطف ملتا۔ جب بھی ان کے پاس سے اٹھتی' سیر ہو کر اٹھتی۔ میری اور شازیہ کی تحاریر کی خوب تعریف کرتیں۔ ہمارا حوصلہ بڑھاتیں۔ مجھے ان کے مصنفہ ہونے پہ ایک فخر سا ہوتا۔

"فرحانہ ناز ملک میری کزن ہیں۔" بچپن میں ان کی پھول اور کلیاں میں چھپی کہانیوں کو میں اپنے جاننے والوں میں بہت ناز سے متعارف کرواتی۔

ہاں۔ ہاں یہ خوب صورت۔ مدھر ہنسی والی میری کزن ہے۔ جس کے بے تحاشا لمبے بال مسحور کردیتے ہیں۔ جس کو اپنی شخصیت سے ہر کسی کو گرویدہ کرنے کا فن خوب آتا ہے۔ کسی کے دل میں گھر کیسے کرتے ہیں؟ کوئی ان سے پوچھتا۔ اپنے تینوں بچوں کے لیے ایک بہترین ماں' ہر وقت ان کے بہتر مستقبل کی باتیں کرتیں۔ اپنے شوہر کی تابع دار اور وفادار بیوی' بہت انکساری سے تھیں۔

"اللہ ہر لڑکی کو میرے جیسا نصیب عطا فرمائے۔" اور ہم سب لڑکیوں کے دل سے بے ساختہ آمین نکلتی۔ بے حد فراخ دل' بہت مہمان نواز' ان کے گھر جاتے تو اشیائے خورد و نوش کا ڈھیر لگا دیتیں۔ تاآنکہ ہمیں ہاتھ جوڑنے پڑتے "بس کردیں باجی بے بی!"

انہیں مجھ سے ہمیشہ ایک ہی گلہ رہا۔

"یار! تم کبھی اپنے خطوط میں میری تحاریر کی تعریف نہیں کرتی ہو۔ چلو تعریف نہیں' کوئی حوالہ ہی دے دیا کرو۔ دوسری رائٹرز کی تو بہت تعریفیں کرتی ہو۔"

"تحاریر چھوڑیں۔ میں آپ کی ویسے جو دیوانی ہوں۔ آپ کی سب سے بڑی فین۔" میں ان کا گلہ دور کرنے کی کوشش کرتی۔

شازیہ نے بالوں کا جوڑا لپیٹ کے رکھ دیا۔ میوزک، لائٹس، ڈریاں، برتن، سب سامان واپس۔
گلاب چہرے، ستارہ آنکھوں اور کھنکتی ہنسی والی فرحانہ ناز اپنے شریک حیات جن کے ساتھ تاحیات زندگی کا سفر نبھانے کا عہد کیا تھا۔ اپنے بچوں کو دم بھر خود سے جدا نہ کرنے والی سب سے منہ موڑ کر، سارے عہد توڑ کر خاک اوڑھ کر سو گئیں۔
ایک پری کی طرح اس نے اڑان بھری کہ نجانے کن آسمانوں کی کھوج میں نکل گئیں۔ میرے پاس اب ان کی باتیں، یادیں اور بس یادیں۔

اسے جانے کی جلدی تھی

— صائمہ اکرم چوہدری

کل اس کی آنکھ نے کیا زندہ گفتگو کی تھی
گماں بھی نہ تھا وہ شخص بچھڑنے والا ہے

"یار دانیال نے میٹرک میں 927 نمبر لیے ہیں، کچھ کم تو نہیں ہیں؟" فرحانہ ناز ملک نے بے چینی سے جولائی کو اپنے مخصوص میٹھے سرائیکی لہجے میں بتایا۔
"کچھ خدا کا خوف کرو فری! یہ کم نمبر ہیں کیا؟" میں نے دانیال کی حمایت میں بیان جاری کیا تو وہ فوراً خوش ہو گئی۔
"سنو... میں نے لاہور میں گھر لے لیا ہے۔ کچھ شفٹنگ کے مسائل ہیں اس لیے کنفیوز ہوں۔" اس نے ایک اور مسئلہ بتایا۔
"ایسا کرو استخارہ کر لو۔" میں نے اپنی سمجھ کے مطابق مشورہ دیا۔
"میں دانی کو ڈی جی خان سے لاہور اکیلے اسٹڈی کے لیے نہیں بھیجنا چاہتی۔" اس کا فکرمند لہجہ میرے ذہن میں گونجا۔
"ہرگز مت بھیجنا۔ یہ عمر بہت خطرناک ہوتی ہے۔ بچوں کو اپنی نظروں کے سامنے رکھنا چاہیے۔" میں نے فوراً ہی اسے خبردار کیا۔
"ہاں، سوچ رہی ہوں ایف ایس سی یہیں کر والوں۔ عمران کی ہاؤس جاب ختم ہو گئی ہے، تب تک اس کی بھی لاہور میں جاب ہو جائے گی۔ پھر شفٹ ہو جائیں گے۔" وہ فیصلہ کر کے اب پرسکون تھی۔
فرحانہ ناز ملک سے میرا اٹھارہ انیس سال پرانا تعلق ہے۔ وہ میری دوست تھی۔ اس کے لیے لفظ "تھی" لکھتے ہوئے دل ایک لمحے کو کانپا اور قلم اٹھاتے ہی یادیں کسی ضدی بچے کی طرح دامن تھام کر بیٹھ گئیں۔ سمجھ میں نہیں آ رہا کیا لکھوں اور کیا چھوڑ دوں۔ وہ جو والدین کی "بے بی" تھی۔ بچوں کی انتہائی محبت کرنے والی ماں تھی اور ہم سب کی بہت پیاری فری تھی۔ ہم سب کو چھوڑ کر چلی گئی۔
گیارہ اکتوبر 2014ء کی وہ ظالم شام تھی۔ جب میں نے عید کی چھٹیوں کے بعد اسلام آباد میں قدم رکھا تو پہلی دفعہ مجھے مارگلہ کی پہاڑیوں پر اترتی شام میں کسی گہری اداسی کی جھلک محسوس ہوئی۔ میں نے خود کو مصروف کرنے کے لیے ٹی وی آن کر لیا مگر اس میں بھی دل نہ لگ سکا۔ اسی وقت سائرہ کی کال آ گئی۔
"صائمہ! کیا کر رہی ہو؟" سائرہ نے ذرا محتاط انداز سے دریافت کیا۔
"ٹی وی دیکھ رہی ہوں۔" میں نے بے دھیانی میں جواب دیا۔
"فرحانہ کا پتا چلا؟" اس نے اب اور زیادہ محتاط انداز اپنایا۔
"کیا؟" میں نے لاپروائی سے کہا۔
"اس کی روڈ ایکسیڈنٹ میں ڈیتھ ہو گئی۔ فیس بک پر خبر لگی ہوئی ہے۔" سائرہ کی آواز سے ایک لمحے کو ماہ و سال کی گردشیں تھم سی گئیں۔
"نہیں... نہیں یار! ابھی صبح تو اس کا "گڈ مارننگ" کا میسج آیا ہے۔ ایسے کیسے ہو سکتا ہے۔ فیس بک پر کسی نے ہوائی اڑا دی ہوگی۔" میں نے سائرہ سے زیادہ خود کو تسلی دیتے ہوئے جواب دیا۔ پھر سائرہ کو خدا حافظ کہہ کر فوراً فرحانہ کا نمبر ملایا تو وہ ناٹ

رسپانڈنگ جا رہا تھا۔ فوراً اس کے میاں کو کال کی۔ اور اس لمحے دل کی بے ربط دھڑکنیں کچھ انہونی کا احساس دلا رہی تھیں۔
"بھائی! فرحانہ کہاں ہے؟" میں نے فرحانہ کے میاں کی آواز سنتے ہی بے تابی سے پوچھا۔
"اس کی آج دوپہر روڈ ایکسیڈنٹ میں ڈیتھ ہو گئی۔ اس کی والدہ اور ایک بہن اور بھائی بھی ساتھ تھے۔ سب کا رات نو بجے جنازہ ہے۔" فرحانہ کے میاں کی افسردہ آواز نے میرے جسم سے روح کھینچ لی۔ ایسا لگتا تھا جیسے کسی نے پگھلا ہوا سیسہ کانوں میں ڈال دیا ہو۔
"اور بچے...؟" میرے منہ سے بے اختیار پھسلا۔
"ان کو میں نے گھر روک لیا تھا۔ بس دانیال ساتھ تھا۔" انہوں نے بمشکل صدمے سے سنبھلتے ہوئے کہا۔ میری تو جیسے قوت گویائی سلب ہو گئی۔ میں نے پاگلوں کی طرح اپنا سیل فون اٹھایا۔ ہمیشہ کی طرح آج بھی اس کا "گڈ مارننگ" کا میسج موجود تھا لیکن ان لفظوں میں مجھے پہلی دفعہ زندگی کی دھڑکنیں محسوس نہیں ہو رہی تھیں۔ میرا دل و دماغ مفلوج سا ہو گیا۔ ذہن اس چیز کو قبول کرنے کو تیار ہی نہیں تھا۔ اس کی کھنکتی آواز، خوش گوار لہجہ، سادہ طبیعت اور دوستانہ مزاج۔ ایک ایک چیز حافظے پر نقش ہے۔ فیس بک اوپن کی تو ہر طرف ایک ہی دل دہلا دینے والی خبر تھی۔ اس کے اکاؤنٹ میں حیفظ، عبداللہ اور دانیال کی تصویریں لگی ہوئی تھیں۔ اپنے تینوں بچوں میں اس کی جان تھی۔
فرحانہ ناز ملک سے میری اس وقت قلمی دوستی ہوئی جب ہم دونوں بچوں کے میگزین "پھول" میں لکھا کرتے تھے۔ میں دسویں کلاس کی اسٹوڈنٹ تھی اور وہ میری ہی ایج فیلو تھی لیکن شادی شدہ۔ یہ چیز مجھے ہضم نہیں ہوئی تو اس نے فوراً ثبوت کے طور پر اپنی اور بچوں کی تصویریں بھجوا دیں۔ جو کسی اسٹوڈیو کی تھیں۔ دراز قد، بڑی بڑی سحر انگیز خوب صورت آنکھوں والی لڑکی مجھے پہلی ہی نظر میں اچھی لگی۔
"تم نے شادی اتنی جلدی کیوں کر لی؟" میں نے حیرت سے ایک دن پوچھا۔
"بس یار! کچھ امی ابو کو جلدی تھی اور کچھ میاں جی کو مجھ سے پیار تھا۔" اس نے شرارت بھرے لہجے میں جواب دیا۔ وہ اپنی ازدواجی زندگی سے بہت خوش تھی اور اکثر اپنی ساس کی بہت تعریفیں کرتی تھی۔
"میری ساس نے آج تک مجھے روٹی بنانے نہیں دی، میری تو موجیں ہی موجیں ہیں۔ سب کچھ پکا پکایا مل جاتا ہے۔" ایک دن اس نے فون پر بات کرتے ہوئے بتایا۔
"شرم کرو! اپنے میاں کی والدہ سے خدمتیں کرواتی ہو۔" میں نے اسے چھیڑا۔
"یار دنیا میں بہت کم خوش قسمت بہوئیں ہوتی ہیں جن کی ساسیں اتنی اچھی ہوں۔ میرا شمار ان چند بہوؤں میں ہوتا ہے۔" اس نے ہنستے ہوئے بتایا۔
شادی کے چند سال بعد جب اس نے علیحدہ گھر لیا تو کچھ افسردہ تھی۔ میں یونیورسٹی گئی، پھر اس کے بعد شادی ہو گئی، لیکن فرحانہ کے ساتھ میرا تعلق قائم رہا۔ اکثر ہم لوگ پیکیج پر گھنٹوں لمبی لمبی باتیں کرتے۔ وہ بہت محنتی لڑکی تھی اور زندگی میں کچھ کرنا چاہتی تھی۔ شادی شدہ ہونے کے باوجود اس نے میٹرک کے بعد کی ساری تعلیم حاصل کی۔ ایف اے، بی اے اور ایم اے کے دوران جب بھی اسے گائیڈ لائن کی ضرورت پڑتی، وہ مجھ سے ہی مشورہ کرتی۔ اسے ایم اے اردو کرنے کا بھی میں نے ہی مشورہ دیا۔ جب بھی گورنمنٹ جابز کا پتا چلتا تو میں فوراً اسے بتاتی اور وہ جلدی سے اپلائی کر دیتی۔ اسے اپنا کیریئر بنانے کی دھن تھی۔ بہت سادہ مزاج اور دوسروں پر اعتبار کرنے والی لڑکی تھی۔ ایک کالج میں اس کی ہوسٹل وارڈن کی جاب ہوئی تو وہ تین دن بعد ہی چھوڑ کر واپس آ گئی کہ بچوں کے بغیر نہیں رہ سکتی۔ میں نے خوب اسے چھیڑا۔ میں اپنی بیسٹ فرینڈ فریحہ خان کی شادی اٹینڈ کرنے ڈی جی خان گئی تو وہ مجھ سے وعدہ کر کے ملنے نہیں آئی۔ جس پر میں کافی عرصہ اس سے خفا رہی، لیکن پھر اس نے مجھے منا لیا۔

ایک دن میں کچھ رنجیدہ تھی تو اس نے کہا۔

"تو اتنی سی بات سے پریشان ہو گئیں۔ میں تمہیں بتاتی ہوں میرے ساتھ کیا کیا ہو چکا ہے۔" اس کے بعد اس نے اپنی زندگی کے کچھ تلخ واقعات مجھے بتائے اور میں ہکا بکا رہ گئی۔ مجھے یقین ہی نہیں آرہا تھا۔ وہ اپنی بے دھیانی اور سادگی میں مجھے حیران کرتی جارہی تھی۔ مجھے اس دن فرحانہ پر بہت پیار آیا۔

"تائی گاڈ فری! مجھے یقین نہیں آرہا' اتنا کچھ ہو چکا ہے تم لوگوں کے ساتھ۔" میں نے تعجب انگیز انداز سے کہا۔

"اب اس پر ناول مت لکھ دینا میں نے ابھی اپنی ناگوں کا بیمہ نہیں کروایا۔" اس کا کھنکتا ہوا شوخ لہجہ میری سماعتوں سے ٹکرایا۔ اپنے والد سے بے تحاشا محبت تھی اسے۔ ان کی ذرا سی تکلیف اسے دکھی کردیتی تھی۔ جب میرے میاں کی اسلام آباد پوسٹنگ ہوئی تو اس نے کہا۔ "صائمہ! اسلام آباد بڑا خونی شہر ہے۔ دھیان سے رہنا۔"

میں نے حیرت سے اس کی وضاحت مانگی تو وہ افسردگی سے گویا ہوئی۔ "یاد نہیں سلطے پروین شاکر پھر شازیہ چوہدری کو اسی شہر کی سڑکیں نگل گئیں۔"

"ارے میرے میاں اتنے خوش قسمت نہیں' بے فکر رہو۔" میں نے ہنستے ہوئے اسے تسلی دی۔

"صائمہ آپا! کبھی وہ دن بھی آئے گا جب تمہارا اور میرا کوئی سلسلے وار ناول شعاع یا خواتین ڈائجسٹ میں شائع ہو گا؟" اس کی خواہشیں بہت معصومانہ ہوتی تھیں۔ ایک دن کہنے لگی۔ "مجھے لمبتل سے فون پر بات کرتے ہوئے بہت ڈر لگتا ہے۔ پتا نہیں رائٹرز کیسے ان کے ساتھ لمبی لمبی باتیں کرلیتی ہیں۔" مجھے اس دن اندازہ ہوا کہ وہ بہت شرمیلی ہے۔ اپنی کہانیوں کے بارے میں بھی بات کرنے سے پہلے کئی دفعہ سوچتی تھی اور اکثر میسج کرکے گزارہ کرلیتی تھی۔

فرحانہ کے ساتھ تعلق کی ڈور بہت مضبوط تھی۔ لیکن درمیان میں کچھ عرصہ ایسا آیا' مجھے محسوس ہوا جیسے وہ کچھ خفا خفا سی ہے۔ میں نے ایک دفعہ پوچھا تو کہنے لگی۔ "تمہاری اور میری دوستی اتنی پرانی تھی' لیکن تم ہمیشہ آمنہ ریاض کو مجھ پر ترجیح دیتی ہو۔ تمہیں مجھ سے زیادہ اس سے محبت ہے۔" میں اس کے بچگانہ شکوے پر ہنس پڑی' اسے کافی تسلی دی' لیکن وہ مطمئن نہیں ہوئی۔

میرا ناول "دیمک زدہ محبت" شائع ہوا تو اس پر ہر مہینے اس کا تبصرہ آجاتا تھا اور جب ماہنامہ کرن میں اس کا سلسلے وار ناول شروع ہوا تو وہ کچھ ہی عرصے کے بعد بہت اپ سیٹ سی رہنے لگی۔ ایک دن بات ہوئی تو اس نے کہا۔ "میں "شام آرزو" کو جلد از جلد ختم کرنا چاہتی ہوں۔ اس لیے اس کی اگلی قسطیں لکھ کر اپنے پاس رکھ رہی ہوں۔ آہستہ آہستہ ریحانہ کو بھجواؤں گی۔"

"تم "شام آرزو" کو اتنی جلدی کیوں ختم کرنا چاہتی ہو؟" میں نے حیرانگی سے پوچھا تو اس نے بتایا۔ وہ اب الیکٹرانک میڈیا کے لیے لکھنا چاہتی تھی۔ اسے ہر کام کی جلدی تھی۔ شاید اسے خبر ہو گئی تھی کہ اس کے پاس وقت کم ہے۔

بڑی عید سے ایک ہفتہ پہلے اس سے بات ہوئی' لیکن ان دنوں اس کی باتیں بس اسکرپٹ رائٹنگ کے ارد گرد ہی گھومتی تھیں۔

"میں کس پروڈکشن ہاؤس کو اپنا ون لائنر بھیجوں؟ کتنے صفحات کا لکھوں؟ یار! مجھے فہد مصطفیٰ اور اعجاز اسلم کے ای میل ایڈریس بھیجو۔" ایسا لگتا تھا جیسے اس کے اندر کوئی بے چین روح گھس گئی ہو۔ وہ کم عرصے میں بہت سے کام نپٹا لینا چاہتی ہے۔

"صائمہ! میری بیٹی میں بڑا ایٹی ٹیوڈ ہے' لیکن اس پر بجتا ہے۔" ایک دن فون پر بات کرتے ہوئے اس نے ہنستے ہوئے مجھے بتایا۔ اس کے لہجے میں اپنے بچوں کے لیے ہمیشہ محبت چھلکتی تھی۔ ایک دفعہ اس کا سب سے چھوٹا بیٹا عبداللہ بیمار ہو گیا تو وہ بہت پریشان ہو گئی۔ میں نے کافی تسلی دی۔ اس کے بعد کرن (چھوٹی بہن) ایم بی بی ایس کرکے واپس آئی تو اس کے رشتے کے لیے اکثر پریشان رہتی تھی۔ کئی دفعہ باتوں میں ذکر کرتی' اپنے میاں کا ذکر کرتے ہوئے اس کے لہجے میں بڑی بے ساختہ محبت امڈ آتی۔ وہ اکثر کہتی تھی۔ "میں اپنے میاں کی بہت لاڈلی بیگم ہوں۔" اپنے والد صاحب سے اسے بے تحاشا محبت تھی۔ اپنی بہن کرن' شبانہ اور بھائی خاور اور شاہد کا اکثر ذکر کرتی۔

وہ سادہ مزاج کی لڑکی تھی' ہر کسی کی باتوں کا اعتبار کرلیتی۔ حد درجہ حساس تھی۔ کسی کے اپنے لہجے کی ہلکی سی تبدیلی اسے گھنٹوں پریشان رکھتی تھی۔ پچھلے دنوں میں کچھ بزی تھی' اس کے میسجز کا رپلائی نہیں کرسکی تو اس نے مجھے دو ستمبر کو ایک شعر بھیجا۔

مصلحت ہوگی کوئی مجھ کو بھلا دینے میں
ورنہ احباب کو معلوم ہے' میں زندہ ہوں

میں نے اس سے فوراً رابطہ کیا۔

ہم دونوں کے درمیان بہت خوب صورت تعلق تھا۔ وہ مجھ سے خفا ہوتی تو دائیں بائیں سے خبر مل جاتی اور مجھے کسی بات کا غصہ ہوتا تو میں بھی کسی نہ کسی ذریعے اس تک اپنا میسج پہنچا دیتی۔ ایک دوسرے کا نام ڈائجسٹ میں دیکھ کر دونوں کو کوئی جن چڑھ جاتا اور جو تحریر پندرہ دن میں مکمل ہوتی' وہ دو دن میں لکھی جاتی۔ وہ عالیہ بخاری اور عنیزہ احمد سے بہت امپریس تھی۔ عالیہ آپی کی بہت تعریفیں کرتی۔ نایاب کا بھائی جن دنوں قید میں تھا' اکثر اس کے لیے دعا کرنے کا کہتی۔

"تم زیادہ مت لکھا کرو' مجھے ٹینشن ہونے لگتی ہے۔" جن دنوں میرا ناول دیمک زدہ محبت چھپ رہا تھا اس نے مجھے شوخ لہجے میں کہا تو میں ہنسنے لگی۔ ہم دونوں نے تقریباً اکٹھے لکھنا شروع کیا' ایک ڈائجسٹ میں ہم دونوں کے اکٹھے سلسلے وار ناولٹ شائع ہوئے تو خوب ایک دوسرے کی تعریفوں کے پل باندھے جاتے۔ اس کو اپنی تحریر کے مسترد ہونے سے بہت خوف آتا تھا۔ میں حیران ہوتی تھی کہ وہ گھر اور بچوں کی ذمے داریوں سے کیسے ٹائم نکال کر لکھ لیتی ہے۔ کرن میں اپنے شائع ہونے والے ناول "شام آرزو" کو جلد از جلد سمیٹنا چاہتی تھی' لیکن افسوس اس کی یہ خواہش پوری نہیں ہو سکی۔

مجھے اسلام آباد کی سڑکوں سے ڈرانے والی خود انڈس ہائی وے پر خاموشی سے اپنے ابدی سفر پر چلی گئی۔ سوچتی ہوں شادی میں شرکت کے لیے جاتے ہوئے اس نے خوب ہار سنگھار کیا ہو گا۔ جیولری کا تو اسے پہلے ہی بہت شوق تھا۔ کتنی پیاری لگ رہی ہوگی۔ نہ جانے موت اتنی بے رحم کیوں ہوتی ہے۔ اتنے خوب صورت چہروں کو نگلتے ہوئے اسے ترس کیوں نہیں آتا۔

اس کا گھر' اس کا کمرہ' اس کی وہ فائل۔ جس میں اس کی ڈھیروں ادھوری کہانیاں رکھی ہیں۔ ان سب چیزوں کو فرحانہ کی لاڈلی حیفہ نے کیسے سمیٹا ہو گا۔ عبداللہ کو تو ماں کی بہت عادت تھی۔ اس کو کس نے سنبھالا ہوگا۔ ساس اور شوہر کی لاڈلی کے دل میں کتنے ارمان اور کتنے خواب تھے' جو اس کے ساتھ ہی دفن ہو گئے۔ اکیلے رہنے سے اسے خوف آتا تھا۔ اس لیے جاتے جاتے ساتھ میں اپنی والدہ' بہن ڈاکٹر مہرالنساء (کرن) اور بھائی خاور کو لے گئی۔ اس کے والد کے دل پر کیا قیامت ٹوٹی ہو گی؟ شبانہ' جس نے اس کے کپڑے بنوا کر رکھے ہیں۔ جو ہر بات اپنی لاڈلی "بےبی" سے شیئر کرتی تھی۔ وہ زندگی میں اتنی محبت کرنے والی بہن کہاں سے ڈھونڈ کر لائے گی؟ اس کے میاں سے جب بھی بات ہوئی' ان کی صدمے سے بھرپور آواز سن کر کچھ بھی پوچھنے کی ہمت نہیں ہوئی۔ اس کا لاڈلا بیٹا دانیال نشتر اسپتال ملتان میں زندگی اور موت کی کشمکش میں مبتلا ہے۔ اللہ اسے زندگی اور صحت دے۔ اس کی والدہ' بہن اور بھائی کو جنت الفردوس میں جگہ دے۔ (آمین)

آخر میں فرحانہ سے اتنا ہی کہنا ہے "یار! تم تو مجھ سے مقابلہ کرکے لکھا کرتی تھیں۔ اتنے سال ایک دوسرے کو دیکھ کر ہم ہمت پکڑتے تھے۔ اب بتاؤ راستے میں ہی انگلی چھڑا کر کیوں چلی گئیں؟ تم تو میدان چھوڑنے والوں میں سے نہیں تھیں۔ پھر اتنی بڑی جنگ کیوں کی؟ اٹھارہ' انیس سال کی رفاقت میں ایسے کرتا ہے کوئی؟ ایسے چھوڑ کر جاتے ہیں بھلا؟"

تاریخ کے جھروکوں سے

شاہ تبع کا محل

آفتاب رسالت طلوع ہونے سے سات سو برس پہلے کا ذکر ہے کہ شاہ تبع اسعد بن کرب مشرقی ممالک کو زیر نگیں کرنے کی غرض سے نکلا۔ اسی دوران اس کا گزر مدینہ منورہ سے بھی ہوا جہاں مقام سلع پر اس نے قیام کیا۔ اس وقت اہلیان مدینہ کا رئیس عمرو بن طلحہ تھا۔ شاہ تبع یہود کو قتل اور شہر کو برباد کرنے کا ارادہ رکھتا تھا مگر اہل مدینہ نے جنگ پر صلح کو ترجیح دی۔

جب اہل مدینہ سے صلح کا معاہدہ طے پا گیا تو بادشاہ اپنے لڑکے کو وہاں مقرر کر کے مکہ معظمہ پر فتح پانے کے لیے چل پڑا۔ اس کے جانے کے بعد شہزادے کو قتل کر دیا گیا۔ جب بادشاہ کو اطلاع ہوئی تو وہ سخت غضب ناک ہو کر لوٹا اور اہل مدینہ کا قتل عام کرنے کا فیصلہ کر لیا۔

بادشاہ کے انتہائی خطرناک ارادے کا علم بنی قریظہ کے دو علما سمیت منبشہ کو ہوا تو وہ بادشاہ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور ناصحانہ و ہمدردانہ مشورہ دیا کہ وہ اہل مدینہ کی ہلاکت کا ارادہ ترک کر دے اور ان کی خیر خواہی کو قبول کرلے ورنہ اندیشہ ہے کہ کسی ناگہانی آفت کا شکار ہو جائے گا۔ شاہ تبع نے دریافت کیا کہ عذاب میں مبتلا ہونے کی کیا وجہ ہو سکتی ہے؟ علما نے بتایا کہ مدینہ باسکینہ نبی آخرالزمان حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا دارالہجرت اور دارالقرعہ ہوگا۔ اس لیے اللہ نے اس کی حفاظت اپنے ذمے لے رکھی ہے۔

بادشاہ نے اس مشورہ کی قدر کرتے ہوئے اپنا ارادہ بدل دیا اور علما کرام کی علمیت اور فضیلت کو تسلیم کرتے ہوئے ان کا مذہب اختیار کر لیا۔ اس طرح خاموشی کے ساتھ مدینہ سے روانہ ہو گیا۔

ایک روایت میں ہے کہ جب شاہ تبع مدینہ سے گزرا تو اس کے ساتھ چار سو علما تورات تھے۔ علما نے بادشاہ سے درخواست کی کہ انہیں اس سرزمین پاک پر رہنے کی اجازت دی جائے۔ بادشاہ نے اس کا سبب دریافت کیا۔ جس پر علما کرام نے کہا کہ ہم نے انبیا کرام کے صحیفوں میں پڑھا ہے کہ نبی آخرالزمان حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا دارالہجرت یہ شہر ہوگا۔

بادشاہ نے نہ صرف انہیں وہاں رہنے کی اجازت دے دی بلکہ ان سب کے لیے مکانات تعمیر کرائے۔ ان کے نکاح کرائے اور گزر اوقات کے لیے مال و دولت بھی عطا کی اور مقصود کائنات کی ذات بابرکات کے لیے بھی ایک عالی شان محل تعمیر کرایا اور آپ کے نام خط لکھا جس میں اپنے اسلام اور اشتیاق دید کا ان الفاظ میں اظہار کیا۔

"میں گواہی دیتا ہوں کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے رسول برحق ہیں۔ اگر میری عمر نے وفا کی اور ان کی آمد تک خدا نے زندگی بخشی تو میں ان کا معاون و مددگار بنوں گا اور ان کے دشمنوں سے جہاد کروں گا اور ان کے دل سے ہر غم دور کروں گا۔"

بادشاہ نے اس خط کو سربمہر کر کے ایک عالم کے سپرد کر دیا اور وصیت کی اگر تم نبی کو پاؤ تو میرا یہ عریضہ پیش کر دینا بصورت دیگر یہ خط اپنی اولاد کے حوالے کر کے یہی وصیت کر دینا۔

چنانچہ وہ خط نسل در نسل چلتے چلتے سیدنا ابو ایوب انصاری تک پہنچ گیا اور شاہ تبع کا تعمیر کردہ محل بھی زمانہ نشیب و فراز سے گزرتا ہوا اور تعمیر در تعمیر کے مراحل

طے کرتا ہوا سیدنا ابو ایوب کے زیر تصرف آ گیا۔ چنانچہ جب خیر الخلائق سید الاولین والآخرین مدینہ منورہ تشریف لائے تو وہ دونوں چیزیں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت اقدس میں پیش کر دی گئیں۔

سیدنا ابو ایوب انصاری کا مکان دو منزلہ تھا۔ انہوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے درخواست کی کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اوپر والے حصے میں قیام فرمائیں مگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے زائرین کی سہولت اور راحت رسانی کے لیے زیریں منزل پسند فرمائی۔ کچھ عرصہ یوں گزر گیا مگر حضرت ابو ایوب کا دل ادب و احترام اور عشق نبوی صلی اللہ علیہ وسلم سے لبریز تھا۔ آپ کو ہر وقت فکر دامن گیر رہتی کہ رحمت کائنات نیچے مقیم ہیں اور ہم اوپر رہتے ہیں۔ یعنی ہم آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے سر مبارک پر چلتے پھرتے ہیں۔ بنا بریں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت اقدس میں عاجزی و انکساری سے عرض کی کہ ہمارے ایمانی جذبات اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ادب و احترام کا تقاضا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم بالائی منزل میں اقامت گزیں ہو جائیں تاکہ سوئے ادب کا احتمال نہ رہے۔ چنانچہ آپ نے ان کی درخواست کو شرف قبولیت سے نوازا اور بالائی منزل میں راحت گزیں ہو گئے۔ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے زیریں حصے کے مقام کے دوران ایک مرتبہ اتفاق سے بالائی منزل میں پانی کا برتن ٹوٹ گیا۔ صاحب خانہ حضرت ابو ایوب رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو خدشہ ہوا کہ پانی نیچے گرنے سے محسن کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کو اذیت پہنچے گی۔ اس لیے پانی جذب کرنے کے لیے فوری طور پر لحاف ڈال دیا۔ حالانکہ ان کے پاس صرف وہی ایک لحاف اوڑھنے کو تھا۔

(تاریخ مدینہ منورہ از محمد عبدالمعبود)

شبانہ الیاس۔ نیو ملتان



موسم کے پکوان

خالدہ جیلانی

کھڑے مسالے کا چکن اسٹو

اجزا :

چکن	ایک کلو
ثابت سرخ و سیاہ مرچ	بارہ بارہ عدد
ادرک لہسن پیسٹ	ایک کھانے کا چمچہ
دار چینی تیز پات	دو دو ٹکڑے
چھوٹی الائچی	چھ عدد
دہی	ڈیڑھ کپ
پیاز	ایک کلو
زیرہ دھنیا	آدھا، آدھا چائے کا چمچہ
نمک تیل	حسب ذائقہ و ضرورت

ترکیب :

تیل گرم کرکے پیاز سنہری کریں۔ چھوٹی الائچی، ثابت لال مرچ، لونگ، سیاہ مرچیں، تیز پات، دار چینی اور لہسن ادرک ڈال کر دو منٹ فرائی کریں۔ پھر گوشت ڈال دیں۔ گوشت کا رنگ ہلکا سنہری ہو جائے تو دہی اور نمک ڈال کر مکس کریں اور درمیانی آنچ پر ڈھک کر پکائیں۔ گوشت گل جائے تو اچھی طرح بھون لیں۔ تیل الگ ہو جائے تو زیرہ اور دھنیا ڈال کر مکس کریں اور چولہے سے اتار لیں۔

سندھی کڑھی

اجزا :

دہی	آدھا کلو
بیسن	دو کپ
پالک	ایک کپ
ادرک لہسن پیسٹ	ایک چائے کا چمچہ
ہلدی، سرخ مرچ	آدھا، آدھا چائے کا چمچہ
پیاز	ایک عدد
کڑی پتے	چند پتے
نمک تیل	حسب ذائقہ و ضرورت

ترکیب :

بیسن چھان کر دہی میں ملائیں اور خوب اچھی طرح

پھینٹ لیں۔ پھر نمک، سرخ مرچ، ہلدی اور لہسن ادرک پیسٹ کے ساتھ پانچ گلاس پانی ڈال کر چڑھا دیں۔ ایک ابال آجائے تو آنچ ہلکی کر دیں اور اتنی دیر پکائیں کہ بیسن کا کچا پن ختم ہو جائے۔ پھر عام طریقے سے بنائے گئے پکوڑے اور پالک ڈال کر پکائیں۔ گاڑھی ہو جائے تو چولہا بند کر دیں۔ فرائنگ پان میں پیاز، ثابت مرچ، کڑی پتا اور زیرہ کڑکڑا کر کڑھی میں بگھار لگا دیں۔ ابلے چاول یا تندوری روٹی کے ساتھ پیش کریں۔

حیدر آبادی بھنڈی

اجزا :

بھنڈی	آدھا کلو
کھوپرا، زیرہ	ایک، ایک چائے کا چمچہ
پیاز، ٹماٹر	دو، دو عدد
کٹی مرچ، ہلدی	آدھا، آدھا چائے کا چمچہ
تل، بھنی مونگ پھلی	ایک، ایک چائے کا چمچہ
نمک تیل	حسب ذائقہ و ضرورت

ترکیب :

زیرہ، مونگ پھلی، کھوپرا باریک پیس لیں۔ بھنڈی کے درمیانے ٹکڑے کاٹ کر فرائی کریں۔ الگ دیگچی میں ایک چھوٹی پیاز سنہری کریں پھر نمک، مرچ، ہلدی اور باریک کٹے ہوئے ٹماٹر ڈال دیں۔ ٹماٹر نرم ہو جائیں تو فرائی کی ہوئی بھنڈی ڈال کر ہلکی آنچ پر دس منٹ پکائیں۔ پھر پسا ہوا مسالا ڈال کر پانچ منٹ کے لیے دم پر رکھ دیں۔ چاہیں تو املی کا پیسٹ بھی ڈال دیں۔ حیدر آبادی بھنڈی فرائی تیار ہے۔

کبابی پلاؤ

اجزا :

قیمہ	آدھا کلو
بیسن	ایک کھانے کا چمچہ
پیاز	دو عدد
ادرک لہسن پیسٹ	ایک کھانے کا چمچہ
چاول	تین کپ
ثابت گرم مسالا	ایک کھانے کا چمچہ
نمک تیل	حسب ذائقہ و ضرورت

ترکیب :

قیمے میں لہسن ادرک پیسٹ، سرخ مرچ، نمک، پسا گرم مسالا، بیسن، ایک پیاز (براؤن کرکے پیس لیں) اچھی طرح ملا کر رکھ دیں۔ ایک گھنٹے بعد کسی بھی شیپ میں کباب بنا کر فرائی کرکے رکھ لیں۔ الگ پتیلی میں پیاز کے ساتھ ثابت گرم مسالا کڑکڑائیں۔ پھر لہسن ادرک پیسٹ اور دودھ چنگی جائفل جاوتری بھی ڈال دیں۔ چاول کے ساتھ حسب ضرورت پانی (یخنی استعمال کریں تو زیادہ بہتر رہے گا) ڈال کر درمیانی آنچ کر دیں۔ پانی خشک ہو جائے تو کباب رکھ کر احتیاط سے مکس کریں اور دم پر رکھ دیں۔ رائتے کے ساتھ نوش فرمائیں۔

دل بہار میٹھا

اجزا :

سوجی	ایک کپ
بیسن	دو کپ
چینی	ڈیڑھ کپ
ناریل پاؤڈر	ایک کپ
خشک دودھ	آدھا کپ
بادام، پستے، گھی	حسب ضرورت

ترکیب :

چینی میں آدھا کپ پانی ملا کر گاڑھا شیرہ بنا لیں۔ ایک فرائنگ پان میں تین چمچے گھی ڈال کر بیسن بھون لیں اور سنہری ہو جائے تو الگ نکال لیں۔ اسی فرائنگ پان میں گھی ڈال کر سوجی بھونیں اس کے بعد ناریل، خشک دودھ اور بھنا ہوا بیسن بھی شامل کر دیں۔ پھر آہستہ آہستہ شیرہ ملائیں۔ ساتھ ساتھ مکس بھی کرتے جائیں۔ خوب اچھی طرح یکجان کرکے آمیزے ٹرے میں آمیزہ پھیلا دیں۔ پستہ، بادام کی ہوائیاں اور کش کیا ہوا کھوپرا اوپر چھڑک دیں۔ جم جائے تو حسب پسند شیپ میں کاٹ کر پیش کریں۔

ادارہ



سردیوں کا استقبال کیجیے

موسم سرما کا آغاز ہو چکا ہے۔ یہ موسم کئی بیماریوں مثلاً "نزلہ" زکام اور کھانسی کو بھی ساتھ لے کر آتا ہے۔ دن میں تیز دھوپ اور رات میں خنکی سے جسم کا دفاعی نظام متاثر ہوتا ہے۔ جسم کی قوت مدافعت مستحکم رکھنے کے لیے لہسن اور پیاز وغیرہ کا استعمال مفید ہوتا ہے۔ گرم پانی میں آدھے لیموں کا رس اور شہد گھول کر پینے سے افاقہ ممکن ہے۔

سردیوں کی بے احتیاطی کا پہلا تحفہ انفلوئنزا یا وبائی فلو ہے۔ اس سے بچت کے لیے آپ چائے میں ذرا سی ادرک اور دار چینی ڈال دیں صبح شام استعمال کیجیے۔

سردیوں میں عموماً" کھانسی بھی طول پکڑ لیتی ہے۔ کھانسی کی شکایت اگر بچے کو ہو تو ادرک کا عرق نکال لیں اور اسے ہم وزن شہد میں ملا کر ایک چائے کا۔ چمچ صبح شام دیں یا پھر شہد کو ہلکا سا گرم کرکے اس میں سفید الائچی پیس کر ملا دیں اور ایک ایک چمچ صبح شام پلائیں یا پھر ابلے ہوئے انڈے کی زردی لیں اور شہد میں ملا کر بچے یا بڑے چند روز تک کھائیں تو سخت کھانسی میں بھی افاقہ ہو جاتا ہے۔

اس کے علاوہ سفید خشخاش اور مصری برابر مقدار میں لے کر پیس لیں اور دن میں دو تین بار چھ چھ ماشے کھاتے رہیں۔ اس سے کھانسی سے شفا ہو جاتی ہے۔

سردیوں میں ایک مسئلہ جلد پر خشکی کا ہو جانا بھی ہے۔ رات سونے سے پہلے لیموں کا عرق اور گلیسرین ملا کر اپنے ہاتھوں اور چہرے پر مل کر سو جائیں۔ صبح منہ دھونے کے بعد آپ کا چہرہ کھل اٹھے گا۔

جاڑوں کے موسم میں اکثر ہاتھوں اور پیروں کی انگلیاں برف کی طرح ٹھنڈی ہو جاتی ہیں۔ ان کے شل ہو جانے سے کوئی کام صحیح طور پر نہیں ہوتا۔ اس کا ایک عام سبب دراصل خون میں فولاد (آئرن) کی کمی ہوتی ہے۔ اس کمی کی وجہ سے خون پوری مقدار میں آکسیجن جذب نہیں کرتا۔ جس سے جسم میں گرمی پیدا نہیں ہوتی۔

قدرتی فولاد حاصل کرنے کے لیے تازہ ساگ سو گرام باریک کتر کر فرائی پین میں تھوڑے سے تیل کے ساتھ ہلکی آنچ پر پکائیں۔ جب ساگ آدھا پک جائے "تھوڑا نمک اور مرچ شامل کرکے اسے روکھا یا روٹی کے ساتھ کھالیں۔ اس طرح پکا ہوا یہ ساگ بڑی تیزی سے جسم میں فولاد کی کمی دور کرتا ہے۔ اسی طرح خشک خوبانی کے باقاعدہ استعمال سے بھی خون میں فولاد کی سطح میں اضافہ ہو جاتا ہے۔

جسم میں فولاد کے جذب ہونے میں وٹامن سی بڑا اہم کردار ادا کرتا ہے۔ سنگترے کا رس اس کا بہترین ذریعہ ہے۔ پاکستان میں قدرت مہربان ہے۔ جاڑوں کے آغاز ہی میں ہمیں بکثرت کینو' فروٹر' گریپ فروٹ اور لیموں جیسے پھل عطا کرتی ہے۔ جاڑوں کا مقابلہ کرنے کے لیے توازن و اعتدال کے ساتھ ان کا استعمال بہت مفید ثابت ہوتا ہے۔





